بہنوں کا اپنا ماہنامہ

اگست 2015

شعاع

سالگرہ نمبر

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے

مستقل سلسلے

اگست 2015
جلد 29 شمارہ 12
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی، نی فاری سی ای ایچ ایس سوسائٹی، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

پہلی بات

شعاع کا سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تیس واں سالگرہ نمبر

شعاع تیس سال کی طویل مسافت طے کر کے اکتیس ویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہیں جس نے ہماری محنت، ریاضت اور لگن کو قبولیت بخشی اور ہمیں کامیابی اور کامرانی سے نوازا۔ بلاشبہ شعاع کی کامیابی اور مقبولیت اسی کی عطا کردہ ہے۔

ایک پرچا جب آپ کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے تو اس میں بہت سے لوگوں کی خلوص دل سے کی گئی محنت و مشقت اور شب و روز کی ریاضت شامل ہوتی ہے۔ اور ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں مخلص، محنتی اور قابل قدر ساتھیوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ شعاع کی کامیابی میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

اور یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ شعاع کو بہترین لکھنے والی مصنفین کا ساتھ ملا۔ شعاع کے ذریعے بے شمار نئے نام سامنے آئے جو آج شہرت و مقبولیت کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔ قارئین کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی بدولت مصنفین کی بہترین تخلیقی صلاحیتیں پوری طرح ابھر کر سامنے آئیں۔ ہماری مصنفین نے ہمیشہ شعاع کی پالیسی کا خیال رکھا اور ہماری تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی روایات کی پاس داری کرتے ہوئے زندگی سے قریب کہانیاں لکھیں، ہم تہہ دل سے ان کے ممنون ہیں۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے شعاع کا اجراء کیا، محمود بابر فیصل اور محمود خاور آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ہماری بہت سی مصنفین جنہوں نے شعاع کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا، آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں بلند درجات سے نوازے۔ آمین۔

اگست کے مہینے میں محمود خاور اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تھے۔ 20۔ اگست کو ان کی برسی ہے۔ قارئین سے خصوصی طور پر دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اور ہماری قارئین۔

اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ شعاع کی قارئین بہت ذہین اور بے حد باصلاحیت ہیں۔ شعاع کے سلسلوں نے ان کی صلاحیتوں کو سامنے آنے کا موقع دیا۔ اور شعاع کے منفرد اور دلکش سلسلے ان کی ذہانت کے آئینہ دار ہیں۔

اپنی قارئین کا بھی ہم شکریہ ادا کرتے ہیں، اور رب کریم سے دعا گو ہیں کہ ان کا تعاون، خلوص اور محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- رنگ و خوشبو سے بھرے آنگن ۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- وہ اک لمحہ ۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- تعویذ حب ۔ ایمل رضا کے ناول کی آخری قسط،
- صائمہ اکرم کا ناولٹ ۔ سیاہ حاشیہ،
- حنا یاسمین، ام طیفور، مہناز یوسف، شمسہ فیصل اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے،
- آرزو کا دیا ۔ قارئین سے سروے،
- فلمی اداکارہ ثنا اور فخر عالم کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- آمنہ مفتی کا سفرنامہ ہند،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

سالگرہ نمبر آپ کو کیسا لگا، ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

تو ہی سب کا مولا ہے اے خالق دو عالم
کوئی نہیں ہے مجھ سا اے خالق دو عالم

دونوں جہاں میں اپنا سمجھا ہے تجھ کو ہم نے
ہم کو بنا لے اپنا اے خالق دو عالم

سب عالموں کو بے شک سیراب کر رہا ہے
رحمت کا تیری دریا اے خالق دو عالم

مسلم ہو یا کہ منکر تو دے رہا ہے سب کو
ہے لطف عام تیرا اے خالق دو عالم

تو ہے رحیم و رحمان، رحمت ہے عام تیری
سب پا رہے ہیں حصہ اے خالق دو عالم

تو ہے کریم عقبیٰ واں خاص تیری رحمت
عقبیٰ میں لاج رکھنا اے خالق دو عالم

بے حد خطائیں کر کے آیا بچشم پرنم
ہے پھول تیرا بندہ، اے خالق دو عالم

تنویر پھول

نعت رسول مقبول ﷺ

مبارک مومنو دنیا میں ختم المرسلیں آئے
نکھار آیا ہے عالم پر شہ دنیا و دیں آئے

خدا نے رحمت اللعالمین کہہ کر جنہیں بھیجا
وہ پیغمبر مجسم مژدۂ فتح مبیں آئے

جو گہوارے میں رہ کر صاحب شق القمر ٹھہرے
وہی معجز نما آقا شفیع المذنبیں آئے

یہ عید اولیں ہے ہر طرف اک نور چھایا ہے
مجسم نور بن کر دین حق کے وہ امیں آئے

ستاروں کو چلا بخشی شب معراج آقا نے
جو نور اولیں تھے بن کے ختم المرسلیں آئے

ہزاروں زخم سب کے گل بنے جس کے تبسم سے
مسیحائے جہاں، رحمت سراپا شان دیں آئے

ریحانہ تبسم

ادارہ

لاالہٰ الا اللہ کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' انہوں نے گواہی دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب بندہ کہتا ہے۔ "لا الہٰ الا اللہ واللہ اکبر۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔"

تو اللہ عزوجل فرماتا ہے "میرے بندے نے سچ کہا' میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میں سب سے بڑا ہوں"

اور جب بندہ کہتا ہے۔ "لا الہٰ الا اللہ وحدہ۔ اکیلے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

تو وہ فرماتا ہے۔

"میرے بندے نے سچ کہا' مجھ اکیلے کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

جب بندہ کہتا ہے "لا الہٰ الا اللہ لا شریک لہ۔ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اس کا کوئی شریک نہیں۔"

تو وہ فرماتا ہے۔ "میرے بندے نے سچ کہا' میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میرا کوئی شریک نہیں۔"

جب وہ کہتا ہے لا الہٰ الا اللہ لہ الملک ولہ الحمد۔ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' بادشاہی اسی کے لیے ہے اور تعریف بھی اسی کی ہے۔"

تو وہ فرماتا ہے۔ "میرے بندے نے سچ کہا' میرے سوا کوئی معبود نہیں' بادشاہی میرے ہی لیے ہے اور تعریف بھی میری ہی ہے۔"

جب بندہ کہتا ہے "لا الہٰ الا اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ کی توفیق کے بغیر گناہ سے بچاؤ نہیں اور نیکی کی طاقت نہیں۔"

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "میرے بندے نے سچ کہا' میرے سوا کوئی معبود نہیں اور میری توفیق کے بغیر (گناہ سے) بچاؤ نہیں اور (نیکی کی) طاقت نہیں۔"

دین کا علم

حضرت یحییٰ بن طلحہ رحمتہ اللہ نے اپنی والدہ حضرت ام سعدی مریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا' انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد (ایک دفعہ) حضرت عمر رضی اللہ حضرت طلحہ رضی اللہ کے پاس سے گزرے تو فرمایا۔ "آپ کیوں پریشان ہیں؟ کیا آپ کو اپنے چچا زاد (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے امیر المومنین بننے سے ناگواری محسوس ہوئی ہے؟"

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ نہیں' بلکہ (بات یہ ہے کہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے ایک کلمہ معلوم ہے جسے اگر کوئی شخص اپنی موت کے وقت کہہ لے تو وہ اس کے نامہ اعمال کا نور بن جاتا ہے اور موت کے وقت اس کی وجہ سے اس کے جسم و جان کو راحت حاصل ہوتی ہے۔" (افسوس اس بات کا ہے کہ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کلمہ دریافت نہ کر سکا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "مجھے وہ کلمہ معلوم ہے۔ یہ وہی ہے جسے کہنے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا (ابو طالب) کو ان کی موت کے وقت) فرمایا تھا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا کہ کوئی اور کلمہ ان کے لیے نجات کا زیادہ سبب بن سکتا ہے تو آپ انہیں وہی (کوئی اور کلمہ) پڑھنے کا حکم دیتے۔

فوائد و مسائل :

1۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خاندان (بنو تیم) سے تعلق رکھتے تھے۔

2۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل میں اللہ تعالیٰ کا اتنا خوف تھا کہ جنت کی خوشخبری ملنے کے باوجود ڈرتے تھے۔ یہ خوف ایمان کا جزو ہے۔ جس طرح اللہ کی رحمت کی امید ایمان کا جزو ہے۔

3۔ مومن کی نظر میں دنیا کی حکومت اور عہدے کی نسبت آخرت کی نجات زیادہ اہم ہے۔

4۔ دین کا علم بہت قیمتی ہے۔ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مسئلہ معلوم نہ کر سکنے پر بہت غم ہوا۔

5۔ کلمہ توحید کا اقرار اور اس پر ایمان ہی نجات کی بنیادی شرط ہے۔

یقین دل سے گواہی

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو انسان اس چیز کی گواہی دیتا ہوا فوت ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا رسول ہوں' اور یہ گواہی اس کا دل یقین سے دے رہا ہو تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مغفرت فرما دے گا۔"

فوائد و مسائل : 1 نجات کا دارومدار دل کے یقین پر ہے۔ اس کے بغیر زبان کا اقرار نجات کے لیے کافی نہیں۔

تین باتیں

حضرت ابو کبشہ عمر بن سعد انماری رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

"میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں اور ایک بات تمہیں بتاتا ہوں' اسے یاد رکھو! کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ اور جس پر ظلم کیا جائے' وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے۔ اور جو شخص مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر فقر و محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ (آپ نے فقر فرمایا یا اس جیسا کوئی اور کلمہ۔)

اور ایک بات میں تمہیں بتاتا ہوں' پس اسے یاد رکھو! (فرمایا) دنیا میں چار قسم کے لوگ ہیں۔

ایک وہ بندہ جسے اللہ نے مال اور علم عطا کیا' پھر وہ ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور رشتے داروں سے حسن سلوک (صلہ رحمی) کرتا ہے اور ان میں جو اللہ کا حق ہے' اسے پہچانتا (اور اسے ادا کرتا) ہے تو یہ شخص جنت کے سب سے افضل درجوں میں ہوگا۔

اور (دوسرا) وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم تو دیا مگر مال نہیں دیا' پس وہ سچی نیت رکھتا اور کہتا ہے۔ اگر میرے پاس مال ہوتا تو یقیناً" میں بھی فلاں آدمی کی طرح عمل (خرچ) کرتا (جب) اس کی نیت یہ ہے تو اس کا اور پہلے شخص کا اجر برابر ہے۔

اور (تیسرا) بندہ وہ ہے جسے اللہ نے مال دیا اور علم نہیں دیا' پس وہ بغیر علم کے اندھا دھند طریقے سے خرچ کرتا ہے اس کے بارے میں نہ تو وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے اور نہ اس میں وہ رشتے داروں کے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ اللہ کا کوئی حق اس میں پہچانتا ہے۔ یہ سب سے بدتر مرتبے والا ہے۔

اور (چوتھا) وہ بندہ ہے جسے اللہ نے مال دیا نہ علم' لیکن کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں آدمی کی طرح عمل (اندھا دھند خرچ) کرتا۔ پس (جب) اس کی نیت یہ ہے تو ان دونوں (اس کا اور تیسرے بندے) کا گناہ برابر ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

(1) اس میں اچھی یا بری نیت سے مراد پختہ نیت' یعنی عزم (کا ارادہ) ہے کیونکہ عزم ہی پر ثواب و عتاب ہے۔

(2) اس میں مال کی فضیلت بھی ہے بشرطیکہ اس میں حدود شرعیہ کا خیال رکھا جائے اور مال کی مذمت اور اس کی خطرناکی کا بیان بھی' جب کہ اس میں اللہ کی ہدایات کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اسی طرح علم شریعت کی فضیلت ہے اگر اس کے مطابق عمل کیا جائے اور جہل کی مذمت اور اس کے نقصانات کا بیان کہ یہ جہالت انسان کو محارم میں مبتلا کر دیتا ہے۔

گن کر خرچ کرنا

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بند ھن باندھ کر نہ رکھو (بلکہ خرچ کرتی رہو) ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر بندھن باندھے گا (یعنی تمہیں نہیں دے گا۔)"

ایک دوسری روایت میں ہے۔

"خرچ کرو اور گن گن کر نہ رکھو ورنہ اللہ بھی تمہیں گن گن کر دے گا اور سینت سینت کر نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ فرمائے گا" (بخاری و مسلم)

فائدہ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے ایک اصول کا تذکرہ ہے اور وہ یہ کہ وہ جزا جنس عمل سے ہی دیتا ہے' یعنی جیسا عمل ویسا ہی بدلہ۔ بے حساب اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو بے حساب ہی بدلہ دے گا' گن گن کر خرچ کرو گے تو وہ بھی گن گن کر ہی دے گا۔ سینت کر رکھو گے' خرچ نہ کرو گے تو وہ بھی دینا بند کر دے گا۔ اس میں اللہ کی راہ میں خوب خرچ کرنے کی ترغیب اور بخل اور امساک پر سخت وعید و تہدید ہے۔

صدقہ کی برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں' ان کے بدن پر سینے سے ہنسلی تک لوہے کی زرہیں ہیں۔ پس خرچ کرنے والا خرچ کرتا ہے تو یہ زرہ اس کے بدن پر دراز اور لمبی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کے پوروں کو چھپا لیتی ہے اور اس کے نشان قدم کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ اور بخیل چونکہ کچھ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا' اس لیے زرہ کا ہر حلقہ اپنی جگہ پر چمٹ جاتا ہے۔ بس وہ اسے ڈھیلا کرتا ہے لیکن وہ ڈھیلا نہیں ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس تشبیہ کا مطلب ہے کہ صدقہ انسان کو اس طرح چھپا لیتا ہے جیسے ایک پوری زرہ' جو پیروں تک ہو' اس کے بدن کو حتیٰ کہ اس کے قدم اور نشان قدم کو بھی چھپا لیتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں صدقہ کرنے والے کے لیے خوش خبری ہے کہ اس کے مال میں برکت اور اس کی حفاظت و صیانت ہو گی' اس لیے کہ صدقے سے بلائیں ٹل جاتی ہیں' جبکہ بخیل کے لیے وعید ہے کہ پردہ پوشی کے بجائے اس کی پردہ دری ہو گی اور وہ بلاؤں کا نشانہ ہو گا۔

(2) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سخی آدمی جب صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے سینہ فراخ ہو جاتا ہے اور وہ خوشی خوشی کشادہ دستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب بخیل کے سامنے خرچ کرنے کا معاملہ آتا ہے تو اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا ہاتھ بند کر لیتا ہے۔ اس میں سخی کے لیے بشارت اور بخیل کے لیے وعید ہے۔

ایک کھجور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ!

"جو شخص پاکیزہ (حلال کی) کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ صدقہ قبول ہی پاکیزہ کمائی کا کرتا ہے' تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے' پھر وہ اسے صاحب صدقہ کے لیے بڑھاتا رہتا ہے جیسے تم میں سے ایک شخص اپنے بچھیرے کو پالتا اور بڑھاتا ہے یہاں تک کہ (وہ کھجور برابر صدقہ) پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت' ہاتھ کا ذکر ہے۔ اس پر بغیر تاویل اور تشبیہ کے ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ کے بھی ہاتھ ہیں' جس طرح کہ اس کی شان کے لائق ہیں۔ ہم اسے کسی کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے نہ اس کی کیفیت ہی بیان کر سکتے ہیں اور نہ تاویل ہی جائز ہے کہ ہاتھ میں لینا' قبول کرنے سے کنایہ ہے وغیرہ۔

(2) اس حدیث سے واضح ہے کہ حرام آمدنی سے کیے گئے صدقے کی اللہ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں اور حلال کمائی سے کیا گیا کھجور کے برابر بھی صدقہ اجر و ثواب میں پہاڑ کی طرح ہو جائے گا۔

صدقہ کی کرامت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دفعہ ایک آدمی ایک صحرا میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے بدلی سے ایک آواز سنی۔ "فلاں کے باغ کو سیراب کر۔" پس بادل کا یہ ٹکڑا الگ ہوا اور اس نے اپنا پانی ایک سیاہ سنگلاخ زمین میں برسا دیا پس ان نالوں میں سے ایک نالے نے سارا پانی اپنے اندر جمع کر لیا اور (پانی چلنے لگا۔) یہ شخص بھی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلا (آگے جا کر ایک مقام پر دیکھا) کہ ایک آدمی اپنے باغ میں کھڑا اپنی کسی (اوزار) سے اپنے باغ کو پانی لگا رہا ہے۔ اس نے اس سے پوچھا۔

"اے اللہ کے بندے! تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے وہی نام بتلایا جو اس نے بدلی میں سے سنا تھا۔

پس باغبان نے اس سے کہا۔ "اے اللہ کے بندے! تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں نے اس بادل میں سے' جس کا یہ پانی (یہاں بہتا ہوا آیا) ہے' ایک آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر۔ اور یہ وہی نام ہے جو تو نے اپنا بتلایا ہے تو اس باغ میں ایسا کون سا عمل کرتا ہے (کہ تیرے باغ کی سیرابی کے لیے اللہ نے بادل کو حکم دیا؟) اس باغ والے نے کہا۔ "جب تو یہ کہہ رہا ہے تو (میں بتلاتا ہوں کہ) میں اس باغ کی پیداوار کا اندازہ لگاتا ہوں اور اس میں سے تیسرا حصہ صدقہ کرتا ہوں' تیسرا حصہ میری اور میرے اہل و عیال کی خوراک ہو جاتا ہے اور اس کا تیسرا حصہ اس باغ پر دوبارہ لگا دیتا ہوں۔" (مسلم)

فائدہ۔ اس میں بھی صدقہ و خیرات کی فضیلت کے علاوہ کشف و کرامت کا بیان ہے کہ ایک انسان نے بادل سے آواز سن لی جو ایک خرق عادت بات ہے' لیکن یہ کشف و کرامت یا معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ وہ جب چاہے کشف و کرامت کے ذریعے سے کوئی انہونا کام کے دکھا سکتا ہے جیسا کہ بعض لوگ ایسا دعوا کرتے اور اس کی بنیاد پر سادہ لوح عوام کو لوٹتے اور انہیں گمراہ کرتے ہیں۔

بخل اور حرص

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"لیکن جس نے بخل کیا اور بے پروائی اختیار کی

اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم اس کے لیے تنگی کا سامان مہیا کردیتے ہیں (یعنی ایسی راہ پر لگادیتے ہیں جس کا انجام برا ہے) اور اس کا مال اس کے کام نہیں آئے گا

جب وہ ہلاک ہوگا (یا جب جہنم میں گرے گا)۔" (دلیل 8-11)

اور فرمایا۔ "اور جو اپنے نفس کے بخل اور حرص سے بچا لیا گیا پس وہی کامیاب ہے۔" (سورہ التغابن 6-1)

فائدہ آیات۔

بخل اور شح کا مفہوم تقریباً ایک ہی ہے' تاہم بعض کہتے ہیں کہ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا بخل ہے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے ہڑپ کرجانا شح ہے۔ یہ بخل سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔ اسی طرح جو شخص اپنے مال میں سے زکاۃ ادا کرتا اور حسب ضرورت صدقہ و خیرات کرتا اور مال حاصل کرنے کے لیے کوئی ناجائز حربہ اور ذریعہ اختیار نہیں کرتا' وہ گویا شح نفس سے بچا لیا گیا جو اس کے عند اللہ کامیاب ہونے کی دلیل ہے اور اس کے برعکس رویہ بخل اور شح ہے جو انسان کی تباہی و بربادی کی علامت ہے۔

ظلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ظلم کرنے سے بچو' اس لیے کہ ظلم' قیامت والے دن اندھیروں کا باعث ہوگا۔ اور شح (بخل و حرص) سے بچو اس لیے کہ اسی شح نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس شح نے ہی انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ آپس میں خون ریزی کریں اور حرام کردہ چیزوں کو انہوں نے حلال سمجھ لیا۔" (مسلم)

فائدہ: انسان جب مال کا بندہ بن جائے اور اسے دنیا کی ہوس لگ جائے تو اس کے دل سے ہمدردی ختم ہوجاتی ہے اور وہ حصول دولت کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے' حتیٰ کہ بخیل نفس کی تسکین کے لیے خون تک بہانے سے بھی گریز نہیں کرتا بلکہ اس قدر حیوان بن جاتا ہے کہ اپنی خواہشات کو شرعی جواز دینے کے لیے حرام کو حلال سمجھ بیٹھتا ہے۔

مسواک کی فضیلت اور فطری چیزوں کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے'

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر مجھے اپنی امت یا (فرمایا) لوگوں کے مشقت میں پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یقیناً" انہیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کو پسند فرماتے تھے' تاہم آپ نے اسے واجب اس لیے نہیں فرمایا کہ اس سے لوگوں کو مشقت ہوگی۔

2۔ اس سے واضح ہے کہ آپ اپنی امت کے لیے نہایت درجے شفیق اور مہربان تھے' نیز یہ کہ مسواک نہایت پسندیدہ امر ہے' اس لیے ہر مسلمان کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہمیشہ مسواک کرنے کو اپنا معمول بنائے اور ہوسکے تو ہر نماز سے پہلے مسواک ضرور کرے۔

3۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ جس چیز کا حکم دیں اسے بجالانا فرض ہوتا ہے الا یہ کہ کسی دوسری دلیل سے یہ معلوم ہوجائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ادا کرنا فرض قرار نہیں دیا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نیند سے بیدار ہوتے تو اپنا منہ مسواک سے خوب صاف کرتے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: انسان جب سو کر اٹھتا ہے تو اس کے منہ کا ذائقہ بدبو کی وجہ سے بدلا ہوا ہوتا ہے' اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بیدار ہونے کے بعد خوب مسواک فرماتے تھے' ہمیں بھی اس سنت نبوی کو اپنا معمول بنانا چاہیے۔

ایک دیا سالگرہ آرزو کا

امت الصبور

ان ہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے' رات ان کی
ان ہی کے مطلب کی بات کہہ رہا ہوں' زبان میری ہے بات ان کی

جارج برنارڈ شا نے کہا ہے۔

"وہ شخص جو اپنے بارے میں اپنے دور کے بارے میں لکھتا ہے۔ در حقیقت سب لوگوں کے بارے میں اور سب زبانوں کے بارے میں لکھتا ہے۔"

تخلیق کا فن زندگی کا ترجمان ہوتا ہے' ایک اچھا ادیب بہت سارے لوگوں کے دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے جذبات و احساسات کو زبان دیتا ہے۔ ان کی سوچ کو خوب صورت الفاظ کا پیراہن دینے میں خون جگر صرف کرتا ہے اور لاکھوں دلوں میں گھر کرلیتا ہے' ان کے ذہنوں کو اسیر کرلیتا ہے۔ ان کی سوچ اور فکر کے دھاروں کو تبدیل کرلیتا ہے۔

قاری اور تخلیق کار کا رشتہ بڑا عجیب ہے اور بہت خوب صورت بھی۔ بن دیکھے بن جانے محبت کا رشتہ... عقیدت کی حدوں کو چھوتی ہوئی محبت' جہاں فاصلے اہمیت نہیں رکھتے' جس پر وقت اثر انداز نہیں ہوتا۔ صدیوں اور نسلوں تک قائم رہنے والا رشتہ کتنے شاعر' ادیب جنہیں دنیا سے رخصت ہوئے صدیاں گزریں' لیکن قارئین سے محبت' تعلق' لگاؤ' عقیدت کا رشتہ آج بھی استوار ہے۔ ان کی تخلیقات آج بھی پڑھی جارہی ہیں۔

پچھلے دنوں عبد اللہ حسین اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے "لیکن اداس نسلیں" نہ جانے کتنی نسلوں تک پڑھی جاتی رہے گی۔ اور قارئین سے ان کا تعلق قائم رہے گا۔

فطری بات ہے کہ ہم جن سے محبت کرتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں' پسند ناپسند' مزاج طبیعت ان کے تخلیقی حوالوں سے ہمارے ذہن میں بے شمار سوالات مچلتے رہتے ہیں۔

اس بار سالگرہ نمبر میں ہم نے سروے ان ہی سوالوں کے حوالے سے ترتیب دیا ہے' جو ہماری قارئین اپنی پسندیدہ مصنفین سے پوچھنا چاہتی ہیں۔

اگر مصنفین قارئین کے ان سوالوں کا جواب دیں گی تو قارئین کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی بے حد خوشی ہوگی۔

سوالات یہ ہیں

1۔ شعاع کی وہ کون سی خوبی ہے جو — دیگر پرچوں کے مقابلے میں آپ کو زیادہ پسند ہے۔

2۔ اگر شعاع کی مصنفین سے آپ کی ملاقات ہو اور ان سے ایک ہی سوال کرنا ہو تو آپ کس مصنفہ سے کیا سوال کریں گی۔

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین اپنی پسندیدہ مصنفین سے کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟

مسرت الطاف احمد..... کراچی

1 شعاع سے پسندیدگی کی ایک خاص وجہ ہماری رائٹرز بھی ہیں جو اپنی مصروفیات سے قیمتی وقت نکال کر رسالے کے لیے معیاری تحریریں لکھتی ہیں اور ہمیشہ اپنے قلم سے انصاف کرتی ہیں۔ قارئین کو اپنی تحریروں سے کبھی مایوس نہیں کیا اور ان باکمال رائٹرز نے معاشرے کی تلخ حقیقت ہو یا احساس سے جڑے رشتے' ہر موضوع کو کبھی ہلکے پھلکے کبھی مزاحیہ اور کبھی منفرد انداز میں قارئین کے سامنے اس انداز میں پیش کیا کہ قارئین کی زندگی میں مثبت تبدیلی اور خود اعتمادی پیدا ہو۔

2 یہ کیا....؟ ایک ہی مصنفہ سے صرف ایک ہی سوال.. ایسا نہیں ہو سکتا' میں سب سے پہلے نمرہ احمد سے یہ سوال ضرور پوچھوں گی آپ کو ناولز سے ریلیٹیڈ تھیمز اور ٹاپک کہاں سے آتے ہیں اور وہ بھی اتنے پر تجسس اور چیلنجنگ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اگر میری ملاقات نبیلہ عزیز سے ہو تو میں ان سے یہ سوال کروں گی کہ پہلے دردِ دل اور اب رقصِ بسمل کی وجہ سے ہم آپ کے مکمل ناولز پڑھنے سے دستبردار ہو چکے ہیں اور کب تک انتظار کروائیں گی' ہمیں آپ کے مکمل ناولز کی شدت سے طلب محسوس ہو رہی ہیں۔

کیا تعریف کروں آپ کی آپ تو ہیں سب کی دل عزیز ناولوں میں جو رنگ بھر دے ہماری پیاری نبیلہ عزیز

لاسٹ میں عمیرہ احمد سے یہ سوال ضرور پوچھوں گی کہ آب حیات اپنے نام کی طرح بہت ہی منفرد تحریر ہے' لیکن مجھے ایسا لگتا ہے اس ناول کا اینڈ بہت ہی ڈیریسنگ ہوگا' کیونکہ اس ناول کا اینڈ سالار اور امامہ کی جدائی پر منحصر ہوگا کیا آپ کا بھی یہی پلان ہے....؟"

عائشہ جمیل..... لیک سٹی لاہور

4 مارچ 2015ء کو ہماری پیاری دادی اماں' حفیظاں" اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ ان کی مغفرت اور بلند درجات کی دعا کریں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اب آتی ہوں سوالات کی طرف۔

1 شعاع پسند اس لیے ہے کہ تحریریں واقعی پر اثر ہوتی ہیں۔ حقیقت سے قریب' دل کو چھوتی ہوئی.... یہ بات نہیں کہ باقی تمام پرچے برے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ ان کی کچھ تحریریں اچھی ہوتی ہیں اور خواتین' شعاع کی "زیادہ تر" اور ایک خوبی جو خواتین کو ممتاز بناتی ہے وہ ہیں "اسکیچز" جو ہر ناول' افسانے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بالکل حقیقت معلوم ہونے والے یہ اسکیچز' یقیناً" خواتین' شعاع کی منفرد خوبی ہے۔ (بھئی خواتین اور شعاع الگ الگ تھوڑی ہیں۔ کرن..... شاید ان کی کزن ہے ہاہا)

2 اف! کس قدر ظالم ہیں نا آپ لوگ۔ خیالوں میں بھی خوش نہیں ہونے دیتے۔ اب اگر ملاقات ہوگی تو کیا ہم پاگل ہیں جو صرف ایک سوال پوچھیں گے؟ چلیں کیا یاد کریں گی۔ ایک' ایک پہ ہی اکتفا کر لیتی ہوں۔

عمیرہ احمد سے پوچھنا ہے' ان کے شوہر کیا "شیر دل" جیسے ہی ہیں؟

نمرہ احمد' آپ کی زندگی اور سوچ کی تبدیلی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟

آسیہ رزاقی' کیا آپ کی شادی بھی ایسے ہی جھٹ پٹ ہوئی تھی جیسے آپ کے ناولز کے کرداروں کی ہوتی ہے۔

راحت جبیں' کیا آپ میرے لیے بھی ساون کا ویسا ہی سیٹ لگا سکتی ہیں' جیسے اپنے کرداروں کے لیے لگاتی ہیں؟ پلیز۔

فاخرہ جبیں' جب آپ اپنے ناولز میں راحت جبیں کو گھسیٹتی ہیں تو وہ آپ سے لڑتی تو نہیں ہیں؟

سمیرا حمید' کیا آپ بھی "یارم" کے کرداروں کے ساتھ مانچسٹر یونیورسٹی میں پڑھتی ہیں؟

سائرہ رضا' اپنی پوری زندگی' بچپن' لڑکپن' جوانی' شادی' ناولز' اپنے بچوں کے بارے میں مختصراً" بتا دیں پلیز۔ آپ کو قریب سے جاننے کا شوق ہے۔

فرحت اشتیاق' آپ کے ناولز کے جیسے ڈیسنٹ' ویل مینرڈ اور ذہین ہیروز کون سی جگہ سے امپورٹ ہوتے ہیں؟

عنیزہ سید' سعد سلطان اور بلاول سلطان کے درمیان ہونے والی نوک جھونک آپ کیسے لکھتی تھیں اور سعد جیسا "ہرفن مولا" بندہ کیا واقعی ہوتا ہے؟

عفت سحر' ازمیر' ث اور روحا گل کی شادی کب کروا رہی ہیں؟

تنزیلہ ریاض' آپ اتنے عرصے سے کہاں غائب تھیں؟ اتنا عرصہ آپ نے ہمیں اپنے فن سے محروم رکھا۔ عہد الست کے لیے مبارکباد۔

رخسانہ نگار عدنان' آپ نے محبت خواب سفر میں لائبہ اور تنزیل کا اچھے بہن بھائی کے طور پر کوئی سین کیوں نہیں لکھا؟

مریم عزیز' آپ کے کرداروں میں اس قدر شدت کیوں پائی جاتی ہے؟

مریم ساجد' "آنگن میں اترے چاند" کے ساتوں شہزادوں سے ان کی شہزادیوں سمیت ملاقات کرنی ہے۔ کروا دیں گی؟

صوفیہ بشیر' دجانے عثمان کیا ابھی بھی اتنا ہی فرض شناس پاکستانی' مسلمان اور کلاس فیلو ہے؟

سحر ساجد' مجتبیٰ خان نیازی جیسے شفاف آئینے کے جیسا کردار رکھنے والے پٹھان کہاں ملتے ہیں؟

فائزہ افتخار' آپ کہاں غائب ہو چکی ہیں؟

آسیہ مرزا' آپ نے "دل اک شہر جنون" کی شیرین کو دیکھا ہے؟ میں نے دیکھا ہے۔

نگہت سیما' "زمین کے آنسو" جیسا کوئی اور ناول کب لکھ رہی ہیں؟"

نگہت عبداللہ' ایک کھڑکی کب کھلے گی؟

صائمہ اکرم چوہدری' "دیمک زدہ محبت" لکھنے کے لیے انسپائریشن کہاں سے ملی؟

وجیہہ احمد' آپ کو اپنا بچپن کیا بہت زیادہ یاد آتا ہے؟ جو ہمیں ہمارا یاد دلوا دیتی ہیں۔

فرح بخاری' "حازم حیدر" کا کردار سچا تھا یا تصوراتی؟

بشریٰ گوندل' نئی عید آنے والی ہے۔ اگلے ناول کی تیاری ہو گئی؟

بشریٰ سعید' سفال گر کے بعد آپ کہاں چلی گئیں؟

انیسہ سلیم' پلیز اپنا سیانا اور اپنی سیانی سے دوبارہ ملاقات کروادیں گی؟
ثمرہ بخاری' اچھا سا "ہم سے ہے زمانہ" کب لکھیں گی؟

جو رائٹرز رہ گئی ہیں ان سے معذرت۔

حباء خان۔۔۔۔ بھاول پور

1 شعاع میں چھپنے والے افسانے اور ناول زندگی سے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اس میں چھپنے والی تمام کہانیوں میں اخلاقیات پر بہت زور دیا جاتا ہے یہ ہی بات اسے دوسرے پرچوں سے ممتاز بناتی ہے۔

2 عمیرہ احمد سے۔۔۔ آپ اتنا اچھا کیسے لکھتی ہیں؟
نمرہ احمد سے۔۔۔ کیا آپ نے اتنے ممالک کا سفر کیا ہے؟

سمیرا حمید سے۔۔۔ آپ اتنے کردار کیسے تخلیق کرتی ہیں؟
حیا بخاری سے۔ کیا آپ حقیقت میں بھی اتنی رومینٹک ہوتی ہیں؟
صدف آصف سے۔ آپ کے کرار جو زبان بولتے ہیں وہ اتنی اعلا ہوتی ہے مزہ آجاتا ہے' کیا آپ کے گھر میں ابھی ایسی ہی زبان بولی جاتی ہے؟

ثوبیہ نور۔۔۔ گشن گڑھ

اسلام علیکم!۔ ادارہ و اشاف کے لیے ڈھیروں دعائیں اور شعاع کو سالگرہ پر بہت مبارک باد' اللہ کرے ایسے ہی پھلتا پھولتا رہے۔ (آمین)

1 کوئی تو بات ہے اس میں فیض
ہر خوشی جس پر لٹا دی ہم نے
ہاں یہ ہے کہ خوشیاں لٹائی نہیں' پائی ہیں۔ شعاع ہمیں پسند ہے تو ظاہر ہے تو اس میں کوئی تو ایسی بات ہے نا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں بہت "دوست پرست" ہوں اور شعاع میرا "ہم مزاج" ہے۔ شعاع کے کردار چونکہ اسی دنیا سے ہوتے ہیں لہٰذا بوقتِ ضرورت ذہن کے پردے سے جھانک کر اپنے تجربوں سے مستفید کرتے ہیں۔

2 کیا بات ہے دل خوش کردیا' بھئی! فرض کرنے سے کیا جاتا ہے بھلا؟ ہاں تو کوئی مصنفہ ہم سے ملتی ہیں تو۔۔۔ ہم نے کیا کہنا ہے کہ بقول شاعر

وہ پاس آئیں تو موضوع گفتگو نہ ملے
وہ لوٹ جائے تو ہر گفتگو اسی سے رہے

مجھے پتا ہے بہت دیر تک تو ہمیں یقین ہی نہیں آنا اور جب تک یقین آئے گا تب تک چاہے خواب ہی ٹوٹ جائے۔

ویسے عمیرہ احمد اور نمرہ احمد سے تو ایک شکوہ بنتا ہے کہ ان کی شادی کا احوال نہیں پہنچا ہم تک (نمرہ احمد کی شادی ہو گئی ہے نا؟ کہیں یہ میری غلط فہمی تو نہیں؟)
عالیہ بخاری اور فائزہ افتخار سے کہنا ہے کہ۔۔۔

یہ ادائے بے نیازی تم کو بے وفا مبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

نگہت سیما سے کہنا ہے کہ جب آپ شہیدوں کے لہو کو بطور روشنائی استعمال کرکے درد کو صفحہ قرطاس پر اتارتی ہیں تو کیا اس کے بعد بھی "پڑھنے والوں کی طرح" دنوں بے کل پھرا کرتی ہیں؟
تنزیلہ ریاض کو تو فی الحال "پھلاں نال دھرتی سجا کے" ویلکم بیک ہی کہنا ہے۔۔۔ ان کے علاوہ کوئی آیا تو منہ دیکھتے بیٹھے رہیں گے کہ سروے میں لکھے سوال ہی یاد رہ جائیں تو رہ جائیں ورنہ اس وقت تو دماغ نے کام نہیں کرنا ہے۔

سمیعہ حنیف منور

1 کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہی خوبیاں ہیں کیا کیا بتاؤں

شعاع میں یوں تو بے شمار خوبیاں ہیں (کبھی آٹھ' دس صفحات ہمارے لیے مخصوص کریں تو لکھ بھیجوں) مختصرا" یہ ایک مکمل جریدہ ہے' کیونکہ ہر طبقہ فکر اور مختلف ذوق رکھنے والوں کے شوقِ مطالعہ کی تسکین کردیتا ہے' مثلا" ادبی' اسلامی' طنزومزاح' گھریلو معاملات' ذہنی الجھنیں' بے تکلف اندازِ گفتگو وغیرہ وغیرہ۔ کوئی موضوع "مسنگ" نہیں ہے کہ مشورہ دینا پڑے کہ۔
"پیاری باجی فلاں سلسلہ بھی شروع کریں"
"آپ کے منہ میں گھی شکر" آپ کا کہا پورا ہو اور اپنی ہر دل عزیز مصنفین سے کبھی ملاقات ہو جائے۔
عمیرہ احمد سے تو پوچھوں گی! "امربیل" "من و سلوئ" اور پیر کامل جیسی تحریریں لکھنے کے لیے کون سے باغ کے باداموں سے دماغ کو زرخیز بنانا پڑتا ہے؟"
فرحت اشتیاق جی! آپ کے ہیروز اور ہیروئین بڑے فنٹاسٹک ہوتے ہیں' لڑتے لڑتے آخر محبت کیوں کر بیٹھتے ہیں؟"
نمرہ احمد سے! "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اتنی سی عمر میں قلم کی پختگی اور انوکھے موضوعات کیسے سوچ لیتی ہیں۔ کیا آپ بھی عمیرہ جی والے بادام استعمال کرتی ہیں؟

تنزیلہ ریاض جی! آپ کی تحریریں بہت پھیلا وا پھیلا کر پھر بہت خوب صورت طریقے سے سمٹنا شروع ہوتی ہیں کیا آپ کے ذہن میں کوئی "الاسٹک تو انائی" کام کررہی ہے؟
عفت سحر جی! اب کے مظلوم ہیروئین کو جابر حسینہ کے روپ میں کب ڈھالیں گی؟

آسیہ رزاقی! سے پوچھنا ہے کہ کیا وہ کوئی مزاحیہ ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں یا نہیں؟ ورنہ ہنسنے ہنسانے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔ (لیکن معیاری تحریر ہو جیسے آسیہ "انشاء جی' مشتاق یوسفی وغیرہ لکھتے تھے)

بنت خلیل۔۔۔۔ سمندری

1 شعاع کی یہ خوبی کہ یہ حساس موضوعات پر لکھتا ہے۔
میں بہت سے رسالے پڑھتی ہوں لیکن شعاع کو کھولتے ساتھ ہی احساس ہوتا ہے کہ ایک معیاری رسالہ پڑھ رہی ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ آج کل جتنے بھی رسالے چھپ رہے ہیں ان سب سے زیادہ یہی پڑھا جاتا ہے۔
3 اگر مصنفین سے ملاقات ہو جائے تو شاید ایک سوال نہیں سوالنامہ لے کر جانا پڑے گا۔ ایک سوال کرنے سے تو

تشنگی ختم نہیں ہوگی۔ لیکن پھر بھی اگر آپ کہتی ہیں کہ سوال ایک ہو تو سب سے پہلے جبین سسٹرز سے پوچھوں کہ وہ موسموں کی اتنی خوب صورتی کیسے بیان کر لیتی ہیں ان کی کہانیوں میں رنگینی کا احساس ہوتا ہے۔

سمیرا حمید سے پوچھوں کہ کیا دنیائے ادب کے ہر مصنف کو پڑھ لیا ہے اور مجھے کئی دفعہ تو لگتا ہے کہ اشفاق احمد سے زیادہ متاثر ہیں۔ یا مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کو بہت کھوجتی ہیں۔

اور نمرہ احمد از اے گریٹ پرسن سے پوچھوں کہ اتنے ٹیلنٹنڈ ہیرو کہاں سے ڈھونڈ نکالتی ہیں اور ان سے یہ فرمائش کروں کہ ترکی میں رہنے والوں کی ایک کہانی اور لکھ دیں۔ باقی پھر پوچھوں گی اب امی آوازیں دے رہی ہیں۔

ملائکہ کوثر...... بسم اللہ پور

1 شعاع کی ایک خوبی ' بھئی یہ پوچھیں کون کون سی خوبیاں۔ قاری کو اپنے اندر سمونے کی خداداد صلاحتیں۔ اردگرد سے بے خبر کردینے والا سحر' اونچ نیچ سے آگہی دینے والا رہبر' بہترین ہم سفر' غمزدہ گھڑی میں تسلی و تشفی دینے والا ہمدرد' کبھی خوشیوں کے ہنڈولے پر میرے ساتھ بیٹھنے والی ہم جولی بنا اور کبھی کمزور لمحوں میں توانائی عطا کی۔

2 سمیرا حمید کی تحریروں میں سب کچھ ہوتا ہے۔ تصوف' زندگی' محبت' فلسفہ' حقیقت' امنگیں' رواداری' گزری عمر جیسا تجربہ' سوال یہ ہے ان سے کہ۔

"اتنی سی عمر میں ایسی پختہ تحریروں سے آگہی انہیں کیسے ملتی ہے کیا کوئی وجدان اترتا ہے یا وحی' کشف؟"

سحرش فاطمہ...... کراچی

1 شعاع کا معیار ہمیشہ جداگانہ رہا ہے۔ افسانہ ہو یا ناول یا ناولٹ ہر کوئی اپنی مثال آپ ہے' پرچے کے پہلے صفحے سے لے کر آخری تک ہر تحریر ہر سلسلہ سب کا پسندیدہ ہے۔

2 یہ تو بڑا ہی مشکل سوال ہے کہ ایک طرف تو اتنی ساری مصنفائیں ہیں اور پھر سوال بھی ایک؟ میرا بس چلے تو میں ساری پیاری پیاری مصنفاؤں سے ملوں اور ڈھیر سارے سوال کروں۔ ویسے پہلا سوال تو یہی ہوگا ناں کہ "کیا حال ہیں؟" "ارے یہ واقعی آپ ہی ہیں ناں۔"

ثمینہ اکرم...... لیاری کراچی

1 میں شعاع کی مستقل اور باقاعدہ قاری ہوں۔ ہمیشہ ہی میں نے اس کی کہانیوں سے کوئی نہ کوئی اچھی بات ضرور سیکھی ہے..... خدا کا شکر ہے کہ شعاع کو ہمیشہ سے ہی ایسی ذہین رائٹرز کا ساتھ ملا' جن کے لفظوں کا جادو قارئین کے دل کی دنیا بدل ڈالتا ہے اور ان تحاریر کی بدولت برائی کی طرف بڑھتے قدم رک جاتے ہیں۔ نیکی کی رغبت اور معاشرے میں کار آمد بننے کی ترغیب ملتی ہے۔ مذہبی اور معاشرتی ہر لحاظ سے یہ کہانیاں مثبت تبدیلی پیدا کرتی ہیں.....

اگر شعاع ڈائجسٹ کی مصنفین سے میری ملاقات ہو اور ان سے کوئی سوال کرنا ہو تو "ان کو دیکھیں یا ان سے بات کریں کہ مصداق میں خوشی کے مارے کچھ پوچھنا ہی بھول جاؤں گی۔ بمشکل ہی میرے منہ سے کوئی الفاظ نکل سکے..... مگر پھر میرا ازلی اعتماد عود آئے گا اور اگر کہیں شعاع ڈائجسٹ کی کسی رائٹرز سے ملاقات ہو تو میرا سوال ان رائٹرز سے ہوگا جو اب خواتین میں لکھنا (بھول) چھوڑ چکی ہیں۔

میرا سوال ' شعاع ڈائجسٹ نے آپ کو ایک مقام' ایک نام اور پہچان دی' اس کے پلیٹ فارم سے ہی آپ کو عروج ملا' عزت اور محبت ملی..... پھر جب آپ ٹیلی وژن پر لکھنا شروع کردیتی ہیں دوسرے لفظوں میں آپ جب ٹی وی کو پیاری ہو جاتی ہیں..... تو ہمارے ڈائجسٹ کو اور اپنے قارئین کو کیوں بھول جاتی ہیں..... کبھی کبھار تو آپ کو اپنے قارئین کے لیے بھی ڈائجسٹ میں کہانی لکھنی چاہیے۔

کیونکہ جو مزہ کہانی پڑھنے میں آتا ہے وہ ڈرامہ کو دیکھتے ہوئے بالکل بھی نہیں آتا۔ سارا مزہ ہی برباد ہو جاتا ہے..... (ٹی وی پر تو.....) اس لیے پیاری رائٹرز! پلیز اپنی قارئین اور ان پرچوں کو نہ بھولیں..... آپ کی شہرت اور پہچان و نام کو چار چاند ان ہی کی بدولت لگے ہیں۔

افشاں یاسر گوندل...... اٹاوہ

1 میرا اور شعاع کا بہت پرانا ساتھ ہے' ساتھی ساتھی سا لگتا ہے۔

اس کی ہر تحریر اک مثبت سوچ دے گئی کچھ نہ کچھ گر سکھا کے ہی گئی۔

2 اگر کسی مصنفہ سے ملنا ہوا تو میں عمیرہ احمد سے پوچھوں گی کہ آپ سالار اور امامہ کو جدا تو نہیں کردیں گی؟ جدائی جان لیوا ہے شاید پیرِ کامل کے تمام قارئین کے لیے۔ (ہے نا)

میری بے شمار دعائیں اپنے پیارے پسندیدہ ڈائجسٹ کے لیے۔ یونہی ترقی کرتا رہے۔ آمین

عظمیٰ شفیق...... گوجرانوالہ

1 شعاع کی ہر تحریر معیاری اور سبق آموز ہوتی ہے۔

2 میں عنیقہ محمد بیگ سے کہنا اور پوچھنا چاہتی ہوں' عنیقہ جی آپ افسانہ اور ناولٹ لکھنے میں مہارت رکھتی ہیں تو اب تک سلسلے وار ناول کیوں نہیں لکھا؟

طلعت ثنا...... سیال شریف

1 ویسے تو خواتین' شعاع اور کرن تینوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں اور ان کو پڑھے بغیر ہمارا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ شعاع کا ہر ہر صفحہ سبق آموز ہے۔ ہر تحریر میں ضرور کوئی نہ کوئی جملہ یا اچھی بات ہوتی ہے جس سے میں اپنے اندر بہت سی مثبت تبدیلیاں محسوس کرتی ہوں۔

2 اگر میری مصنفین سے ملاقات ہو جائے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی یہ میری زندگی کا بیسٹ دن ہوگا۔

اگر میری ماہا ملک صاحبہ سے ملاقات ہوئی تو میں ان سے کہوں گی کہ آپ نے میرے خواب ریزہ ریزہ کی زینب کو کیوں ایسا بنایا اس کے کیے میں آج بھی کڑھتی رہتی ہوں اور کہوں گی آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ پلیز کچھ اچھا لکھیے نا۔

فرحت اشتیاق ' سے پوچھوں گی کہاں غائب ہیں اپنے ہینڈسم ہیروز کے ساتھ جلد واپس آئیں اچھا سا ناول لے کر۔

نمرہ احمد ' سے کہوں گی آپ نے اتنا اچھا دماغ کیسے پایا ہے' جس میں لاجواب آئیڈیاز آتے ہیں اور شکریہ ادا کروں گی جو انہوں نے گھر بیٹھے ہمیں ترکی کی سیر کروائی۔

اور کوہ پیمائی کا شوق پیدا کیا میرے اندر۔ ویل ڈن نمرو جی۔

سمیرا حمید' سمیرا حمید کے تو کیا کہنے' ان سے بس ملاقات طے کروں گی اور ان کی تحاریر پر تبصرہ کروں گی اور کہوں گی آپ بہت خوش قسمت ہیں جو دنوں میں سب کے دلوں میں چھا گئیں۔

فائزہ افتخار' فائزہ افتخار سے تو بس ایک ہی شکوہ کروں گی کہ آپ نے بے وفائی کیوں کی ہمیں چھوڑ کر چینل والوں کو کیوں پیاری ہو گئیں۔ ہمارا بھی آپ کی تحریر پر اتنا ہی حق ہے کیا آپ اپنی تحریروں کے ذریعے ہمارا ہنستا مسکراتا نہیں برداشت کر سکتیں۔

جبین سسٹرز' راحت جبیں اور فاخرہ جبیں جو رنگوں اور تتلیوں کی باتیں کرتی تھیں شادی کے بعد ایسی خاوندوں کو پیاری ہوئیں کہ ہمارا پیار بھول گئیں' جلد واپس آئیں ساون کی تحریر کے ساتھ۔ ایمن جیسی ہیروئن کے ساتھ۔

نگہت سیما' آپ کب سے غائب ہیں ہم آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔

عمیرہ احمد' آپ کا بہت شکریہ جو آپ نے ہم سب کے کہنے پر لازوال ناول پیرِ کامل کا دوسرا حصہ آبِ حیات تحریر کیا۔

کنیز نبوی' آپ کہاں روپوش ہو گئی ہیں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ واپس آئیں۔

نایاب جیلانی' آپ ہم سے بھائی کے لیے دعا کرواتی رہیں اور جب آپ کا بھائی واپس آگیا تو آپ نے ہمیں بھی بھلا دیا واہ بات دل کو لگتی نہیں۔

فرحانہ ناز ملک' آپ ہم سب کو چھوڑ کر اس دیس جا بسی ہیں جہاں سے آپ کو واپس بھی نہیں بلوایا جاسکتا اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے (آمین) آپ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گی۔

عفت سحر طاہر' پلیز ابیہا کے ساتھ کچھ برا مت کرنا۔ اب تو اس کی مشکلات ختم کردیں پلیز۔

بندھن

ثنا ہمراہ فخرِ عالم

شاہین رشید

ہمیشہ ان ہی فن کاروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو اپنی عزت کا خود خیال رکھتے ہیں کہ فلم کی دنیا بے شک چکا چوند کر دینے والی دنیا ہے مگر کسی لڑکی کا فیوچر نہیں ہے۔ لڑکی کا فیوچر تو اس کا گھر اس کا شوہر اور اس کے بچے ہیں۔ ثنا نے فلمی دنیا سے بہت نام کمایا' مگر اپنی صحیح عمر میں شادی کر کے اپنی عزت میں مزید اضافہ کیا اور آج ثنا اپنے گھر میں اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہیں۔

"کیا حال ہیں جی' زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی حال ٹھیک ہیں اور الحمد للہ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"آپ گھر کی بڑی بہو ہیں اور کیا جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہیں آپ؟"

"جی میں گھر کی بڑی بہو ہوں۔ فخر کے ایک ہی بھائی ہیں اور ہم خود چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ والد کا ہمارے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ والدہ نے پرورش کی اور ہمیں فخر ہے اپنی والدہ پہ کہ انہوں نے ہماری اتنی اچھی تربیت کی اور جناب ہم جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے ہیں۔"

"اچھا... جوائنٹ فیملی سسٹم عموماً" بہوؤں کو پسند نہیں ہوتا کوئی مسئلہ ہوا؟ اور سسرال کو کیسا پایا؟"

"سچ بتاؤں مجھے تو جوائنٹ فیملی سسٹم بہت پسند ہے' کیونکہ بہت فائدے ہیں اس کے۔ اب مجھے ہی دیکھ لیں۔ کام کے سلسلے میں خواہ ملک کے اندر جانا ہو یا ملک سے باہر' مجھے اپنے بیٹے کی کوئی فکر نہیں ہوتی' کیونکہ میری ساس اپنے پوتے کی بہت اچھی دیکھ بھال

کرتی ہیں اور ہمارا بیٹا بھی دادی کے بہت قریب ہے۔"

"اور سسرال؟"

"جوائنٹ فیملی سسٹم اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب سسرال سے تعلقات بہت اچھے ہوں تو آپ خود ہی سوچ لیں کہ ہمارے تعلقات کیسے ہوں گے۔ میرے ساس سسر مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ بالکل اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔ شادی سے پہلے تو لوگ سسرال والوں سے بہت ڈراتے ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"جی ہنی مون کے لیے کسی ایک ملک میں نہیں گئے۔ پاکستان میں "بھوربن" "مصر" اور "دبئی" میں بھی ہنی مون منایا اور منہ دکھائی میں فخر نے مجھے گولڈ کا ایک سیٹ دیا۔"

"فخر صاحب کو عموماً" کن باتوں پر غصہ آتا ہے اور آپ دونوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہے؟"

"فخر کا غصہ تو تیز نہیں ہے۔ بس میرا ہی غصہ تھوڑا تیز ہے۔ اصل میں مجھے گھر کو صاف ستھرا رکھنے اور ہر چیز کو قرینے سے رکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ بس اگر کبھی گھر گندا دیکھ لوں یا چیزیں بکھری ہوئی دیکھ لوں تو مجھے غصہ آجاتا ہے۔ تو فخر سے بحث و تکرار ہو جاتی ہے۔ ورنہ تو الحمد للہ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"بیٹے کی تربیت میں کون حساس ہے؟"

"میں بہت حساس ہوں اور سخت بھی... اس کی تربیت میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتی۔ میں نہیں چاہتی کہ گھر والوں کا لاڈ' پیار بچے کو خراب کردے۔"

"کبھی سسرال والوں نے اور میاں صاحب نے اداکاری چھوڑنے کے لیے کہا؟ اور اگر کہیں تو؟"

"اگر منع کریں گے تو شاید چھوڑ بھی دوں۔ مگر انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا' بلکہ مجھے ہر طرح سے سپورٹ کرتے ہیں اور نہ ہی سسرال میں کسی نے کہا' بلکہ مزے کی بات بتاؤں کہ کچھ لوگوں نے میری ساس سے کہا بھی تو انہوں نے بڑا اچھا جواب دیا کہ اداکاری ثناء کا پروفیشن ہے اور کوئی لڑکی خواہ وہ ڈاکٹر ہو' انجینئر ہو یا ڈیزائنر ہو یا کسی بھی پروفیشن سے وابستہ ہو' وہ اپنا پروفیشن نہیں چھوڑتی' تو ہم اسے کیوں مجبور کریں۔ وہ اپنی گھریلو ذمہ داریاں احسن طریقے سے ادا کر رہی ہے تو میں کیوں کچھ کہوں... مجھے تو اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"گھریلو ذمہ داریوں کی بات ہو رہی ہے تو آپ نے اپنے ذمہ کیا' کیا کام لیا ہوا ہے؟"

"اپنے ذمہ تو کچھ کام نہیں لیا ہوا' کیونکہ اپنے گھر میں تو انسان جو مرضی کام کرلے تو میرا بھی جو دل چاہتا ہے میں کرتی ہوں اور نہیں چاہتا تو نہیں کرتی۔ اپنے زیادہ تر کام خود کرتی ہوں اور جیسا کہ میں نے بتایا صفائی ستھرائی کا تو جنون ہے تو بس اس بات کا بہت خیال رکھتی ہوں کہ گھر گندا نہ ہو۔"

"کھانا خود پکاتی ہیں یا کک کی خدمات حاصل کرتی ہیں؟"

"گھر میں ماشاء اللہ سے کک ہے۔ مگر پھر بھی میں کبھی کبھی خود بھی پکاتی ہوں' کیونکہ مجھے خود پکانا اچھا لگتا ہے۔ ہر کھانا پکانے میں پرفیکٹ نہیں ہوں۔ مگر پھر بھی قیمہ' پلاؤ' سبزیاں اور پاستا وغیرہ بنا لیتی ہوں۔"

"فخر فرمائش کرتے ہیں پکوانے کی؟"

"جی ان کا تو دل چاہتا ہے کہ میں ان کے لیے ہر کھانا اپنے ہاتھوں سے پکاؤں' مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ ویسے میری ساس بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں اور فخر کی فرمائش پوری کرتی رہتی ہیں۔"

"کہا جاتا ہے کہ ملازمت پیشہ بیوی میں غرور اور تکبر بہت ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں؟ ایسا ہے؟"

"ارے غرور و تکبر کیسا؟ میں تو کہتی ہوں کہ پڑھی لکھی اور باصلاحیت لڑکیوں اور بیویوں کو کمانا

چاہیے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے اور شادیاں ناکام کیوں ہوتی ہیں تو میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بیوی کو عزت نہ ملے، اس کی قدر نہ کی جائے، وہ کمائے بھی اور گھر بھی سنبھالے، پھر بھی اس پر مسلسل تنقید ہو تو جھگڑے جنم لیتے ہیں اور رزلٹ برا آتا ہے۔ ورنہ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی لڑکی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کا گھر خراب ہو۔ اس کی شادی ناکام ہو۔"

"آپ اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ رشتوں کے بغیر اور خاص طور پر شادی شدہ لڑکی کے لیے شوہر کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ میں تو اپنے شوہر اور اپنے بچے سے دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ میری فیملی کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ کیونکہ ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔"

"ہوٹلنگ کا شوق ہے یا گھر کے کھانے کو ترجیح دیتی ہیں آپ اور فخر؟"

"ہم دونوں کو ہی گھر کے کھانے پسند ہیں۔ ہوٹلنگ بھی کرتے ہیں، مگر کبھی کبھار۔ کبھی کبھی تو آؤٹنگ کرنا بھی اچھا لگتا ہے، جو کہ ہم کرتے ہیں گھر سے باہر اگر کھانا کھائیں تو ہماری ترجیح چائنیز کھانے ہی ہوتے ہیں۔"

"اپنی زندگی کو آئیڈیل کہیں گی یا اپنے میاں کو؟"

"زندگی بھی آئیڈیل ہے اور الحمد للہ شوہر بھی آئیڈیل ہیں۔ میں تو ایک ایسی زندگی گزار رہی ہوں جس کے خواب ہر لڑکی دیکھتی ہوگی۔"

"آپ کی فیلڈ خطرناک فیلڈ کہلاتی ہے۔ میاں صاحب نے کبھی شک کی نگاہ سے دیکھا یا کچھ کہا؟"

"جی خطرناک تو ہے، مگر انسان خود مضبوط ہو تو کوئی اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا۔ فخر نے کبھی شک نہیں کیا۔ البتہ شادی کے شروع دنوں میں میرا موبائل ضرور چیک کرتے تھے۔ مگر پھر خود ہی چھوڑ دیا چیک کرنا۔"

"آپ نے کہا کہ آپ ایک آئیڈیل زندگی گزار رہی ہیں تو کبھی کرائسز میں بھی دن گزرے؟"

والد صاحب کے انتقال کے وقت ہم پر برا وقت آیا تھا۔" مگر امی نے ہمت نہیں ہاری اور میرا خیال ہے کہ ہر انسان زندگی میں ایک بار کرائسز سے گزرتا ہے۔ زندگی ہے ہی نشیب و فراز کا نام۔"

"کڑے وقت میں کیا کرتی تھیں، قسمت پر بھروسا یا دعا پر یقین؟"

"دونوں پہ۔۔۔ کیونکہ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے وہ ہی ملتا ہے اور دعا یہ اس لیے یقین ہے کہ سنا ہے کہ دعائیں برے وقت کو ٹال دیتی ہیں اور مجھے اپنی دعا سے زیادہ اپنی ماں کی دعا پر بھروسا ہے کہ وہ جو دعا مانگیں گی وہ قبول ہوگی۔"

"کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"

"نہیں کبھی نہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے کسی نجومی کو ہاتھ دکھانا یا قسمت کا حال معلوم کرنا۔ اس لیے ایسی جرأت کبھی نہیں کی۔"

"کس شہر میں رہنا پسند کرتی ہیں؟"

"پاکستان کا ہر شہر مجھے پسند ہے۔ ہم شوٹ کے لیے پورے ملک میں گھومتے پھرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میری مستقل رہائش لاہور کی ہے اور تعلق میرا ملتان سے ہے اور کراچی میں بھی میری رہائش ہے تو کراچی میں بھی اکثر پائی جاتی ہوں۔" (ہنستے ہوئے)

"پاکستان تو سارا گھوم لیا اور دنیا؟"

"دنیا بھی آدھی سے زیادہ گھوم چکی ہوں۔ مگر ہر ملک صرف گھومنے کی حد تک ہی اچھا لگا۔ واپس اپنے ہی ملک آنے کو دل چاہتا ہے۔"

"کیا بات متاثر کرتی ہے پاکستان کی؟"

"کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔۔۔ مجھے پورا ملک ہر شہر ہر خطہ متاثر کرتا ہے، کیونکہ میری پہچان اور میری عزت اس ملک سے ہے۔ اس ملک نے مجھے شہرت دی۔ آج میں کہیں بھی چلی جاؤں۔ پاکستان کے حوالے سے ہی پہچانی جاتی ہوں۔"

"مگر سنا ہے کہ عزت تو بھارت میں ملتی ہے؟"

"ہاں کام کے حوالے سے "فلم انڈسٹری فن کاروں کی بہت عزت کرتی ہے اور ہماری عزت پورا پاکستان کرتا ہے۔"

"آپ کے علاوہ بھی کوئی اس فیلڈ میں ہے؟"

"جی میری ایک بہن اور میری کزن "نور" اس فیلڈ سے وابستہ ہیں۔ میری بہن "ریحانہ" ٹی وی ڈراموں میں کام کرتی ہیں اور نور کے بارے میں آپ سب جانتے ہی ہیں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟"

"جی بالکل۔۔۔ الحمد للہ۔۔۔ کیونکہ میں نے اپنی شادی کو خفیہ نہیں رکھنا تھا اور کیوں رکھتی۔ یہ تو حکم خداوندی ہے۔ شادی تو سب کو کرنی چاہیے، تو میں نے اپنی شادی میں کافی لوگوں کو مدعو کیا تھا اور کافی لوگوں نے شرکت کی تھی۔"

"فائدے کیا ہیں؟"

"فائدے کیا ہیں؟ میں سمجھتی ہوں کہ فائدے ہی فائدے ہیں۔ نقصان ان کے لیے ہیں جو اس رشتے کو سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ رشتہ مضبوط ہے تو نازک بھی ہے اور ہر اچھی لڑکی اپنے اس رشتے کو مضبوط رکھنا چاہتی ہے اور سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کو لائف پارٹنر مل جاتا ہے اور دونوں کی محبت سے اولاد جیسی نعمت ملتی ہے تو مجھے تو فائدے ہی نظر آتے ہیں۔"

"عموماً" ایک بچے کی پیدائش کے بعد لڑکیاں موٹی ہو جاتی ہیں؟ آپ ویسی ہی اسمارٹ ہیں وجہ۔۔۔؟"

"ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہماری فیلڈ ایسی ہے کہ ہمارے لیے اسمارٹ رہنا بہت ضروری ہے اور دوسری وجہ یہ کہ انسان کی اپنی بھی کوئی شخصیت ہوتی ہے اور پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ شوہر کو کیا پسند ہے۔"

"تو کیا کرتی ہیں ڈائیٹ یا ورزش؟"

"میں ورزش بھی کرتی ہوں اور کھانے پینے میں تھوڑی احتیاط بھی کرتی ہوں۔ مثلاً" تلے ہوئے اور مرغن کھانے نہیں کھاتی۔ کولڈ ڈرنک کا استعمال بالکل بھی نہیں کرتی۔"

"ایک خواہش جس کے پورا ہونے پر بہت خوش ہوں؟"

"بیٹے کی پیدائش میرے لیے زندگی کا سب سے قیمتی دور تھا، بلکہ لمحہ تھا۔ ایسا لگا کہ میں اب مکمل ہو گئی ہوں۔"

"گھر آکر کیا دل چاہتا ہے؟"

"یہی کہ گھر جاتے ہی بیٹے کو گلے لگاؤں اور شوہر سے سارا دن کی روداد بیان کروں۔"

"کب پچھتاوا ہوتا ہے؟"

"نہیں پچھتاوا تو خیر نہیں ہوتا، لیکن کبھی کبھی میں اپنی غلطی تسلیم کرنے میں دیر کرتی ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ یا اپنے دل کی بات فوری طور پر نہیں کہہ پاتی۔"

"تقریبات میں کون سا لباس زیب تن کرنا اچھا لگتا ہے؟"

"تقریبات میں تو اچھی طرح سے تیار ہو کے جانا بہت اچھا لگتا ہے۔ تو آج کل جو فیشن چل رہا ہے اسی کے مطابق فیشن کرتی ہوں۔ گھر میں تو آپ مجھے ڈھیلے ڈھالے لباس میں دیکھیں گی۔"

"اور آخر میں لڑکیوں کے لیے کوئی بات کہنا چاہیں گی؟"

"ہاں۔۔۔ بس دو لفظوں میں بات کروں گی۔ گھر کو اچھے طریقے سے چلانا اور گھر کو مضبوط بنانا۔۔۔ دینا عورت کا ہی کام ہے۔ گھر اور خاندان میں عورت کا اہم کردار ہوتا ہے اور پلیز اپنے کردار کو ذمہ داری کے ساتھ نبھائیں تو ہمیشہ خوش رہیں گی۔"

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

میلہ علی

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔

غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں، کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی، نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا، طعنے تشنے ہوں، اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

سالگرہ نمبر کے لیے کافی مشکل سلسلہ شروع کیا آپ نے چلیے ہمت کر کے جواب دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

س :۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج :۔ "جناب! میری شادی 22 مارچ 2009 کو ہوئی۔"

س :۔ "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج :۔ "شادی سے پہلے کے مشاغل میں شوقیہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹائم پاس، میٹرک کے اسٹوڈنٹس کو پڑھانا، خود ڈائجسٹ پڑھنا، کہانیوں پر تبصرہ کرنا، پودوں کا خیال رکھنا اور مہمانوں کی آمد پر جلد از جلد مزے دار ڈشیں بنا کر ان کو حیران کرنا اور داد پانا شامل تھا۔"

س :۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔

ج :۔ "ارے صاحب رشتہ جڑنے میں کیسی مرضی، ہزاروں، لاکھوں تابع دار بیٹیوں کی طرح سر جھکا دیا۔ جب کہیں بھی رشتہ طے نہیں ہو رہا تھا تو امی کا ہر بات پر اظہار فکر مندی، چاول نہ کھاؤ موٹی ہو جاؤ گی اور اسی گھر میں رہ کر میرے سینے پر مونگ دلوگی۔ کوئی بیاہنے نہیں آئے گا۔ اس طرح کی ہزاروں باتیں اور میرا جناتی قہقہے لگا کر ہنسنا کہ "امی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر میں مونگ دلوں۔ آخر آپ کے سینے پر ہی کیوں؟ اور اگر میں موٹی ہو گئی تو کیا فکر۔ ارے بھئی آپ بھی میرے لیے کوئی ہاتھی ڈھونڈ لینا ضرور جھاڑو کے تیلے سے رشتہ کرنا ہے۔"

ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں۔

☆ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی خاص تصور نہیں تھا۔ بس ٹی وی پر آنے والا ہر ہیرو دل کرتا تھا کہ ہمارا ہو، جیسے کہ نعمان اعجاز، نعمان مسعود، ہمایوں سعید، دانش تیمور، عمران عباس اور نہ جانے کتنے ہی، مگر ملا تو کون، اپنے ہی چچا جان کے سپوت (جو کہ اب شوہر نامدار کے عہدے پر فائز ہیں۔) خوبیاں کیا دیکھنی تھیں۔ بس خواہش تھی کہ شوہر خوب صورت ہو، مجھے سیرت کے ساتھ ساتھ خوب صورتی بھی متاثر کرتی ہے، تو واقعی شوہر خوب صورت ہی ملا، ایک زمانہ تعریف کرتا ہے، ہو سکتا ہے قاری بہنیں میرے خیالات سے اختلاف کریں مگر دوستو! میری ننھی معصوم سی خواہش تھی کہ اگر میاں بیوی لڑ بھڑ کر بیٹھ گئے ہیں تو کم از کم شوہر کی صورت اتنی پیاری ضرور ہو کہ لڑائی کے بعد دیکھنے پر مزید غصہ نہ آئے۔ قاری اور حساس بہنوں سے بہت بہت معذرت کے ساتھ۔ باقی رہی بات تعلیم و تربیت کی، تمیز شائستگی کی تو وہ سب خوبیاں ظاہر ہیں۔ لازمی دیکھنی تھیں جو کہ الحمدللہ موجود ہیں، اللہ کا شکر ہے۔

س :۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟"

ج :۔ "اگست 2008ء میں بزرگوں میں زبانی کلامی رشتہ طے ہوا، یہ ہی منگنی تھی، جو کہ 20 مارچ تک خاموشی سے رہی، فون پر بات اس لیے نہیں ہوئی کہ سسر نے سختی سے بیٹے کو منع کر دیا تھا، کہ وقت سے پہلے ہونے والی بات چیت سے تمام تر پردے نہ اٹھ جائیں۔ ہر طرح کا چارم ختم نہ ہو جائے اور رشتے کی نزاکت پر آنچ نہ آئے۔ کچھ میرا مزاج بھی اسی قسم کا تھا اور ہے کہ میں منگنی کو انتہائی بودا رشتہ تصور کرتی ہوں، جس کی مذہبی اور کسی حد تک معاشرتی لحاظ سے کوئی بھی حیثیت نہیں۔ ملاقات ہونا تو قطعاً "ناممکنات میں سے تھا" لڑکی کراچی کی اور منڈا شہر لاہور دا، اب خود ہی سوچیے جناب!"

س :۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟

ج :۔ "شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کافی نیک خیالات تھے، یہ ہی سوچا تھا کہ سگے رشتہ داروں کے گھر جا رہی ہوں۔ راوی چین ہی چین لکھے گا۔ ہر طرف میا نام کی پکاریں ہوں گی، خاندان بھر میں میرے سلیقے طریقے کی دھوم مچ جائیں گی۔ نندیں دعاؤں میں مجھ جیسی بھابھی مانگا کریں گی۔ دیور خوش ہو گا" تو آ۔ اور ہوا کیا کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا، وہ بھی مرا ہوا۔ اپنا گھر سمجھ کر بڑے اعتماد سے رخصتی ہو کر آئی، مگر اپنوں کا گھر تو اسی وقت زمین بوس ہو گیا جب نکاح نامے پر سائن کیے۔ کیسے "آنا" "فانا" اپنوں کا گھر سسرال میں بدل گیا؟ آج تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔" (اوئے کوئی تے آکے کڈے، کتھے پھس گئی آں)

س :۔ "شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی۔"

ج :۔ "شادی کے لیے تعلیم بالکل نہیں چھوڑنی پڑی کیونکہ تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ ہاں۔ اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو پڑھ پڑھ کر ایک عدد غائب دماغ پروفیسر تو بن ہی جاتی۔ سب سے بڑی قربانی تو یہ ہی دی کہ دیگر لڑکیوں کی طرح والدین اور بہن بھائیوں کا ساتھ چھٹ گیا اور افسوس ناک قربانی یہ دی کہ اپنا پیارا شہر کراچی جو کہ ہم سب ہی بہن بھائیوں کی جائے پیدائش بھی ہے۔ چھوڑ کر لاہور شہر آنا پڑا، اگر لاہور نہ آتی تو یہ کیسے ثابت کرتی کہ بھئی ہم بھی پیدا ہو چکے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ (جنے لاہور نہیں ویکھیا او جمیا ای نہیں۔) لیجیے اپنے وجود میں آنے کا یقین دلانے کے لیے شہر لاہور کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ اب حالیہ صورت حال یہ ہے کہ نہ میں تین میں ہوں، نہ ہی تیرا میں، نہ کراچی مکمل بھولتا ہے، نہ ہی لاہور کو مکمل اپنا پائی ہوں۔ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے خبر نہیں۔"

س :۔ "شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟"

ج :۔ "جی ہاں! شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ چونکہ شادی لاہور ہی میں منعقد ہوئی تھی' بڑے چچا کے گھر (بڑے چچا کے بے حد اصرار اور محبت سے بلانے پر ہم سب ہی لوگ کراچی سے ان کے گھر آ گئے تھے۔) لہٰذا ان کے مزاج کے سرد و گرم کا بھی خیال رکھنا تھا۔ پہلے سسر صاحب نے چاہا کہ مہندی' مایوں کمبائن ہوں' پھر بڑے بھائی کے مزاج سے ڈر کر علیحدہ علیحدہ مہندی' مایوں ہوئے۔ دلہن کی فیملی یعنی کہ میری فیملی اور بڑے چچا کی مکمل فیملی کی موجودگی میں مایوں کی رسم انجام پائی' میں گھریلو ماحول میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے یہاں وہاں گھومتی رہی تو بڑے چچا نے کہا "کڑی تے شرماندی نئیں" یعنی لڑکی تو شرما ہی نہیں رہی۔ بارات والے دن بھی سب ہی مجھے دیکھ کر ایک بار تو ضرور ہی چونکے کیونکہ ایک بار پھر میں بالکل نہیں شرما رہی تھی' آنے والے مہمانوں کو اسٹیج سے ہی دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی' اشاروں ہی اشاروں میں سلام دعا کرتی رہی' امی دولہا کو گھڑی پہنا رہی ہیں تو دلچسپی سے یہ سین دیکھ رہی ہوں۔ دولہا کو سلامی دی۔ تب بھی میرا یہی حال رہا۔ دودھ پلائی کی رسم ہوئی تو آرام سے دولہا کا چھوڑا ہوا دودھ پی لیا۔ آپی اور دیگر کزنز کیا بحث و مباحثہ کر رہے ہیں' کچھ پتا نہیں کزن آصفہ باجی کا چار سالہ بیٹا مسلسل مجھے کہتا رہا۔ (توں دودھ نہیں پیناتے مینوں دے دے۔) نہ جانے میں ایسی انوکھی دلہن کیوں بن گئی۔ ولیمہ بھی اسی طرح کی صورت حال لیے ہوئے تھا۔ شوہر صاحب کی خالہ نے بڑی محبت سے کہا کہ میا! آپ بہت پیاری اور کانفیڈنٹ لگ رہی ہیں۔" اب ہم بہن' بھائی یہ باتیں یاد کر کے خوب ہنستے ہیں۔

شادی کے بعد

س :۔ "شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟"

ج :۔ "شادی کے بعد پہلی بار شوہر نے مجھے دیکھ کر کہا کہ "ہمیں شکرانے کے نفل پڑھ لیں۔" ساڑھے سات ہزار کا کرایا ہوا' میک اپ جس پر اک نگاہ غلط نہ ڈالی۔ رخصتی کے وقت امی نے سختی سے منع کیا کہ رونا نہیں' میک اپ خراب ہو جائے گا۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ سسرال جاتے ہی منہ دھل جائے گا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شوہر سے گلہ کیا کہ آپ نے تو میرا میک اپ دیکھا ہی نہیں۔ تو روکھا سا جواب آیا "میں نے دیکھ لیا تھا۔ اب آپ ہی بتائیں ایسی صورت حال میں انسان کیا کرے۔"

س :۔ "شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟"

ج :۔ "شادی کے بعد زندگی مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔ میں گھر بھر میں چھوٹی بچی' شادی کے بعد ایک دم بہت اہم ہو گئی۔ اب امی کسی بھی چھوٹے بڑے کام کو کرنے سے پہلے میری آمد کا انتظار کرتی ہیں۔ میکے میں شادی کے بعد بہت معتبر ٹھہری اور سسرالی حوالے سے بات کی جائے تو اپنے آپ کو دنیا کی بے کار ترین شے سمجھنے پر مجبور ہوں۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو عرب بیٹی کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیا کرتے تھے تو بالکل ٹھیک کرتے تھے۔ میکے میں سلیقہ مند اور سسرال میں کچھ کرنا ہی نہ آیا یا شاید ان کو ہی پسند نہ آیا۔ یقین جانیں' میں کچھ عرصہ سے سنجیدگی سے یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ آخر مائیں اپنی بیٹیوں کو سلیقہ کیوں سکھاتی ہیں' کیونکہ بہرحال سسرال میں یہ سلیقہ مندی فیل ہو جاتی ہے۔ کبھی سوچتی ہوں اپنی بیٹیوں کو کچھ نہ سکھاؤں۔ کیونکہ ہر دو صورت میں تذلیل ہی ہے۔ میرے اس جواب سے اتفاق کرنا قطعاً ضروری نہیں کیونکہ انسان وہی بات کرتا ہے جو اسے اس کا تجربہ یا مشاہدہ سکھاتا ہے۔"

س :۔ "شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟"

ج :۔ "شاید پانچ یا سات دن بعد' وہ بھی میرے پڑھے لکھے سائیں سسر نے ڈائریکٹ نہیں کہا۔ باقاعدہ ماحول بنا کر کام کیا۔ سسرال میں شروع دن سے ملازمائیں آتی ہیں۔ وہ ملازمہ جو صبح چھ بجے گھر میں آ کر کام سنبھال لیتی تھی۔ اس

دن وہ گئی ہی نہیں۔ ساس، سسر کو ناشتہ بنا کر دینے لگیں تو میں دوڑ کر سامنے آگئی کہ "لائیں میں بنا دوں" ناشتے سے فراغت اور ملازمہ کی آمد کے باوجود کام کرتے کرتے شام کے چار بج گئے۔ اسی وقت کھیر بھی پکوائی اور کام کا آغاز ہوگیا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے کہ اگر منہ سے کہہ دیتے کھیر پکوائی کا اور باقاعدہ کچن میں کہہ کر بھیجتے تو میرا بھی کچھ مان رہ جاتا۔"

س :۔ "کیا میکے اور اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے۔"

ج :۔ "بالکل بالکل سسرال اور میکے کے کھانے میں زمین آسمان کا فرق تھا اور آج تک برقرار ہے۔ ماسیوں کے پکائے کھانے کسے اچھے لگ سکتے ہیں۔ سسرال جا کر پتا چلا کہ بوڑ بھی کوئی سالن ہے کریلوں کے چھلکوں کا۔ میری حیرت پر ساس حیران اور میں پریشان۔"

س :۔ "میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟"

ج :۔ سسرال کا ماحول بہت ہی مختلف تھا میکے سے۔ شروع شروع میں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ شادی کے چوتھے ہی دن شوہر ڈیوٹی پر چلے گئے، ساس سے حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگیں۔ "اب کیا تمہارے لیے نوکری ہی چھوڑ دے۔" اور میں ان کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ صبح آٹھ بجے شوہر دفتر چلے جاتے رات نو بجے واپسی ہوتی۔ ٹی وی میرے کمرے میں تھا۔ مگر نہ جانے کیوں کیبل کنکشن نہیں تھا اس لیے شوہر جو دفتر سے آکر ٹی وی کے سامنے بیٹھتے تو رات کے ڈھائی تین بج جاتے۔ جمائیاں لے لے کر میرا برا حال، اپنے کمرے میں بھی نہیں جاسکتی کہ سسر برا مانیں گے، اور شوہر سینکڑوں اشاروں پر بھی نہیں اٹھتے تھے۔ بالآخر سسر ہی کہتے "جاؤ بھئی اب سو جاؤ صبح دفتر بھی جانا ہے" اور وہ اٹھ آتے۔ ڈیڑھ سال ایک کمرے میں دو اجنبیوں کی طرح گزرے، شوہر کافی ٹھنڈے۔ رومانس کس چڑیا کا نام ہے انہیں پتا تک نہیں۔ انہیں میری تنہائی اور اکیلے پن کا بھی احساس نہ تھا۔ بڑی نند شادی شدہ چھوٹی نند پڑھائی میں غرق، دیور انجینئرنگ کی پڑھائی میں ہلکان، ساس اپنے ہی مزاج کی۔ کسی نے احساس تک نہ کیا کہ یہ لڑکی دوسرے شہر سے مکمل طور پر اجنبی ماحول میں آئی ہے، بڑا مشکل وقت تھا ٹل گیا۔ شکر ہے۔

س :۔ "سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟"

ج :۔ "میں نے سسرال میں تقریباً" ڈیڑھ سال گزارا۔ سسر کی مرضی اور منشاء پر۔ اس تمام وقت میں یہی لگتا تھا کہ اک آگ کا دریا ہے اور تیر کر جانا ہے۔ پانچویں مہینے میں جب پہلی بچی کی آمد کی اطلاع ملی تو سسر نے اسی دن علیحدہ کچن کرنے کا حکم دے دیا۔ اب آپ سمجھ بھی جائیں کہ کیوں؟ ظاہر ہے میں ان کی کمائی سے کچا پکا "چھابڑا" سب ہی کھاتی جو کہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ جبکہ میری والدہ کا کہنا ہے کہ ایسی حالت میں عورت کو گلاس پانی کا بھی پلا دو تو ثواب ہی ثواب ہے۔ تعریف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ تنقید کے ٹوکرے ہی ٹوکرے۔ میں نے زندگی میں کبھی چکی کے آٹے کی روٹی نہیں بنائی۔ روٹی بناتی ٹوٹتی۔ کبھی ایک آدھ باریک، جوڑی جتنا بل پڑ جاتا۔ جسے ساس بجائے مجھے دکھانے کے روٹی پھیلا پھیلا کر سسر کو دکھاتیں۔ اور ذلت کی انتہا تب ہوتی جب سسر مجھے کسی مجرم کی طرح ایک انگلی سے اشارہ کرکے بلاتے اور کہتے کہ "تجھے روٹی بنانی نہیں آتی تیری ماں تو اتنی پتلی اور نرم روٹی بناتی ہے" اور میں اگلی بار ٹھیک روٹی بنانے کا وعدہ کرکے پلٹ جاتی۔

میری عادت ہے نہاتے وقت میلا سوٹ ہاتھ کے ہاتھ دھولیتی ہوں کہ کیوں نازک کپڑوں کو ہفتہ بھر میلا رکھوں۔ سسر کو میری یہ عادت پتا چلی تو ملازمہ کو کہہ دیا کہ چھت پر سرف نہ رکھو میا ضائع کرتی ہے۔ بہت سی باتیں ہیں جو ابل ابل کر باہر آنے کو بے تاب ہیں۔ جانے دیں قصہ مختصر، وہاں گزرا وقت مکمل تنقید سے بھرا ہے۔ کوئی تعریف حصے میں نہ آئی۔"

س :۔ "سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔"

ج :۔ "میری سسرال نے مجھے کبھی وہ مقام نہیں دیا جس کی ایک بڑی بہو حقدار ہوتی ہے۔ نند کی ساس فوت ہوئیں نہ مجھے بتانا گوارا کیا نہ ہی ساتھ لے کر گئے۔ حتیٰ کہ چھوٹی نند اور دیور گھر میں موجود تھے۔ اس کی ذمہ داری تک دے کر نہیں گئے۔ دیور کی منگنی کی میں اور شوہر گھر پر موجود تھے۔ بڑی نند، چھوٹی نند، دیور ساس سسر سب ہی گئے۔ نچلے پورشن کو تالا لگایا اور یہ جا وہ جا۔ شوہر نے ساتھ جانے کا کہا تو سسر فرمانے لگے۔ "اپنا کرایہ لگاؤ اور چلو۔" منگنی دوسرے شہر میں تھی۔ میری رائے کو کیا اہمیت دیتے، ناک کے نیچے بڑے بڑے فیصلے ہوئے۔ ہمیں آخر وقت تک اطلاع نہیں ملی۔"

س :۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج :۔ "سسرال والوں سے وابستہ توقعات کوئی تھیں ہی نہیں جو پوری ہوتیں۔ ان کی ایک دو باتوں سے ہی اندازہ ہوگیا کہ گردن بھی کاٹ کر رکھ دوں تو میرے نہیں ہوسکتے۔"

س :۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے خصوصاً" پہلا بچہ۔ ایک طرف خود میں آتی تبدیلی، دوسری طرف شوہر اور سسرال والے۔ آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

ج :۔ "بچوں کی پیدائش واقعی بڑا امتحان ثابت ہوئی جیسا کہ میں نے بتایا کہ بچے کی آمد کا سنتے ہی کچن علیحدہ کردیا۔ نچلے پورشن میں فلٹر لگا ہوا تھا۔ ہم وہاں سے صاف پانی بوتلوں میں بھر کر لاتے تھے۔ جب میرے شوہر بوتلوں میں پانی بھر کر اوپر لانے لگے تو کنوارے دیور صاحب نے کہا کہ "اسے اتنا نہ سر پر چڑھا۔" اور آج الامان الحفیظ (بیوی کی غلامی کے پچھلے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے نئے ریکارڈ قائم کردیے ہیں) بچی کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو سسر نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ تمہاری بیوی یہ گند یہاں نہ پھیلائے۔ لیجیے ہم نے تمام گند ماں کے گھر میں پھیلایا اور بقیہ گند (میری پیاری بیٹی) سسر کو پکڑا دیا۔ اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے کلیجہ چھلنی ہوتا ہے میرا۔ جن لوگوں کے پاس یہ گند نہیں ان کی زندگی کتنی ویران اور بے کل ہے۔ یہ وہی جانتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہوں۔

میری بچی کا نام نانی نے داماد اور بیٹی کی منشا پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی مسلسل کہتی بھی جاتیں 'بیٹا! تمہارے والدین

حیات ہیں ان کا بہت حق ہے ان سے پوچھ لو۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔" شوہر اپنے والدین کے رویے سے نالاں تھے۔ صاف کہہ دیا "نہیں تائی اماں آپ نے جو نام رکھ دیا وہی فائنل ہے۔"

لاہور جاتے ہی بدل گئے والدین کا بڑا کام ہو چکا تھا۔ اب صرف پوتی کو گود میں اٹھانا باقی تھا۔ سارے حقوق یاد آگئے۔ شوہر نے فون پر کہہ دیا ..... نام رکھتی ہو تو گھر آنا ورنہ والدین کے گھر پر بیٹھی رہو۔ میرے خیال میں تابعدار بیٹا ہونا بھی کڑا امتحان ہے۔ مرد والدین اور بیوی کے درمیان پس کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ ہونے والی زیادتیاں شوہر کی نظر میں تھیں انہوں نے والدین کو کیسے منایا واللہ علم۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بچی دادا دادی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان کی محبت سے دور رہی' ڈیڑھ سال انہوں نے بچی کو اس کے نام سے نہیں پکارا (مثل آپی آپ میری بچی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہیں۔ بلاشبہ وہ خوب صورتی کے ہر معیار پر پورا اترتی ہے (سو فیصد درست ماشاء اللہ) مگر دادا دادی کو قطعا" نہیں بھاتی۔ اس کی ہر بیماری پر میں اور میرے شوہر بولائے بولائے پھرتے۔ پہلا بچہ' نا تجربہ کاری اور دادا دادی نے کبھی گائیڈ نہ کیا۔ خود ساختہ ناراضیاں' دوستیاں بالآخر عرصے بعد پوتی یاد آئی مگر اب بھی سرد و گرم جاری ہے۔"

س :۔ "آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے۔؟"

ج :۔ میں کسی قیمت پر جوائنٹ فیملی کی حمایت نہیں کروں گی جو مجھ پر بیت گئی' وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ یہ تو چند دنوں کا قصہ ہے۔ گزرے چھ سال اذیت کی بھٹی میں جھونکے ہیں۔ ہاں۔ اگر کنوارے ہوتے ہوئے یہ سوال پوچھا جاتا تو مجھ سے بڑا حمایتی جوائنٹ فیملی کا شاید ہی کوئی اور ملتا۔ آپ کو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ساری زندگی تنہا گزاری ہے' صرف والدین اور ہم چار بہن بھائی۔ ہم نے دادا دادی کی محبت نہیں دیکھی۔ وہ فوت ہو چکے تھے اور رشتہ دار وغیرہ دوسرے شہروں میں آباد تھے۔ یہ کمی اب بھی ہمارے اندر کسک بن کر موجود ہے۔"

س :۔ آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی۔

ج :۔ تمام تر طوفان بدتمیزی کے باوجود میں اب بھی چاہتی ہوں کہ سسرال سے تعلقات بہتر ہوں۔ سسر نے خود ہی دنیا جھیلنے کے لیے پانچ سال پہلے گھر سے نکال دیا۔ جب میں والدین سے ملنے کراچی آئی تو پتا چلا کہ گھر سے دیس نکالا مل چکا ہے۔ واپسی کا سفر انجان راستوں کا تھا۔ اب دنیا جھیل رہی ہوں۔ انہوں نے میرے حقوق پورے کیے ہوں یا نہ کیے ہوں' میری پڑھی لکھی والدہ اور بھائی بہن آج بھی ان کی حمایت کرتے ہیں اور مجھے ہر زیادتی در گزر کرنے کا کہتے ہیں۔ ان ہی کے مشوروں پر چلتے ہوئے میں ہر ہفتے سسرال جاتی ہوں۔ بچے لازمی دادا اور دادی سے ملتے ہیں۔ قطعا" کسی قسم کا زہر بچوں کے دل میں نہیں بھرا۔ اس سے ان کی شخصیت مجروح ہوگی اور میرے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا۔ ہاں جب دل بھر جاتا ہے تو خوب خوب شوہر سے جنگ کرتی ہوں۔ بھڑاس نکل جاتی ہے' دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ نندیں میرے نام کی مالا جپ رہی ہیں۔ ساس سسر کہتے ہیں کہ اس سے اچھے کھانے کوئی نہیں بناتا۔ اور پُر زور اصرار ہے کہ واپس گھر لوٹ آؤ یہ سطور جب آپ پڑھیں گی تو شاید بلکہ یقینا" میں سسرال میں موجود ہوں گی۔ آگے جو اللہ کو منظور۔

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوشش کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں سو وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آ جاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آ جائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے

جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ جاتی ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بشریٰ اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے۔ بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کمیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ، بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آ کر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ مثال، واثق کی نظروں میں آ چکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار، وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی، مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کر لیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہو جاتا ہے۔ بشریٰ، مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر چکا ہے۔ واثق، عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کرتا ہے۔ عاصمہ خوش ہو جاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آ جاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کر کے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو انجانا سا اٹیک ہو جاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کر دیتا ہے۔ عفت، مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہو جائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پا رہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واثق کی ملاقات پریشے سے ہو جاتی ہے جو کافی نازو ادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے، واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ عفت خوش ہو جاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کر کے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتا دیتی ہے۔ عدیل از حد پریشان ہو جاتا ہے۔ پریشے، وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

اٹھائیسویں قسط

وہ دائیں بائیں آگے پیچھے کسی بھی طرف دیکھے بغیر کچھ بھی سوچے بغیر بس چلتا چلا جا رہا تھا۔

بار بار اس کی آنکھوں کے آگے دھندلے سے پانی کی چادر تن جاتی، وہ بس وقفے وقفے سے آستین کی پشت سے دونوں آنکھوں کو رگڑتا اور چلتا جاتا۔

اسے یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ گاڑی میں ہی بیٹھ جاتا یا آنے سے پہلے کسی کو بتا ہی آتا، فکر کیا جاتا کر آتا؟ وہ کہاں جا رہا ہے، کس لیے جا رہا ہے۔ اور اسے تو یہ بھی سوچ سوچ کر خود پر بہت غصہ آئے جا رہا تھا کہ وہ عاصمہ کے سرسری سے ہی کہنے پر فنکشن میں شامل ہونے کیوں چلا آیا۔ دل عجیب بے ایمان، دھوکے باز جو اس قیامت جیسی گھڑی میں بھی ایک نظر بس مثال کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔ وہ عروسی جوڑے میں اس کے خوابوں سے بھی بڑھ کر

خواب ناک لگ رہی تھی۔
مگر جیسے وہ ایک خواب ہی تو تھا صرف۔ اس کی آنکھوں سے پھر پانی چھلکنے لگا۔
"میں پہلے دن سے جانتا تھا۔ مثال میرے لیے نہیں ہے پھر میں نے پہلے ہی قدم پر خود کو روک کیوں نہ لیا۔"
وہ ایک دم سے نڈھال ہو کر سڑک کے کنارے شور مچاتی ٹریفک کی روانی سے بے خبر بیٹھ گیا۔
جیسے ہی نکاح خواں فہد اور مثال کے سامنے جا کر بیٹھا۔ واثق کو لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر زور سے مکا مارا ہو' وہ ایک لمحہ بھی وہاں رکے بغیر خاموشی سے باہر نکل آیا' پھر اس کے بعد اس کے دماغ میں جانے کیا سمایا کہ وہ کسی بھی سمت کا تعین کیے بغیر بس بہت دور تک چلا گیا۔
"اب تک نکاح ہو چکا ہو گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہو چکی ہو گی' اس کے اندر سے ہوک سی اٹھی۔ پہلی بار اسے لگا' اس کی زندگی خالی ہو گئی ہے۔ ہر مقصد' ہر خواہش' ہر خواب سے خالی۔ اس زندگی کا وہ کیا کرے گا۔ اس کے دل میں شدت سے خودکشی کی خواہش زور پکڑ رہی تھی۔
"میں اس بے مقصد زندگی سے نجات پالوں گا' مگر ای اور رودہ...." اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

نکاح خواں تو کیا کوئی بھی اس اچانک صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا اور مثال کو ایک لمحے کے لیے ایسا لگا' جیسے کسی نے یخ بالٹی بھر پانی اس کے اوپر انڈیل دیا ہو' وہ اندر تک جیسے شانت ہو گئی تھی۔ یہ آنے والی عورت کوئی فراڈ بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی بلیک میلر بھی۔ فہد اور آنٹی' انکل کے مخالفوں کی کوئی سازش! کوئی بڑا جان دار جھوٹ... کچھ دیر بعد اس عورت کو اور اس بچی کو ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیا جائے گا اور پھر سے فہد اور مثال کے نکاح کا سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔ یہ سب کچھ بہت ممکنات میں سے تھا۔
مگر اس لمحے صرف ایک لمحے کی سرخوشی' انوکھی سی رہائی کے احساس نے مثال کو سرشار کر دیا تھا۔
اس نے بہت ممنون و محبت بھری نظروں سے اس واجبی سی شکل و صورت والی الٹرا ماڈرن لڑکی نما عورت کو دیکھا جس کے بال گہرے سرمئی تھے۔ اس کی آنکھوں کے ہم رنگ ان نیلگوں گہرائیوں میں بڑی گہری سرد مہری تھی' جیسے وہ سب کچھ جلا کر بھسم کر دینے کے بعد بھی بہت سکون سے کھڑی ہو۔
اس کی آنکھوں سے چھلکتی سفاکی اس کی فطرت کی سختی کا پتا دے رہی تھی۔
"کیا۔ کیا بولا آپ نے اور کون ہیں یہ وقار! بھابھی! یہ عورت کیا کہہ رہی ہے؟" عدیل کے دل کے آس پاس بہت سے شیشے چٹخے تھے۔
وہ بے یقین سا پاس کھڑے وقار کے بازو کو جیسے دبوچ کر اٹک اٹک کر بولا۔
"جھوٹ بکواس بالکل غلط۔" وقار نے دانت بھینچے نفرت بھرے لہجے میں جیسے سرگوشی کی تھی' دوسرے لمحے وہ عدیل کو جھٹک کر اس لڑکی کی طرف بڑھا تھا۔
اگر عدیل عفت کا کندھا نہ تھام لیتا تو وہ یقیناً گر جاتا۔
"میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ گھٹیا ذلیل بلیک میلر! چلو یہاں سے۔ یہ جگہ ہے تمہاری بکواس کرنے کی۔ باہر گاڑی میں بیٹھو جا کر۔ میں آکر بات کرتا ہوں تم سے۔"
"کیا بات کریں گے آپ مجھ سے؟" وہ نفرت بھرے سرد لہجے میں اپنا بازو چھڑا کر غرائی۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں جیسے وہاں ہو کا عالم تھا' سوئی بھی گرتی تو اس کے گرنے کی آواز صاف سنائی دے جاتی اور مثال کی حالت

ابھی بھی بہت پُرسکون تھی' وہ جو اتنے دنوں سے اس کے دل میں بے چینی' ہلچل اور اضطراب تھا آج جیسے ان ساری بے یقین کیفیات کا خاتمہ ہو گیا تھا۔
وہ اسٹیج پر بیٹھی سامنے ڈٹ کر کھڑی لیلیٰ اور وقار کو یوں دیکھ رہی تھی' جیسے وہ سب کسی اور کے بارے میں ہو رہا ہو۔
"کیوں جاؤں میں باہر۔ میں نہیں جاؤں گی باہر۔ فہد کی بیوی ہوں میں' آج سے نہیں چھ سال سے اور آپ مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہے ہیں تاکہ آپ لوگ دھوکے سے میرے شوہر کی دوسری شادی کرا دیں۔" وہ اسی سرد' خود سر لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"لیلیٰ! چلو یہاں سے۔" فائزہ کو شوہر کی مدد کے لیے اسٹیج سے اتر کر آنا پڑا۔
اس نے قدرے نرم' مہذب لہجے میں سرگوشی کی تھی۔
"Never (ہرگز نہیں)" لیلیٰ دوٹوک لہجے میں بولی۔
وہ فائزہ کو پرے دھکیل کر تیزی سے اسٹیج پر چڑھ آئی تھی۔ اس نے ایک دم سے مثال کو کندھے سے پکڑا تھا۔
"تم جانتی ہو کہ تم اس شخص کی دوسری بیوی بننے جا رہی ہو۔" وہ مثال کے سجے سنورے چہرے کو نفرت سے دیکھ رہی تھی۔
"لیلیٰ! یہ کیا تماشا ہے' چلو یہاں سے؟" فہد کو بالآخر اٹھ کر اس کے بے خوف انداز کو ٹوکنا پڑا۔
"اوہ' تماشا۔ تمہارا مطلب ہے' میں یہاں تماشا کرنے آئی ہوں اور تم کیا کر رہے ہو؟" وہ مثال سے ہٹ کر فہد کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی۔
"وقار! اس پاگل لڑکی کو لے جائیں یہاں سے۔ یہ ہماری عزت دو کوڑی کی کر دے گی۔ یہ کیا کرنے جا رہی ہے۔ اس کو لے جائیں یہاں سے۔" فائزہ کو ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں وقار سے منت کر رہی تھی۔
"مجھے نہیں لگتا فائزہ! اب ایسا کچھ ہو گا۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں۔ ہونے والی بات ہو کر رہے گی۔" وقار کے لہجے میں مکمل ہار تھی۔
"میں تمہیں ساری بات بتا کر آیا تھا پھر یہاں آکر یہ سب ڈراما کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تمہیں؟"
فہد کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔
"جھوٹ بول رہے ہو تم۔ تم مجھے کچھ بتا کر نہیں آئے۔" وہ زور سے چلائی تھی۔
"تمہاری ماں ہاسپٹل میں ہے اور تم اس کی عیادت کو جا رہے ہو' یہ کہہ کر آئے تھے تم مجھ سے۔"
اس کی آنکھوں میں نمی تھی' دکھ تھا' بے یقینی تھی اور بہت سارا رنج تھا۔
مثال کو اس پر بے تحاشا رحم آیا۔
اس کی نظریں دور کھڑی اس کی چھوٹی سی بچی پر جم گئیں۔ اسے لگا وہ خود اس بچی کی جگہ کھڑی ہے اور اس کے ماں باپ وحشی جانوروں کی طرح لڑ رہے ہیں۔
اس کا بے اختیار جی چاہا' وہ اسٹیج سے بھاگتی ہوئی جائے اور اس بچی کو اپنے سینے میں چھپا لے۔
وہ یک ٹک اس ننھی بچی کو دیکھے جا رہی تھی' جس کی آنکھوں میں خوف تھا اور ڈر بھی۔
"کون ہے یہ' فہد! تمہاری بیوی ہے؟" عدیل کو بہت دیر لگی تھی خود کو سنبھالنے میں۔
اور ایسا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی مثال کا نصیب یوں بننے سے پہلے ہی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔

صرف ایک بار، صرف ایک بار اس نے بشریٰ کو طلاق دیتے ہوئے مشال کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا اور اس کے ساتھ بہت برا کر ڈالا تھا۔
اس ایک اختیاری زیادتی کے بعد اس نے جب جب مشال کے لیے اچھا کرنا چاہا اس کے ساتھ مزید برا ہی ہو رہا تھا جیسے کہ اب!
"انکل۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ میں بات کر رہا ہوں۔" فہد کو عدیل کو دیکھ کر ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔
"میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ یہ تمہاری بیوی ہے؟" عدیل جیسے ساری برداشت کھو کر بولا تھا۔ بہت تیز آواز میں۔
"اسے اپنے منہ سے بتاتے ہوئے شاید شرم آتی ہے۔ میں اس کی بیوی ہوں۔ یہ ہم دونوں کی بیٹی ہے اور آپ کی بیٹی صرف اس کے ماں باپ کی بہو ہوگی کہ وہ اپنی ضد سے آپ کی بیٹی کو بیاہ رہے ہیں۔"
لیلیٰ کی آنکھوں کی سرد جھیلیں اب گرمپانیوں میں ڈھل چکی تھیں۔
وہ ضبط کرتے ہوئے بھی اپنے آنسو روک نہیں پا رہی تھی۔ اسے شاید فہد سے ایسی اجنبیت کی امید نہیں تھی۔
"تو تم نے ہمیں دھوکا دیا؟" عدیل پتھریلے لہجے میں غرایا۔ اس نے فہد کے چوڑے کندھے کو بہت سختی سے اپنی طرف گھمایا تھا۔
"نہیں انکل! یقین کریں ایسا کچھ نہیں ہے یہ۔۔۔ تو۔۔۔"
"کیا یہ بکواس ہے۔۔۔ جھوٹ ہے' یہ تمہاری بیوی ہے۔ تم منہ سے اقرار نہیں کر رہے تو کیا یہ بچی تمہاری نہیں؟ کیا اس کے لیے بھی انکار کرو گے بولو۔" عدیل کی پھٹی ہوئی آواز اب کپکپا رہی تھی۔
فہد کا سر جواب میں جھک گیا۔ اس سے بڑا اقرار اور کیا ہو سکتا تھا۔ فائزہ نے تڑپ کر وقار کی طرف دیکھا۔
"جائیں' بات کریں وقار!" وہ بے قراری سے بولی تھی۔
"کچھ نہیں بچا اب بات کرنے کو اور کس منہ سے جا کر میں بات کروں گا میں نے دوست بھی کھو دیا اور عزت بھی۔" وہ شکست خوردہ تھا۔
"وقار پلیز' جائیں ورنہ۔" فائزہ نے شاید اس کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ اسی طرح بے قراری سے بولی۔
"تم نے ہمیں دھوکا کیوں دیا؟ کیا بگاڑا تھا ہم نے تمہارا۔۔۔ میں نے' میری بیٹی نے؟" عدیل وہیں اپنے قدموں پر کھڑا جیسے بکھر سا گیا تھا۔
"انکل! ایسی بات نہیں ہے۔ میں چاہتا تھا۔ آپ کو یہ سب معلوم ہو مگر۔" فہد انگلیاں آپس میں جکڑ کر مضطرب لہجے میں بولتے ہوئے فاصلے پر کھڑے وقار کو دیکھنے لگا۔
اسے باپ کی مدد کی ضرورت تھی اور وقار کسی بھی طرح خود کو عدیل کا سامنا کرنے کے قابل نہیں پا رہا تھا۔
"کیا بتانا چاہتے تھے تم کہ ہمارے ساتھ' ہماری عزت کے ساتھ تم باپ بیٹا مل کر کھیل کرنا چاہتے ہو اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے تم نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ تم خود بھی ایک بیٹی کے باپ ہو۔ عفت! مشال کو اندر لے جاؤ۔" اس نے مڑ کر کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مما! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کتنی دیر سے فون لیے بیٹھی ہیں۔ کس سے بات کر رہی ہیں آپ؟"

آئینہ بشریٰ کے کمرے میں آ کر سخت کوفت بھرے انداز میں بولی تھی۔
بشریٰ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔
فون اس کے ہاتھوں میں تھا' وہ وقتاً "فوقتاً" کبھی مشال کا نمبر ملاتی اور کبھی عدیل کا مگر دونوں میں سے کوئی بھی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔
"مما!" وہ اس کی خاموشی پر پھر بولی۔
"کچھ کام ہے آئینہ تمہیں مجھ سے؟" وہ سرد لہجے میں بولی۔ اس لمحے اسے کسی کی بھی موجودگی نہیں چاہیے تھی۔ آئینہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔
"بھائی آپ کو دوسرے نمبر پر کال کر رہے ہیں' آپ کا نمبر مسلسل بزی مل رہا ہے انہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"
وہ ماں کے انداز پر فوراً" بولی۔
"اس سے کہہ دو جا کر میں سو رہی ہوں' میری طبیعت اچھی نہیں ہے' سو کر اٹھوں گی تو میں خود کال بیک کر لوں گی اسے۔"
آئینہ کو معلوم تھا۔ سیفی کا نام سن کر بشریٰ کی آواز بے تاثر رہتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں کتنی ناگواری اور کوفت ہوتی ہے' وہ صرف آئینہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔
"مشال آپی سے بات کر رہی ہیں؟"
وہ یہاں سے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھنے لگی' جب بھی بشریٰ یوں گھر کے کونوں کھدروں میں آ کر فون لیے بیٹھتی تھی' آئینہ کو پتا چل جاتا تھا۔ وہ مشال سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔
"نہیں۔" بشریٰ قطعیت سے بولی۔
"میں جا رہی ہوں مما! لیکن پلیز آپ اتنا اسٹریس نہیں لیں' صاف نظر آ رہا ہے۔ آپ بہت پریشان ہیں۔ مشال آپی ٹھیک ہوں گی۔ آج ان کی شادی ہے نا! آپ بتا رہی تھیں مجھے لاسٹ ویک۔" ایک دم سے یاد آنے پر وہ ماں کے پاس دو زانو بیٹھ کر ہمدردی سے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی تو بشریٰ کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ آئینہ کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"عدیل! میری بات سنو خدا کے لیے۔" وقار نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تھے۔
عدیل لمحہ بھر کو ساکت کھڑا رہا پھر سرد مہری سے اس نے وقار کے ہاتھ کندھے سے ہٹائے تھے۔
"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ تم نے دوست ہو کر جس طرح میرے سینے میں خنجر گھونپا ہے۔ وقار! تم میری نظروں سے نہیں گرے میں خود اپنی نظروں سے گر گیا ہوں کہ میں نے تم جیسے دھوکے باز کو دوست سمجھا' تم پر اعتبار کیا۔"
عدیل کا لہجہ کرچی کرچی تھا اور آنکھوں میں جیسے خون چھلک رہا تھا۔
"میں خود کو بھی معاف نہیں کروں گا۔" عدیل خود کو سنبھال کر نفرت بھرے لہجے میں وقار پر نظریں گاڑ کر بولا۔
"نہ کرنا معاف' لیکن میری نیت پر شک نہیں کرو بخدا میں نے مشال کو اپنی بیٹی۔۔۔"
"نام مت لو میری بیٹی کا اپنی زبان سے' تم تو اس قابل بھی نہیں ہو کہ خدا تمہیں بیٹی تو کیا دیتا' تم کسی بیٹی کا نام بھی لے سکو۔"

عدیل کے لہجے میں کیا نہیں تھا جو وقار کو اپنی ہی نظروں میں گرا گیا۔

"تم جتنا چاہو مجھے لعن طعن کرلو مگر حقیقت یہی ہے میں مثال کو اپنی بیٹی ہی بنا کر لے جانا چاہتا تھا۔ لیلیٰ اس کی حقیقت میں تمہیں بتاؤں گا تو شاید تم یقین نہیں کرو۔"

"آپ مت بتائیں میری حقیقت میں ان کے سامنے کیا پوری دنیا کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی حقیقت خود بتا سکتی ہوں۔" لیلیٰ ان کے پیچھے سے آئی تھی۔

عدیل باہر جانے لگا تھا تب وقار اس کے پیچھے آیا تھا۔ فہد اور فائزہ لیلیٰ کے ساتھ وہیں اسٹیج پر ہی تھے۔ مہمانوں میں ہونے والی چہ میگوئیاں اب بآواز بلند تبصروں میں بدل چکی تھیں۔

اور عدیل کو لگا تھا کہ اگر وہ یہاں کچھ دیر اور کھڑا رہا تو اس کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ سو وہ اس لیے وہاں سے بھاگا تھا۔

"میں ایک کال گرل تھی۔ جس سے ان کے بیٹے نے شادی کی تھی۔" لیلیٰ بغیر پلکیں جھپکے بے خوف لہجے میں بولی تھی۔ عدیل اس کی بات پر بے اختیار چونکا۔ وقار نے جیسے بے بسی سے سر جھکا لیا تھا۔

"مگر میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ ان کے بیٹے سے شادی کے بعد اور اس سے بھی ایک سال پہلے میں یہ سب کچھ چھوڑ چکی تھی۔" وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

"مجھے اس دلدل سے نکالنے والا فہد تھا اور میں نے اس کی خاطر ہر گناہ کو چھوڑ کر پاکیزہ زندگی شروع کی تھی جو فہد کے ماں باپ کو گوارا نہیں تھی۔ یہ پہلے دن سے چاہتے ہیں کہ فہد مجھے چھوڑ دے اور یہ اپنی پسند سے خاندانی بہو..."

وہ کہتے کہتے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔

"اللہ معاف کر دیتا ہے' انسان معاف نہیں کرتا۔ اس کے آگے صدق دل سے تین بار کہہ دو کہ اللہ میں نے توبہ کی تو وہ سارے گناہ بخش دیتا ہے' مگر انسانوں کے سامنے آپ صدیوں تک ناک رگڑتے رہیں معافیاں مانگتے رہیں۔ انسان معاف نہیں کرتے۔" وہ بھاری آواز میں بولی۔

"میں نے ان دونوں کو راضی کرنے کے لیے ہر وہ کام کیا جو کوئی بھی خاندانی بہو' بیوی کر سکتی ہے۔ میں گھر کی چار دیواری میں قید ہو گئی۔ میں نے حجاب لینا شروع کر دیا۔ میں نے ان کو خوش کرنے کے لیے کیا نہیں کیا مگر انہوں نے ان چھ سالوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی دل سے قبول نہیں کیا۔"

"تو پھر تم میرے بیٹے کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟" وقار نفرت سے بولا۔

"پیچھا میں نہیں کر رہی اگر آپ کہتے ہیں تو میں ابھی آپ کے بیٹے کی زندگی سے نکل جاتی ہوں' آپ اس سے کہیں وہ مجھے ابھی طلاق دے دے یہاں سب کے بیچ میں' لیکن اس سے پہلے میں ان سارے لوگوں کو اپنی حقیقت ضرور بتاؤں گی۔"

وہ وقار کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی جس میں کھلا چیلنج تھا۔

☼ ☼ ☼

"ممّا! یہ کیا ڈراما ہے؟" وردہ کے لیے یہ سب کچھ بہت عجیب تھا عجیب تو عاصمہ کے لیے بھی بہت تھا بلکہ بہت غیر متوقع بھی!

اگرچہ وہ واثق کے جذبات سے مثال کی محبت کی شدت سے واقف تھی لیکن ایسا تو اس نے بھی کبھی نہیں

سوچا تھا۔ کبھی نہیں چاہا تھا۔

سب سے بڑھ کر وہ خود بیٹیوں والی تھی اور اس وقت جو سچویشن تھی اس نے اسے بہت دل گرفتہ اور بہت خوف زدہ سا کر دیا تھا۔

مثال پر اس وقت کیا گزر رہی ہو گی اور اس کے ماں باپ پر۔۔۔ اسٹیج پر اب کیا ہو رہا تھا' کسی کے لیے بھی دلچسپی کا باعث نہیں رہا تھا۔

وقار' عدیل سے بات کرنے گیا تھا تو فائزہ کو کچھ امید تھی کہ شاید بات بن جائے۔ وہ فہد کو لیے ایک طرف مضطرب سی کھڑی تھی۔

بظاہر پُر اعتماد لیکن کسی سے بھی نظریں ملانے سے گریزاں۔ اس وقت لیلیٰ نے عین وقت پر آکر جس طرح انٹری دی تھی ان کا خاندانی کردار ہی مشکوک ہو کر رہ گیا تھا۔

"ممّا! اب کیا ہو گا۔" وردہ پھر اس کے کانوں میں منمنائی۔

"واثق کہاں ہے؟" عاصمہ کو بہت دیر بعد خیال آیا تھا۔

"پتا نہیں۔ شاید چلے گئے ہوں گھر۔ وہ پہلے ہی کب آنا چاہ رہے تھے ہمارے ساتھ۔" وردہ کچھ برا سا منہ بنا کر بولی۔ سو وردہ واثق سے کچھ کچھ بجھی رہنے لگی تھی۔

عاصمہ سب دیکھ رہی تھی مگر خاموش تھی۔ سو پری کی فطرت کو تو سمجھ گئی تھی لیکن چاہتی تھی کہ وردہ پری کو خود سمجھے' اگر عاصمہ بار بار اسے ٹوکتی منع کرتی تو وہ شاید ضد میں آکر پری کے ساتھ کچھ اور بھی جذباتی تعلق جوڑ لیتی۔

"ممّا! یہی ہے وہ لڑکی جو اس دولہا میاں کی پہلی بیوی ہے ویسے دیکھیں تو لوگ ہوتے کیا ہیں اصل میں اور لگتے کیا ہیں۔ دونوں ہی اس طرح کے نہیں لگ رہے چیٹر۔"

لیلیٰ اب دونوں کے پاس سے گزری تھی جب وردہ اسے کن اکھیوں سے دیکھ کر منہ میں بڑبڑائی تھی۔

"کسی کے بھی بارے میں کچھ بھی بہت یقین سے کہنا ممکن نہیں ہوتا وردہ۔" عاصمہ اسے نرمی سے کہہ گئی۔

"پلیز ممّا! ہر جگہ لیکچر تو اچھی بات نہیں ہے۔ اچھا۔ اب یہ لوگ کیا کریں گے؟"

وہ کچھ دلچسپی سے پوچھنے لگی جیسے یہاں کوئی فلم چل رہی ہو۔ عاصمہ کچھ سخت بولتے بولتے رہ گئی۔

"آج کل کے بچوں کو براہ راست نصیحت کرنے کا کچھ بھی فائدہ نہیں۔" وہ سوچ کر خاموش ہو رہی۔

"پتا نہیں بیٹا! یہ معاملہ اب کس طرح سیٹل ہو گا۔ مشکل تو بہر حال بہت کڑی ہے' خاص طور پر اس بچی اور اس کے پیرنٹس کے لیے۔" عاصمہ دکھ سے بولی۔

"میں پری کو دیکھتی ہوں۔ کہاں ہے' اسی سے آگے کی سچویشن کا کچھ پتا چلے گا۔"

وردہ کچھ چٹخارہ سا لے کر بولی۔ اس کی نظریں مسلسل فہد' فائزہ اور لیلیٰ پر جمی تھیں۔ ایسا ہی حال وہاں موجود لوگوں کا بھی تھا۔ سب ہی کو آگے ہونے والی سچویشن کا جیسے انتظار تھا۔

بلکہ کچھ لوگ تو آہستہ آہستہ وہاں سے جانے لگے تھے۔ کیونکہ گھر کے لوگوں میں سے اب وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

"واثق کا پتا کرو' کہاں ہے وہ۔" عاصمہ کچھ بے چینی سے بولی۔

"آپ فون کرلیں میں ذرا پری کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔" وہ ان سنی کر کے چلی گئی۔ عاصمہ واثق کا نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ بیچ پیچ کرکے کلائیوں میں پڑے گجروں کو ادھیڑتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔
آنکھوں میں سجا گہرا کاجل اسی طرح تھا ذرا بھی آنکھوں کے کناروں سے باہر نہیں پھیلا تھا۔
وہ شاید اپنے ساتھ ہونے والی اس خوفناک ٹریجڈی پر ذرا سی بھی نہیں روئی تھی۔
بلکہ اس کی تو آنکھیں بھی نم نہیں ہوئی تھیں۔
اور شاید یہ اس کی زندگی کا واحد حادثہ تھا جس کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے اتنا قریبی تھا اور اس کی آنکھیں خشک تھیں۔
"میں نے ایسا نہیں سوچا تھا اور شاید چاہا بھی نہیں تھا بلکہ میں تو دل سے یہ سب کچھ قبول کرچکی تھی۔ پاپا کی خوشی کے لیے ان کی رضامندی کے لیے پھر ایسا کیوں ہوا۔"
بہت دیر بعد کچھ خیال آنے پر اس نے دکھ سے سوچتے ہوئے رونا چاہا مگر آنکھیں ہنوز خشک تھیں۔
"پاپا کتنے پریشان ہوں گے۔ مجھے ان کے پاس جانا چاہیے۔ انہیں تسلی دینا چاہیے' ان سے بات کرنا چاہیے۔" اسے ایک دم سے خیال آیا تو وہ کھڑی ہوگئی۔
اس کا زرتار دوپٹہ کرسی کے کنارے سے الجھا تھا۔
"اوہو! مجھے اس کو تو اتار دینا چاہیے۔" وہ جھلا کر دوپٹے میں لگی پنوں کو تلاش کرنے لگی۔
"ٹھہر جاؤ' مت اتارو ابھی اس کو۔" عفت اندر آتے ہوئے کچھ عجیب سے لہجے میں بولی۔
مثال کے ہاتھ وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔
عفت اس کے قریب آکر اسے یوں غور سے دیکھنے لگی جیسے اس نے پہلی بار مثال کو دیکھا ہو۔
"جاتے جاتے بھی مجھے لگتا ہے تم ہمارے لیے کوئی بہت بڑی پہاڑ سی مصیبت کھڑی کرکے ہی جاؤ گی۔" وہ کچھ دیر بعد جب زہرخند لہجے میں بولی تو مثال کے اندر دھڑام سے کچھ ٹوٹا تھا۔
اور وہ جو اتنی دیر سے ساروں کے بیچ تماشائی تھی اور اسے کسی بھی بات پر رونا نہیں آرہا تھا۔ عفت کی اس بات پر اس کا جی چاہا' وہ یہیں زمین پر دوزانو بیٹھ جائے اور دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ ضبط سے صرف ہونٹ کچل کر رہ گئی۔
"یہ کوئی چھوٹی اور معمولی بات نہیں ہے۔" عفت پھر سے بڑبڑائی تھی اس کی آنکھوں میں سخت بیزاری تھی۔
"ایک بار تمہاری بارات یہاں سے خالی چلی گئی تو پھر دوسرا رشتہ اتنی آسانی سے کہاں آئے گا اور اس بات کی پروا نہ تو تمہارے باپ کو ہوگی اور نہ تمہیں۔"
وہ یوں جلے کٹے لہجے میں بول رہی تھی جیسے اس ساری سچویشن کی ذمہ دار مثال ہی ہو۔
"آپ عفت ماما! آپ کیا چاہتی ہیں۔ کیا ہونا چاہیے' مجھے کیا کرنا چاہیے پھر کہ آپ سب کے لیے میں کسی طرح کی مصیبت کھڑی نہ کروں۔" ہمت ٹوٹ ٹوٹ کر اس نے یہ جملے ادا کیے تھے۔
اس کے دل کو عجیب سا گمان تھا کہ شاید جواب میں عفت اسے بے اختیار گلے سے لگالے گی۔
آج شام میں بھی جب وہ پارلر سے تیار ہوئی تھی تو عفت اسے لینے آئی تھی تب بے اختیار اس کا دل چاہا' وہ اسے پیار کرتے ہوئے گلے سے لگائے' دنیاداری کو سہی۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔
بلکہ جب ابھی لمبے پری تیار ہو کر آئی تو عفت نے بے اختیار اسے گلے سے لگا کر بہت سارا پیار کیا تھا اور پری کو ڈھیروں ڈھیر دعائیں دی تھیں وہ ساری دعائیں جن کی ان لمحوں میں مثال کو شدت سے طلب تھی۔

صرف اس لمحے اس کی آنکھیں بھیگی تھیں اور اسے بشریٰ کی یاد ٹوٹ کر آئی تھی۔

"مجھ سے پوچھو گی یہ تم؟" وہ کچھ طنز سے جتانے والے انداز میں بولی۔ مثال کچھ بول ہی نہیں سکی بس بے بسی سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر پرچانے والے انداز میں عفت بولی تھی۔

"میرا بس چلے تو اب جیسا بھی ہے۔ بھئی کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ کون سے کنگلے ہیں۔ دو بیویاں آرام سے افورڈ کر سکتا ہے فہد' ایک امریکہ میں رکھے' ایک یہاں اماں باوا کے پاس تو کچھ برائی نہیں۔"

او مثال سکتے کے عالم میں عفت کو دیکھتی رہ گئی۔

اور اسے عفت کی بات میں ہی اپنے بہت سارے سوالوں کا جواب بھی مل گیا کہ فہد اس روز ڈنر کے دوران اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

وہ وہاں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ خوش تھا۔

مثال سے یہاں شادی کرنے کا مقصد صرف ماں باپ کے پاس کسی کی موجودگی کے لیے تھا کہ وہاں اسے یہ فکر نہیں ہو کہ فائزہ اور وقار اکیلے ہیں۔

کس خوب صورتی سے اس سارے کھیل کو سجایا گیا تھا عدیل اور مثال کتنے آرام سے اس جال میں آ گئے تھے۔ عدیل ان کی محبت اور دولت دیکھ کر اور مثال باپ کی خوشی اور رضامندی کے لیے!

"خیر۔ ابھی تم یہ بناؤ سنگھار رہنے دو' اسی طرح۔ زیادہ عجلت پسندی کی ضرورت نہیں کہ کپڑے وپڑے بدلنے بیٹھ جاؤ۔ ابھی باہر بات چیت چل رہی ہے' کچھ بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ تم یہاں بیٹھ کر سکون سے انتظار کرو میں ذرا باہر کے حالات دیکھوں جا کر۔" وہ اسے سکون سے بیٹھنے کا مشورہ دے کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

"کچھ بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔" مثال کا دل بے اختیار دھڑکا تھا اگر پاپا صرف بارات واپس لوٹ جانے کے خوف میں آ کر مجھے فہد کو سونپنے کا فیصلہ کر بیٹھے تو۔"

اسے لگا' اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اس کا سیل فون مترنم گھنٹی سے بجنے لگا۔

بشریٰ کی کال تھی۔

وہ بے بسی سے فون کو دیکھتی رہی۔

اگر میں ماما کو یہ سب بتا دوں گی تو خدا جانے ان کا وہاں کیا حال ہو گا۔ وہ مجھ سے کتنی ہی بے زار سہی' لیکن یہ بات انہیں بہت ڈسٹرب کرے گی۔

"اور اسے چھپایا بھی نہیں جا سکتا۔" وہ کال ریسیو کرنے لگی۔

"کچھ بھی "فیصلہ" ہو سکتا ہے۔" عفت کی بات کی بازگشت اسے ٹھٹکا گئی۔

"نہیں۔ مجھے ابھی ماما سے بات نہیں کرنی' میں نہ چاہتے ہوئے بھی پھر ایک بار ان دونوں کا امتحان بن گئی ہوں۔"

اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

اسے لگا یہ گھڑیاں تھم گئی ہیں اور کبھی نہیں گزریں گی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں کے کنارے نم ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو تم واثق؟" بہت دیر میں واثق نے عاصمہ کی کال ریسیو کی تھی۔

وہ تین چار بار اسے فون کر چکی تھی۔ وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔

"آپ گھر آ گئی ہیں؟" اس کی آواز میں زمانوں کی تھکن تھی۔ عاصمہ چونک گئی۔

"تم ٹھیک ہو ناں واثق۔ کہاں ہو اس وقت؟" وہ پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں' آپ پریشان نہیں ہوں۔" وہ اپنی تھکی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولا۔

"تم مجھے بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہے ہو۔ تم فوراً" یہاں آ جاؤ۔ ابھی اس وقت۔" وہ لوگوں کے رش سے ذرا ہٹ کر اکیلے گوشے میں کھڑی واثق سے بات کر رہی تھی۔ معاملہ ابھی تک یہاں جوں کا توں تھا۔

"آ جاتا ہوں میں تھوڑی دیر میں۔"

وہ گہرا سانس لے کر دھیمی آواز میں بولا۔

"واثق! یہاں بہت بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔"

عاصمہ کچھ سوچ کر پریشان لہجے میں بولی تو واثق ایک دم سے چونک گیا۔

"کیا ہوا امی! آپ ٹھیک ہیں۔" "ورنہ تو ٹھیک ہے نا!وہ بے چینی سے بولا۔

"ہم دونوں ٹھیک ہیں بالکل مگر یہاں مثال کے گھر میں۔۔۔ ابھی یہیں ہوں میں' یہاں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے میں چاہتی ہوں۔ تم یہاں آ جاؤ۔" وہ رک رک کر مبہم لہجے میں بولی۔ تو واثق لحہ بھر کو ٹھٹک گیا۔

"مثال کو کیا ہوا۔ وہ ٹھیک ہے؟ امی پلیز بتائیں مجھے کیا ہوا ہے؟" اس کے لہجے کا اضطراب عاصمہ کو بھی تڑپا گیا۔

"فون پر بتانے والی بات نہیں ہے۔ واثق! میں یہاں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ تم جلدی سے آ جاؤ۔ تم آ رہے ہو نا پھر؟" اس نے تصدیق چاہنے کے لیے دوبارہ پوچھا۔

"آتا ہوں امی! کچھ دیر میں۔" اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا ہو گا وہاں ایسا جو امی مجھے فون پر نہیں بتا رہیں۔" وہ وہیں اس رش والی سڑک کے کنارے بیٹھا سوچتا رہا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کا زور بھی کم ہو چکا تھا۔

واثق کو ابھی یہ اندازہ لگانا تھا کہ وہ اندھا دھند چلتے ہوئے گھر سے کتنی دور آ چکا ہے۔

اور جب اندازہ ہوا تو وہ ٹیکسی کو رکنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے' عدیل سر کے ساتھ کچھ مسئلہ ہو گیا ہو' ان کی طبیعت نہ ٹھیک ہو۔" آخری بات جو اس کے خیال میں ہو سکتی تھی' اس نے یہی سوچی۔

"مثال رخصت ہو کر جا چکی ہو گی۔" دوسرا بہت تکلیف دہ خیال جو اس کے دل میں کسی تیر کی طرح پیوست ہوا تھا' اسے آیا تو اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسے پھر سے اپنی زندگی کی بے مقصدیت اور خالی پن بے قرار کرنے لگا تھا جبکہ اسے معلوم تھا' اس بے قراری کا علاج اب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے عفت؟" عفت کی توقع کے عین مطابق عدیل بھڑک اٹھا تھا اس کی بات سن کر۔

عفت کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جیسے اس نے بہت معمولی بات کی ہو۔

"تو آپ کیا چاہتے ہیں۔ جب یہ بارات خالی لوٹ جائے گی۔ اس کے بعد ہم سب کے دماغ درست رہیں گے۔ یہ دنیا جینے دے گی ہمیں۔ اس لڑکی کا جب بھی جہاں بھی دوسرا رشتہ ہونے لگے گا' گیا وہ لوگ وجہ نہیں پوچھیں گے

اور جب وجہ بتائی جائے گی تو کیا وہ یقین کرلیں گے کہ سچ یہی ہے 'ہماری لڑکی بے قصور ہے۔"

وہ بہت کچھ جتادینے والے انداز میں عدیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے خوف لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"تو کیا چاہتی ہو تم میں اپنی مثال کو ان دھوکے باز لوگوں کے حوالے کردوں جنہوں نے ایسا گھٹیا پن دکھایا۔ ان کے ارادے اصل میں کیا تھے میں بھی نہ جان سکا۔" عدیل تنفر سے کہہ کر رہ گیا۔

"اسے گھر میں بٹھائیں گے تو اس بات کا اثر ہماری پری کی زندگی پر کتنا برا پڑے گا۔ سوچی ہے آپ نے یہ بات؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔ عدیل لمحے بھر کو کچھ بول نہیں سکا۔

اس نے یہ بات تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچی تھی اور حقیقت میں وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

اس وقت تو مثال کی زندگی کے ساتھ جو کچھ ہونے جارہا تھا 'اس بات نے اسے بری طرح سے توڑ دیا تھا۔

"نہیں سوچی ہوگی۔ میں شرط لگا کر کہہ سکتی ہوں 'آپ نے ایک لمحے کے لیے بھی پری کے بارے میں یہ نہیں سوچا ہوگا کہ میری معصوم بیٹی اس گناہ کی سزا جھیلے گی جو اس نے کیا بھی نہیں۔"

وہ آخر میں لہجہ گلوگیر بناتے ہوئے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کے کنارے صاف کرنے لگی۔

"تم پلیز 'یہ فضول کا جذباتی پن نہیں دکھاؤ۔ میرا ایمان ہے ہر بچے کا اپنا نصیب 'اپنی قسمت ہوتی ہے۔ جب پری کا وقت آئے گا تو اس کے لیے یقیناً "بہت اچھا رشتہ مل جائے گا۔" عدیل بظاہر اسے جھاڑ کر آخر میں تسلی دینے کو بولا۔

"پری کا وقت جب بھی آئے گا 'مثال کا گڑا مردہ ضرور اکھاڑا جائے گا۔ لکھ کر رکھ لیں آپ میری بات۔" وہ تیز لہجے میں زور دے کر بولی۔

"صاف کیوں نہیں کہتے۔ آپ کو نہ پری کی کچھ پروا ہے نہ میری نہ دانی کی۔ آپ کی زندگی کی واحد خوشی 'واحد ترجیح مثال اور اس کی خوشیاں ہیں۔" وہ آج عمر بھر کے حساب چکانے کے موڈ میں تھی۔

"اور آپ جانتے ہیں 'آپ کی لاڈلی کے نصیب میں یہ مصیبتیں ایک کے بعد ایک کیوں آرہی ہیں۔ سگی ماں کیسے مکھن سے بال کی طرح نکال کر یہاں ڈال گئی۔ اس کی شادی تک میں آنے کی اس نے زحمت نہیں کی اور آپ نے اس کے لیے اپنی طرف سے بہترین رشتہ تلاش کیا اور نتیجہ کیا نکلا... سب کے سامنے ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے عدیل صاحب کہ آپ نے میرا اور میرے بچوں کا حق مار کر اس لڑکی کو دینا چاہا اور خدا تو انصاف کرنے والا ہے 'اس نے آپ کو آپ کی نیت کا بدلہ دے دیا۔"

وہ غصے میں کانپتی جوش بھری آواز میں کہتی چلی جارہی تھی 'عدیل نے عفت کا یہ رویہ نہیں دیکھا تھا۔

"تم اس وقت اپنی فضول راگنی بند کرو ناشکری عورت! میں نے ہمیشہ تمہارا اور اپنے بچوں کا سب سے بڑھ کر خیال رکھا ہے اور اصل بات یہ ہے کہ تم مثال کو برداشت کرہی نہیں سکتیں۔ اور آج یہ سب کچھ پتا ہے کیوں ہوا ہے 'تمہاری بد نظری کی وجہ سے۔" وہ دوبدو لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"عدیل!" عفت پھٹ کر بولی۔

"چلاؤ مت۔ جس دن سے یہ رشتہ ہوا تھا کہ پیر جلی بلی کی طرح ادھر اُدھر پھرتی تھیں۔ تمہاری کالی نظریں میری بیٹی کے نصیب کو کھا گئیں۔ سن سکتی ہو یہ سب۔ تم سمجھتی ہو صرف تم دوسروں کی نیت کو جانچ سکتی ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے 'دوسرے تمہاری بدنیتی کو نہیں سمجھ سکتے؟ آج تم نے اپنی اصلیت بتا کر تمہاری جو رہی سہی عزت تھی میری نظروں میں 'وہ بھی ختم کردی۔ تم مثال سے نفرت میں اتنی آگے نکل گئی ہو کہ چاہتی ہو میں ان دھوکے باز لوگوں کے حوالے اپنی بیٹی کردوں تو سن لو تمہاری یہ مکروہ خواہش۔ کبھی بھی پوری نہیں ہوسکتی کیونکہ میں کسی بھی طرح اپنی بیٹی کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ تم چاہے جلو 'چاہے مرو۔"

عدیل کے لہجے میں اتنی نفرت 'اتنی حقارت تھی کہ لمحہ بھر کو عفت گنگ ہو کر رہ گئی۔

یہ تو اسے معلوم تھا 'وہ عدیل کے دل کے بہت قریب کبھی بھی نہیں رہی لیکن اتنی دور ہو گی اس کے دل سے 'یہ بھی اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"تو پھر سینے سے لگا کر رکھیں اپنی بیٹی کو 'مت بیاہیں۔ میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر جارہی ہوں۔ کیا کمایا میں نے ان اٹھارہ سالوں میں۔ یہ ذلت 'یہ نفرت 'یہ بے عزتی۔ مجھے کسی بھی موقع پر اپنی بات کہنے کا کوئی حق نہیں۔ جب مجھے آپ کی نظروں میں 'آپ کے دل میں جگہ نہیں مل سکی۔ اتنے سالوں کی محنت کے بعد بھی 'تو اس گھر میں رہ کر میں کیا کروں گی۔ جارہی ہوں میں ابھی یہاں سے۔ لے کر بیٹھے رہیں اپنی مثال کو ہمیشہ کے لیے۔" عفت کے لہجے میں شدید غصہ اور طیش تھا "اس کی ماں طلاق لے کر چلی گئی۔ اس کی بارات واپس چلی گئی تو پھر میں دیکھتی ہوں 'اس کو کون بیاہنے آئے گا۔"

اور یہ تو عدیل کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔ مثال کا معاملہ نپٹاتے نپٹاتے اس کا پورا گھر ہی لپیٹ میں آجائے گا۔ یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

"عفت! رکو بات سنو میری۔" جب تک وہ چویشن کی سنگینی کو سمجھتا عفت وہاں سے جاچکی تھی۔

عدیل کا اس وقت اس کے پیچھے جانا فضول تھا۔

"آخری بار عدیل! میں چاہتا ہوں 'آخری بار ٹھنڈے دل سے تم میری اور فائزہ کی بات سن لو۔ اس کے بعد جو تم فیصلہ کرو گے 'ہمیں منظور ہوگا ہم فہد کو لے کر یہاں سے چلے جائیں گے بارات کے ساتھ۔"

اس سے پہلے عدیل عفت کے پیچھے جاتا 'فائزہ اور وقار اندر آگئے اور گہری سنجیدگی کے ساتھ وقار نے اس سے کہا تھا۔

"صرف ایک بار عدیل بھائی! ہمیں موقع دے دیں بات کرنے کا جبکہ ہمارا ارادہ خدانخواستہ بالکل بھی آپ کو دھوکا دینے کا نہیں تھا۔" فائزہ نے آگے بڑھ کر بے اختیار اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ بس دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"جی!" مثال لمحہ بھر کو کچھ بول ہی نہیں سکی۔

"بیٹا! میں واثق کی مدر ہوں۔ جانتی ہو نا واثق کو تو تم؟" عاصمہ بہت میٹھی سی مسکان چہرے پر لیے اس کے پاس بیٹھی اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

مثال بے ساختہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔

"یہ سب جو کچھ ابھی ہوا نہ میرے بیٹے نے ایسا چاہا تھا نہ میں نے خدانخواستہ ایسی کوئی بات سوچی تھی 'لیکن پتا نہیں کیوں اس وقت سے مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے شاید قدرت کی یہی مرضی ہے کہ تم کہیں بھی نہیں جاؤ۔ ہم سے دور۔"

وہ پیار سے اس کی ٹھوڑی ذرا سی اونچی کرتے ہوئے بولی تو مثال بس اس کے صبیح متانت بھرے چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ بہت نازک لمحے ہیں مثال بیٹا! جس میں تمہاری قسمت کا فیصلہ ہونے جارہا ہے۔ مجھے اس وقت تمہارے پاس جو آنا پڑا 'اس کی وجہ سے 'تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں مثال! مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" عاصمہ بولی تو مثال کچھ پریشان سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور رہ گئی دوستی' اعتبار اور اعتماد کی بات تو وہ سب ختم ہو چکا جس کے بھروسے پر میں یقین کر سکتا تھی تمہارا۔" عدیل کھردرے لہجے میں دو ٹوک الفاظ میں بولا۔

"عدیل بھائی! ہم حلف اٹھانے کو تیار ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اور صرف مثال کو نہ صرف اپنی بیٹی بنا کر اپنے پاس رکھنے کا تھا بلکہ اس لیلیٰ۔ آپ نہیں جانتے یہ بد خصلت لڑکی کس طرح ہمارے بیٹے کو ہم سے چھین رہی ہے۔"

قائزہ چہرے پر مظلومیت لیے کہہ رہی تھی۔

"جان چکا ہوں میں سب کچھ' اس لڑکی کی حقیقت بھی اور آپ لوگوں کو بھی۔" عدیل طنز سے بولا۔

قائزہ اور وقار ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

"اگر فہد لیلیٰ کو طلاق دے دے تو بھی آپ انکار کریں گے؟" قائزہ پھر سے بولی۔

"استغفراللہ پڑھیں ہم لوگوں نے طلاق جو ہمارے اللہ نے بڑی حالت جبر میں دینے کی اجازت دی ہے' اس کو کھیل تماشا بنا لیا ہے جبکہ آپ جانتی ہیں' آپ کا بیٹا ایک بچی کا باپ ہے پھر بھی آپ اتنی سنگ دلی سے یہ بات کہہ رہی ہیں۔" عدیل تڑپ کر بولا تھا۔

"اس لیے تو چاہتے ہیں کہ ہمارے بیٹے کا خون ہماری پوتی ہمارے پاس رہے۔ وہ لیلیٰ اس کی کس طرح پرورش کرے گی۔ ہم جانتے ہیں۔"

"بخدا انکل! یقین کریں نہ ماما' پاپا کا مقصد آپ کو دھوکا دینا تھا نہ میرا۔ ہم صرف مناسب وقت..."

"بس بات ختم ہو چکی ہے۔ بہتر ہے۔ اس کو یہیں ختم کر دیا جائے۔" عدیل سخت بیزاری سے بولا۔

"جبکہ ہم تمہیں ہر طرح کی گارنٹی دینے کو تیار ہیں۔ مثال کے نام گھر ہو گا۔ اس کے نام پر ہر وہ چیز ہو گی جس کے فہد اور ہم مالک ہیں۔" وقار آخری کوشش کے طور پر بولا۔

"اور یہ سب ہم نکاح سے پہلے لکھ کر دیں گے۔ فہد مثال کے ساتھ یہیں رہے گا پاکستان میں۔" قائزہ ملتجی لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ یہ ممکن نہیں۔" عدیل خشک لہجے میں کہہ کر باہر نکل گیا۔ تینوں گم صم سے کھڑے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼
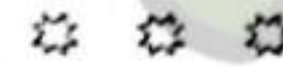
"مما! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" پری شاکڈ سی رہ گئی۔ عفت نے عجلت میں اپنے' دائی کے اور اس کے کچھ کپڑے' زیور اور کچھ نقدی ایک بیگ میں رکھ لی تھی اور اب پری کو ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔

"ہم اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکیں گے۔" عفت کو ایسے برہم مزاج میں پری نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"ہم کہاں جائیں گے مما؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" وہ پریشانی سے بندھے بیگ کو دیکھ رہی تھی۔

"جہنم میں جائیں گے۔ سن لیا تم نے۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ کیا ہم تینوں کو کہیں جگہ نہیں ملے گی؟" عفت زور سے آنکھیں رگڑ کر بولی۔ اسے اپنی بے وقعتی پر رونا آرہا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ کیا پاپا سے لڑائی ہوئی ہے؟" پری ہراساں لہجے میں پوچھنے لگی۔

"بکواس بند کرو اپنی اور دائی کو بلاؤ' وہ ٹیکسی لے کر آئے' ہمیں ابھی یہاں سے جانا ہے۔" عفت شدید جذباتی پن سے بولی۔

"اس وقت مما! اتنی رات کو؟" پری شاکڈ تھی۔ اور اندر آتا عدیل وہیں رک گیا۔

پھر تھکے ہوئے انداز میں اندر آگیا۔

"عفت! بات کو بڑھاؤ نہیں۔" وہ نڈھال سا بولا۔

"میں بات ختم کر رہی ہوں ہر طرح سے' آپ کو آج کے بعد آزادی ہو گی' آپ اپنی مرضی کے فیصلے اپنی لاڈلی کے لیے کریں۔ کوئی بھی آپ کی بیٹی کے شاندار نصیبوں کو بری نظر سے دیکھنے والا نہیں ہو گا اس گھر میں۔" وہ تیز لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"عفت! میں بہت پریشان ہوں۔ اس وقت مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"چلو پری!" عفت ایک ہاتھ سے بیگ' دوسرے سے پری کو گھسیٹتے ہوئے بولی۔

"آؤ میرے ساتھ۔" عدیل نے زور سے عفت کا ہاتھ کھینچا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

"مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ کہیں بھی۔" وہ بول رہی تھی جب وہ اسے لے کر قائزہ' وقار اور فہد کے پاس آ گیا۔ اسی وقت عاصمہ اور واثق وہاں آئے تھے۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وقار! نکاح ابھی ہو گا فہد اور مثال کا اور اس کے لیے وہ ساری شرطیں لکھی جائیں گی جس میں مثال کے نام گھر پراپرٹی اور دوسری چیزیں ہوں گی۔ میں نکاح خواں کو کال کر رہا ہوں۔ آپ اپنے وکیل کو بلا لیں تاکہ سارے معاملات طے ہو جائیں۔"

وقار قائزہ اور فہد بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے جبکہ پیچھے کھڑے واثق اور عاصمہ سکتہ میں کھڑے رہ گئے۔ اندر آتی لیلیٰ نے بے اختیار اپنی بیٹی کو گود میں اٹھاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

عفت نے فتح مند نظروں سے عدیل کو دیکھا جو ابھی بھی اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔

"اللہ اس طرح بھی انصاف کیا کرتا ہے۔ میرے دل کو یقین تھا۔" صرف وہ تھی جو مسکرا رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا یاسمین

اُلٹی تدبیرہ

اف اتنا پیارا میٹرس تمہارا ہے؟" سائرہ نے اورنج میٹرس پر پیلی دھاری دیکھ کر شانزے سے پوچھا۔ کمرے کی کلر اسکیم کے ہمراہ یہ میٹرس انتہائی پیارا لگ رہا تھا۔ شانزے کا رنگ ہی اڑ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کے بعد کیا ہوگا۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

"میں مما سے کہہ کر یہ والا میٹرس لے لوں گی۔ تم ایسا کرو میرا والا لے لو۔" کاسنی پھولوں پر سفیدی کے چھینٹے اسے سائرہ کا میٹرس پسند نہیں تھا' پر سائرہ کا دل اب اس کے میٹرس پر آچکا تھا۔

مما۔ مما۔" وہ وہیں سے چلاتی ہوئی مما کے کمرے کی طرف بھاگی۔ "مجھے شانزے والا میٹرس چاہیے۔"

"کیوں؟ تمہارے والے میٹرس کو کیا مسئلہ ہے؟ تم نے اپنی مرضی سے لیا تھا۔" وہ حیران ہوئی۔

"لیکن مما؟ میں شانزے والا لینا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"سائرہ! یہ فضول بات ہے۔ تم شانزے والا میٹرس نہیں لوگی۔ بلکہ جو تم نے پسند کیا ہے وہ والا ہی لوگی۔"

اور یہیں سے بات بڑھ گئی۔ رات تک اس نے رو رو کر برا حال کرلیا۔ پاپا کے حضور پیشی ہوئی۔ انہوں نے سائرہ کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ فرحین وہیں سے اکھڑ گئی۔ رات کو کمرے میں جا کر ثاقب سے لڑنے بیٹھ گئی۔

"یہ آپ نے کیا حرکت کی ہے؟ مجھے ذرا اچھا نہیں لگا۔ آپ دونوں بیٹیوں میں تفریق کررہے ہیں۔ یاد رکھیے گا۔ آج کی بڑی تفریق کو سالوں کی جمع شدہ رنجش مٹا نہ پائے گی۔" فرحین کو نگہت سیما کی وہ کہانی یاد آگئی۔ جس میں دو بہنوں کے درمیان اختلاف صرف خوب صورتی کی بنیاد پر پڑ گیا تھا۔ ایک دوسری پر حاوی رہتی۔ خیر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ دونوں جڑواں تھیں۔ دونوں ایک جتنی خوب صورت اور قد کاٹھ کی تھیں۔ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہوجاتا۔ بس یہ پتا چلتا تھا کہ شانزے ذرا نرم مزاج کی بچی تھی' جبکہ سائرہ اکھڑپن میں اپنی مثال آپ تھی۔ ضدی۔ اپنی مرضی کرنے والی۔

فرحین کو سائرہ کا یہ ہی رویہ ہولائے رکھتا۔ پھر ثاقب کی لاپروا فطرت' وہ سائرہ کے بے طرح رونے اور بے جا ضد کرنے پر شانزے کی اکثر چیزیں اس کے حوالے کردیتے۔ شانزے کی آنکھوں میں آنسو تو آجاتے پر وہ چپ کرجاتی۔ فرحین کی ہمدردیاں ماں ہونے کے ناتے شانزے کی طرف ذرا زیادہ بڑھ گئیں۔ حالانکہ سائرہ بھی بیٹی تھی پر باپ کی بے جا طرف داری کے سبب لاشعوری طور پر فرحین' شانزے کو ترجیح دیتی۔ تاکہ توازن قائم رہے' اب وہ اکثر دونوں کو ایک جیسی چیزیں لے کردینے لگی۔ جو چیز سائرہ کے لیے پسند کی جاتی' وہی شانزے کے لیے۔ اس طرح لڑائی جھگڑے کی نوبت ہی نہ آتی۔

ان کی بڑی بہن عروبہ خود ماہر نفسیات تھیں۔ وہ ان سے دونوں بچیوں کی فطرت ڈسکس کرتی رہتی۔ "تم ان دونوں میں کمپیٹیشن (مقابلے) کا رجحان زیادہ سے زیادہ کم کرنے کی کوشش کرو۔" وہ فرحین کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتی رہتیں۔ وہ خود اسلام آباد میں مقیم

تھیں' جبکہ فرحین بہاولنگر سے لاہور شفٹ ہوئی تھی۔ ثاقب کی جاب کی وجہ سے۔

بہاولنگر میں تو اس کی بچیوں کی اس کے محلے میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ مظفر الاسلام کی پوتیاں ہوئی ہیں جڑواں۔ ایک جیسا ناک نقشہ اور خدا کی قدرت دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت۔ اکثر ثاقب اور فرحین بھی مغالطے میں پڑجاتے کہ ان میں سے شانزے کون سی والی ہے اور سائرہ کون سی ہے۔ بہرحال دونوں کے مزاجوں کے فرق نے دونوں کی پہچان کرانے میں آسانی کردی تھی۔ سائرہ شروع سے

ہی پُر اعتماد۔ نڈر۔ ضدی سی طبیعت کی تھی۔ جبکہ شانزے اتنی ہی شرمیلی۔ صبر والی اور جلد بات مان جانے والوں میں تھی۔ دونوں بیٹیوں سے والدین خوش تھے۔

فرحین خود ایم ایس۔ سی اسٹینس تھی۔ اور چاہتی تھی کہ بیٹیاں بھی کسی فیلڈ میں نام کمائیں۔ ان کی تعلیم و تربیت میں گھر کے کاموں کے علاوہ خود بھی گہری دلچسپی لیتی۔ ثاقب ان شوہروں میں سے تھے۔ جو کھلاتے پلاتے۔ عیاشی تو ضرور کروا دیتے۔ پر گھریلو ذمہ داریوں کو سر پر لادنے کے لیے بالکل تیار نہ ہوتے۔ گھر کے بجٹ کو فرحین ہی بناتی تھی۔ بچیوں کے اسکول کے متعلق فیصلہ فرحین کر رہی ہے۔ فرحین کو اپنی بچیوں کے رجحان کا پتہ ہے۔ کون کس میں دلچسپی دکھا رہی ہے۔ صرف ثاقب کو لاڈ کرنے آتے تھے یا بوقت ضرورت پیسے فرحین کے ہاتھ میں رکھنے آتے تھے۔ شکر تھا پیسوں کے معاملے میں وہ کنجوس نہ تھے۔

اس دن ناشتے میں پہلی دفعہ شانزے نے بریڈ پر شہد اور چاکلیٹ لگانے کی فرمائش کی۔ فرحین نے شانزے کے بریڈ بنا کر اسے پکڑائے۔ سائرہ کے لیے توس تلنے شروع ہو گئی۔ واپس آئی تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ شانزے چپ بیٹھی منہ بسور رہی تھی جبکہ شانزے کے بریڈ سائرہ کھا رہی تھی۔ سائرہ کو شہد سخت ناپسند تھا' مگر آج پتا نہیں وہ کیوں کھائے چلے جا رہی تھی۔

فرحین کو اس کی حرکت پر بے حد غصہ آیا اور وہ اب سارا لحاظ بالائے طاق رکھ کر سائرہ کو ڈانٹنے لگی۔ حتیٰ کہ دونوں بچیوں پر اس نے کبھی ہاتھ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ پر آج سائرہ کو دو تھپڑ بھی جڑ دیئے۔ نتیجتاً" وہ اسکول وین تک جاتے جاتے بھی ہچکیاں بھر رہی تھی۔ بعد میں ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے فرحین کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ سائرہ کی ضد اسے پریشان کر دیتی پر اب اسے تھپڑ لگا کر خود اپنے دل کو کچھ ہوئے جا رہا تھا۔ کچن کی سلیب پر برتن رکھ کر وہ اپنا موبائل اٹھائے عروبہ کو کال کرنے لگی۔ سارا مسئلہ اس سے بیان کیا۔

"فرحین! تم خوامخواہ اس بات پر اتنا پریشان ہو رہی ہو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نارمل رویہ ہے۔ کوئی غیر معمولی نہیں۔ بعض دفعہ بچے اپنے اندر کے سرکش انسان کو مطمئن کرنے کے لیے دوسروں کی چیزوں کو لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ تمہیں سختی کی نہیں اس وقت صرف پیار کی ضرورت ہے۔ سخت رویے سے تم اس کے ہیکلے پن میں مزید شدت پیدا کرو گی۔ تم پیار سے اسے سمجھاؤ۔ اسے اس چیز کا احساس دلاؤ کہ شانزے ایک الگ لڑکی ہے اور وہ خود ایک الگ لڑکی۔ ہر انسان کی سوچ۔ خواہش۔ انداز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ جو شانزے کا دل چاہتا ہے وہ شانزے کرے۔ اور جو سائرہ کا دل چاہتا ہے وہ سائرہ کرے شانزے کی چیزیں سائرہ نہ لے اور سائرہ کی چیزیں شانزے نہ لے۔ ہاں شیئر ضرور کریں۔ شیئر کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔

اس واقعے کے بعد سے فرحین نے دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ شاید اس میں بھی زیادہ ہاتھ شانزے کی نرم طبیعت کا تھا۔ اب اکثر دونوں اکٹھے کھیلتیں۔ سائرہ اس کی چیزیں لینے کی ضد تو نہ کرتی پر شیئر ضرور کرتی۔ ہاں کبھی کبھی پھر دورہ سا پڑ جاتا اور شانزے کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھ کر فوراً" اسے اپنانے کی کوشش کرتی۔

فرحین کبھی پیار سے تو کبھی ڈانٹ سے سمجھانے کا سلسلہ یونہی جاری و ساری رکھے ہوئے تھی۔ اسی طرح کرتے کراتے دونوں سیکنڈ ایئر میں آگئیں۔ ان کے کزن رمیض کی شادی تھی۔ عروبہ خالہ کے بڑے بیٹے کی۔

فرحین نے جھٹ پٹ دونوں کے لیے ایک جیسی میکسیاں تیار کرائیں۔ دونوں کی ضد پر صرف کلر تبدیل کر دیے گئے۔ شانزے کی میکسی سرخ رنگ کی تھی جبکہ سائرہ کی بلیک۔ دونوں پر وہ رنگ سوٹ بھی بے حد کیے۔ گوری رنگت متناسب سراپے نے دونوں کی خوب شان اٹھائی۔ قد کاٹھ۔ رنگ روپ میں دونوں کے درمیان انیس بیس کا بھی فرق نہ تھا۔

لاہور والی خالہ زاد امامہ آپی نے فرحین سے جھٹ اپنے بیٹے بہزاد کی بات کر لی۔ دونوں بیٹیوں میں سے کوئی ایک اس کی جھولی میں ڈال دے۔ بہزاد نے سی۔ اے کر رکھا تھا۔ اور اسلام آباد میں رمیض سے چھوٹے مغیث نے بھی جھٹ سائرہ کو پسند کر لیا یا شاید سائرہ نے اسے پسند کر لیا تھا۔ بات ایسی بنی کہ عروبہ کو مجبوراً" فرحین سے بات کرنی پڑی۔

"فرحین! مغیث سائرہ سے شادی کی بات کر رہا ہے۔ فنانس میں ایم۔ بی۔ اے کر رہا ہے۔ اظفر اسے باہر بھجوا دیں گے۔ مستقبل بھی شاندار سا ہے۔ بس تم ذرا ہاں کہہ دو۔ اچھا ہے بھانجی کو ہی پسند کیا ہے۔ کسی اور لڑکی کو نہیں۔"

"ہاں۔ آپا مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ بس ثاقب کے کان میں ڈال دوں۔ ویسے بچیوں کے سلسلے میں ہر قسم کا اختیار انہوں نے مجھے ہی دے رکھا ہے۔ لیکن انہیں بتانا بھی ضروری ہے۔ ویسے میں چاہتی ہوں آپ کنفرم کر لیں۔ سائرہ کے لیے کہا ہے یا شانزے کے لیے۔" فرحین نے مسکرا کر کہا۔ عروبہ بھی مسکرا پڑی۔ دونوں میں فرق تو نہ تھا۔ اسی لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ مغیث نے کس کے لیے کہا ہے۔ عروبہ نے مغیث سے کنفرم کروایا۔

"ممّا! کوئی خاص تو مجھے پتا نہیں کہ دونوں میں سائرہ کون سی تھی اور شانزے کونسی تھی۔ ہاں ایک بس میٹھی میٹھی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔" وہ تصور میں سوچتے ہوئے بولا۔

"جبکہ دوسری ذرا چپ چپ سی تھی۔"

"ہوں' اچھا چلو یہ بتاؤ کہ اس نے کس رنگ کی میکسی پہن رکھی تھی۔" عروبہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

"ممّا! اس نے کالے رنگ کی میکسی پہنی ہوئی تھی۔" مغیث کی بات پر عروبہ کا منہ لٹک گیا۔ وہ دل سے شانزے کو چاہتی تھی۔ اس کی پیاری عادتوں کی بنا پر۔ چلو خیر ہے۔ ہے تو سائرہ بھی بھانجی ہی نہ۔ دل کو تسلی دے کر فرحین کو فون پر اطلاع کر دی۔

فرحین تو اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھی۔ دونوں بیٹیوں کے لیے بر مل گئے۔ وہ بچیوں کو جلد بیاہ کر ان کے گھر کا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس کے خیال میں بچیوں کی لیٹ کی جانے والی شادیاں کئی بچیوں میں نفسیاتی مسائل کو پروان چڑھاتی ہیں۔ پھر بچیاں خود سے دوسرے مردوں میں انوالو ہونے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ انٹرنیٹ دور میں وہ خود کافی کچھ دیکھ چکی تھی۔ سو فیصلہ کرنے میں اس نے دیر نہ لگائی۔ ثاقب کو بھی اطلاع کر دی۔ ایک پر سکون سی نیند لے کر وہ اٹھی۔ اپنے لیے چائے بنانے کا ارادہ تھا۔ سو کچن میں چلی آئی۔ بیٹیوں کے اچھے بر مل جائیں تو ماں کے لیے وہ دن عید کا دن ہوتا ہے۔ وہ سرشاری کے عالم میں چائے بنا کر اطمینان سے کاوچ پر بیٹھی چسکیاں لے

سانحہ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفہ سعدیہ عزیز آفریدی کی والدہ محترمہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔

مرحومہ بہت ملنسار' با اخلاق اور محبت کرنے والی ہستی تھیں۔ ایک دو سرسری ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کا گہرا تاثر دل پر نقش ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں' مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

سعدیہ عزیز آفریدی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا ہے۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور دیگر اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

رہی تھی۔ جب شانزے اس کے پاس آئی۔ روئی روئی آنکھیں' متورم سا چہرہ۔

"ممّا! میں مغیث کو پسند کرتی ہوں۔" ایک بم سا پھوڑ کر وہ پھر رونے بیٹھ گئی۔ فرحین کا سارا جوش۔ ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"پر مغیث نے خود اپنے منہ سے سائرہ کے لیے کہا ہے۔"

"ممی! مغیث کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ عین بارات والے دن سائرہ نے ضد باندھ لی کہ وہ سرخ میکسی پہنے گی۔ مجھے مجبوراً" سرخ اس کو دے کر بلیک خود پہننی پڑی۔ میں نے اس لیے ایسے کیا کہ سائرہ وہاں بھی ضد باندھ کر نہ بیٹھ جائے۔ اور جھگڑا طول پکڑے۔ سو میں نے چپ چاپ بلیک میکسی پہن لی۔" بات مکمل کر کے وہ پھر رونے لگی۔ اور فرحین سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

رات کو عروبہ سے فون پر بات کرتے ہوئے اس نے ساری بات بہن کے گوش گزار کی۔ صد شکر عروبہ کو پہلے سے ہی سائرہ کے اس اسپیشل رویے کا پتہ تھا۔ سو اس نے برا منانے کی بجائے معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔

"میں مغیث سے بات کرتی ہوں۔ آئی تھنک اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ تم اطمینان سے شانزے کو مجھے دے دو۔ پرسنلی بھی میری خواہش یہی تھی۔ پر مغیث کے منہ سے سائرہ کا سن کر میں چپ ہی رہ گئی۔ بہرحال وہ بھی میری ہی بھانجی ہے۔" عروبہ کی بات پر فرحین نے اطمینان کا سانس لیا۔

پر یہ اطمینان وہی کا وہی دھرا رہ گیا۔ جب ہمیشہ کی طرح سائرہ نے ضد باندھ لی کہ شادی ہو گی تو بس مغیث سے' ورنہ وہ کسی صورت بھی شادی کے لیے تیار نہ ہو گی۔ اور سونے پہ سہاگہ ہمیشہ اس کی غلط بات پر حمایت کرنے والے ثاقب بھی میدان میں اتر آئے۔ عروبہ خالہ پر اعتراض ہوا کہ کبھی وہ سائرہ کے لیے کہتی ہیں' کبھی شانزے کے لیے۔ اندر کی بات کا انہیں کیا پتہ۔ فرحین کا بی پی ٹینشن سے چڑھا رہتا۔

اس دفعہ ہمیشہ کی طرح شانزے بھی جھک نہیں رہی تھی۔ جہاں سائرہ رو رو کر برا حال کر رہی تھی۔ وہیں شانزے بھی لگی ہوئی تھی۔ اور ثاقب کا غصہ بھی ناک پر دھرا رہتا۔ ان کے خیال میں یہ سب عروبہ خالہ کی غلط فرمائش کے سبب ہوا تھا۔ ایک ہی چھت تلے رہنے کے باوجود یہ بندہ اپنی بیٹیوں سے اتنا بے پروا رہا تھا کہ ان کے مزاج کو سمجھ نہ سکا تھا۔ فرحین نے غصے سے ثاقب کو تو سنالی۔ پر سائرہ کا کیا کرتی۔ وہ جذباتیت کی انتہا پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ خودکشی کی دھمکی تک دے دی۔ اب معاملہ عروبہ کے آگے رکھا گیا۔ وہ فرحین سے بھی زیادہ پریشان ہو گئی۔ بات اظفر اور مغیث تک پہنچی تو انہوں نے ان کو ہی پاگل سمجھا تھا۔ صرف ایک ہی صورت تھی کہ شانزے کو اس پر راضی کیا جاتا کہ اس نے ہی سرخ میکسی پہنی تھی۔

"دیکھو شانزے! تم میری پیاری بیٹی ہو۔ تم میرا مان رکھو۔ پلیز تم بہزاد کے لیے مان جاؤ۔ وہ بھی پیارا بچہ ہے۔ میں کیا کروں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

شانزے کی آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ ماں کو کیسے بتاتی۔ ممّا چیزوں سے تو آسانی سے دستبردار ہوا جا سکتا ہے۔ اپنی محبت سے کیسے ہوا جائے۔ اوائل عمری کی پہلی پہلی نظر کی محبت تھی۔ دل پر مغیث کی چھاپ گہری تھی۔ بھلا وہ کیسے بہزاد کے لیے مان جاتی۔ فرحین کی روز روز کی منتوں سے وہ مان گئی۔ دل کا خون کرنا کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ بے طرح سے بے کلی اور اداسی اس کے وجود پر چھا گئی۔ خیر شادی کا دن بھی قریب آ گیا۔ سائرہ کی کھلکھلاہٹیں عروج پر تھیں۔ بارات کے لہنگے میکے والے ہی تیار کراتے ہیں۔ یہ ان کے ہاں کا رواج ہے۔

فرحین نے سائرہ کے لیے پیچ رنگ اور شانزے کے لیے مرجنڈا رنگ منتخب کیا۔ دونوں کی گوری رنگت پر دونوں رنگ ہی سوٹ کرتے تھے۔ شانزے کے لیے تو کوئی چیز بھی دل کو نہ مہکا رہی تھی۔ سائرہ کا رویّہ شانزے کے لیے بے حد اچھا ہو گیا۔ دونوں کو پارلر تیار ہونے کے لیے بھیج دیا گیا۔ شانزے کا دل پیچ لہنگا پہننے کو چاہنے لگا۔

"سائرہ! میں نے ہمیشہ اپنی خواہش کو پس پشت ڈال کر تمہاری خواہش کا احترام کیا ہے۔ کیا تم آج کے دن مجھے پیچ کلر پہننے دو گی۔ اور تم مرجنڈا پہن لو۔" سائرہ نے کچھ دیر سوچ کر حامی بھرلی۔ ہمیشہ وہ اس کی چیزیں لیتی رہی ہے۔ آج کے دن اپنی ایک چیز دے دے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس نے مرجنڈا اور شانزے نے پیچ رنگ پہن لیا۔ پارلر والی کے مشاق ہاتھوں نے پہلے شانزے کو تیار کیا اور پھر سائرہ کو۔ فرحین سائرہ کو لینے پہلے آ گئی۔ ثاقب نے شور ڈالا ہوا تھا کہ پہلے پہلی کا نکاح اور پھر دوسری کا کرنا ہے۔

شانزے کے لیے یہ سب سے بہترین موقع تھا۔ چھیننے کا غلبہ سارے احساسات پر غالب آ گیا۔ وہ فرحین کی گاڑی کا ہارن سن کر جھٹ سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سائرہ ثاقب بن کر شانزے ثاقب کا نکاح مغیث سے پڑھا دیا گیا۔ اور جب سائرہ کو بہزاد کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا۔ تو وہ بری طرح چونکی۔ بہزاد کا نکاح شانزے ثاقب کے لیے پڑھایا جا رہا تھا اور پتھرائی قبول ہے کے الفاظ بولتی سائرہ کو لگا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہی پتھر ہو گئی تھی۔ نکاح کے بعد روتی لپٹتی سائرہ ماں کے کاندھے سے لگی۔ اور اس کے کان میں کہا۔

"امی! میں شانزے نہیں' سائرہ ہوں۔ شانزے نے میرا لہنگا پہنا ہے۔"

"کیا؟" فرحین کی چیخ ہی نکل گئی۔

"تم نے پھر آج یہ حرکت کی۔ آج کے دن بھی تم نے اس کا لہنگا پہن لیا۔ اب مزہ چکھو۔ بیوقوف لڑکی۔ تمہارا نکاح بہزاد سے ہو چکا ہے۔" جھٹ ثاقب۔ اظفر۔ عروبہ اور فرحین کی خفیہ میٹنگ ہوئی۔ نکاح نامے پر غلط نام کا اندراج ٹھیک کروایا گیا۔ ایک جیسی شکلوں کا بہانہ خوب چلا کسی نے کوئی اعتراض بھی نہ کیا۔

شانزے کو فرحین اور عروبہ نے گلے سے لگا کر خوب خوب پیار کیا۔ اس کی نیک فطرت پر اسے مغیث مل گیا۔ جبکہ سائرہ کو سخت سست سنائی گئی۔ کہ آج کے دن بھی اس نے شانزے کو نہ بخشا۔ وہ اپنے ہی جال میں پھنس گئی۔ کسی کو بھی لمحہ بھر کے لیے اس بات پر یقین نہ آیا کہ آج چھیننے والا حربہ شانزے نے آزمایا تھا۔ سائرہ روتے ہوئے شانزے کے پاس گئی۔

"تم خود اپنے منہ سے بتاؤ کہ تم نے کیا کیا؟ کسی کو میرے کہنے پر یقین نہیں آ رہا۔ پلیز شانزے بتاؤ۔" شانزے بے اختیار ہنسی۔ پھر قہقہوں نے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔

"میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔ پر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسروں کی زندگی جہنم بنا کر خود اپنے لیے کوئی جنت سجا سکتا ہے بھلا۔ تم ساری عمر صرف لینے کی ہی عادت میں مبتلا رہی ہو۔ اپنی چیز دوسروں کو کیسے دیتے ہیں۔ اس کا شاید تمہیں اور اک ہی نہیں۔ اب تم اس چیز کو محسوس کرو۔" شانزے کا لہجہ قطعیت سے بھرپور تھا۔ ان کے کمرے کی طرف آتی۔ فرحین اور عروبہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ فرحین نے شرمندگی سے آنکھیں جھکا لیں۔ دونوں بیٹیوں نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

"جو بھی ہوا بہت بہتر ہوا۔ میں ماہر نفسیات ہو کے وہ کام نہیں کر سکی جو شانزے نے کر دیا۔ یہ احساس سائرہ میں جگانا ضروری تھا۔ انسان کے اندر جب جذبہ ملکیت حد سے بڑھ جائے تو پھر اس کو کم کرنے کی ضرورت تو ہونی چاہیے۔ اسی لیے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے بہت حد تک ٹھیک ہوا ہے۔ تم فکر نہ کرو اور پریشان نہ ہو۔" عروبہ آپا کے ہمیشہ کی طرح حوصلہ مند طرز عمل نے فرحین کو ہر طرف سے پرسکون کر دیا تھا۔ کچھ تدبیریں قدرت کرتی ہے اور قدرت جو کرتی ہے بہت اچھا کرتی ہے۔

شمسہ فیصل

شانزے کی ساس

شانزے شاہ نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا' سامنے ہی تخت پوش پر عشنا خاتون اسے تسبیح کرتی نظر آئیں۔ سر پر سلیقے سے جما سفید دوپٹا ان کی گندمی چمکیلی رنگت پر خوب جچ رہا تھا۔ ہاتھوں میں تسبیح تھامے آنکھیں موندے وہ جس خشوع سے عبادت کررہی تھیں شانزے کو ان کا یہ روپ ہربار دیکھنے پر عجیب کشمکش میں مبتلا کردیتا جیسے وہ ان کے بارے کوئی فیصلہ یا رائے قائم کرنہ پارہی ہو۔ اس نے دروازہ بجانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھایا' اس کی کلائی میں بھری کانچ کی چوڑیاں کھنک اٹھیں جو دفعتاً عشنا خاتون کی توجہ کا مرکز بنیں۔

"آؤ۔" انہوں نے تسبیح پڑھنے کا سلسلہ موقوف کیا اور اسے اپنے قریب بلایا۔

"وہ۔ میں پوچھنے آئی تھی۔ آپ کے لیے چائے لے آؤں۔" وہ کسی غلام کی طرح مؤدب کھڑی پوچھ رہی تھی۔

عشنا خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور اپنے قریب بٹھاتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اگر تم مجھے "ماں" سمجھ کے ادب کرتی ہو تو تمہاری قدر ہربار ایسا کرنے پر میری نگاہوں میں بڑھ جاتی ہے' اور اگر تم ہمارے درمیان موجود رشتے سے خوف زدہ ہو تو تم مجھے میری نظروں میں گرادیتی ہو۔"

وہ اس قدر سچائی اور بے ریا لہجے میں بول رہی تھیں کہ شانزے نے حیرانگی سے انہیں دیکھا' اس کی شادی کو چھ ماہ ہوچکے تھے' لیکن ابھی تک وہ اس گھر کے مکین پراٹھوں کا ذائقہ نہیں سمجھ پارہی تھی۔ وہ گمان اور حقیقت کی سچائی نہیں جان پارہی تھی' ہربار گمان پر حقیقت ایسی غالب آتی کہ وہ ششدر رہ جاتی۔

اس کی شادی غیروں میں ہوئی تھی۔ چھ ماہ منگنی رہنے کے بعد بے حد دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی۔

جتنا عرصہ منگنی رہی اس کی ساس بے حد خلوص اور لگاوٹ سے ملیں۔ وہ جب بھی اس سے ملنے آتیں یوں واری صدقے جاتیں کہ دیکھنے والا ان کی شخصیت کے ہر پرت میں ایک خرابی ضرور نکال لیتا۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی ہزاروں وسوسے اور خدشات لے کر سسرال آئی تھی۔ اس کی ساس نے ہر فضول رسم کرنے سے نہ صرف سختی سے انکار کیا تھا بلکہ جہیز کے نام پہ ایک تنکا لینا بھی گوارہ نہ کیا۔

بہت سوں نے شانزے کی قسمت کو سراہا تھا اور بہت سے لوگوں نے اسے اس کی ساس سے خبردار کیا تھا' ان کے خیال میں اچھی نظر آنے والی ساسیں سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ اس نے ہر خدشے' ہر مشاہدے' کسی کی نصیحت اور دوسروں کے ذاتی تجربوں کو پلو سے باندھا اور یوسف کے ساتھ رخصت ہوکر آگئی۔

پہلی ہی رات یوسف کی نرم خوئی نے اس کا دل موہ لیا تھا۔ اس کی ایک نند جو شادی شدہ تھی اور ایک چھوٹا دیور جو بی اے کے دوسرے سال میں تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ اس گھر کا ہر شخص بے ضرر اور اپنے رشتوں سے مخلص ہے۔ دھیرے دھیرے اس کے سارے خدشے ریت کی طرح بکھر گئے۔ اس کے باوجود دل پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ظالم ساس کی ہر شکل عشنا خاتون کو دیکھ کر منتشر ہوجاتی۔

شادی کے دو ماہ بعد انہوں نے اس کا ہاتھ کھیر میں ڈلوایا اس کے باوجود اسے پہلے دن کی دلہن کا آرام میسر رہتا' شادی کے چھ ماہ گزر جانے کے باوجود وہ سج دھج کے رہتی' اس کے ہاتھوں سے مہندی نہ اتری۔ ہاتھوں میں کھنکتی چوڑیاں تو اس کی موجودگی کا احساس ہردم اس گھر کی درودیوار کو دلاتی رہتیں۔ اسے خود پر کسی شہزادی کا گمان ہوتا' اکثر وہ اس سج دھج سے گھبرا

جاتی، لیکن کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔ حالانکہ عشنا خاتون نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا تھا اس کے باوجود وہ ان سے نہ صرف خوف زدہ رہتی، بلکہ بات کرتے ہوئے بھی ہچکچاتی شاید اس کی وجہ وہ باتیں تھیں، جو اسے اپنی ساس کے اچھے سلوک کو غلط رنگ دے کر سکھائی جاتی تھیں۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہونے کے باوجود وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھی۔ وہ عشنا خاتون کو دیکھتی تو کسی فرشتے کا گمان ہوتا۔ ان کی زبان نہ فالتو بولتی نہ کان فضول سنتے۔ وہ ہر وقت باوضو رہتیں۔ بے شمار دوسری عورتوں کی طرح ہاتھ میں تسبیح لیے نہیں رکھتی تھیں۔

ان کا کہنا تھا کہ عبادت کا مزا تو تنہائی میں ہے، ہر وقت تسبیح ہاتھ میں رکھنے سے نہ عبادت کا مزا آتا ہے اور تسبیح کی بے ادبی الگ ہوتی ہے۔ دھیان بھٹکا رہے تو سکون نہیں آتا جب ہم محبوب کی پوری توجہ چاہتے ہیں تو محبوب کو پوری توجہ کیوں نہ دیں۔

ان کا بے ریا لہجہ، سچائی سے بھرپور لفظ اسے حیران کر دیتے۔ اتنے ماہ گزرنے کے باوجود وہ ان کی کوئی بھی برائی پکڑنے میں ناکام رہی تھی۔ وہ شانزے کی غلطیوں پر یوں پردہ ڈالتیں کہ وہ شرمندہ ہو جاتی، جب اس نے پہلی بار قورمہ بنایا، پہلا لقمہ لیتے ہی اسے احساس ہوا کہ کھانے میں اچھی خاصی خرابی ہے اور اس خرابی کی سمجھ اسے نہ آئی۔ ساس کو بتانے یا پوچھنے کی ہمت نہیں تھی، اس نے جیسے تیسے ہانڈی ڈھکی اور کچن سے باہر آ گئی۔ رات کو متوقع بے عزتی اس کی آنکھوں کے سامنے آئی تو آنکھیں نم ہو گئیں۔ رات کھانے کی میز پر وہ منتظر تھی کب یوسف اسے ڈانٹیں، ساس طعنے دے اور دیور "ہونہہ" کر کے میز چھوڑ جائے، لیکن یوسف نے پہلا نوالہ لے کر یوں تعریف کی کہ وہ پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اتنی ہونق کہ مسکرانے کا بھی خیال نہ آیا۔

"شانزے نے بنایا ہے۔" مٹھاس بھرے الفاظ سماعت سے ٹکرائے، اس نے حیرانی سے ساس کو دیکھا۔ وہی بے ریا، وہی متانت بھرا انداز۔

"بھابھی کے ہاتھ میں آپ جیسا ذائقہ ہے۔" سلیمان نے کہا اور اس ایک لفظ سے ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس کی ساس نے اس کے کچن سے نکلنے کے بعد قورمہ کو بہتر کیا تھا۔ اس کے دل میں ان کے خلاف ہلکی سی خلش آ گئی تھی۔ ان کے یہ ڈھکوسلے اسے اب عجیب ذہنی تناؤ میں مبتلا کرنے لگے تھے۔ اب وہ اکثر سالن خراب کرتی جو رات کو ٹھیک ملتا، ایک دن اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

"میں جانتی ہوں یوسف کھانے پینے کا شوقین ہے اور مرد کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی اسے اپنے ہاتھوں سے اچھا پکا کے کھلائے۔ اگر میں کھانا ٹھیک کرتی ہوں تو اس لیے نہیں کہ مجھے تم سے کوئی پرخاش ہے یا میں تمہیں نیچا دکھانا چاہتی ہوں، بلکہ اس لیے کہ تم دونوں کے درمیان کسی بے ضرر بات پر جھگڑا نہ ہو۔ پھر مائیں تو ہوتی ہی گھروں کو سمیٹنے کے لیے ہیں۔" وہ اس پیار سے بولیں کہ اس کے دماغ کی ساری تنی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ وہ ایسی بند کتاب تھیں جس کا ورق ورق پڑھنے کو دل چاہتا، اس دن کے بعد اس نے دماغ سے ہر قسم کے خلل کو نکال کے زندگی کی چاشنی کو اندر اتارنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ تخلیق کے مرحلے سے گزری تو گویا انہوں نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا۔ اس کے ہر قدم پر ان کی نظر ہوتی، لیکن اس نظر پر اسے شک نہیں تھا، کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ محبت کی نگاہ ہے، ان کی رفاقت میں، وہ میکہ بھول گئی، اماں کے خدشے بھرے فون آتے، اس کے مطمئن کرنے سے بھی وہ پرسکون نہ ہوتیں۔ شانزے کی ساس انہیں دنیا بھر کی چلتر اور چالاک ساس لگتیں۔ وہ ماں کے وسوسوں کو دور نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ وہ ماں تھیں۔ اس دن اس نے اعتراف کیا تھا۔

"آپ جیسی قابل رشک عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ یو آر پرفیکٹ... گڈ مدر... گڈ وائف، گڈ ڈاٹر، گڈ سسٹر اینڈ گڈ بہو..."

وہ جو اس کی بات پر مسکرا رہی تھیں گڈ بہو پر ان کی مسکراہٹ سمٹی تھی، کرب اور اذیت کی لکیریں اتنی گہری تھیں کہ وہ بری طرح چونکی۔

"کیا آپ کی ساس اچھی نہیں تھیں اماں؟" اس نے یہی اندازہ لگایا۔

"میں اچھی بہو نہیں تھی۔" وہ کہہ کر اٹھ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی، اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اس نے رات یوسف سے پوچھا تو انہوں نے گہری سانس لی۔

"مرے ہوئے کی بات جو برائی کے زمرے میں آتی ہو، نہیں کرنی چاہیے۔" بات عجیب تھی اس کے سر سے گزر گئی۔

"بتائیں نا یوسف..." وہ ان کے قریب ہوئی۔

"صبح مجھے نماز کے لیے جلدی اٹھانا۔ کل بھی بہت سارے وظائف رہ گئے تھے۔" انہوں نے کروٹ بدلی۔ اسے کھد بد لگ گئی۔

"میں نے برائی کے لیے کب کہا۔" سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔

فجر کی نماز کے بعد وہ ان کے کمرے میں چائے دینے گئی تو ان کی آنکھوں میں رت جگے کی لالی تھی۔ اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔ اس لالی میں عبادت کا سکون نہیں، بلکہ کرب اور دکھ تھا۔ بعض دفعہ ہم ان جانے میں کسی کے ان زخموں کو کرید لیتے ہیں جو جان لیوا تکلیف دیتے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

"ادھر آ کے بیٹھو..." انہوں نے ایک ہاتھ سے چائے پکڑی اور دوسرے سے اس کی کلائی تھام کے اپنے قریب بٹھایا۔

"تمہیں ہمیشہ میرا رویہ دوغلا لگا ہے۔ جبکہ اس میں سوائے خلوص اور محبت کے کچھ نہیں ہوتا۔ اب جب تم تخلیق کے عمل سے گزر رہی ہو تو میں نہیں چاہتی کہ کسی واہمے یا خدشے کا شکار ہو۔"

شانزے نے انہیں چونک کے دیکھا۔ "ظلم دو طرح کا ہوتا ہے یا تو وہ آپ کو ظالم بنا دیتا ہے یا پھر آپ کے دل میں نرم گوشہ بنا دیتا ہے کہ آپ دوسروں پر وہی ظلم کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ میں دریا تو نہیں بن سکی، لیکن میں قطرے اکٹھے کر کے سمندر ضرور بنا سکتی ہوں۔" ان کے الجھے لفظ شانزے پر ان کو آشکار کر رہے تھے۔ شانزے کا رواں رواں ہمہ تن گوش تھا۔

☆ ☆ ☆
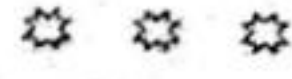
آؤ کائنات بانٹ لیں

تم میرے، باقی سب تمہارا

اس نے کوئی دسویں بار شرمیلی مسکان کے ساتھ اس ایس ایم ایس کو پڑھا تھا، ہر بار دھنک کے ساتوں رنگ اس کی سنہری رنگت کو اور بھی پُر رونق کر دیتے۔ اس کا دل چاہا کہ یہ لفظ وہ "احد" کے منہ سے سنے، کتنی ہی بار اس کی گداز انگلیاں احد کا نمبر ملاتے ملاتے ٹھہر جاتیں۔ اک نئی نویلی جھجک تھی جو اس کے نوخیز زندگی سے بھرپور جذبوں پر بند باندھ دیتی۔ اک بار پھر اس نے شرمیلی مسکان کے ساتھ شعر پڑھا۔

"نو دیتی آنکھیں... شریر ہونٹ..." محبت لٹاتے لفظ... بہکتے جذبات، احد کا دلکش سراپا اس کی دھڑکنوں کو منتشر کر گیا۔

آپ ہی آپ مسکراتے ہوئے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ محبت کے رنگ کس قدر خوب صورت ہوتے ہیں کہ جس پر بھی اتریں اسے خاص کر دیتے ہیں، وہ بھی انہی معتبر جذبات سے گزر رہی تھی۔ اس کی شادی کو آج دسواں دن تھا۔ اور شروع کے دن تو میاں بیوی کے لیے کسی جنت سے کم نہیں ہوتے۔ جب جذبات کا ٹھاٹیں مارتا سمندر اندر تک سیراب کرتا ہے۔

آج احد پہلے دن آفس گیا تھا اور اس نے جاتے ہی یہ شعر بھیجا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی لمحہ لمحہ اترتی محبت کی بوندوں کو خود پر برستا محسوس کر رہی تھی۔ زندگی اسے نئے رنگوں سے متعارف کروا کے اس کے جذبوں کو لفظوں کی قید سے آزاد کر رہی تھی۔ اس نے آئینے میں اپنا دلکش سراپا دیکھا، اس کی ہر ہر پور میں احد کا لمس سانس لے رہا تھا۔ رگوں میں بھاگتا دوڑتا خون محبت کے احساس کو اجاگر کرتا گزرتا جا رہا تھا۔ ابھی وہ

محسوسات کے مرحلے سے گزر رہی تھی کہ دھاڑ کی آواز سے دروازہ کھلا آنے والے نے دستک دینے کا تکلف نہیں کیا تھا۔

"ابھی تمہارے چونچلے ختم نہیں ہوئے' لے آؤ باہر تشریف سب ناشتے کا انتظار کررہے ہیں۔" بے حد تلخ الفاظ۔ ہتک آمیز لہجہ۔۔۔ نفرت انگیز انداز نے پل بھر میں عشنا کو آسمان کی بلندیوں سے زمین پر لا پھینکا تھا۔ "ہاتھوں میں تھامی تسبیح کے دانے گراتے وہ بول رہی تھیں۔ میری چار نندیں تھیں تین شادی شدہ اور ایک کنواری۔ وہ کنواری تین پر بھاری تھی۔ احد کے جاتے ہی وہ پوری طرح سے سامنے آگئی تھی' حالانکہ احد کی موجودگی میں بھی غیر محسوس طریقے سے ہی بدتر کام کررہی تھی۔ سسرال میں کسی بھی رسم کو نبھانے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ رسمیں صرف لڑکی والوں کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے اپنی ساس سے بہت ڈر لگتا تھا وہ بہت کم بولتی تھیں' لیکن کم بولنے میں بھی وہ ہر بات کہہ جاتی تھیں۔ بھاری بھر کم وجود ہاتھ میں سفید تسبیح۔۔۔ سر پر گرمیوں میں سفید اور سردیوں میں گرے دوپٹا' چہرے کی کرختگی اور لہجہ کے پاٹ دار انداز کو کم نہیں کرتا تھا۔

وہ اس انداز سے عشنا کو دیکھتیں کہ اس کی روح تک کانپ اٹھتی۔ دن بھر گدھوں کی طرح کام کرنے کے بعد واحد پناہ گاہ جہاں وہ چند گھنٹے سکون کے گزارتی تھی وہ احد کا قرب اور اپنا کمرہ تھا۔ اس کی ساس میں روایتی پن کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہر کام میں کیڑے نکالنا' اس پر ہر لمحہ مسلط رہنا بات بے بات دھنک کے رکھ دینا' اس کے لیے کھانوں میں خرابی پیدا کرکے ہنگامے برپا کروانا اس کی ساس کا من پسند مشغلہ تھا۔ احد بے شک بے حد اچھا شوہر تھا' لیکن روایتی فرماں بردار جسے بیوی کے سوا کسی کے آگے سر اٹھانے کی جرأت نہ تھی۔

وہ خاندان بھر کی سگھڑ لڑکی' جسے اس کی ساس نے صرف 365 دنوں میں پھوہڑ اور بدسلیقہ کا ٹائٹل دے کر سارے خاندان میں بانٹ دیا تھا۔ نہ اسے نئے ماحول کو سمجھنے کا موقع دیا اور نہ اسے سمجھا گیا۔ وہ تخلیق کے مرحلے سے گزری تو دوہری تکلیف میں مبتلا ہوگئی۔ طبیعت خراب ہوتی تو بہانے بازی قرار دی جاتی کوئی چیز کھانے کو دل چاہے تو بے حیائی کا الزام لگتا۔ وہ پہلے ہی کولہو کا بیل تھی اب تو وہ کام بھی اس کے سپرد کردیے گئے جو وہ نہیں کرتی تھی۔ ساس کی منطق تھی کہ اس دوران کا کیا کام پیدائش میں آسانی پیدا کرتا ہے' کیا ضروری تھیں اور کیا غیر ضروری۔ اس کی شادی سے پہلے بھابھی موجود تھی اور جب بھابھی اس دور سے گزری تھیں تو مما نے انہیں موم کی شہزادی بنا دیا تھا۔

وہ اس اذیت اور تکلیف سے تھکنے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہ پارہی تھی کہ جس لڑکی کو اتنے چاؤ سے گھر لایا جاتا ہے۔ وہ اتنی قابل نفرت کیوں ہوجاتی ہے۔ دھان پان سی نازک سی لڑکی کو اچھوت کیوں سمجھ لیا جاتا ہے۔ بیٹی کو بہو بنا کے درجوں میں تقسیم کیوں کردیا جاتا ہے۔ ایک عورت ساس اور ماں کے روپ میں جدا کیوں ہوجاتی ہے اس کا دل ماں اور ساس کی لے پر الگ۔۔۔ کیوں دھڑکنے لگتا ہے۔ مرد پر اگر ماں کی فرماں برداری فرض ہے تو بیوی کے حقوق و فرائض کی حفاظت بھی اس کا فرض ہے۔ بیوی کا خیال اور اس سے نرمی غلامی میں شمار کیوں کی جاتی ہے۔ عورت میں اتنا حوصلہ کیوں نہیں ہوتا کہ وہ مرد میں قرابت برداشت کرے۔ پھر چاہے یہ قرابت بیوی کی صورت میں ہو یا سوکن کی صورت میں یا بہو کی صورت۔۔۔

وہ خود سے سوال کرتی خاموش جواب اسے گہرے کرب میں مبتلا کرتے۔ وہ تھک گئی تو اس نے شکایت کرنا چھوڑ دی اور تب دکھ اور سوالوں کا خاتمہ ہوا' جب اس نے گھر میں موت کی دہلیز پر جاکے اپنے بیٹے کو زندگی دی درد کی تکلیف کے ہر لمحے میں اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب کسی عشنا کو جنم نہیں دے گی۔

اس نے عہد کیا تھا کہ وہ خود پر سہی تکلیف اب کسی اور کو سہنے نہیں دے گی۔ وہ ظلم سہہ کے ظالم نہیں بنے گی۔ یوسف کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں تین گنا اضافہ ہوا تھا۔ روتے بلکتے یوسف کو گود میں اٹھائے وہ سارے کام کرتی۔ دکھ اور تکلیف کو سہتے سہتے وہ پتھر کی ہوگئی تھی۔ اسے اب کسی کے لفظ اور بات دکھ نہیں دیتے تھے۔ احد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک پتھر کی عورت سے اکتا گیا تھا۔ وہ پھر بھی شاکر رہی تھی۔ احد بھی اپنی ماں بہنوں کی باتوں میں آکے اس سے متنفر ہوگیا تھا اس تنفر کے باوجود اس نے دو مزید بچوں کو پیدا کیا تھا۔ عشنا کی ہر تکلیف' ہر دکھ' ہر کرب کا خاتمہ اس کی ساس کی موت کے ساتھ ہوگیا تھا۔ نندیں صرف ساس کی زندگی تک حاوی رہتی ہیں۔ اس بات پر یقین اسے اپنی ساس کے مرنے کے بعد آیا تھا۔ اسے ساس کے مرنے پر رونا نہیں آیا تھا بلکہ ان لمحوں پر رونا آیا تھا جو اس نے ان کے ساتھ گزارے تھے۔

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست
سب کو اپنی ہی کسی بات پر رونا آیا۔۔۔

اپنی زندگی کے دس سال اگر اس نے ظلم سہتے گزارے تھے تو باقی کے سال اس نے اپنے بچوں کو بہتر مستقبل دینے میں گزارے تھے۔ "عورت کی زندگی مسلسل سفر میں رہتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے شانزے کو دیکھا جو اپنی ساس کے دکھ میں رو رہی تھی۔

"کیا اب بھی تجھ پر شک ہے۔۔۔" انہوں نے شانزے کے آنسو پونچھے۔

"ظلم سہنے والا بھی تو ظالم ہوتا ہے نا اماں۔۔۔" وہ انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"ایسا نہیں ہے میری جان! اگر زندگی بچانے کے لیے کچھ دیر کڑوی گولی کھالی جائے تو کیا وہ غلط ہوگا؟ وہ ویسے بھی دکھ عبادت ہوتے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"دکھ کیسے عبادت ہوتے ہیں۔۔۔" وہ حیرانگی سے بولی۔

"جب انسان دکھ میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اللہ کو پکارتا ہے اسے یاد کرتا ہے اور اللہ کو یاد کرنا عبادت ہی تو ہے۔"

"ایسا ہمیشہ تو نہیں ہوتا کہ دکھ اللہ کی جانب رجوع کرنا سکھادیں۔"

"نہیں۔۔۔ لیکن ہم چاہے کتنے بھی پریشان' بدظن کیوں نہ ہوں' ہم شکایت اللہ سے کرنے کے فوراً بعد اسی سے اس کا حل بھی تو مانگتے ہیں۔"

"آپ نے کبھی اپنی ساس کے لیے بددعا نہیں کی۔" شانزے کو اس عورت سے نفرت محسوس ہورہی تھی۔

"کیا میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ انہوں نے تو کبھی دشمن کو بھی بددعا نہیں دی تھی اور وہ تو پھر میرے شوہر کی ماں تھیں۔" وہ محبت سے بولیں۔

"آپ مکمل ہیں۔۔۔ آپ جیسی ساس سب کو ملے۔۔۔" وہ محبت سے ان سے لپٹ گئی۔

"ایک وعدہ کرو مجھ سے۔۔۔" انہوں نے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

"ہم معاشرے کو تو نہیں بدل سکتے' لیکن معاشرہ مل کر ان ظالم رواجوں اور رواتیوں کو بدل سکتا ہے۔ اگر ہم ایک اچھی روایت بھی اپنی نسل میں منتقل کردیں تو سمجھ لو ہم معاشرے کے فاتح ہیں۔" وہ بات جو وہ کہنا چاہتی تھیں وہ شانزے تک پہنچ چکی تھی شانزے نے عہد کیا تھا کہ وہ قطرہ قطرہ اکٹھا کرکے سمندر ضرور بنائے گی۔

"آپ دونوں کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو ناشتا ملے گا۔" یوسف اندر جھانکتے ہوئے بولا۔

"ایسے حاسد پن کا بھی کوئی حل اماں۔۔۔" وہ تیکھی نظروں سے یوسف کو دیکھتے ہوئے بولی۔ تینوں کا قہقہہ بے ساختہ بلند ہوا تھا۔ شانزے نے اپنی ساس کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر ہمیشہ سے زیادہ اطمینان اور سکون تھا۔ وہ اپنی ایک روایت اپنی نسل میں منتقل کرچکی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ روایات کی پاسداری رکھنا ابھی بھی اس عہد کے جوانوں کو آتی ہے۔

نایاب جیلانی

وہ ایک لمحہ

یہ ایک شکستہ اور بد حال مکان تھا۔
جس کی ٹوٹی دیواروں میں بڑے بڑے گڑھے دکھائی دیتے تھے اور ان کے اندر چوہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ تین مرلے پہ پھیلا یہ مکان انتہائی غلیظ اندھیرے میں ڈوبا گندگی سے اٹا اور بدبو سے بھرا ہوا تھا۔
جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی تھی اس کا جی الٹنے لگا۔
پورا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ انتہائی خستہ حالی کا شکار اور ہر جگہ مرغیوں کا فضلہ، گندگی اور غلاظت برنٹ شدہ تھی۔
یوں لگ رہا تھا جیسے بدبو دماغ میں گھس رہی ہے۔

اور کبھی کبھی دماغ میں گھسنے والی بدبو بھی سوچوں کے در کھول دیتی ہے۔ اور اک اور آگہی کے مرحلوں تک لے آتی ہے اور کبھی کبھی عظیم ٹھوکروں سے بھی بچا دیتی ہے۔ انسان کی زندگی میں کبھی ایک لمحہ بہت قیمتی ہوتا ہے۔ وہ یا تو زندگی سنوار دیتا ہے یا زندگی تباہ کر دیتا ہے۔
اور اس وقت بدبو کو آخری حد تک محسوس کرتی وہ زندگی میں در آنے والے اس لمحے کی قید میں تھی جس نے اسے واپسی کی راہوں تک جانے میں راہنمائی کی تھی۔
کبھی خوشبو تو کبھی بدبو بھی راہنما بن جاتی ہے۔

مکمل ناول

کبھی خوشبو تو کبھی بدبو بھی بڑے کھلے فیصلے کروا دیتی ہے
کبھی خوشبو تو کبھی بدبو ہم سفر ہوتی ہے۔ اور اس کی ہم سفر فی الوقت بدبو تھی، جس نے بروقت اس کی آنکھیں کھول کر بہت بڑے گڑھے میں گر جانے اتر جانے ڈوب جانے سے بچالیا تھا۔

اسے اپنے ان الفاظ پہ اب تک پشیمانی تھی جو اس نے اپنے شوہر سے کہے تھے۔
"کل کورٹ میں پہلی اور آخری تاریخ ہوگی۔ اگر دل چاہے تو کورٹ میں آجانا... ورنہ یہاں پہ مجھے تمہاری طرف سے فیصلے کا انتظار رہے گا تحریری فیصلے کا۔"

اور اس وقت انتہائی بدبو دار ماحول میں کھڑی وہ اپنے الفاظ پہ پچھتا رہی تھی۔

اور اسی بساند "گندگی" نے اسے واپس مڑنے اور گلنے سے محفوظ کرلیا تھا۔
اور کبھی کبھی زندگی میں ایک بدبو دار لمحہ بھی بہت قیمتی ہوتا ہے۔
صحن میں زرد دھوپ سر چکراتی پھر رہی تھی۔
رات بھر باد صرصر کی تند اور صعب ہواؤں نے درختوں کو سخت بے چین رکھا تھا۔ ایسے لگتا تھا آندھی کا غضب شاخوں کو تنوں سے اکھاڑ پھینکے گا۔
بھادوں کے طوفان ایسے ہی دبے پاؤں آتے تھے اور اپنا آپ دکھا کر جاتے۔
صبح دیر تک وسیع و عریض صحن میں پتوں، شاخوں، پھٹے ہوئے پھلوں اور ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں کا جگہ جگہ ڈھیر لگ چکا تھا۔ اوپر سے دھول، مٹی، غبار سے اٹی ایک ایک چیز، فرش، فرنیچر، کھڑکیاں، دروازے۔ اب تو یوں لگتا تھا حلق تک میں گرد اور غبار گھس رہا ہے۔ سانس تک لینا محال ہو رہا تھا۔
وہ صبح سے کئی مرتبہ کھانس چکی تھیں اور کئی مرتبہ یسماں کو کوس بھی چکی تھیں جو ہر طوفان، آندھی، بارش کے بعد آرام سے بہانا بنا کر گھر بیٹھ جاتی تھی۔

تاکہ کام زیادہ نہ کرنا پڑے۔ شروع سے بڑی ہڈ حرام تھی۔ اگر آ بھی جاتی تب بھی پھیلاوا زیادہ دیکھ کر آرام سے بائیں برآمدے میں پڑی جھلنگا سی چارپائی پہ ایسی گرتی کہ رات کی خبر لاتی۔ ایسی صورت میں بھی نیلم کو خود سارا گھر سمیٹنا پڑتا تھا۔
اور آج تو نیلم بھی یہاں نہیں تھی۔ آؤٹ پہ آؤٹ آف سٹی تھی۔ جانے کل بھی آتی یا نہیں۔
فرحت کو گندگی دیکھ دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔
سارا گھر گرد گرد ہو چکا تھا۔ کچن تک میں جانا محال تھا۔ فرش پہ چلنے سے کرچ کرچ کی آواز آتی تو ان کا دل برا ہوتا۔ اور آج فرائی ڈے تھا یعنی جمعہ، ہاف ڈے... کچھ ہی دیر میں بھوکی پیاسی جینا، بیلا بھی چلاتی ہوئی آ جاتیں۔ اور انہوں نے کھانے کے نام پر کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ اب فوری طور پر کیا پکاتیں؟
ویسے بھی رات سے شدید بلڈ پریشر ہائی تھا۔ اوپر سے وہ عجیب و غریب اطلاع! ان کے دل میں ڈھیر ساری گھٹن بھر رہی تھی اور یہ گھٹن صرف گرد، غلاظت اور گندگی کے سبب نہیں تھی۔ سوچ کچھ اور ہی تھی۔ جس کو سوچنا بھی شدید غصے کے گراف کو بڑھا دیتا تھا۔
اور اس وقت وہ رنگین کھڑکیوں اور قدیم طرز کے ہی رنگین دروازوں سے لٹکے جالوں کو دیکھ کر ہول سی اٹھیں۔ ارے، یہ کہاں سے آگئے؟"
اور صرف کھڑکیوں سے ہی نہیں چھتوں کے کونوں سے بھی جالے لٹکتے نظر آرہے تھے۔ اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ ورنہ نیلم تو خود بڑی صفائی پسند تھی۔ ایک ایک کونے کھدرے کا باریکی سے جائزہ لیتی۔ آخری کونے اور سوراخ تک سے کوڑا کرکٹ نکال کر باہر کرتی۔ اس حال میں کہ یسماں خوامخواہ بغلیں جھانکنے لگتی تھی۔ آئیں بائیں کرنے لگتی۔ اور یہ تو یسماں کی ازل سے عادت تھی۔ جھاڑو لگائی اور ادھر ادھر فرنیچر کے نیچے آگے پیچھے کوڑا گھسا دیتی۔
کئی مرتبہ فرحت نے یسماں کی عاجز آکر چھٹی کروا دینی چاہی تھی لیکن ہر مرتبہ نیلم آڑے آجاتی۔ "ایسے خوامخواہ اس مکار عورت پہ ترس آجاتا تھا۔ کہتی تھی امی! اس کا کون سا گھر بار ہے۔ بے چاری یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی۔"
اور بات تو کسی حد تک نیلم کی ٹھیک ہی تھی۔ رات کو کچی بستی اپنے بھانجوں بھتیجوں سے ملنے چلی جاتی تھی کبھی رات بھی وہیں رہ آتی لیکن زیادہ پڑاؤ اس کا آشیانہ گلکین میں ہی تھا۔
اس وقت گندگی، دھول مٹی اور جالوں کو دیکھ دیکھ کر فرحت کا پارہ ہائی ہوتا جا رہا تھا۔ اور صرف یسماں پہ ہی نہیں، نیلم پہ بھی غصہ آرہا تھا۔
"ایک ہفتہ ایک مہینے کے برابر ہو گیا۔ کل چھٹی ہے پھر بھی جانے آئے گی یا نہیں۔ میں تو چولہا چوکی سے تنگ آگئی۔ بھاڑ میں جائے نوکری۔ آتا ہے اس کا باپ تو کرتی ہوں ان سے فائنل بات۔" انہوں نے زیر لب بڑبڑا کر جیسے ہی گھڑی کی طرف دیکھا تو ہول اٹھنے لگے تھے۔ پیروں میں پہیے سے لگ گئے۔ اسی دھول مٹی کچن میں جاتے ہوئے ایک ایک کیبنٹ کھول کھول کر کچھ تلاش کرتے ہوئے ان کا میٹر پھر سے گھوم گیا تھا۔
"صبح بھی بھوکی پیاسی چلی گئیں۔ اب بھی کچھ نہیں پکا۔ کیا کھائیں گی وہ کیا میرا بھیجہ؟" انہوں نے عادتاً "ایک ایک دراز کو دھڑ دھڑ بند کرتے ہوئے با آواز بلند کہا تھا۔ یوں کے اندر آتے لدے پھندے سے وکیل صاحب ایک ایک تھیلے کو میز پہ رکھتے گہرے طنزیہ لہجے میں بولے۔
"تمہارا بھیجہ کھا کر کسی نے کند ذہن نہیں ہونا۔ اللہ تمہارے بھیجے سے سب کو محفوظ رکھے۔"
انہوں نے سبزیوں، پھلوں کے شاپر الگ الگ سلیب پہ رکھے تھے۔ پھر آئس کریم کی بکٹ جلدی سے فریزر میں ڈال دی۔ تاکہ گرمی کی شدت سے پگھل نہ جائے۔ یہ جینا، بیلا کے لیے واحد عیاشی تھی۔ ورنہ تو بے چاریوں کو ایک ایک فرمائش کے لیے دنوں ترسنا پڑتا تھا اور بار بار منتیں کرنا پڑتیں۔ کبھی جو اس گھر میں ان کا من پسند کھانا پکا ہو۔ اور ابھی سبزیوں کے تھیلے دیکھ کر وہ وکیل صاحب کو منہ توڑ جواب دینا بھول گئی تھیں۔
"گوشت کے نام پہ تو یہاں بھیجہ بھی نہیں آتا۔ اسی کو بھون کر ایک وقت کے لیے بچیوں کو بہلا سکوں... ہر روز ٹنڈے، کدو، کریلے، بینگن، کچنار۔"
آخر تک پہنچتے ہوئے ان کا دل چاہا تھا ان تمام سبزیوں کو کچا چبا کر الٹ دیں۔ وکیل صاحب سبزی خور تھے، بچیاں سمیت فرحت ـــ گوشت خور۔ مہینے کے شروع میں گوشت آتا تھا۔ باقی کا سارا مہینہ دال اور سبزیوں پہ گزارا کرنا پڑتا۔
یہاں پہ وکیل صاحب بھی بے بس تھے۔ سرکار سے جو پنشن ملتی تھی۔ اسی میں کھینچ تان کے گزارا کرنا پڑتا تھا۔ اسی محدود پنشن میں بجلی، گیس، پانی، انٹرنیٹ کا بل نکلتا تھا۔ اور جو پیسے بچتے تھے ان میں بمشکل مہینے بھر کی دال، سبزی چلتی تو بھی غنیمت تھا۔

سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی مصنفہ صبا سحر کی والدہ طویل علالت کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہو گئیں۔
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔
بے شک موت برحق ہے اور ہم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ لیکن ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا بہت بڑی محرومی ہے۔ ہم صبا کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔
قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

"تم تو سدا کی ناشکری ہو۔ کبھی جو شکر ادا کیا ہو۔ بہتیروں سے بہتر ہیں۔ کھا کر سوتے ہیں۔ بھوکے نہیں رہتے اور ویسے بھی تمہارا ناشکرا پن آج کا تھوڑی ہے۔ یہ تو ازل سے ہمارے ساتھ چل رہا ہے۔" وکیل صاحب نے بڑی گہری ضرب لگائی تھی۔ فرحت کا پہلے سے پھنکتا بھیجہ الٹ سا گیا۔

"میرے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔ ویسے بھی ساری زندگی تم نے باتوں کی کمائی کھائی ہے۔ جتنی زبان گھر میں چلاتے ہو۔ اتنی عدالت میں چلا لیتے تو ہمارے حالات ایسے کبھی نہ ہوتے۔ یہ تو سرکار کی مہربانی تھی جس نے تمہیں جھیل لیا۔ ورنہ پرائیویٹ پریکٹس کرتے تو چولہا چوکی بھی ٹھپ ہو جاتا۔" فرحت نے ٹنڈے 'کدو' بیچ بیچ کر ٹوکری میں رکھے تھے۔ ہری مرچیں دھوتے ہوئے وہ خود بھی ہری مرچ ہو رہی تھیں۔

"تم جیسی بھاگوان سے متھا جو لگا ہے۔ ہاتھ آگے جانے کے بجائے ہمیشہ پیچھے ہی رہا۔ مان جاؤ کہ یہ ساری تمہاری بے برکتی ہے۔" وکیل صاحب نے خود آگے بڑھ کر بیگم کے عتاب سے خربوزوں کو بچایا تھا۔ ورنہ پھلوں میں خربوزے دیکھ کر ان کے ماتھے پہ بل پڑ جاتے تھے۔ انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"یہ پھیکے سیٹھے آلو ملے تھے؟ نہ ذائقہ نہ مٹھاس۔"

"دماغ کے ساتھ ساتھ بینائی بھی چلی گئی؟ حد ہے بیگم! خربوزے تمہیں آلو دکھائی دے رہے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی بھر کے اس میں خربوزے اور آم بھگو دیے تھے۔ آموں کو دیکھ کر فرحت کی تلخی کچھ کم ہوئی تھی۔

"صد شکر کہ تمہیں بھی ڈھنگ کا کوئی فروٹ نظر آیا۔ بچیاں شوق سے کھا تو لیں گی۔"

"سارے چٹخارے تمہارے اپنے ہوتے ہیں۔ بچیوں کا نام رکھ کے اپنا سواد پورا کرتی ہو۔" وکیل صاحب نے بھی وہاں لگا دی تھی جو پانی سے بھی نہ بجھتی۔

فرحت نے گھور کر انہیں دیکھا تھا پھر تلخی سے بولیں۔

"جیسے تم نے تو نعمتوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔"

"گھما پھرا کر بات کو لے آئی ہو نا۔ ناشکری پہ۔" وکیل صاحب نے گہرا طنز کیا تھا۔

فرحت نے سارا دالوں والا تھیلا کھنگال ڈالا تھا۔ لیکن جس کی تلاش تھی وہ ملا ہی نہیں۔ ان کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ کیا پکائیں؟ بچیوں کی وین بھی آنے والی تھی۔ مارے بوکھلاہٹ اور غصے کے انہوں نے ایک مرتبہ پھر وکیل صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"وہ موئے شیطان کی آنت سے لے آتے تو تمہارے خزانے میں کوئی کمی نہ آجاتی۔" انہوں نے دالوں کے سارے پیکٹ دراز میں ایک ایک کر کے پٹخ دیے تھے۔ گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو اور بھی غصہ آیا۔ اب کیا پکاؤں؟ بچیاں تو آنے والی تھیں۔ اور کھانے کے نام پر ٹنڈے 'کدو' کچنار کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اور یہ سب ابھی پکنے کے مرحلے سے محروم ہی تھے۔

"شیطان کی آنت کیا؟" وکیل صاحب باہر جاتے جاتے چونک سے گئے تھے۔

"ارے 'وہی۔۔۔ جو دس منٹ میں پک جاتے ہیں۔ پانی میں ابال کر۔" فرحت کو مارے جھنجلاہٹ میں نام تک بھول گیا تھا۔

"نوڈلز۔" وکیل صاحب نے ان کی یادداشت کو کوستے ہوئے چبا چبا کر کہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ایک ٹنڈا اٹھا کر ان کے سر پہ دے ماریں۔ آنکھوں پہ چربی چڑھ گئی تھی۔ سامنے رکھے پیکٹ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پھر وہ مزید باتوں کے تیر چلاتے چلاتے رک سے گئے تھے۔ گو کہ فرحت اور ان کے درمیان تلخ کلامی معمول کا حصہ تھی۔ جس میں فرحت کا اپنا جوش و خروش بھی دیدنی ہوتا تھا۔ لیکن آج فرحت گولہ باری کے دوران بھی بہت الجھی الجھی لگ رہی تھیں۔ جیسے شدید ٹینشن کا شکار ہوں۔ یا شدید ڈپریشن میں مبتلا ہوں۔

آخر کیا وجہ تھی؟ وہ مزید فائر کھولنے سے پہلے کچھ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ پوچھیں یا نہ پوچھیں۔۔۔ اور ابھی تک تو فرحت بھاپ سے چلنے والے چھوٹے انجن کی طرح دھواں چھوڑ رہی تھیں۔ اگر پوچھ لیتے تو پھٹ ہی پڑتیں۔ جانے کیا ہوا تھا؟ اور جانے کس کی شامت آنے والی تھی؟

"آج اسٹیمر سے بھاپ خاص اور قسم کی نکل رہی ہے۔ خیر تو ہے بیگم!" ان کا پوچھنے کا اسٹائل بھی بوکھری ٹائپ کا تھا۔ وہ جو نوڈلز کے لیے پانی ابال رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے گہری سوچوں کے اژدھام سے باہر آئیں اور پھر دوبارہ ڈوب گئیں۔ اب تو وکیل صاحب کچھ متفکر ہو گئے تھے۔ ان کے باہر نکلتے قدم پلٹ آئے تھے۔ یعنی وہ رزم گاہ کی طرف دوبارہ آئے تھے۔

"کچھ نیا ہوا ہے کیا؟" وہ خاصے متفکر تھے۔ فرحت اچانک خیالوں سے باہر آئی تھیں۔ پھر ان کی تیوری کے بل نمایاں ہو گئے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر زہر بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا تھا۔

"نیا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ابھی تک تو پرانا ہی بھگت رہے ہیں۔ اسی میں سرخرو ہو گئے تو بڑی بات ہے۔" ان کا لہجہ بھی آنچ دیتا تھا۔

"ہوا کیا ہے؟" وکیل صاحب کی آنکھوں میں لہری اٹھی تھی۔ فرحت نے چمچہ زور سے سلیب پہ پٹخا تھا۔ پھر گردن گھما کر شوہر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔

"سب کچھ کر کرا کے 'ہمارے حلق میں پھندا ڈلوا کر پوچھتے ہو 'ہوا کیا ہے؟" فرحت جیسے پھٹ پڑی تھیں۔

اور اب کے وکیل صاحب بھی کچھ کچھ سمجھ گئے تھے۔ تو کیا آج پھر محترمہ کو پرانے قصے یاد آگئے تھے؟ اور جیسے ہی فرحت کو بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی تھیں ایک لمبی لڑائی اور ایک طویل "دور جنگ" ضرور چلتا تھا۔

وکیل صاحب تو جیسے چھیڑ کر پچھتائے تھے۔

"اپنے قصور تو تمہیں بھول چکے ہیں۔" "نہیں بھی بلاوجہ ہی غصہ آگیا تھا۔ ورنہ ہزار مرتبہ سوچتے تھے کہ کم از کم اس موضوع پہ فرحت سے منہ ماری نہیں کریں گے مگر پھر بھی۔

"ہمارے گناہوں کی باری تو بہت بعد میں آتی تھی۔ پہلے تو تم نے ایسا دھکا دے کر کنویں میں گرایا تھا جو آج تک اسی کنویں میں بے بس پڑے ہیں۔ نہ نکل سکتے ہیں نہ کوئی نکالتا ہے۔" فرحت کا لہجہ غیض آلود ہو گیا تھا۔ وکیل صاحب بھی اس الزام پہ فل فارم میں آئے تھے۔

"تم جیسوں کو کون ہاتھ دے کر نکالے؟ جنہیں کھائی میں گرنے کا شوق ہو' وہ ٹھوکر لگنے سے بھی گر پڑتے ہیں۔"

"جہنم میں تم ہی نے جھونکا تھا۔" وہ اس معاملے میں کبھی بھی ہار نہیں مانتی تھیں۔

"جس جہنم کا واویلا کر رہی ہو تم۔ اس میں چنگاری تم نے سلگا کر خود جہنم بھڑکائی تھی۔ سارا قصور تمہارا تھا۔ تمہاری ہٹ دھرمی 'نام نہاد انا اور ضد کی وجہ سے نوبت یہاں تک آئی تھی۔"

وکیل صاحب دھیمی آواز میں تلخی سے بولے تھے۔ وہ چاہ کر بھی فرحت کی طرح اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔ فرحت تو انہیں دو کی چار سناتی تھیں' برتنوں پہ غصہ نکالتی تھیں' کچھ اور نہیں تو اپنی بھڑاس یہاں پہ انڈیل کر اس فرسٹریشن کے اثر کو زائل کر لیتیں۔ وہ خود کیا کرتے؟ کسے اپنے اندر کے زخم اور ناسور دکھاتے۔ اپنے اندر کے حبس کو کیسے باہر نکالتے؟ کس سے دکھ کا حال کہتے؟ کس پہ بھڑاس نکالتے؟ کس پہ غصہ کرتے۔

"اور جو تمہارے سگوں نے کیا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا؟ دولت کیا آئی آنکھیں بدل گئے تھے۔" فرحت غصے میں چیخ گئیں۔

"پیسے کی کمی انہیں پہلے بھی نہیں تھی۔" وکیل صاحب نے انہیں یاددہانی کروائی تھی۔

"ارے جہنم میں جائے ان کا پیسہ 'میری تو جوتی کو بھی پروا نہیں۔" فرحت اپنے ازلی جلال سے بولی

تھیں۔ وکیل صاحب ان کو تاسف سے دیکھتے رہ گئے تھے۔

"یہی تمہارے تب بھی کرتوت تھے۔ اپنی ناک نیچے نہیں آنے دیتی تھیں۔ حلیمی تم میں تھی نہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تھیں۔"

"اپنے سگوں پر تو تم آنچ نہیں آنے دو گے۔" انہوں نے مارے غصے کے برنر زور سے بند کیا۔ ساس پین اتار کر سلیب پہ پٹخا تھا۔

"میرے سگوں کے ساتھ تم بھی سگی بن جاتیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔" وکیل صاحب نے سابقہ تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"اب بھی ان ہی کی حمایت کرنا۔۔۔ ان ہی کو ٹھیک سمجھنا ساری غلطیاں سارے قصور ہمارے تھے۔"

فرحت نے لہجہ بدل لیا تھا۔ انداز بدل لیا تھا۔ اب ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ آنکھوں میں نمی بھی بھر بھر آئی۔ بس رونے کی کسر رہ گئی تھی۔ جیسے ہی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے اور وکیل صاحب میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ ان ہی آنسوؤں کے حربوں سے ہمیشہ فرحت انہیں رام کرتی آئی تھیں۔ یہ اور بات تھی کہ ساری بھڑاس نکال کر یہ حربہ بعد میں استعمال کرتی تھیں۔

"تم اپنی خوبد لتیں کچھ ذرا سا جھکاؤ لاتیں۔ تھوڑی حلیمی پیدا کرتیں تو آج وقت بہت مختلف ہوتا۔" وکیل صاحب کا لہجہ بھی بہت بوجھل ہو گیا تھا۔

"ارے ہم ہی پیر پکڑتے ناک نیچی کرتے تمہارے "ہوتوں سوتوں" کی منتیں کرتے تب ہی تم ہم سے خوش دکھائی دے سکتے تھے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھیں پھر سابقہ تنتناہٹ سے بول پڑیں۔

"لیکن میں نے بھی نوشابہ کی ضد کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ بڑی آئی تھی مجھ پہ رعب جمانے والی۔ بات یوں کرتی تھی جیسے میں اس کی زر خرید ملازمہ ہوں۔"

"اس سارے پروسیس میں نقصان کس کا ہوا؟ کبھی تم نے سوچا ہے اس بات کو؟" وکیل صاحب کے اگلے الفاظ نے یک دم فرحت کو خاموش ہونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ گھڑی بھر کے لیے گم صم ہو گئی تھیں۔

جیسے وکیل صاحب کی بات عین نشانے پہ لگی تھی۔ ان کا چہرہ بھی کچھ دیر کے لیے سفید پڑ گیا تھا۔ لیکن یہ کیفیت ساعت بھر کے لیے تھی۔ دوسرے ہی لمحے ان کی ازلی نخوت عود آئی تھی۔

"سارا قصور ہی تمہارا تھا۔ نہ تم غیر مناسب وقت میں غیر مناسب فیصلے کرتے اور نہ ہی ہمیں آج یہ دن دیکھنے پڑتے۔"

"اگر میں تقدیر کے ہاتھوں بے بس ہو گیا تھا تو تم ہی بعد میں عقل مندی کے ثبوت دیتیں۔ ہر رائی کو پہاڑ تم نے بنایا تھا۔" وکیل صاحب غصے میں بھڑک اٹھے تھے۔ معاً گیٹ پہ ہارن کی آواز آئی تو وکیل صاحب سمیت فرحت بھی بوکھلا گئی تھیں۔ ساری بحث سمٹ سمٹا کر ایک کونے میں گھسا دی گئی تھی۔ کیوں کہ بچیوں کے سامنے اس موضوع کو بہت ہی کم چھیڑا جاتا تھا۔ اور اس وقت وکیل صاحب اور فرحت دونوں ہی سابقہ تکرار کو بھلا کر بیرونی گیٹ پہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں سے فرحاں شاداں سی جینا' بیلا داخل ہو رہی تھیں۔

ان کے خوب صورت صحت مند سیبوں سے رخساروں پہ دھوپ کی تمازت' پسینہ اور کچھ بے زاری ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ کچھ جوش اور بے چینی سے بھی سرخ ہو رہے تھے اور ان کی کانچ سی نیلگوں آنکھوں میں ڈھیر سارا تجسس بھرا ہوا تھا۔ ایک جیسی شکلیں' ایک جیسے چہرے' ایک جتنے قد۔۔۔ یوں لگتا تھا' اللہ نے جڑواں سی یہ جوڑی بنائی ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ جینا اور بیلا میں صرف دس مہینے کا فرق تھا۔ اور یہ فرق اب بالکل غائب ہو چکا تھا۔ کیوں کہ دونوں کی شکلیں' جسامت اور بڑھوتری ایک ساتھ ہو رہی تھی۔ کوئی انجان تو مانتا ہی نہیں تھا کہ یہ دونوں بہنیں جڑواں نہیں ہیں۔ حتی کہ اسکول' کلاس بھی ایک ہی تھی۔ دونوں کی عادتیں بھی ایک سی اور دونوں کے مزاج اللہ کی پناہ۔۔۔ جانے مزاج کس پہ چلا گیا تھا؟ ایسا نخوت بھرا' شاہانہ' موڈی۔۔۔ ناک تلے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ فرحت اکثر ان کے نخروں پہ عاجز آجاتی تھیں اور پھر سوچنے لگتیں۔ یہ کس پہ چلی گئی ہیں؟ اور تب ذہن

پیچھے، بہت پیچھے کی طرف بلا سبب بہنے لگتا۔

"اسی پہ' بالکل اسی پہ۔۔۔ ویسی اکڑ' ویسا ہی نخرہ' ویسی ہی منہ پھٹ۔" اور اس کا تصور ہی فرحت کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ اسے خیالوں میں بھی نہیں آنے دیتی تھیں۔ جیسے ان کی خیالوں خیالوں میں ہی اس کمینے کے ساتھ منہ ماری ہو جائے گی۔

اور اس وقت جینا' بیلا کے بھاری بیگ اٹھا کر اندر لاتے ہوئے وہ سو مرتبہ اسے کوس چکی تھیں' جو اچانک اس دھوپ بھری دوپہر میں یاد آ گیا تھا۔ اور بڑے غلط وقت میں یاد آ گیا تھا۔

اور ابھی وہ دودھ سوڈے کا جگ بھر کے لاؤنج میں آئی ہی تھیں۔ تبھی جینا' بیلا سارے کمروں میں تانکا جھانکی کر کے اس وقت کچھ کچھ بجھی بجھی تخت پہ دھم سے بیٹھ گئیں۔ اور انہیں بیٹھتے دیکھ کر فرحت نے بے ساختہ ٹوکا تھا۔

"جینا' بیلا! اٹھو' پہلے یونی فارم بدلو۔ جرابیں اتارو' اور اپنے جوتے بیگ سنبھالو۔ دیکھو' پہلے ہی بہت پھیلاوا ہے۔ اوپر سے سیماں بھی نہیں آئی۔"

وہ اپنی جگہ پہ جمی رہی تھیں۔ ہلیں بھی نہیں۔ بلکہ نیلی نیلی آنکھوں میں ڈھیر سارا غصہ سمو کر ایک ساتھ بولیں۔

"ہم نے کچھ نہیں کرنا۔۔۔ کچھ بھی نہیں کرنا۔" دونوں نے تنک کر کہا تھا' اور ایک مرتبہ پھر ایک ایک کونے پہ نگاہ ڈالی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تلاش تھی۔ جو ناکام ہی رہی۔

"کیوں نہیں کرنا۔ یہ سوڈا تو پیو۔ باہر کیسی آگ پڑ رہی ہے۔ ایسی گرمی کہ حد نہیں۔ ساون گئے اور اپنا حبس پیچھے چھوڑ گئے۔" فرحت ان کی خفگی کا پس منظر جانتے ہوئے بھی نظر انداز کر رہی تھیں۔ اور اس محاذ پہ انہیں اکیلے ہی لڑنا تھا۔ وکیل صاحب بچیوں کی عدالت لگنے سے پہلے ہی بھاگ چکے تھے۔

"نیلی کہاں ہے؟ ابھی تک نہیں آئی؟ اتنا لمبا آفس ورک ختم ہو کے نہیں دے رہا۔ اسے ہمارا بالکل خیال نہیں۔" جینا کی موٹی موٹی آنکھوں میں پانی پھیلنے لگا تھا۔ اور یہی حال بیلا کا بھی تھا۔ جینا نے ابھی رونے کی ٹرائی ماری تھی۔ بیلا کے آنسو بھی چھلک پڑے تھے۔ یوں کہ فرحت گھبرا گئی تھیں۔ اب ان کے آنسو کون سنبھالتا! اگر چھڑ جاتیں تو پھر نیلم ہی انہیں کنٹرول کر سکتی تھی۔ فرحت کے بس کا روگ نہیں تھا۔

"سہ پہر تک پہنچ جائے گی۔" کچھ سوچ کر فرحت نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ گو کہ انہیں کنفرم نہیں تھا کہ نیلم سہ پہر تک پہنچ جائے گی۔ پھر بھی بچیوں کو کسی نہ کسی طرح بہلانا تو تھا۔

"پرامس؟" دونوں نے بے ساختہ چونک کر پوچھا تھا۔ ایک لمحے میں ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور یہ پرامس کوئی عام پرامس نہیں تھا۔ اگر وہ پرامس لے رہی تھیں تو اس کا مطلب تھا ہر صورت نیلم کا سہ پہر میں گھر پہنچنا' ورنہ تو اس گھر میں بھونچال آ سکتا تھا

مرتا کیا نہ کرتا فرحت کو سر ہلانا ہی پڑا تھا اور جیسے ہی انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں بچیاں ہرا کا نعرہ لگاتی غٹاغٹ سوڈے کا گلاس چڑھا گئی تھیں۔ پھر انہوں نے بغیر کسی نخرے کے یونی فارم بھی تبدیل کر لیے تھے۔ بیگ بھی سمیٹے' جوتے بھی اٹھائے۔ پھر منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی تھیں۔

"آج کیا پکا ہے؟" اب اگلا امتحانی مرحلہ شروع ہو چکا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے ٹنڈے' کدو بینگن کی بھری ٹوکری سلیب پہ دیکھی تھی۔ ایک دم جیسے چیخ ہی پڑیں۔

"ان میں سے کچھ پکا ہو گا' ہمارے کھانے کے لیے یہی رہ گیا ہے' بھوکا مار دیں ہمیں۔ صبح بھی دو پاپے کھلا کے بھیج دیا تھا۔ لنچ کے نام پہ کچھ بھی نہیں اور ابھی یہ ٹنڈے' کدو نہیں کھانا ہمیں۔" وہ پاؤں پٹخ کر رونے لگی تھیں اور رونا جیسے انہوں نے پلکوں پہ دھرا ہوتا تھا۔ جب دل کیا بھاں بھاں کرنے لگیں۔ اور ان دونوں

تو کچھ زیادہ ہی رونا مچا رکھا تھا۔ بات بے بات غصہ کرتیں' لڑتیں اور رونے بیٹھ جاتیں۔

فرحت تو اس صورت حال سے تنگ آچکی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا ایک ایک چماٹ لگا کر چپ کروا دیں۔ ان کی اپنی طبیعت اس اطلاع پہ صبح سے سخت بے زار تھی۔ اوپر سے ان بچیوں کے نخرے۔

"بڑے نواب آف دکن کی بیٹیاں ہو۔ جو صبح شام سات سات ہرن بھون کر تمہارے سامنے رکھے جائیں۔" فرحت اب اپنی ساری فرسٹریشن بچیوں پہ نکال رہی تھیں۔ جو اتنی بھی بچیاں نہیں تھیں جو ان کے طعنوں کو سمجھ نہ سکتیں۔ پورے دس سال کی جینا اور اس سے دس ماہ چھوٹی بیلا۔ انتہائی تیز طرار' حاضر جواب' ذہین' منہ پھٹ' ہوشیاری' چالاکی میں اپنے "ہوتوں سوتوں" کو مات کر دینے والی۔ انہی کے جیسی بد دماغ اور ہٹ دھرم اور اس وقت فرحت کے طعنے پہ جینا بلبلا اٹھی تھی۔

"ہرن کی ڈیمانڈ کون کرتا ہے؟ یہاں تو ایک منتھ میں چکن مل جائے تو اسی کو عید سمجھ لیتے ہیں۔ ہرن تو ہم خوابوں میں بھی نہ سوچیں۔"

"اور ہرن کو لائک بھی نہیں کرتے۔ اور ویجی ٹیبلز کو تو بالکل بھی نہیں۔ نیلی آلے تو بتاؤں گی۔ ہمیں ہر روز گھاس کھلائی جاتی تھی۔ اور اوپر سے کہا جاتا تھا کہ کس نواب کی بیٹی ہو۔" یہ بیلا تھی اسٹول پہ چڑھ کر چمچے سے ٹیبل بجاتی' بہت تیز لہجے میں بول رہی تھی۔ فرحت کا پہلے سے الٹا بھیجہ اور بھی الٹنے لگا۔

"کن بلاؤں میں پھنس گئی ہوں میں۔ وہ آتو لے ہوش ٹھکانے لگاتی ہوں اس کے بھی۔ مجھ سے نہیں قابو ہوتیں یہ چڑیلیں۔" فرحت نے اٹھ کر ساس پین چولہے پہ رکھا۔ برنر گھما کر آگ جلائی۔ اور اس دوران جینا بولتی رہی۔ ایک چپ کرتی تھی تو دوسری بولتی۔ اور کبھی اکٹھا شروع ہو جاتی تھیں اور تب یوں لگتا جیسے اس خاموش آشیانہ ثقلین میں زلزلہ آگیا ہے۔ اور وکیل صاحب کہتے تھے۔ ان بچیوں کے دم سے رونق تھی۔ اور کیا یہ رونق تھی؟ دماغ پلپلا کر رکھ دیا تھا۔ خود تو وکیل صاحب قیلولہ فرمانے بھاگ نکلے تھے' پھر دو بجے تک جمعہ ادا کرنے بھی جانا تھا۔ فرحت کو ان رونقوں کے درمیان پھنسا کر خود آزاد ہو چکے تھے۔

"یہ فاؤل ہے۔ نیلی کو بتاؤں گی۔ کبھی ہمیں بلائیں کہا جاتا ہے اور کبھی چڑیلیں۔" جینا نے انتہائی خفگی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ پھر دونوں اٹھ کر باہر جانے لگیں۔ یہ کھانے سے بائیکاٹ کا اظہار تھا۔

فرحت نے نوڈلز دو رکابیوں میں الٹ کر ان پہ کیچپ ڈالی تھی۔ اور پھر دونوں کو آواز دے کر خفگی سے روکا۔

"نواب صاحب کی بیٹیو! واپس آؤ کنیز نے تم دونوں کے طعام کا بندوبست کر رکھا ہے' بس باپ کی طرح بے صبری رہنا اور کمینگی دکھانا۔" فرحت نے میز پہ رکابیاں پٹختے ہوئے کھرا کاٹ دار طنز کیا تھا۔

وہ بھوک کی وجہ سے ادھ موئی ہو رہی تھیں۔ نوڈلز دیکھ کر ہرا کا نعرہ لگایا اور جیسے رکابیوں پہ ٹوٹ پڑیں۔ اور ان دونوں کو بے صبری سے نوڈلز کھاتے دیکھ کر جانے کیوں فرحت کی آنکھیں گیلی ہو گئی تھیں۔

کیسے چھوٹی چھوٹی نعمتوں کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔ ضد کرنا پڑتی تھی۔ رو کے بات منوانی پڑتی تھی اور کبھی "آشیانہ ثقلین" کی اوپری منزل پہ نعمتوں کے انبار لگے ہوتے تھے۔ لیکن ان دونوں کے نصیب میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

یہ ایک مصروف ترین بینک کا منظر تھا۔

اور آج پچھلے دنوں کی نسبت رش بھی بے بہا تھا۔ یوں لگتا تھا سارے شہر کی عوام اسی بینک پہ ٹوٹ پڑی ہے۔ عورتیں' جوان' بزرگ۔ اور عورتوں کے ساتھ آئے چیختے چلاتے بچے۔ پسینہ' گرمی' ایک دوسرے پہ سبقت لے جانے کے لیے بھگدڑ۔ کہیں بھی ڈسپلن نام کو نہیں تھا۔

بینک کی عمارت میں لگے اے سی بھی شدید حبس اور گرمی کا توڑ نہیں کر پا رہے تھے۔ پنکھے تک آگ

اٹک رہے تھے۔ اوپر سے کام کا اتنا ڈھیر تھا کہ حد نہیں۔

آج جمعہ کے دن ہی نہیں 'کلوزنگ ڈے' بھی تھا۔ سو "بیتا" کام کا بوجھ بھی زیادہ تھا۔ اسے آج ہی سارا کام ختم کرنا تھا۔ ہر صورت' ہر قیمت پہ۔ کچھ فائل ورک ہو چکا تھا اور کچھ پہ کام ہو رہا تھا۔

اوپر سے اس کا بجتا موبائل۔ گھنٹی پہ گھنٹی' یوں لگتا تھا کوئی ری ڈائل پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے۔ جب اس نے موبائل اسکرین دیکھنا بھی گوارا نہیں کی تو پھر میسجز کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر منٹ کے بعد میسج آتا۔ ہر سیکنڈ کے بعد بیپ بجتی۔ یوں ایک گھنٹہ مسلسل موبائل بج بج کے خاموش ہو گیا تھا اور اسے موبائل کو پرس سے نکال کر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں نصیب ہوئی تھی۔

اللہ اللہ کر کے بارہ بجے تک کام ختم ہوا' کلوزنگ شروع ہوئی تو وہ منیجر کو سارا ریکارڈ دے کر اپنا پرس وغیرہ سنبھالتی لونگ روم میں آگئی تھی۔

یہاں پہ اسٹاف اس کے فارغ ہونے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اور انہوں نے الوداعی لنچ میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ کیونکہ آج اس بینک میں اس کا آخری دن تھا۔ پیر سے وہ اپنے شہر کی برانچ میں چارج لینے والی تھی۔ کیوں کہ ایک ہفتے تک اس کی پروموشن ہونے والی تھی۔ پیر کو اس نے اپنی برانچ میں بطور منیجر چارج سنبھالنا تھا۔ وہ اپنی برانچ کی سب سے زیادہ محنتی اور کمیٹڈ ورکر تھی۔ اس کی پروموشن کے چانس بھی اس کی محنت' لگن اور ایمان داری کو دیکھ کر بنے تھے۔

کیوں کہ وہ جان توڑ کر کام کرنے کی عادی تھی۔

پھر محنت تو اسے کرنا ہی تھی۔ اپنے لیے نہ سہی' اپنوں کے لیے ہی سہی۔

اور اس وقت وہ لنچ پہ اسٹاف سے معذرت کرتی واپس جانے کے لیے پر تول رہی تھی' جب منیجر صاحب نے اسے زبردستی روک لیا۔ بقول منیجر صاحب کے انہوں نے محض اس کے لیے الوداعی لنچ پہ اتنا اہتمام کیا ہے۔ سو اس کا ان کے خلوص کو ٹھوکر مار کے اٹھ جانا بدتہذیبی کے زمرے میں آتا تھا۔

پھر جب روسٹ کا چھوٹا سا پیس' تھوڑا سا رشین سلاد اور آدھا گلاس کوک کا بھرتے ہوئے خیال پیچھے گھر کی طرف پرواز کرنے لگا تو ایک ایک نوالہ حلق میں اٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"وہ کیا کھا رہی ہوں گی اس وقت؟" کوک کا چھوٹا سا گھونٹ پی کر اس نے بمشکل نوالہ نگلنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی سبزی؟ جو انہیں پسند نہیں' کوئی دال جسے دیکھ کر پلیٹ فرش پہ جا گرے۔" وہ ہونٹ کاٹتی عجیب سی اداسی کا شکار ہو گئی تھی۔ سامنے پڑی نعمتیں کاٹنے سی لگیں۔ وہ کیسے یہ سب کھا رہی تھی؟ وہ کس طرح سے کھا رہی تھی' بھوک اچانک مٹ گئی تھی۔ اور کھانے کی خوشبو تک گراں گزر رہی تھی۔

اس کا ہاتھ بے ساختہ پہلو میں جا گرا تھا۔ اور پلیٹ واپس اپنی جگہ پہ پہنچ گئی۔ منیجر صاحب نے اس کی بے دلی فوراً" نوٹ کر لی تھی۔ تبھی انہوں نے زبردستی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔

"سفر میں جاتے ہوئے خالی پیٹ نہیں نکلتے۔ صبح سے کام کر رہی ہو۔ آرام سے کھانا کھاؤ۔ تمہاری کوچ نہیں نکلتی۔" منیجر صاحب کے بے حد اصرار پہ اس نے تھوڑا سا کھانا بمشکل کھایا تھا۔ پھر ان کی محبت' خلوص اور مدد کے لیے بہت سا شکریہ ادا کر کے خدا حافظ کہتی بینک کی عمارت سے باہر نکل آئی تھی۔

کیوں کہ آج اس کا یہاں آخری دن تھا۔

بینک کی وین اسے اسٹاپ تک چھوڑ گئی تھی۔ اور یہاں سے دو تین گھنٹوں میں وہ اپنے شہر پہنچ جاتی۔ لیکن جانے سے پہلے اسے کچھ لینا چاہیے تھا؟؟ وہ بے خیالی میں پرس کھنگالنے لگی تھی۔ کچھ بچت کی رقم بالآخر ایک پاؤچ سے مل ہی گئی تھی اور سامنے ہی روڈ کراس کرنے کے بعد "چین ون ٹاور" تھا۔ اس کا دل جیسے للچا گیا۔

وہ جنیا' بیلا کے لیے کچھ زیادہ نہیں لیکن ایک ایک فراک تو لے سکتی تھی۔ اور وہ دونوں کس قدر خوش ہو جاتیں۔ دو ہفتے بعد ان کے اسکول میں سمر پارٹی بھی

تھی۔ سو کپڑوں کی ضرورت تھی ساتھ جوتوں کی بھی۔ پرانے سینڈل اب کچھ رف ہو چکے تھے۔ پھر جس اسکول میں وہ دونوں پڑھ رہی تھیں۔ وہاں امراء کے بچوں کی زیادہ تعداد تھی۔ بچے رنگ رنگ کے ہر پارٹی میں لباس پہن کر آتے تھے۔ یوں جنیا' بیلا بھی اس کا ناک میں دم کر دیتی تھیں۔

وہ ہر فنکشن کے لیے نئے کپڑے سنواتیں۔ چاہے' رو کر' چاہے ضد کر کے' چاہے خاموشی کے ساتھ اور نیلم کو ہر بات ہر دفعہ ماننی پڑتی تھی۔ ورنہ ان کے آنسو۔ اف جنہیں دیکھنے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔

ان دونوں کے آنسو دیکھنا' اس کی برداشت سے بہت اوپر کا کام تھا۔

اور اس وقت چین ون ٹاور میں گھوم پھر کر اسے دو بہت نفیس فراک اور میچنگ کے نفیس سے سینڈل مل گئے تھے۔ یوں وہ دل میں بہت ہی الوہی سا سکون سمیٹ کر اپنے شہر کی طرف جانے والی کوچ میں بیٹھ گئی تھی۔

اب دل میں کوئی خلش نہیں تھی۔

اس نے امی کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ جینا' بیلا کو اچانک جا کر سرپرائز دینا چاہتی تھی اور اس وقت کوچ انسانی جانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی' جب ایک مرتبہ پھر اس کو موبائل چنگھاڑنا شروع ہو گیا تھا اور نیلم ابھی پرس کھول کر موبائل نکالنا چاہتی ہی تھی' جب کوچ نے زوردار جھٹکا کھایا تھا اور ایک آنٹی اس کے اوپر آگریں۔ نیلم اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا سر بری طرح سے کھڑکی کے کنڈے سے ٹکرایا تھا اور نیلم کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

آنٹی بھی اس دوران اپنے بھاری جثے کو سنبھال چکی تھیں۔ نیلم کے سرخ چہرے پہ تکلیف کے آثار دیکھ کر بڑے بڑے دانت نکال کر مسکرانے لگیں۔

"کوئی گل نئیں پتر! شیراں نوں لگدیاں رہندیاں۔" آنٹی نے بڑے عام لہجے میں اپنے تئیں معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔ جبکہ نیلم کو ان کی بات بڑی اندر تک چبھی تھی۔ سر پہ لگنے والی چوٹ کا درد اچانک گم گیا تھا اور یہ بات تو اس کے ابو بھی عموماً" کہا کرتے تھے۔

"چوٹ اسی کو لگتی ہے جو بہادر ہو اور چوٹ سہنے کی ہمت رکھتا ہو۔" ابو کی آواز اسے اذیت کی گہرائی میں لے گئی تھی۔ وہ کبھی بھی ابو کو بتا نہیں سکی تھی کہ نہ وہ بہادر ہے نہ اس میں چوٹ سہنے کی طاقت ہے۔ اس پہ جو بھی گزرا تھا۔ اس کی ہمت اور طاقت سے بڑھ کر گزرا تھا۔

بہت پرانی بازگشت میں کھو کر وہ ایک مرتبہ پھر بجتے موبائل کو نظرانداز کر چکی تھی۔ ایک تو گھٹن' گرم لو' اوپر سے انسانوں کا ہجوم۔ پسینے کی بدبو اور باتوں کا عجیب بے ہنگم شور۔ اس کا زپ کی طرف بڑھتا ہاتھ اچانک رک گیا تھا۔

شاید گھر سے کال ہو یا پھر۔

"خیر جو بھی ہو کوچ سے اتر کر دیکھوں گی۔" اس نے پرس کو بند ہی رہنے دیا تھا۔ پھر مٹھی میں پکڑا کرایہ کنڈیکٹر کو تھما کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

گو کہ شدید لو کے تھپیڑے چل رہے تھے۔ پھر بھی وہ گردن باہر نکال کر اس گھٹن زدہ ماحول کی کثافت کم کرنا چاہ رہی تھی۔ معاً" اس کے شہر کی حدود شروع ہونے لگی تھیں۔

اس گھٹن' گرمی اور حبس میں یوں لگا تھا کہ باد صبا کا جھونکا منہ سے ٹکرا گیا ہے۔ اس کے انگ انگ میں خوشی اور سرشاری بھر گئی تھی۔

جینا اور بیلا سے ملنے کی خوشی میں اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی دن لگ گئے تھے۔ حالانکہ وہ اکثر ٹریننگ کے لیے بھی شہر سے باہر جاتی رہتی تھی۔ لیکن تب جینا' بیلا اتنی بڑی نہیں تھیں امی کے بہلانے سے بہل جاتی تھیں۔ لیکن اب صورت حال کچھ مختلف تھی۔ رات کو بھی امی کی کال آئی تھی۔ اور وہ ان دونوں سے ناک تک عاجز آئی لگتی تھیں۔

باقی ساری چیزیں تو ایک طرف ان دونوں کو کھانا کھلانا کے تو سر کرنے کے برابر تھا۔ اور اگر کھانا من

پسند ہوتا تو؟ پھر کیا ہی کہنے ہوتے۔ وہ دونوں شاہانہ مینو پسند کرتی تھیں۔ ہائی فائی ٹائپ کا۔ جو کہ نیلم کی اوقات اور بساط سے بہت بڑھ کے ہوتا۔

اس کی بڑی اچھی سیلری تھی۔ پروموشن کے بعد بیس ہزار کے قریب۔۔۔ لیکن جینا بیلا کا اسکول بھی شہر کا نامور اسکول تھا۔ جس کی فیس 'فنکشنز' وین کا کرایہ اور بچیوں کو مین ٹین رکھنے میں ساری تنخواہ ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے آج تک گھر پہ ایک روپیہ نہیں لگایا تھا۔ صرف بچیوں پہ لگتا "انہی پہ خرچ ہوتا۔ بچیاں پھر بھی ناخوش تھیں۔ کیونکہ ان کی ڈیمانڈ صرف اچھا اسکول نہیں تھا۔ اچھا پہناوا بھی تھا۔ سب سے زیادہ اچھا کھانا۔

اور کھانے کا مسئلہ اس گھر میں مسئلہ کشمیر بنتا جا رہا تھا۔

ابو کی محدود پینشن میں گھر چلانا امی کے لیے بھی بہت مشکل تھا۔ اوپر سے جینا' بیلا کی فرمائشیں جو دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔

اور اس وقت کوچ سے اتر کر وہ جینا بیلا کو سمجھانے کے بارے میں الفاظ سوچ رہی تھی' جب اپنے ہی اسٹاپ کی ایک تکہ شاپ سے اس نے تکہ اور ونگز' فرائز' پیک کروا لیے تھے۔ ساتھ کوک کے ٹن بھی اور جیسے ہی وہ اپنی پرانی کالونی میں داخل ہوئی موبائل نے پھر سے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

اب کی بار نیلم نے جلدی سے پرس کھول کر موبائل نکالا تھا اور جھٹ سے آن کر کے کان سے لگا لیا۔ موبائل آن کرنے سے پہلے اس نے اسکرین چیک کی تھی اکتالیس مسڈ کالز اور اکیاون میسجز کو دیکھ کر اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"اب بھی کال پک نہ کرتیں کیا ضرورت تھی۔ یہ تو میں ہوں۔ تمہارے پیچھے پاگل۔ سوہلا نا ہوا۔ تمہیں تو پروا بھی نہیں ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ شہر سے باہر گئی تھیں تم۔ دنیا سے نہیں' یہ نہیں پتا کوئی کس قدر پریشان ہو گا۔ کیسے کیسے وہموں میں پڑا ہو گا۔ میری تو جان پہ بنی ہوئی تھی۔ جانے تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ تم بیمار نہ ہو چکی ہو۔ یا پھر خدانخواستہ کچھ اور۔۔۔ اور تمہیں ایک میسج پہ اپنی خیریت بتا دینے کی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی۔"

خرم جو بولا تو نان اسٹاپ ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کا غصہ بجا تھا۔ اور وہ ٹھیک ہی نیلم پہ ابال نکال رہا تھا۔ واقعی ہی وہ خرم سے رابطہ نہیں کر سکی تھی' بلکہ وہ تو گھر میں بھی بہت کم بات کر سکی تھی۔ امی سے ایک آدھی مرتبہ بات ہوئی تھی۔ جینا' بیلا سے تو وہ بھی نہیں۔

اور ابھی اسے گہرا سانس کھینچ کر خرم کو وضاحت دینا تھی۔ اسے منانا بھی تھا اور اس کا غصہ بھی کم کرنا تھا۔ گو کہ بینک میں اتنا کام کرنے کے بعد' پھر اتنی شدید گرمی میں سفر کر کے دماغ پلپلا رہا تھا۔ طبیعت بے زار تھی۔ اور تھکن سے انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس ساری تکلیف اور تھکان کو ایک طرف رکھ کے اسے خرم سے فریش اور تر و تازہ لہجے میں بات کرنا تھی۔

یوں اس نے گلا کھنکھار کے اپنے آپ کو بمشکل ہی تازہ کیا تھا۔ پھر قدرے نرم آواز میں بولی۔

"خرم! میری بات سنو۔۔۔ میں تو۔"

خرم نے اچانک اس کی بات اچک کر کاٹ دی تھی۔

"کوئی ایکسکیوز نہیں۔ کوئی وضاحت نہیں "کیا تمہیں ایک میسج ٹائپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا؟"

وہ غصے سے چبا چبا کر بولا تھا۔

نیلم فٹ پاتھ پہ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لیے رک گئی۔ یہ شہتوت کا سایہ دار درخت تھا۔ نقوی انکل کے گھر کی بیرونی دیوار سے لگا ہوا۔ گیٹ کے برابر کیبن کے پاس ان کی پوتی سوہا کی سائیکل کھڑی تھی۔ جسے دیکھ کر نیلم کو جینا بیلا کی فرمائش یاد آ گئی تھی۔ اس سالگرہ پہ ان دونوں نے بے انتہا شور مچایا تھا کہ دو نہ سہی' نیلم ایک ہی سائیکل لے دے۔ وہ دونوں باری باری چلا لیا کریں گی۔ مگر نیلم کا وہی رونا۔۔۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ نکل آتا کہ ساری بچت ہوا ہو جاتی تھی۔

اس وقت شہتوت کے درخت تلے کھڑے ہو کر نقوی انکل کے پرانے طرز پہ بنے بنگلے کو دیکھتے ہی

اسے کچھ خیال آیا تھا۔ یہ ایک عجیب سا خیال تھا۔ چونکا دینے والا۔

وہ تھوڑا اچک کر باؤنڈری وال سے دیکھنے لگی۔ ڈرائیو وے پہ چم چم کرتی ہنڈا سوک کھڑی تھی۔ بالکل نئی "کیا نقوی انکل نے نئی گاڑی لے لی تھی؟

اس کی بے سمت نکلتی سوچوں کو بریک تب لگے تھے جب اس کی طویل خاموشی پہ خرم چلا اٹھا تھا۔ تب نیلم حواسوں میں آ کر ایک مرتبہ پھر منمنائی تھی۔

"یقین کرو' ٹائم ہی نہیں۔" اس کی منمناہٹ کو خرم نے لمحہ بھر میں ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

"میرے سامنے مصروفیت کا رونا مت رو کر دکھانا۔" خرم نے اسے دھمکایا تھا۔ "کیا تمہیں دو لفظ ٹائپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملا؟" خرم کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ شہتوت کے نیچے ایک پتھر پہ بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔ اسٹاپ سے یہاں تک آنے میں ہی اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔

"خرم! پلیز' میری بات تو سن لو۔ اتنا کام کا برڈن تھا۔ کلوزنگ چل رہی تھی۔ نہ میں کال پک کر سکی نہ خود کرنے کا وقت ملا "اور اس ایک ہفتے کے دوران میری جینا بیلا سے بھی بات نہیں ہو سکی۔" ابھی وہ خرم کو مزید وضاحت دے کر ٹھنڈا کرنا چاہتی ہی تھی جب اچانک خرم نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا تھا یوں کہ لمحہ بھر کے لیے نیلم "سن" سی ہو کر رہ گئی تھی۔

"میں جینا' بیلا نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ بہت کھردرا تھا۔ بے انتہا کھردرا گو کہ الفاظ اتنے برے نہیں تھے پھر بھی نیلم کو بہت ہی برے لگے تھے۔ اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ جتائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"تم جینا بیلا ہو بھی کیسے سکتے ہو؟" نیلم کا روکھا انداز ملاحظہ کر کے خرم کو شدت کے ساتھ اپنے الفاظ کی تلخی کا احساس ہو گیا تھا۔ معا" اس کا انداز معذرت خواہانہ ہو گیا۔

"آئم سوری تمہاری لاپروائی نے مجھے اتنا روڈ کر دیا۔ تم سے دوری نے میری یہ حالت بنا دی۔ قائم مقام منیجر سے دو مرتبہ ڈانٹ کھائی آج۔ بس یہی دعا کر رہا تھا تم جلدی سے آ کر چارج سنبھال لو۔ میری بھی بخشی تم ہو۔" خرم واپس پرانی جون میں لوٹ آیا تھا۔ اس کا غصہ بھی پہلے سے کم ہوا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"جہنم میں۔" نیلم نے ترشی سے کہا تھا۔ خرم کے لہجے میں لجاجت بھر گئی تھی۔ اب وہ نیلم کی خفگی کم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ "جینا بیلا" ایسا موضوع تھا جس پہ وہ اپنی ماں کی بھی نہیں سنتی تھی۔ پھر خرم کی کیسے سن سکتی؟

"غصہ جانے دو نیلم! تم میری پریشانی کو جانتیں نہیں نا۔۔۔ اسی لیے میری جان پہ بنی ہوئی تھی۔ دو مرتبہ تمہارے گھر جانے کا بھی سوچا تھا۔ لیکن پھر مناسب نہیں لگا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو خود اڑ کر تمہارے پاس آ جاتا۔" خرم نے اس انداز میں منت کی کہ نیلم کو مانتے ہی بنی تھی۔ ویسے بھی خرم کو بڑی جلدی منانا آتا تھا۔ اور یہ اس کی بہت اچھی عادت تھی۔ نیلم روٹھتی وہ منا لیتا۔ روٹھنا' خفا ہونا' جلدی غصہ کر جانا نیلم کی فطرت کا حصہ تھا۔ اور یہ عادت آج کی نہیں تھی۔ بچپن کی تھی۔ اور اگر خرم اسے منایا نہ کرتا تو ایک بات طے تھی۔ نیلم کو خود سے پیچھے لپک لپک کر آواز دینے کی عادت نہیں تھی۔ شاید یہ عادت اس نے امی سے چرائی تھی۔ ہاں' جس جگہ اس کی غلطی ہوتی۔ وہ ایکسکیوز بھی کر لیتی تھی۔ کوئی مانتا یا نہ مانتا یہ مقابل پہ منحصر تھا۔

"اٹس او کے خرم!" نیلم بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

اور خرم اسی بات پہ خوش ہو گیا تھا۔

"تھینک یو۔۔۔" وہ بے طرح کھلکھلا کر بولا۔ "اب بتاؤ ملو گی کب؟" خرم آئندہ کا پروگرام جاننا چاہتا تھا۔

"بینک میں۔" نیلم نے کچھ سوچ کر بتایا تھا۔ خرم جیسے چیخ پڑا۔

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر۔" وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاپر اور پرس احتیاط سے دوسرے ہاتھ میں کیا تھا۔

"بینک پیر کو کھلے گا۔ اور میں تب تک انتظار نہیں کر سکتی۔" خرم نے جتلایا۔ نیلم کچھ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ معا" نقوی انکل کے بنگلے کا گیٹ کھلا تھا۔ نیلم جلدی سے شہتوت کے تنے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ وہی ہنڈا سوک بیک ہوئی پھر روڈ پہ سیدھی ہو گئی تھی۔ فرنٹ سیٹ پہ وقاص تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ کون تھا، نیلم کو یوں لگا جیسے وہ پتھر ہو گئی ہے۔ سن ہو گئی ہے۔ کسی مجسمے میں ڈھل گئی ہے۔

اور اگر وہ وہی تھا جسے نیلم کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ پہچان رہی تھیں تو پھر یہ کیسا بھیانک انکشاف تھا۔ جو کھڑے کھڑے اس کی ذات پہ اترا تھا۔ اور اسے لمحوں میں کیا سے کیا بنا گیا تھا؟

وہ لمحوں میں کسی بے جان بت کی طرح اپنی جگہ پہ جم گئی تھی۔ وہ جیسے کسی مورت میں ڈھل گئی تھی۔ پچھلی سیٹ پہ سہا بیٹھی تھی اور وہ لٹک کر آگے کی طرف ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے بندے کی طرف جھول رہی تھی۔ یہ لاڈ کا ایک معصومانہ انداز تھا۔ وہ اس کا گال چومتی کھلکھلائی تھی۔ پھر گاڑی زن سے نیلم کے سامنے سے گزر کر دور ہوتی چلی گئی تھی۔ یوں کہ بالکل نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

اور نیلم بے جان سی کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کھڑے ہونے پہ بھی حیرانی تھی۔ اسے اپنے چلنے پہ بھی حیرانی تھی۔ اسے اپنے زندہ ہونے پہ بھی حیرانی تھی؟ کیا وہ اتنے بڑے انکشاف کے بعد بھی چل رہی تھی؟ اور کیا وہ اسے دوبارہ زندہ سلامت دیکھ کر بھی چل رہی تھی؟ نیلم کا دل جیسے تپتی سہ پہر میں جل گیا تھا۔ اور یہ لمبی سڑک پل صراط بن گئی تھی۔ جس کے آخری کونے پہ "آشیانہ ثقلین" تھا اور وہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔ اور اس کے پیر بھی چل کے نہیں دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا پیروں میں چکی کے بھاری پاٹ بندھ گئے تھے۔ ایک ایک قدم اٹھانا محال تھا۔

اور اس کے ہاتھ پہلو میں لٹک گئے تھے۔ موبائل سے آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ اور اس کے دل سے بھی آواز آنا بند ہو چکی تھی، پھر اسے اچانک ہی چلتے چلتے ٹھوکر لگی تھی۔ اور بڑی زور کی ٹھوکر لگی تھی۔ تب بمشکل سنبھلتے ہوئے اسے جھٹکا سا لگا تھا۔ پھر جیسے وہ حواسوں میں آ گئی تھی۔ وہ کمینہ یہاں کیسے؟ کہاں سے؟ کیونکر؟ وہ یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ وہ واپس بھلا کیسے آ سکتا ہے؟" کیا یہ نیلم کا الوژن تھا؟ کیا اتنا برا الوژن تھا۔ سورج کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔

دھوپ بھی تیزی سے سمٹی ہوئی دیواروں کے ساتھ چپک رہی تھی۔ صحن کا فرش ابھی تک جوں کا توں تھا۔ ویسا ہی گرد سے اٹا، دھول مٹی ہوا۔ غبار آلود پتوں، ٹوٹی ٹہنیوں، شاخوں اور گلے سڑے پھلوں کے ڈھیر بھی ویسے کے ویسے جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔

اور آج ہی ایک بجے تقریبا" دو مزدور ٹائپ لڑکے اور دو نوکرانیاں جو نقوی صاحب کے گھر کام کرتی تھیں۔ آشیانہ ثقلین میں بے دھڑک آئے تھے۔ اور بیرونی بل کھاتی چم چم کرتی ٹائلوں والی سیڑھیوں سے اوپر والے جدید طرز پہ بنے پورشن میں گھس گئے۔

پھر تین چار گھنٹے اوپر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ بھاری فرنیچر کے گھسیٹنے، فرش دھونے کی شڑاپ شڑاپ بھی کانوں کو سخت بری لگ رہی تھی۔

پھر کافی دیر بعد اوپر والے پورشن کی ایک ایک چیز کو لشکا کر بیرونی ماربل کی سیڑھیوں کو دھو دھا کر وہ چاروں ہاتھ جھاڑتے نکل گئے تھے۔

اور تب سے ہی فرحت کے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے۔ پیروں میں بھی لگ گئے تھے۔ وہ تکون لاؤنج میں چکر لگا لگا کر تھک گئیں تو صحن میں آ کر تخت پہ ڈھے گئی تھیں۔ دھونکنی کی مانند چلتی سانسوں سے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اوپر والے پورشن کی خوب صورت بالکونیاں مغرور سی آنکھوں میں استہزاء بھرے انہیں دیکھتی شان سے کھڑی دکھائی دی تھیں۔ اس حالت میں کہ سارے دروازے، کھڑکیاں ہوا کی غرض سے کھلے ہوئے تھے۔ اور جس کا مطلب تھا؟ وہ لوگ آیا ہی چاہتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی فرحت کے

اندر کوئی لونٹیاں لگانے لگا تھا۔ دل میں بے چینیاں سی بھر گئی تھیں۔

"کیا پتا، میرا انداز غلط ہو، اور مبینہ کی اطلاع بھی، یہ صفائی تو ہر چھ مہینے بعد کروائی جاتی ہے۔ ابھی پچھلے مہینے بھی سارا نیا پینٹ کروایا گیا تھا۔ فرنیچر، پردے تک بدل دیے تھے۔ ہاں جی، ساری بات ہی ٹکوں کی ہے۔ جس کے پاس چند ٹکے، اس کی عزت اس کا سب کچھ۔" فرحت نے آنکھوں میں ڈھیر سارا تنفر بھر کے اوپر والے پورشن کی طرف دیکھا تھا، پھر ایک اور وہم میں مبتلا ہو گئیں۔

"ابھی وہ آفتیں اٹھیں گی تو سوالوں کا لمبا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ اوپر والا گھر کس کا ہے؟ اس کے تالے کس نے کھولے ہیں؟ وہاں کون آئے گا؟ ہم اوپر جا سکتے ہیں؟ کتنا پیارا پورشن ہے ڈراموں جیسا ہم اوپر جائیں گے اندر سے دیکھیں گے۔" فرحت کا سوچ سوچ کر دماغ پلپلانے لگا تھا۔

نگاہ اوپر سے پھسلتی ہوئی نیچے کی طرف آئی تو یوں ہی لگا کسی محل سرا کو دیکھتے دیکھتے اچانک کھنڈرات پہ نظر پڑ گئی ہو۔ گو کہ نچلی منزل بھی بہت اچھی مضبوط بنی ہوئی تھی۔ لیکن عدم توجہی کے باعث، اس کی حالت اوپر کی نسبت کافی شکستہ تھی۔ جگہ جگہ سے پینٹ اکھڑ رہا تھا۔ دروازوں، کھڑکیوں، روشن دانوں کا روغن اتر چکا تھا۔ ہر برسات کے بعد وہ سوچتی تھیں کہ اس دفعہ بچت کے بعد پینٹ ضرور کروائیں گی۔

لیکن ہوتا کیا؟ ہر دفعہ بچت کی رقم ہوا میں اڑ جاتی تھی۔ کبھی پانی کا بل زیادہ آ جاتا تو کبھی بجلی کا اور سارے ترقیاتی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے تھے۔ اوپر سے جنا بیلا کی دہائیاں۔

"ہمارا گھر سہا جیسا کیوں نہیں؟ ہماری ساری فرینڈز کے گھر اتنے پیارے ہیں۔ بس ایک ہمارا گھر گندا ہے۔ اتنی انسلٹ ہوتی ہے اپنی فرینڈز کو لاتے ہوئے۔"

ان کے چلانے پہ فرحت ڈپٹ کر ان کا منہ بند کروا دیتی تھیں۔

"وہ یہاں ملنے کے لیے آئیں گی یا رہنے کے لیے۔ حد ہے، اتنی اتنی سی بچیوں کو کبھی بھی نہیں چھوٹی چاہیے۔ اپنی عمر کے حساب سے باتیں کرنی چاہیے۔"

تب جنا بیلا کا منہ تو بند کروا دیتی تھیں، لیکن اپنی لا محدود سوچوں کا کیا کرتیں؟ کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھیں۔ یہ گھر آہستہ آہستہ کھنڈر بنتا جا رہا تھا۔ آخری مرتبہ بھلا کب روغن کروایا گیا تھا؟ شاید تیمور کی شادی پہ ثقلین نے ہی آنا" فانا" مزدور لگوا کر دونوں حصے پینٹ کروا دیے تھے اور اس کے بعد نچلی منزل پہ نظر کرم ڈالنے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی تھی۔ ہاں اوپر باقاعدگی سے پینٹ وغیرہ ہوتا تھا اور جیسے ہی بہت سی پچھلی باتوں کی طرف دھیان گیا تھا ان کے سینے میں آگ سی جلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کڑھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف آ گئیں۔

وکیل صاحب جمعہ پڑھنے کے بعد سے اب تک سو رہے تھے۔ فرحت کی ساری دوپہر لحظہ بھر کے لیے بھی آنکھ نہیں لگی تھی اور یہ کیسے اطمینان سے خراٹے لے رہے تھے۔

انہوں نے سلگتے ہوئے وکیل صاحب کو جھنجوڑ کر اٹھایا تھا اور وہ بھی جیسے بیگم کے جھنجوڑنے کے ہی انتظار میں تھے۔ لحظہ بھر میں ہی اٹھ گئے تھے۔ پھر اپنی عینک اٹھا کر ناک کی پھننگ پہ رکھتے ہوئے سہمے انداز میں بولے۔

"کیا زلزلہ آ گیا ہے؟"

"آیا تو نہیں، بس آیا ہی چاہتا ہے۔" فرحت کا انداز کاٹ دار تھا۔ وکیل صاحب جمائی روکتے ہوئے سیدھے ہوئے۔

"تمہیں پہلے سے الہام ہو گیا؟"

"کبھی کسی بات پہ غور کیا ہو تو پتا چلے۔" وہ کڑھ کر رہ گئی تھیں۔

"تم جو غور کرنے کے لیے موجود ہو۔" انہوں نے بھی طنزیہ انداز اپنایا تھا۔ فرحت شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھورتی رہ گئی تھیں۔

"ویسے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔" وہ پلنگ کے نیچے سے سلیپر ڈھونڈتے ذرا دیر کے لیے رکے تھے۔
"ساری زندگی تم نے غور و فکر کر کے کون سا تیر مار لیا ہے؟" ان کا انداز اس قدر سنجیدہ کہ لحہ بھر کے لیے وہ چپ ہو گئی تھیں پھر ترخ کر بولیں۔
"تم نے بھی ساری زندگی صرف باتیں بنائی ہیں۔"
"چلو، کچھ تو کیا ہے نا... باتیں ہی سہی۔ اور تم تو اچھی بات بھی نہیں کر سکتیں۔ جب کی دل جلانے والی بات ہی کی۔ تمہاری زبان کے شر سے کبھی کوئی محفوظ نہیں رہا۔" وکیل صاحب بھی میٹھے طنز کی مار مارتے اٹھ کر واش روم میں چلے گئے تھے۔ جب واپس آئے تب بھی فرحت کو سوچوں میں گم ہی پایا تھا۔ جانے کیا مسئلہ تھا؟ صبح سے ہی مراقبے کے یہ دورے وقفے وقفے سے پڑ رہے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔ پھر گلا کھنکھار کر مخاطب ہوئے تھے۔
"تم چائے ہی لے آتیں۔ ساتھ پکوڑے بنا لیتیں۔ جینا، بیلا خوش ہو جاتیں۔" انہوں نے ڈرتے ڈرتے ہی اپنی فرمائش بیگم تک پہنچائی تھی۔ چائے کی تو طلب بھی ہو رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت وہ لازمی چائے کا کپ لیتے تھے۔
"اپنے چسکوں میں جینا بیلا کا نام مت رکھا کرو۔" فرحت نے بھی صبح والا طنز واپس انہیں لوٹا دیا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھسیا گئے تھے۔
"کوئی بھی پوائنٹ مس نہیں کرتیں تم۔" انہوں نے اپنی کھسیاہٹ دور کرتے ہوئے کہا تھا۔
"تم ہی سے سارے داؤ سیکھے ہیں۔" فرحت نے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔
"جیسے تم تو بڑی بھولی تھیں۔" وہ بھی کھرا جواب دیے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ بحث اچانک کسی اور سمت نکل رہی تھی۔ اور فرحت پہ جھنجلاہٹ سوار تھی۔ وہ کس کام کے لیے آئی تھیں۔ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ وہ پہر میں بھی جب بات کرنا چاہی تو جینا بیلا اسکول سے آ گئی تھیں۔ پھر وکیل صاحب بھی سونے چلے گئے تھے اور اب ایک مرتبہ پھر لا حاصل تکرار شروع ہو گئی تھی۔ اس شخص کو تو کوئی خیال نہیں تھا کہ ارد گرد کیا ہو رہا تھا؟

معا" فرحت کو خیال گزرا تھا۔ "کیا انہیں نقوی صاحب نے بھی نہیں بتایا؟" اور جیسے ہی یہ خیال ذہن میں آیا ان کی زبان میں کھجلی سی ہونے لگی تھی۔ انہوں نے بڑے محتاط لہجے میں پوچھا۔
"صبح نقوی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی!؟" فرحت کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔ ریک سے پرانے اخبار چھانٹ کر نکالتے ہوئے وہ کچھ چونک گئے تھے۔
"واک پہ جاتے ہوئے ہوئی تو تھی۔" پھر وہ دوبارہ سے اپنے کام میں لگ گئے تھے۔ اتنی ردی اکٹھی ہو رہی تھی اور اس عورت کو ذرا بھی دھیان نہیں تھا۔ نیلم نہ ہو تو اس گھر کو کباڑ خانہ بننے میں لحہ بھی نہ لگے۔
"اچھا..." فرحت چونک گئی تھیں۔ پھر ان کے لہجے میں تجسس سا بھر گیا تھا۔
"نقوی صاحب نے کوئی بات تو نہیں بتائی؟"
"کیسی بات!" وہ اپنے ہی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ فرحت کی بے سروپا باتوں کی طرف دھیان کم ہی تھا۔
"کوئی بھی۔" فرحت نے چڑ کر کہا تھا۔
"وہ تو بڑا باتونی ہے۔ ہزار باتیں آدھے گھنٹے کی واک میں سنا دیتا ہے۔ تم کون سی پوچھنا چاہتی ہو۔" انہوں نے ردی کا سارا ڈھیر الگ کر لیا تھا۔ کچھ کام کے رسائل چھانٹی کر لیے تھے۔
"اچھا تو تمہیں کچھ پتا نہیں... اسی انجان پن میں تو مارے جاتے ہو۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی اور تمہیں کچھ پتا نہیں۔
اوپر پھر سے بھونچال آ رہا ہے۔ تمہیں خبر نہیں۔" فرحت نے لحہ بھر میں ہی وکیل صاحب کو بے نقط سنا ڈالی تھیں۔ وہ تھوڑے چونک گئے تھے۔ پھر سابقہ انداز میں طنزیہ بولے۔
"بھونچال پہلے نیچے آتے تھے زمین پر اب اوپر بھی آنے لگے آسمان پہ؟" فرحت نے کھا جانے والی

نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر جیسے کرخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

"اس بے نیازی کے خول سے نکل آؤ۔ اور کچھ ادھر ادھر کی خبر بھی لو۔" ان کا انداز سخت برہم تھا۔

"مجھے کن سوئیاں لینے کی عادت نہیں۔" وہ چڑ کر رہ گئے تھے۔

"اور تم میرا بھیجہ نہ الٹاؤ۔ اٹھ کے چائے بناؤ اور ساتھ کچھ آلو ہی تل لو۔ نیلم بھی بس آیا ہی چاہتی ہے۔" وکیل صاحب ردی کا ڈھیر اٹھا کر اٹھنے ہی لگے تھے جب فرحت نے سرعت سے ان کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"اوپر شاہی محل میں راج ہنس واپس آرہا ہے بلکہ آ چکا ہے۔ آج نہ آئے تو کل تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ تمہیں کانوں کان خبر نہیں اور مجھے صبح سے پتنگے لگے ہوئے ہیں۔" فرحت کے جلے کٹے الفاظ پہ وہ لمحہ بھر کے لیے چونکے تھے۔ پھر دوبارہ سابقہ کیفیت میں چلے گئے۔

"تو پھر؟" ان کی بے نیازی عروج پہ تھی۔ فرحت کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

"وہ جو آفتیں محو استراحت ہیں انہیں دس سال سے کانوں کان خبر نہیں۔ کیا بتاؤ گے انہیں کہ اوپر کون آرہا ہے" فرحت نے جلتی کنپٹیوں کو دباتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ پھر گہرا سانس کھینچ کر آہستگی سے بولے۔

"انہیں سچ بتا دوں گا۔ ان کا اصل حوالہ آ رہا ہے۔"

✡ ✡ ✡
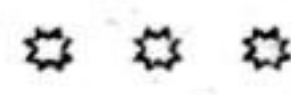
وہ موبائل ہاتھ میں لیے ابھی تک شاکڈ بیٹھا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر وہ اس کا فون بغیر بتائے کاٹ دے گی۔ حالانکہ وہ اتنی ضروری بات کر رہا تھا۔ بات بھی ایسی جو اس کے مطلب اور فائدے کی تھی۔ اور اس نے خرم کی پوری بات سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ یا انجانے میں اس سے ایسا ہوا تھا! یا پھر نیٹ ورک کی وجہ سے؟

وہ خود کو ہزار دلائل دے کر بھی مطمئن نہیں کر پا رہا تھا۔ کچھ تک۔ نیلم بہت غائب دماغی سے اس کی بات سن رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا۔ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ خرم کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ نہ اس کی اتنی اہم باتوں پہ کوئی رسپانس دے رہی تھی۔

حالانکہ ایک ہفتہ پہلے ہی نیلم نے بذات خود ڈھکے چھپے الفاظ میں خرم سے پوچھا تھا۔

"پھر تمہاری امی کا کیا پروگرام ہے؟ وہ کب تک ہمارے گھر آئیں گی؟ امی نے دو تین مرتبہ پوچھا تھا۔" گو کہ یہ بات کرتے ہوئی وہ بہت جھجک رہی تھی۔ پھر بھی خرم جانتا تھا وہ اندر سے مضطرب ہے۔ خرم اس کے اضطراب کو مزید بڑھانا تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی۔۔۔ اس نے بات کو ذرا گھما پھرا لیا تھا۔

"اماں تو تیار بیٹھی ہیں۔ بس ثوبیہ کے سسرالیوں کی طرف سے کوئی فائنل جواب مل جائے تو۔۔۔ اماں تو خود اس قدر بے چین ہیں تم سے ملنے کے لیے۔ میں نے تمہاری تعریفوں کے پل جو باندھ رکھے تھے۔" خرم نے مسکرا کر اسے بتایا تو نیلم کے رخساروں پہ سرخی سی پھیل گئی تھی۔ اور نیلم کا اقرار تو خرم کے لیے ہفت اقلیم کی دولت سے بڑھ کے تھا۔۔۔ نیلم کا مان جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ خرم کی پچھلے دو سالوں کی محنتوں اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ورنہ نیلم کہاں کسی کو گھاس ڈالتی تھی۔ یہ تو خرم کا اخلاق، لگن اور نظر التفات تھا جس نے نیلم کو پیچ دیا اور شاید زیادہ کوششیں نیلم کی امی نے اس معاملے کو کسی کنارے تک پہنچانے کے لیے کی تھیں سو سارا کریڈٹ نیلم کی امی کو جاتا تھا۔

اب خرم کی طرف سے کچھ دیر تھی۔ لیکن آج وہ اسی اہم موضوع پہ بات کر رہا تھا۔ جب نیلم سے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جانے مسئلہ کیا تھا۔ نیلم پچھلے ہفتے سے شہر سے باہر تھی۔ اب واپس آئی بھی تو ٹھیک سے بات نہیں کر پا رہی تھی۔ نجانے مسئلہ کیا تھا

؟ خرم کا بوجھ ہے؟ سفر کی تھکان یا کوئی اور وجہ؟

خرم کے دل کو بے چینیوں نے گھیر رکھا تھا۔ اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ دل چاہ رہا تھا۔ اڑ کر نیلم کے پاس پہنچ جائے۔ اوپر سے اس کی اپنی اماں نے اتنا دباؤ ڈال رکھا تھا کہ حد نہیں۔ وہ جلد از جلد نیلم کے گھر جانا چاہتی تھیں۔ اس سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن نیلم کا رویہ کچھ عجیب ہو رہا تھا "اتنا عجیب کہ خرم الجھ کر رہ گیا تھا۔

✡ ✡ ✡
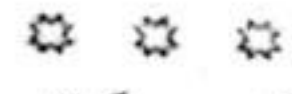
وکیل صاحب کی بات سن کر فرحت جیسے بھونچکا رہ گئی تھیں۔ پھر ایسی نظروں سے انہیں دیکھا تھا جیسے ان کا دماغ چل گیا ہو۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ وکیل صاحب کے ہاتھوں سے ردی کا ڈھیر کھینچ کر انہی کے سر پہ دے ماریں۔ کیا واقعی وکیل صاحب سٹھیا گئے تھے۔

اور وہ ان کی جلتی نظروں سے قطعاً" بے نیاز ہو چکے تھے۔ کافی دیر بعد فرحت کے اپنے حواس مجتمع ہوئے تو انہوں نے غیض بھرے لہجے میں سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا تھا جہاں سے ٹوٹ چکا تھا۔

"ارے تمہاری جرات کیسے ہوئی؟ تم جینا' نیلا کو کچھ بتا کر تو دیکھو۔ جن رشتوں کو میں نے ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا تھا اور انہیں بتا بھی دیا تھا۔ اب انہی رشتوں کو قبر سے کیسے نکال کر سامنے لاؤں گی؟ اور وہ کیسے حقیقت کا تلخ روپ دیکھیں گی۔

تم اپنی سمجھ بوجھ اپنے پاس رکھو۔ اور خبردار اگر زبان کھولی تو۔" فرحت کا لہجہ آخر میں دھمکی آمیز ہو چکا تھا۔ وکیل صاحب نے بیگم کو ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے وہ انہیں عقل سے پیدل لگ رہی تھیں۔

"جانے یہ بال تم نے کہاں سفید کیے ہیں عجیب بد دماغ عورت ہو۔ کیا میرے زبان نہ کھولنے سے سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا؟ کیا جینا' نیلا کچھ بھی نہیں جان پائیں گی؟ اگر میں کچھ نہیں بتاؤں گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ اتنی چھوٹی نہیں ہیں جو تم اب انہیں باتوں سے بہلا سکو گی۔ کم از کم اپنی عمر سے زیادہ فہم رکھتی ہیں۔" وکیل صاحب نے انہیں حقیقت کا جو کیا دکھایا تھا وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھیں۔

"میں کسی کا سایہ بھی ان پہ نہیں پڑنے دوں گی۔" انہوں نے جذباتی انداز میں کہا۔

"یہ تمہاری بھول ہے۔" وکیل صاحب نے لب بھینچ لیے تھے۔ فرحت بھی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر کافی دیر خاموشی میں گزر گئے تھے۔ بہت دیر کی گمبھیر چپ کو فرحت کی آواز نے ایک مرتبہ پھر توڑ دیا تھا۔

"کیا لینے آرہے ہیں وہ لوگ۔!" وہ عجیب چڑچڑے پن سے کہہ رہی تھیں۔

"اپنے گھر کوئی کیا لینے آتا ہے؟" ان کا انداز بھی تلخ تھا۔

"اب یاد آیا گھر جب اسی گھر کو ٹھوکر مار گئے تھے، تب کیا ہوا؟" فرحت زہر خند ہوئیں۔ وکیل صاحب چپ کر گئے تھے۔ اب بھلا کیا جواب دیتے؟ یہ عورت ہر بات میں کوئی نہ کوئی منفی پہلو نکال لیتی تھی۔

اور جب وکیل صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تب وہ کچھ اور جھنجلا گئی تھیں۔ پھر اچانک خیال آنے پر ان کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ یہی مناسب وقت تھا۔ ابھی بات کر لی جاتی۔ کیونکہ بعد میں کیا خبر وکیل صاحب کا موڈ ہی بدل جاتا۔ گو کہ اس میں بھی تحفظات تو بہت تھے پھر بھی نیلم کی اچھی زندگی کے لیے زہر بھرا یہ گھونٹ پینا ہی تھا۔

بچی کی بے رنگ و یران زندگی انہیں پچھتاوں میں دھکیل دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کے ساتھ جو بھی ہوا۔ ان ہی کی نادانی اور کم فہمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ ایک ایسا غیر مناسب وقت میں جذباتی فیصلہ جو عمر بھر کا روگ بن گیا تھا۔ وہ چاہتے بھی تو گزرے وقت کو واپس نہیں لا سکتے تھے۔ لیکن جو وقت ابھی بھی ہاتھ میں تھا اس میں کیے گئے فیصلے سے نیلم کی زندگی سنور جاتی۔ اسے ایک مستحکم کنارہ مل جاتا تو وہ بھی سکون سے مر

سکتے تھے۔

وکیل صاحب کو گہری سوچوں میں گم دیکھ کر فرحت نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہے ہیں اور کس کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟ لوہا گرم بھی تھا اور نرم بھی۔ سو فرحت نے دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

انہوں نے گلا کھنکھار کے سابقہ تمام تر بحث کو سمیٹ کر ایک طرف رکھا اور قدرے نرم آواز میں بولیں۔

"نیلم کے لیے کیا سوچا ہے؟ ان لوگوں نے جب بھی چکر لگایا' رشتہ پکا کرنے کے لیے ہی لگاتا ہے۔ باقی بات تو فون پہ ہو گئی تھی۔ لڑکا بہت اچھا ہے۔ سمجھ دار اور قدر دان۔ باقی ہر بات ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔"

وکیل صاحب نے بیگم کی ساری بات دھیان سے سنی تھی پھر گہرا سانس لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں تو اسی بات پہ بہت خوش تھی۔ نیلم مانی تو سہی۔ ورنہ ہماری زندگی کا کیا بھروسا۔" فرحت آبدیدہ ہو گئیں۔ یہ موضوع ہی ایسا تھا جو وکیل صاحب کا دل بھی کاٹ کے رکھ دیتا۔ انہوں نے بھی بمشکل اپنی آنکھوں کی نمی چھپائی تھی۔ اکلوتی بیٹی اور ایسے نصیب...

وکیل صاحب لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی آنکھوں کا تفکر فرحت کو بھی کچھ بے چین کر رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وکیل صاحب نے دھیمی بوجھل آواز میں کہا۔

"اور تم ہر بات ان لوگوں سے کلیئر کر لینا۔ کسی گمان میں نہ رہیں۔ ہم تو چراغ آخر ہیں۔ آج بجھے کہ کل بجھے۔ جینا' بیلا کو نیلم کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ ہمیشہ۔"

یہ بات انہیں اس دن سے بے چین کر رہی تھی۔ جب سے نیلم کے لیے رشتہ آیا تھا۔ اس بات کو انہوں نے صاف لفظوں میں بیوی تک پہنچا دیا تھا۔

فرحت بھی اثبات میں سر ہلا کر فوراً بولیں۔

"ان کو کوئی اعتراض نہیں۔ پھر خرم نے بہت تسلی دی ہے۔ اچھا لڑکا ہے۔ بہت احساس کرنے والا ہمدرد۔ ورنہ آج کے دور میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔"

فرحت کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔

"یہ تو عنایت ہے ان کی اور ہماری بیٹی کو اس کے صبر کا صلہ مل گیا۔" وکیل صاحب نے رنجیدگی سے کہا تھا۔ پھر اچانک خیال آنے پر بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔

"اور تم دوسرے پہلو کو بھی نظر انداز مت کرو۔" ان کا اشارہ سمجھ کے فرحت نے گہری سنجیدگی بھری خاموشی کو توڑا تھا۔

"میں اس پہلو کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔ پہلے تو ان لوگوں کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ نقوی صاحب سے جب بھی پوچھا' انہوں نے کہا تین چار سالوں سے رابطہ نہیں پھر نیلم بھی تو اب ہی مانی ہے۔ پہلے ان کمینوں کا اتا پتا پوچھ کے کرنا بھی کیا تھا ضرورت تو اب پڑی ہے۔ جب نیلم نے ہمارے بڑھاپے پہ ترس کھا کر حامی بھری۔" فرحت کا ان لوگوں کے ذکر پہ لہجہ زہر آلود ہو گیا تھا۔ وہ کمینے خود غرض لوگ جنہوں نے ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دی تھی۔ تباہ کر دی تھی۔ اس کی زندگی پہ ہمیشہ کے لیے خزاں طاری کر کے چلے گئے تھے۔ نیلم مسکرانا بھول گئی تھی۔ زندگی جینے کا قرینہ بھول گئی تھی۔ نیلم خود کو بھول گئی تھی۔

"اور جینا' بیلا۔ وہ مان جائیں گی کیا؟" وکیل صاحب نے اندر کی بے چینی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ میرا "درد سر" ہے۔" فرحت کا اطمینان قابل دید تھا۔ وکیل صاحب پھر کسی اذیت بھری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پرانے عکس لہرانے لگے۔ یادوں کا ایک پر درد سلسلہ آنکھوں کی پتلیوں پہ رنگ چھوڑ رہا تھا۔ گہرے کالے اور بھدے رنگ۔

انہیں کیا کچھ یاد آ گیا تھا۔ جو بھولا تو پہلے بھی کبھی نہیں تھا۔ اور ان دنوں تو اور بھی شدت سے یاد آتا۔

"مجھے نوشابہ اور تیمور سے کوئی گلہ نہیں... وہ "مزاجاً" ہی ایسے تھے۔ اصل دکھ تو ثقلین نے دیا تھا۔ ایسا گیا کہ پلٹ کر دیکھا ہی نہیں... نہ خط' نہ فون نہ کوئی تعلق کوئی ایسا بھی کرتا ہے کوئی اس طرح سے بھی کرتا ہے۔ میری بیٹی کو عمر بھر کے لیے دار پہ چڑھا دیا۔" ان کی آنکھوں میں گدلا پانی جمع ہونے لگا تھا۔ تب فرحت نے بے ساختہ نظر چرا لی تھی۔ وہ وکیل صاحب کے ایسے شکووں پہ۔ جو انہیں ثقلین سے بے بہا تھے ایسے ہی نگاہ چرا لیتی تھیں۔

"آہ... یہی تو میں تمہیں سمجھاتی تھی۔ خود غرض اور مطلبی لوگ ہیں۔ دیکھا' کیسا خنجر گھونپ دیا ہماری پشت میں بغیر بتائے اندر ہی اندر انتظامات کروائے اور چل دیے۔ بتایا تک نہیں۔ جیسے ہم انہیں روک ہی نہ لیتے۔" فرحت دل کی جلن کو زبان پہ لے آئی تھیں۔

"اور اب ان کی واپسی کا کیا مطلب ہے؟" انہوں نے چمک کر کہا۔ وکیل صاحب بے خیالی میں بیوی کو دیکھتے رہ گئے تھے۔ جیسے ان کی بات سمجھنا چاہتے ہوں اور جب انہیں فرحت کی بات سمجھ میں آگئی تو ایسے ہی دل میں خوش گمانیوں کا طوفان اٹھنے لگا تھا۔ ان کی گدلی آنکھیں لحظہ بھر کے لیے مسکرا دی تھیں۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا جو ان کا دل سوچ رہا تھا۔ چاہ رہا تھا۔ کچھ ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔

"کیا خبر' تعلقات کی بحالی..." اور ابھی وہ اپنی سوچ کو لفظوں کا پیراہن پہنانا چاہتے ہی تھے جب فرحت نے بے ساختہ چلا کر ان کی بات کاٹ دی تھی۔ ان کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا تھا۔

"ایسا تو میں مر کر بھی نہیں سوچ سکتی۔" وہ زہر خند ہی اٹھی تھیں۔ معاً "گیٹ پہ ایک جانی پہچانی پکار نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"جینو' بیلو..." نیلم اونچی آواز میں طبل بجا رہی تھی۔ فرحت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

سفید انڈے جیسے تالاب میں نیلگوں پانی کی لہر بہہ رہی تھی۔ تالاب کے کناروں پہ سفید چکنے لوہے کے گرل نما کنارے تھے۔ جن کے ایک ایک کونے میں سفید بگلے سر جھکا کر بیٹھے کورس میں کچھ گا رہے تھے۔ آسمانوں سے سنہری پریاں کھلکھلاتی ہوئی زمین پہ اتر رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں سنہری ڈوریں تھیں۔ ایک رنگ برنگے ربن والی سائیکل تھی اور ڈھیر سارے چاکلیٹس' کینڈیز' کوکیز' جیلی بیلی اور نجانے کیا کیا۔

ابھی وہ ہاتھ بڑھا کر پریوں سے سارے تحائف وصول کرنا چاہتی ہی تھی جب اچانک کسی نے اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ اور مندی مندی آنکھوں سے اپنے اوپر جھکی جینا کو دیکھا تھا۔ وہ اس کا گال تھپتھپا کر زبردستی جگا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بیلا کے حواس بیدار ہوئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

آنکھیں مسل مسل کر اس نے لمبی سی جمائی کو روکا تھا پھر قدرے خفا خفا لہجے میں بولی۔

"اتنی جلدی کیوں جگا دیا؟" اس پہ سستی سوار ہو رہی تھی۔ جیسے ہی بیلا نے دوبارہ لیٹنا چاہا تھا۔ جینا فوراً آڑے آگئی۔

"بری بات' اب نہیں سونا اور سو سو کے تم مر جانا باہر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔" جینا نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا تھا۔ بیلا بری بری شکلیں بناتی اٹھ گئی تھی۔

"تھوڑا اور تو سو لینے دیتیں۔ سنہری پریاں مجھے گفٹ دینے والی تھیں۔ تم خوابوں میں بھی مجھے کچھ لینے مت دینا۔" بیلا روہانسی ہو گئی تھی۔

"بیلو کی بچی! تم سپنوں میں مری رہو۔ باہر دیکھو' سوہا پوری کالونی میں ریڈ اسپورٹس کار بھگا رہی ہے۔" جینا شاید باہر کا ایک چکر لگا کر آئی تھی۔ اور ابھی سوہا کی اسپورٹس کار کے لیے رشک بھرے جذبات کے ساتھ بہن کو بتا رہی تھی۔ لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔ وہ تو سائیکل کے لیے ترس رہی تھیں۔ سوہا اسپورٹس کار بھی لے آئی۔ بیلا کا دل بھی مچل اٹھا۔ وہ بھی اسپورٹس کار دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے بجھ سی گئی۔

"سوہا کے پاپا ہیں۔ وہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ نیا لے لیتی ہے۔ ہمارے کون سا پاپا ہیں؟ نہ ہمیں کوئی گفٹ ملتا ہے اور نہ ہم کسی ہل اسٹیشن گھومنے پھرنے جاتے

ہیں۔ کاش ہمارے بھی پاپا ہوتے۔ کاش ہمارے پاپا نہ مرتے۔" بیلا کی نیلی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔

"لیکن سوہا کی اسپورٹس کار اس کے پاپا نہیں لائے۔" جینا نے فوراً" ٹوک کر اس کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

"پھر؟" بیلا نے آنکھیں رگڑ کر حیرت سے کہا۔

"اس کے کینیڈا سے انکل آئے ہیں۔ وہی اسپورٹس کار' بیلی اور ڈھیر سارے چاکلیٹس اور جیلز لائے ہیں۔" جینا نے ڈیٹیل بتائی تھی۔ یقیناً" وہ سوہا سے ساری رپورٹ لے کر آئی تھی اور سوہا کی شوخیوں' غرور پہ بہت پی ہوئی بھی تھی۔ اسے سوہا کی نخوت بھری بات پہ ابھی تک غصہ تھا۔

"جینا! تمہارے انکل بھی کینیڈا ہوتے تو تمہارے لیے بھی مزے مزے کی چیزیں آتیں۔" اس وقت بیلا کے سامنے وہی باتیں دوہرا کر جینا اپنا غصہ نکال رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمکیلا پانی بار بار آرہا تھا۔

"سوہا پر اوڈ کیوں نا ہو۔ اس کے پاس ممی' پاپا' نانی' نانا' دادی' دادا سب لوگ موجود ہیں۔ وہ پاس ہو' اس کی سالگرہ ہو۔ سب اسے الگ الگ گفٹ دیتے ہیں اور اب ایک امیر سے انکل بھی اسے مل گئے۔ ان کی ہنڈا سوک پہ سوہا پورا شہر گھوم کر آئی تھی۔ ڈھیر ساری شاپنگ بھی کی ہمس کے انکل بہت نائس ہیں سوہا اسپورٹس کار چلا رہی تھی تو وہ پاس کھڑے تھے۔ اسے گائیڈ کر رہے تھے۔" جینا کی آواز بھر آگئی تھی۔ اس کا دل بھی دکھ سے بھر گیا تھا۔

"کاش ہمارے بھی کوئی انکل ہوتے۔" جینا کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

"انکل نہ سہی ہمیں پاپا تو مل ہی جائیں گے۔" بیلا نے اپنے تئیں بڑی سمجھ داری کی بات کی تھی۔ جینا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہتی ہو۔

"امی بتا رہی تھیں۔ جلدی ہمارے اچھے والے پاپا آجائیں گے۔ پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں خوب لاڈ کریں گے اور خوب مزہ کرائیں گے۔" بیلا نے مزید بھی بتایا تھا۔ وہ فرحت کی باتیں دوہرا رہی تھی۔

"کون سے؟" جینا بھی چونک گئی تھی۔

"ان کا نام خرم ہوگا۔" بیلا نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہی جو نیلی کے ساتھ ایک دفعہ گھر بھی آئے تھے؟" جینا کی آواز روٹھی سی تھی۔ بیلا نے سرہلایا۔

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کے ایک مرتبہ پھر سوہا کے انکل کی پرسنالٹی میں ڈوب گئی تھی۔ سوہا کے انکل زیادہ اچھے تھے اور انہوں نے آواز دے کر جینا کو روکا بھی تھا۔ لیکن وہ اتنی کنفیوز ہوئی کہ بھاگ کر گھر آگئی۔

"سوہا کے انکل مجھے بہت نائس لگے۔ بہت سویٹ اینڈ پولائٹ۔ انہوں نے مجھے کینڈی دی لیکن میں نے نہیں لی۔" وہ بہن کو ہر بات بتاتی تھی۔ ہر بات شیئر کرتی تھی۔ ابھی بھی ایک ایک بات بتا رہی تھی۔

"کاش' سوہا کے انکل ہمارے انکل بن جائیں۔" جینا کا لہجہ حسرت آمیز تھا۔ ایسی حسرت جس میں کانچ ٹوٹ رہے تھے۔ اور دروازے کے باہر کھڑی جینو بیلو کو سرپرائز دینے کے چکر میں نڈھال سی نیلم کے دل میں بھی کانچ سے ٹوٹ رہے تھے۔ اس نے بے ساختہ ہینڈل کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ وہ اتنی سی کوشش بھی نہ کرتی تو زمین بوس ہو جاتی۔ "سوہا کا انکل! تو کیا وہ آگیا تھا' سچ مچ واپس آگیا تھا' تیمور واپس آگیا تھا۔" نیلم کی آنکھوں سے دھواں نکلنے لگا۔ نیلم کو غیر متوقع دیکھ کر وقتی طور پہ جینا' بیلا سب کچھ بھول گئی تھیں۔ ان کے لیے یہی کافی تھا کہ نیلم واپس آگئی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں۔ نیلم کے لائے تحفوں کو انجوائے کر رہی تھیں۔ اور اس وقت بیرونی ماربل کی ڈھلی ڈھلائی سیڑھیوں پہ بیٹھ کر تکے' فرائز اور ونگز کھا رہی تھیں۔ کوک کے ٹن انہوں نے نچلے اسٹیپس پہ رکھے ہوئے تھے۔

اور ساتھ باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع تھا اور موضوع گفتگو وہی سوہا اور اس کے نئے انکل۔ اب چار پانچ دن تک انکل ہی ڈسکس ہونے تھے۔ جینا بیلا

کی یہ بڑی پرانی عادت تھی۔ ایک ہی بات کو کئی کئی دن تک سوچنا اور دوہراتے رہنا۔

بچیوں کے چہروں پہ جگمگاہٹ دیکھ کر نیلم کے دل میں اک گونا سکون اتر رہا تھا۔ سفر کی ساری تھکان جیسے جاتی رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر نئی تازگی سی بھر گئی ہے۔ وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ پھر اسی نے کڑک سی چائے کیا پلائی تھی نیلم نے دوسرے ہی لمحے کمر کس لی۔ پورا گھر گندا ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا یسماں نے آج بھی بہانہ بنا کر چھٹی ماری تھی۔ رات کو شاید طوفان آیا تھا۔ اور سہ پہر تک پورا گھر کوڑا دان بن گیا۔ نیلم سے اتنی گندگی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صبح تک انتظار کیسے کرتی؟

پھر جو اس نے بجلی آتے ہی پائپ لگایا تو پورا گھر دھو کر رکھ دیا۔ پانی دیکھ کر جینا' بیلا بھی مچل گئی تھیں۔ شوق شوق میں ہی دونوں نے وائپر پکڑ لیے تھے۔ سارے گھر سے پانی بھی صاف کیا اور پوچا بھی لگا دیا۔ نیلم کھڑکیاں دروازے جھاڑ کر فارغ ہوئی تو فرش چم چم کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی بھی امڈ آئی تھی۔

"ارے' میری بچیاں تو بڑی ہو گئیں۔ اتنا ڈھیر سارا کام کر دیا۔" وہ ان دونوں کے بے انتہا لمبے بالوں کو سہلا کر مسکرا رہی تھی۔ جینا' بیلا اتنی تعریف پا کر خوش ہو گئیں۔

پھر نیلم نے دونوں کو باری باری نہلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے تھے۔ بال بنائے' جوتے انہوں نے خود ہی پہن لیے۔ اب دونوں ریڈی ہو چکی تھیں اور باہر جانے کے لیے پر بھی تول رہی تھیں۔

"ہم سوہا کے گھر جائیں۔"

"نہیں۔" نیلم نے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ وہ ان دونوں کو سوہا کے گھر تو کیا گلی میں بھی جانے نہ دیتی۔ وہ بھی اس صورت میں جب اس نے از خود تیمور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ تیمور نہ صرف آچکا تھا بلکہ ابھی تک سوہا کے گھر موجود تھا اور نیلم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے حقیقت سے نگاہ چراتی پھر رہی تھی۔ کتنی بھولی تھی وہ۔ اگر جینا' بیلا سوہا کے گھر نہ جاتیں۔ کالونی میں نہ نکلتیں تو اس سے کیا فرق پڑ نا تیمور خود اس گھر میں ڈنکے کی چوٹ پہ آسکتا تھا۔ یہ گھر اس کا اپنا تھا۔ کوئی بھی اسے یہاں آنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور نیلم کی اوقات کیا تھی وہ کیسے اسے روک سکتی تھی۔

اور نیلم کو بھی کیسی کیسی خوش فہمیاں لاحق تھیں۔ جس شخص نے دس سال تک ان بچیوں کی خبر نہیں لی تھی۔ جن کے ناموں سے بھی شاید وہ واقف نہ ہو۔ جنہیں خرچے کے نام پر اس نے کبھی ایک پھوٹی کوڑی نہ دی ہو۔ ان بچیوں کو سامنے پا کر کیسے اس کا پتھر دل پسیج سکتا تھا' کیسے وہ ان کی طرف ملتفت ہو سکتا تھا؟ پھر بچیوں کو خوامخواہ گھر میں روک کر ان کے الٹے سیدھے سوالوں سے بچنے کے لیے نیلم نے سوچا وہ ان دونوں کو سوہا کے ساتھ کھیلنے بھیج دیتی ہے۔ پھر خود ہی اپنے خیال کو جھٹک دیا تھا۔ اس کا دل نہیں مانتا تھا وہ تیمور کی موجودگی میں بچیوں کو نقوی انکل کے گھر بھیجے۔

وہ کیا سوچتا ہوگا۔ نیلم جان بوجھ کر بچیوں کو اس کے سامنے بھیج رہی ہے تاکہ وہ ان پر نظر کرم ڈالے' ہرگز نہیں قیامت تک نہیں' وہ تو مر کے بھی گوارا نہ کرتی کہ تیمور اس کی بچیوں کو دیکھتا بھی۔ بلاتا اور پیار کرتا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ تو تیمور کا سایہ بھی ان دونوں پہ نہ پڑنے دیتی۔

اور اس وقت نیلم ایسی ہی سوچوں کے اژدہام میں کھوئی تھی جب جینا نے نیلم کا کندھا ہلا کر اسے چونکایا تھا۔

"بات تو سنو نیلی!" جینا کا انداز خاصا بے صبرا تھا۔ وہ امی' ابو' سیماں وغیرہ کی دیکھا دیکھی اسے نیلی کہہ کر ہی بلایا کرتی تھیں۔ امی بھی نہیں ٹوکتی تھیں۔ بلکہ آرام سے کہہ دیتیں۔

"اچھا ہے ویسے بھی تم ان کی ماں کہاں سے لگتی ہو صرف سولہ سال بڑی۔ اتنا فرق تو عموماً" بہن بھائیوں میں بھی ہوتا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" نیلم نے بے خیالی میں کہا۔ اس

کی سوچیں بہت منتشر تھیں۔ بھٹک بھٹک کر نقوی صاحب کے بنگلے کی طرف جاتی تھیں۔ دل بڑا پریشان اور بوجھل تھا۔ کیا تیمور کا آنا بے مقصد تھا وہ فیملی سمیت کیوں واپس آگیا؟ کیا وجہ تھی اور اس کی بیوی بچے وہ کہاں تھے۔

"سوہا کے انکل آپ کا پوچھ رہے تھے نیلی! کہتے، تمہاری نیلی پیلی کا کیا حال ہے؟" جینا نے اسے گم صم دیکھ کر ہلایا تھا۔ نیلم جیسے لمحوں میں سنبھل گئی تھی۔ پھر اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

"وہ کہاں ملا تمہیں، مطلب سوہا کے انکل کہاں ملے تمہیں؟" نیلم کی آواز جیسے پھٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

"باہر روڈ پہ۔ وہ سوہا کو بیلی اڑانا سکھا رہے تھے۔ نیلی! ہمیں بھی بیلی چاہیے۔ جو بہت دور تک قلابازی کر سکتا ہو۔" جینا نے چہکتے ہوئے اپنی فرمائش اس تک پہنچائی تھی۔ نیلم غائب دماغی سے جینا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ ذرا جھک کر جینا کے قریب آئی۔ پھر اس نے جینا کے دونوں پھولے پھولے گالوں کو پیار سے سہلایا۔ پھر بیلا کو بھی آواز دے کر بلا لیا۔ وہ دونوں اب اس کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ نیلم کو اک گونا تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ پھر اس نے ان دونوں بہنوں کو سمجھایا۔

"دیکھو بیٹا! کسی کی چیز کو دیکھ کر امپریس ہونا اور بات ہے۔ اس کے حصول کی خاطر کوشش کرنا اور بات... میں جلدی تم دونوں کو سائیکل لے دوں گی۔ لیکن پھر تم اور فرمائش کرو گی۔ وہ پوری کرنے کے چکر میں اک نئی فرمائش میں اتنا افورڈ نہیں کر سکتی۔" نیلم نے نرم لہجے میں انہیں سمجھانا چاہا تھا۔ اور اس کے سمجھانے پہ ان دونوں کے چہروں پہ بے زاری اتر آئی تھی۔

"کوئی نئی بات سمجھاؤ نیلی! یہ باتیں سن سن کر ہم بور ہو چکے ہیں۔" ان کا لہجہ اتنا روکھا اور بے زار تھا کہ نیلم جہاں کی تہاں ٹھہری گئی تھی۔

"آپ ہمیں کچھ لے کر نہیں دیتیں۔ گھمانے نہیں لے کر جاتیں۔ ہم نے کبھی ہوٹلنگ نہیں کی۔ ہر وقت سمجھاتی رہتی ہیں۔" بیلا اور جینا دونوں ایک ساتھ شروع ہو گئی تھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اور نا اس شکوے میں کوئی نیا پن تھا پھر بھی نیلم کو شدید تکلیف ہوئی تھی۔ کیا واقعی ہی جینا بیلا اس سے خوش نہیں تھیں وہ ان کی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستی تھیں۔ اور ان کی زندگی میں کتنے ڈھیر سارے خلا تھے۔

"ہم اس سنڈے سندباد چلیں گے۔" اپنے تئیں نیلم نے اچانک انہیں بتا کر خوش کرنا چاہا تھا۔ گو کہ اس سنڈے لاتعداد رکے ہوئے کام سرانجام دینے تھے، لیکن بچیوں کی خاطر ایک اتوار سابقہ روٹین نہ بھی برقرار رہتی تو کیا تھا۔ دراصل وہ ان دونوں کا ذہن بٹانا چاہتی تھی۔ انہیں سوہا کے انکل اور سوہا کو دیے جانے والے گفٹس کے فیز سے نکالنا چاہتی تھی۔

"نہیں بالکل نہیں، پچھلی دفعہ بھی آپ ہمیں رکشہ پہ سندباد لے کر گئی تھیں سوہا نے تب اسکول جا کر سب فرینڈز کو بتایا تھا۔ سب بچوں نے ہمارا اتنا مذاق اڑایا۔" جینا نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تو کب سے چپ بیٹھی بیلا بھی بول پڑی تھی۔

"نیلی! ہم چھوٹی سی مہران نہیں لے سکتے۔" اس کی بیٹیوں کے خواب اور اونچی اونچی فرمائشیں نیلی کا دماغ ابل پڑا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ پھر جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"مہران خرید لی تو کمتا کرولا چاہیے۔ پھر بی ایم ڈبلیو بڑے نواب کی بیٹیاں ہو نا۔" نیلم نے امی والے الفاظ دوہرا کر ان دونوں کو اتنے زوردار لہجے میں جھڑکا تو وہ دونوں منہ پہ ہاتھ رکھ کر بمشکل چیخ دبائے بلبل بلبل روتی ہوئی اندر بھاگ گئی تھیں اور ان کے الفاظ ابھی تک نیلم کا دل پھاڑ رہے تھے۔

"کاش، ہمارے پاپا نہ مرتے۔"

نیلم کو روتی ہوئی یہ آواز اذیتوں کے نخلستان میں لے جا رہی تھی۔ دل میں درد کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ پیروں میں زخم اکھڑ رہے تھے۔ سلے ہوئے ناسور پھر سے پھٹ رہے تھے۔ پیروں کے آبلے پھوٹ رہے تھے۔ باد صرصر کے ایسے تند جھکڑ چلے تھے جو بہت کچھ اڑا کر لے گئے۔

یہ بگولوں کا طوفان تھا جو دور بہت دور اڑا کر لے گیا۔ اس وقت کی نگری میں جو خود صحرا صحرا تھی۔ جہاں ریت اڑ رہی تھی۔ دھند تھی۔ جس کے پیچھے سارے عکس بھی دھندلے تھے۔ غبار میں گم تھے۔ ہر تصویر ادھوری تھی۔ کوئی تصویر مکمل نہیں تھی۔ ہر رشتہ بے جان تھا، سرد اور اجنبی تھا۔

پردے کے پیچھے وہ منظر جو جینا بیلا کی نگاہ سے مخفی تھے۔ اگر وہ جان جاتیں تو۔۔۔؟ اگر انہیں وہ سب حقیقتیں پتا چل جاتیں جو ان کی نظر سے اوجھل تھیں جنہیں ان سے چھپا دیا گیا تھا تب؟ تب وہ دونوں یہ کہنے پہ ضرور مجبور ہو جاتیں کہ۔۔۔

"کاش، ہمارے پاپا مر چکے ہوتے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دن سرما کے مختصر دنوں میں شمار ہوتے تھے۔ یوں چڑھتے اور یوں لمحوں میں ڈھلتے۔

صبح طلوع ہوتی اور پھر شام پھیلتے بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ دھوپ منٹوں میں سمٹ کر دیواروں سے چپکتی اور غائب ہو جاتی ان دنوں "آشیانہ ثقلین" پہ کلنگ نامی نیلا پرندہ بڑی لمبی پرواز کیا کرتا تھا اور اس کی ناگوار آواز پرانی طرز کی کھڑکیوں سے اندر گھستی اور آشیانہ کے مکینوں کی سماعتوں میں ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگاتی تھی۔

فرحت کو کلنگ کی آواز سے بڑی شدید قسم کی چڑ تھی۔ وہ اس لمبی گردن والے قاز نما پرندے کو منحوس کہا کرتی تھیں جس نے خاص طور پر دوپہر کا آرام محال کر رکھا تھا۔ گو کہ سردیوں کی دوپہریں ہوتی نہیں تھیں پھر بھی آشیانہ کے اوپر نیچے والے مکین قیلولہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چاہے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ملتا، آنکھ ضرور لگالی جاتی تھی۔ اوپر اور نیچے والوں کا یہ سانجھا رواج تھا۔ دونوں گھروں میں اولاد کا خاصا فقدان تھا۔

اوپر ثقلین علوی کا ایک بیٹا تیمور، جو انتہا کا لاپروا، بے نیاز، لاابالی، کھلنڈرا سا تو عمر انیس سالہ ابھی ابھی جوان ہوتا منچلا سا لڑکا تھا۔ کرکٹ ٹینس والی بال جس کا جنون اور شوق تھا۔ پڑھائی میں بس سو سو۔ بھی دوستوں کی مہربانی سے تو کبھی نقلیں مار کے، مرمرا کے پاس ہو ہی جاتا تھا۔ پڑھائی اس کے لیے بڑی غیر ضروری قسم کی چیز تھی۔ جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ البتہ مستقبل کے لیے اس کا لاابالی پن ہر سننے والے کو ورطہ حیرت میں ضرور ڈال دیتا تھا۔ جو لڑکا تعلیم کے لیے اتنا غیر سنجیدہ تھا وہ مستقبل کے لیے اتنا سنجیدہ کیسے ہو سکتا تھا گو کہ فی الحال وہ باپ کی کمائی پہ عیش کر رہا تھا، تاہم امیر ہونے کا دیرینہ شوق ابھی زندہ سلامت تھا۔ حالانکہ ان کے حالات نیچے والوں سے خاصے بہتر بلکہ بہترین تھے۔

چاچو کی جاب ابو کی وکالت سے بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اپنا پورشن بھی حال ہی میں تعمیر کروایا تھا اور نیا فرنیچر بھی منگوا کر پورا گھر ڈیکوریٹ کر لیا اور امی، نوشابہ چاچی کی لاشانیوں پہ ہمہ وقت کڑھتی رہتی تھیں۔

"اس عورت کے ہاتھ میں تو سوراخ ہیں۔ کما کما اڑا رہی ہے سب کچھ۔ جمع جتھا کرنے کا کوئی پتا نہیں۔ برا وقت کبھی بھی آ سکتا ہے۔" امی کے فرمودات پہ نوشابہ چچی بغیر غصہ کیے ہنستیں اور ہر بات قہقہوں میں اڑا دیتی تھیں۔

"چار دن کی زندگی ہے۔ عیش و عشرت میں گزار دینی چاہیے۔" انہیں ہر بات پہ قہقہہ لگانے کی عادت تھی۔ ان کے خیالات اپنے اکلوتے لخت جگر سے بہت ملتے تھے۔ وہ بھی پیسہ اڑانے کا شوقین تھا، کمانے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ چاچو کما لاتے تھے یہ دونوں اڑا دیتے اور یہ کام پوری دل جمعی سے کرتے تھے۔

نیچے والوں کے حالات اوپر والوں کی نسبت خاصے بدحال تھے۔

نچلا پورشن مرسلین علوی کی رہائش گاہ تھی۔ ان کی اکلوتی بیٹی نیلم جو نہایت سنجیدہ مزاج خاصی سگھڑ اور کم

گو تم کی لڑکی تھی۔ پڑھائی میں وہ بھی بس ٹھیک تھی۔ لیکن یہ تھا کہ ذہین نہ ہونے کے باوجود وہ محنتی بلا کی تھی۔ ہر وقت پڑھتی رہتی۔ کتابوں میں سر دیے رکھتی۔ کچن میں جاتی تب بھی کتاب ہمراہ ہوتی۔ یوں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر وہ اچھے گریڈ لے ہی لیتی تھی۔

نیلم تیمور سے تین سال چھوٹی تھی۔ دونوں میں ذہنی ہم آہنگی تو بہت دور کی بات دوستی تک نہیں تھی۔ کزن ہونے کے ناطے وہ اس پہ اپنے کام نکلوانے کے لیے رعب ضرور ڈال لیتا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنی بہن نہیں تھی۔ نوشابہ چچی سدا کی آرام طلب خاتون تھیں سو وہ یہ دیکھ کر خواہ مخواہ بیمار ہو جاتی تھیں۔

یوں تیمور کے سارے کام نیلم کے ذمے تھے۔ حتیٰ کہ نوشابہ اور ثقلین کی اکثر ذمہ داریاں بھی اسی کے کندھوں پہ تھیں اور نیلم سدا کی فرماں بردار جیسے کوئی کتنا آرام سے کرتی جاتی۔ اور امی کو اس کی یہی حضوری سخت زہر لگتا تھا۔ وہ اسے ہر وقت ٹوکتی رہتی تھیں۔

”نوکر نہیں ہو تم نوشابہ اور اس کے آوارہ بیٹے کی، اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ بھاگ بھاگ کر اوپر جانے کی ضرورت نہیں۔“

امی کو نوشابہ چچی سے سخت چڑ تھی۔ اور اسی حساب سے تیمور بھی انہیں انتہائی ناپسند تھا۔

کافی عرصے بعد نیلم کو پتا چلا تھا کہ امی کو نوشابہ چچی سے کیوں چڑ تھی اور ان دونوں کے تعلقات اتنے خراب کیوں تھے؟ دونوں میں روایتی جیٹھانی، دیورانی والی رنجش بدرجہ اتم موجود رہتی تھی۔ نیلم نے تھوڑا اور غور کیا تو اندازہ ہو گیا تھا۔ نوشابہ کی طرف سے تو نہیں البتہ اس کی امی بات بہ بات نوشابہ سے اختلاف رکھتی تھیں۔

ہر وقت ان پہ طنز کرتیں۔ ٹوکتی رہتی تھیں اور نوشابہ جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑتیں۔ ہر تکلیف دہ جملے کو باتوں ہی باتوں میں اڑا دیتی تھیں۔ کبھی انہوں نے کسی طعنے کو کھینچ تان کے لمبا نہیں کیا تھا۔

نوشابہ کا میکہ بھی اسی اسٹریٹ پہ آباد تھا۔ نقوی انکل، نوشابہ کے سگے بھائی اور تیمور کے ماموں تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا وقاص، تیمور کا دوست تھا۔ آوارہ گردیوں میں وہ دونوں شانہ بشانہ رہتے تھے، تاہم وقاص پڑھائی میں بہت سنجیدہ تھا اور تیمور کو سنجیدگی چھو کر نہیں گزری تھی۔

تیمور ہلے گلے کا شوقین، ہنگامہ پرور، سیاحت کا دلدادہ تھا۔ گھر میں ہوتا تب بھی ہنگامہ بپا رکھتا تھا۔ اس کے دوست بے دھڑک گھر میں آ گھسے۔ اوپر والے پورشن میں گھستے میوزک چلا لگانے لگتے اور وہ اودھم مچا کہ حد نہیں۔ پھر اچھے ہوٹلز سے کھانا منگوایا جاتا تھا۔ چائنیز، اٹالین، اسپائسی، کرسپی فوڈز۔ کیونکہ چاچی تو پکانے کی ہمت کبھی نہ خود میں لاتیں۔ انہیں کچن میں جانے سے ہارٹ اٹیک ہونے لگتا تھا۔ یوں باہر سے رنگ رنگ کے کھانے منگوائے جاتے۔ برگر، رول، ونگز، فرائز جنک فوڈ کی بھرمار۔ چاچی تیمور کے ٹھٹے دوستوں کی دل کھول کر خاطر مدارات کرتی تھیں، یہ سچ تھا کہ نوشابہ کا ہاتھ اور دل بہت کھلا تھا۔ وہ ٹرالی بھر بھر کے تیمور اور اس کے دوستوں کو ڈرائنگ روم میں بھجواتی تھیں، پھر ایک خوب صورت ٹرے سج کر نیچے بھی آجاتی۔ نیٹ کے رومال سے ڈھکی۔ جس کے نیچے زنگر، لزانیہ، کریز مہ میں سے کوئی نہ کوئی ورائٹی ہوتی۔ ونگز، کباب، لیگ پیس، فش اسٹکس اور جانے کیا کیا۔

نیلم نے زندگی میں ایسی چیزیں نہیں کھائی تھیں، جو نوشابہ آئے دن چپکے سے اسے پکڑا جاتیں۔ فرحت سے چوری چھپے اور اگر فرحت کو بھنک بھی پڑ جاتی تو نیلم کی دھنائی ہوتے لحہ بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ نہ نوشابہ کو پسند کرتی تھیں نہ ان کے گھر کی کسی اور چیز کو۔

وہ وکیل صاحب کو بھی اپنے چھوٹے بھائی سے زیادہ ملنے ملانے پہ ٹوکا کرتی تھیں۔ اور نیلم پہ تو کڑی نگاہ رکھتیں ان کی نظر میں تیمور بلا کا آوارہ مزاج غنڈا ٹائپ لڑکا تھا۔ جس سے بچ کر رہنا بہت ضروری تھا۔ نیلم کو خود بھی بھاگ بھاگ کے اوپر جانے کا کریز نہیں تھا۔ جب بھی نوشابہ آواز دیتیں۔ کوئی کام بتاتی تب

نیلم کم از کم انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ نیچے آکر امی سے وہ جھاڑ پڑتی کہ حد نہیں۔

اسے نوشابہ بہت اچھی نہ سہی بہت بری بھی نہیں لگتی تھیں۔ موسم گرما اسٹارٹ ہوتا تو امی اور نیلم کے لیے اچھی لان کا سوٹ لے آتیں۔ اور یہ ان کی بہت پرانی عادت تھی۔ اور نیلم کو یاد تھا جب بھی نوشابہ انہیں کپڑے پکڑا کر اوپر جاتیں۔ پیچھے امی کی بڑبڑاہٹیں کانوں میں سوراخ ڈال دیتی تھیں۔

”یہ سستا گھٹیا سا کپڑا اٹھا لائی ہے۔ خود برینڈ کے سوٹ پہنتی ہے۔ گل احمد اور الکرم کی لان سے نیچے نہیں آتی۔ اور ہمیں یہ گند اٹھا کر دے گئی۔“

امی شاپر اٹھا کر پٹخنے لگتی تھیں۔ تب کتاب میں سر کھپائے بیٹھی نیلم سے رہا نہ جاتا تھا۔ وہ نوشابہ کے لائے نفیس کپڑوں پہ ہاتھ پھیر کر امی کو سادگی سے بتاتی۔

”امی! یہ سوئس لان ہے۔ بہت اچھی۔“ فرحت بیٹی کے جواب پر جز بز ہو جاتی تھیں۔ پھر اسے گھور کر دیکھتیں۔ اور ایک نیا نکتہ اٹھا لاتی تھیں۔

”اپنی امارت کا رعب جھاڑتی ہے۔ تمہارے باپ اور چچا پہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ بہت اچھی ہے اور ہم بہت برے۔“ فرحت کی اپنی ہی الگ سی منطق ہوا کرتی تھی۔ وہ کسی کی اچھائی کو مثبت پہلو سے دیکھتی ہی نہیں تھیں۔ نیلم تب بے بس ہو جاتی ”اور یہ سوٹ دے کر تمہیں دانہ ڈال جاتی ہے۔ پھر پورا سال نوکروں کی طرح کام لیتی ہے اس کے پاس انسانوں کو دام میں کرنے کے بڑے بڑے گر ہیں۔

تمہارے چچا کو بھی پھنسا لیا تھا۔“ فرحت بلبلا کر کہتیں۔ اس دن نجانے کس موڈ میں انہوں نے نیلم کو اپنی بے زاری کا قصہ سنا ڈالا جو انہیں نوشابہ کے وجود سے تھی۔

ہوا کچھ اس طرح سے تھا کہ ”ثقلین چاچو کی رسمی بات چیت اس کی چھوٹی خالہ سے طے تھی۔ چاچو خاندان کے بہت لائق لڑکے تھے۔ امی نے بالا ہی بالا چاچو کو اپنی بہن سے منسوب کر لیا تھا۔ لیکن چاچو، نوشابہ کو چاہتے تھے۔ آپس میں رشتہ داری تو نہیں تھی تاہم ہمسائیگی ضرور تھی۔ یوں چاچو نے امی کا جوڑا ہوا رشتہ توڑ کر نوشابہ سے شادی کی، تو امی اور چاچو کے درمیان ٹھن گئی۔ یہ اختلاف نوشابہ کے آجانے بہت گھلنے ملنے کی کوشش کرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ امی نے کبھی یہ گانٹھ دل سے نہیں کھولی تھی۔ کبھی چاچی کو اندر سے قبول نہیں کیا۔ ہمیشہ انہیں نظر انداز ہی کیا تھا۔ میسنی، گھنی، ہوشیار ہی سمجھا تھا۔

گو کہ نیلم کی چھوٹی خالہ بیاہ کر قطر چلی گئی تھیں، انہوں نے کبھی عید کے عید بھی فون نہیں کیا تھا پھر بھی امی ابھی تک بہن کا صدمہ دل سے لگائے، کدورتوں کو ختم کرنے سے باز نہیں آئی تھیں۔ چھوٹی خالہ اپنے گھر میں خوشحال زندگی گزار رہی تھیں۔ اور امی نے اپنے گھر میں ابھی تک اسی پرانے قصے کا رونا ڈال رکھا تھا۔

پھر نوشابہ نے آتے ساتھ ہی چاچو کو بیٹا دے دیا اور فرحت کے ہاں نیلم شادی کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔ وہ تیمور سے تین سال چھوٹی تھی۔

امی کو نوشابہ کی اچھی قسمت کا بھی قلق تھا۔ جو نعمتوں کے ڈھیر اوپر چاچو لگائے رکھتے تھے ان سے نیچے والے ہمیشہ محروم رہے تھے۔ پھر نوشابہ کا بیٹا ہوا۔ فرحت کی بیٹی۔

فرحت کو اپنی قسمت کی خرابی کا یقین ہو چکا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا فرحت کے دل سے بیٹا نہ ہونے کا ملال جاتا گیا تھا۔ جس قدر نیلم بااخلاق، نرم، سنجیدہ اور سگھڑ تھی۔ تیمور اتنا ہی لاابالی، غیر ذمہ دار آوارہ ٹائپ۔ امی اپنی بیٹی کا نوشابہ کے بیٹے سے موازنہ کرتی تو اندر ہی اندر خوش ہو جاتی تھیں۔

”اچھا ہوا۔ میرا تیمور جیسا بیٹا نہیں ہوا۔“ وہ اکثر بلند آواز میں نوشابہ کو سناتی تھیں۔ تب بھی نوشابہ نظر انداز کر دیتی تھیں اور کبھی جواب بھی دے دیتیں۔

”اگر تیمور کو آپ کا بیٹا بننا پڑ جائے تو؟“ نوشابہ کا قہقہہ نیچے تک سنائی دیتا تھا۔ وہ ہر سنجیدہ بات کو بھی

چٹکیوں میں اڑا دیتی تھیں۔ تب پہلے تو امی کو سمجھ ہی نہ آئی تھی جب سمجھ آئی تو ان کے غصے کا گراف اگلی رات تک بھی اتر کے نہ دیا تھا۔

"نوشابہ کی جرأت کیسے ہوئی کیا تیمور جیسا لفنگا میری نیلم کے لیے رہ گیا ہے۔" وہ آگ بگولا ہو کر وکیل صاحب کے سر ہو جاتی تھیں۔

"دنیا میں آخری لڑکا تیمور ہو میں تب بھی نوشابہ کے بیٹے کو اپنا داماد نہ بناؤں۔" اس کی امی کا جلال کئی کئی دن تک قائم دائم رہتا تھا۔ اور تب نیلم خوفزدہ ہو کر کتاب میں منہ گھسا لیتی تھی اور جیسے ہی لفظ پڑھنے کی کوشش کرتی۔ سامنے تیمور کا مسکراتا شوخ چہرہ دکھائی دینے لگتا تھا۔ نیلم اس قدر گھبراتی کہ کتاب الٹ کر لحاف میں منہ دے لیتی تھی۔ لیکن یہاں بھی تیمور ہی...

وہ اٹھ کر لحاف پھینکتی، کچن میں بھاگ جاتی۔ بلاوجہ دھلے ہوئے برتنوں کو دھونے لگتی تھی لیکن یہاں بھی تیمور کا چہرہ، تیمور کی آنکھیں، تیمور کی مسکراہٹ اور نیلم کا دل ہاتھوں سے پھسل پھسل کر لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ سو وہ اپنی کیفیت پہ دنوں انگشت بدنداں رہتی تھی۔

تیمور کے ساتھ اس کے تعلقات کبھی بھی دوستانہ نہیں رہے تھے۔ پھر بھی اس کی امی کو تیمور پہ شک ہی رہتا تھا۔ وہ کبھی کالج یونی فارم استری کروانے آجاتا تو امی سر پہ کھڑی رہتیں۔ تیمور شرٹ اور پینٹ کا گولا بنا کر اس کے منہ پر دے مارتا اور چیخ کر آواز لگاتا۔

"نیلی، پیلی! جلدی پریس کر دو۔ آج کالج کا منہ دیکھ ہی آؤں۔" وہ سیڑھیوں پہ کھڑا ہو کر اوپر سے فائر کھولتا تھا اور امی کچن سے فوراً "برآمد ہو جاتیں۔

"نواب آف کالا باغ! خیریت تو ہے کہیں کالج میں دل تو نہیں اٹکا لیا ورنہ تم اور کالج جاؤ۔ وہ بھی اتنے اہتمام سے۔" امی کی فائرنگ پہ وہ بھی بلا کا منہ پھٹ، منہ توڑ قسم کا جواب دیتا تھا۔

"تیمور کا دل اتنا گرا پڑا نہیں جو خوامخواہ جھاڑیوں میں اٹکا پھرے۔" وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا حساب برابر کرتا۔ امی بھی مزید معلومات کے لیے تفکیر سمیت باہر نکل آتیں۔ سو دراصل وہ اس کا دل یعنی اندر کا راز لینا چاہتی تھیں کیونکہ آج کل نوشابہ بار بار امی کو سنا رہی تھیں کہ وہ تیمور کی جلدی شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔

"تمہاری ماں تو تمہارے بارہ پاس کرنے کے انتظار میں ہے۔ ابھی امتحان دو اور ابھی شادی رچا لے۔" امی کا انداز سلگتا ہوا معنی خیز قسم کا ہوتا تھا۔ تیمور آنکھیں میچ کر دیکھتا پھر نفی میں سر ہلانے لگتا۔

"تائی! ابھی تک مجھے کوئی نیلی پیلی تو پسند آنہیں سکتی۔ میرے لیے تو ممی کو بہت اونچا ہاتھ مارنا پڑے گا۔" وہ بھی کمال کا استاد تھا۔ امی کو باتوں میں ایسے بہلا کر مطمئن کر دیتا۔ یعنی اس دن امی کو اطمینان ہو گیا تھا کہ تیمور خود ہی نیلم کے لیے انکار کر دے گا۔ امی کو چاچو کے سامنے برا نہیں بننا پڑے گا۔ کیونکہ امی اڑتی اڑتی سن رہی تھیں کہ چاچو، ابو سے نیلم کے لیے بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

"تو اور کیا۔ جتنے تم اونچے ہو اتنی اونچی تو وہ بھی ہونی چاہیے۔" امی نے بے ساختہ خوش ہو کر کہا تھا۔ درپردہ کہنا چاہتی تھیں کہ جتنے منہ پھٹ، بدتمیز، آوارہ اور زبان دراز تم ہو۔ اتنی تمہاری بیوی بھی ہونی چاہیے اور وہ بھی تیمور علوی تھا۔ پورا آفت کا پرکالا۔ امی کے اندر تک اتر کے واپس آجاتا۔ ان کے خیالات کو پکڑ لیتا۔ اسی لیے گلا کھنکھار کر گوڑھی سہیلیوں کی طرح بڑے رازدانہ انداز میں پوچھتا۔

"ممی کی تو خواہش ہے ان کی بہو کچھ ہو نہ ہو۔ گک ضرور ہو، آپ بتائیں تائی! اپنے داماد میں کیسی خوبیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کا داماد کیسا ہو۔" وہ امی سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوا دزدیدہ نظروں سے نیلم کی طرف بھی دیکھتا تھا۔ جو سر جھکائے پینٹ کی کریز بناتی ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں بے حال ہوتی تھی۔

اس کی رنگت سرخ اور نیلی آنکھیں کچھ اور نیلی ہو جاتی تھیں۔

جبکہ امی بڑے ہی جوش و خروش سے اپنی خواہش تیمور تک پہنچا دیتیں۔

"میں بھی چاہتی ہوں، میرا داماد کچھ ہو نہ ہو۔ یہ مگر ضرور ہو تاکہ پنشن لینے کے لیے جائیں تو لائن میں نہ لگنا پڑے۔" امی اس قدر جذب کے ساتھ کہتیں کہ تیمور اپنی ماں کی طرح ہی چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگاتا تھا۔ اور وہیں سیڑھی کی ریلنگ پکڑ کر ہنستے ہنستے دوہرا ہو جاتا۔ اور امی اس کے ہنسنے پہ حیران رہ جاتیں۔ پھر انہیں غصہ آجاتا تھا۔ لیکن تیمور کی ہنسی کا سبب تب بالکل سمجھ نہیں آتا تھا۔ اور واقعی ہی نہیں آتا تھا۔ لیکن اگلے آنے والے دنوں میں امی کو تیمور کی اس ہنسی کا سبب معلوم ہو گیا تھا جسے سوچ کر وہ آج بھی طیش سے لال پڑ جاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼
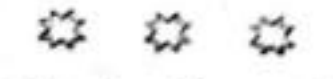
اور یہ بھی سردیوں کے انہی مختصر دنوں کی بات تھی۔

اس دن بڑے انداز میں سورج طلوع ہوا تھا۔ بڑے نرم گرم سے دن تھے۔ لیکن آج کا دن کچھ زیادہ ہی سنہرا اور روشن تھا۔ اس دن کلنگ بھی لمبی اڑان بھر کے نہیں آیا تھا۔ اور نہ ان کی چھت پہ اپنا منحوس شور ڈالا تھا۔ برآمدے کے باہر گلابوں نے اپنی دھوم مچا رکھی تھی جیسے ہی لاؤنج کا دروازہ کھلتا تو ہوا کے زور پہ خوش گوار معطر ہوا کا جھونکا پھسلتا ہوا اندر آجاتا۔ امی چولہے پہ بڑا سا کڑاہا رکھے قلاقند بنا رہی تھیں۔ اور یہ واحد سردیوں کی عیاشی تھی جو نیلم کے نصیب میں آتی۔ سردیوں میں دوپہر کو کھانا نہیں پکایا جاتا تھا۔ بس گرم دودھ کے ساتھ السی کا لڈو، بیسن کی میٹھی ٹکیا یا قلاقند ٹائپ کا کھا لیا جاتا تھا۔

لیکن امی نے چاچی کی طرح کبھی بھی کوئی سوغات اوپر بھجوانے کا تکلف نہیں کیا تھا۔ کبھی بھی۔ نیلم کو یاد نہیں پڑتا تھا امی نے کبھی کوئی چیز اوپر بھجوائی ہو۔ البتہ تیمور زبردستی لڑ جھگڑ کر اپنا حصہ نکلوا لیتا تھا۔ امی لاکھ پردے ڈالتیں بہلانے بناتیں لیکن وہ نکلوا کر ہی دم لیتا تھا۔ اسے ہر اچھی چیز کی خوشبو آجاتی تھی۔

اور امی اس دن قلاقند بنا رہی تھیں۔ یہ کھوئے اور چینی سے بنی بڑی لذیذ مٹھائی ہوتی تھی۔ منہ میں گھلتی بھر جاتی۔ تیمور کو بہت پسند تھی۔

اور جیسے ہی امی نے آمیزہ ٹھنڈا کر کے "قند" کے ڈلے کاٹنے شروع کیے تھے اسی لیے تیمور بھی دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتا اندر آگیا تھا۔ اسے کھوئے کی مہک کھینچ لائی تھی خوشبو مٹھاس بھری لذیذ۔

"تائی! اکیلے اکیلے قلاقند کھا کر کیسے ہضم کریں گی، ایک میری ممی ہیں۔ مونگ پھلی کا دانہ بھی ہو تو بھاگتی ہوئی پیچھے دینے آگئی ہیں اور آپ ایسی بے مروت، حد کر دی آپ نے تائی! دل دکھا کر رکھ دیا میرا۔" وہ کترکتر بولتا قند کے ایک ساتھ دو ڈلے نگلتا بمشکل امی کو بے مروت سے کنجوس بولنے تک لحاظ کر گیا تھا۔ اور امی جیسے ہکا بکا رہ گئیں۔ پھر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئیں۔

"تمہاری ماں تو فریج کا باسی اٹھا کر ہمیں دے جاتی ہے۔" امی کے اس الزام پہ تیمور تڑپ کر ایک اور ڈلہ بھی نگل گیا تھا۔ پھر آنکھیں پھاڑے امی کو دیکھتا رہ گیا۔

"تائی! اتنا بڑا بہتان میں آپ کے خلاف رپٹ درج کروا دوں گا۔ تایا کو وکیل ہائیر کر لوں گا۔ اور آپ کو۔" وہ بولتا ہوا ایک آدھ قلاقند کا قتلہ جیبوں میں اڑستا کھڑا ہو گیا۔ یہ کام اس نے بڑی ہوشیاری سے کیا تھا پھر بھی امی نے دیکھ لیا اور چیخ پڑی تھیں۔

"ارے، کمینے! یہ کیا واپس کرو تم نے اپنا حصہ کھا لیا دو ٹکڑے اوپر بھجواؤں گی واپس کرو ابھی اسی وقت۔" امی کے چیخنے، دہائی دینے پہ بھی وہ ذرا نہ گھبرایا۔

"اپنا حصہ کھایا ہے نا۔ یہ تو واپسی کے لیے ہے۔" اس کے کمال اطمینان پہ امی کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ انہیں اختلاج ہونے لگا تھا۔ غصے میں ان کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ تیمور کی جیبوں سے قتلوں کو جھپٹ لیتیں۔

"ہم نے تمہارے ناکوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔" امی نے غضبناک لہجے میں کہا تھا۔ تیمور مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا۔

"آپ نے کبھی میرے ناکوں کو عید کے عید بھی کوئی چیز نہیں بھجوائی۔ ایک تنکا تک نہیں۔ پیشہ ہی ہے ہم نہیں سجا کر اپنی امی کو دے توڑ کے آپ نے

بھولائی ہے۔ دیکھنا، کتنے نمبر بنیں گے آپ کے 'ماہی' بھی خوش ہو جائیں گی۔" وہ اپنا اگلا لائحہ عمل امی کو بتاتا! انہیں اور بھی غصہ چڑھا گیا تھا۔

"تمہاری ماہی سے نمبر لگوا کر مجھے ایوارڈ نہیں لینا۔ اب جاؤ، دفعہ ہو۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔" امی نے غصیلے لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا تھا۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"آپ کا دماغ کھا کر کسی نے آپ کی طرح خبطی نہیں ہونا۔" وہ باہر نکلتے ہوئے خاص طور پر نیلم کو سنا کر جانے لگا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔ نیلم گیلری میں فرش پہ کتابیں بکھیرے ٹیسٹ رٹنے میں مصروف تھی۔ تیمور نے دزدیدہ نظروں سے کچن کی طرف دیکھا تھا۔ تائی اس وقت بڑی مصروف تھیں۔ ان کا دھیان باہر نہیں تھا۔ وہ اپنے خزانے کو ٹھکانے لگانے میں مگن تھیں۔

تیمور بالوں میں ہاتھ پھیرتا نیلم کے قریب آ رکا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر دو زانو فرش پر بیٹھ گیا۔ نیلم جو آنکھیں بند کیے انگلش کا مضمون رٹ رہی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے کسی کی موجودگی پا کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول لی تھیں۔ کسی کی نظروں کا ارتکاز اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ سا ہو گیا تھا۔ اور آنکھیں نیلگوں سمندر سی۔ خود بخود جھک سی گئی تھیں۔ کہیں دھڑکنوں میں ہلکا سا ارتعاش ہوا تھا۔

وہ کچھ گھبرا سی گئی تھی کیونکہ تیمور بڑے دھیان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کیوں اتنے غور سے اسے دیکھ رہا تھا نیلم سمجھ نہیں پائی تھی۔ بالکل سمجھ نہیں پائی تھی اوپر سے تیمور کی عجیب سی باتیں۔

"تائی کا بی ہیویئر تم نے دیکھا ہے ان کو کس نے نبھانا ہے تایا نے یا میں نے 'پکڑ کر بے عزتی کر دیتی ہیں۔ اور میں بھی بڑا بدلحاظ ہوں۔ آگے کچھ ہوا نا.... تو ذمہ داری تائی کے سر ہو گی۔ سنا تم نے۔" وہ بڑے خفگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ نیلم ہونق سی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔

"تائی خود کو وزیراعظم سمجھتی ہیں۔ اور تمہیں ریاست کی شہزادی سن لو ذرا دھیان سے۔ میں بھی کوئی گرا پڑا نہیں ہوں۔" تیمور کا لہجہ پہلے کی طرح کھردرا اور خفگی سے لبریز تھا۔

"اور ابھی بتا رہا ہوں۔ میرا میٹر بھی الٹا چلتا ہے۔ غور سے میری بات سن لو۔ بعد میں تائی کی ناجائز حمایت کی نا تو بہت برا پیش آؤں گا۔" اس کا انداز کچھ دھمکاتا ہوا تھا۔ نیلم ہکا بکا رہ گئی۔ اسے تیمور کی الٹی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ کون سے بعد کی بات کر رہا تھا، نیلم قطعاً" نہ جان پائی تھی۔ وہ ذرا بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن تیمور کے پیچھے کھڑی شعلہ بار نظروں سے گھورتی فرحت نے تیمور کی ایک ایک بات سن لی تھی اور پھر ایسا فساد مچا تھا کہ حد نہیں۔ اتنی لڑائی ہوئی کہ بیان سے باہر تھی۔

امی اور تیمور نے طعنوں میں پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔ دونوں سوا سیر تھے۔ کوئی بھی کم نہیں تھا۔ کوئی بھی ہار نہیں رہا تھا۔ پھر تیمور کے بارے میں تو مشہور تھا وہ بہت منہ پھٹ ہے۔ بدلحاظ ہے اور جب وہ امی کی طرح اپنی کرنی پہ آتا تھا تو پھر کسی کی نہیں سنتا تھا۔

اور اس دن نوشابہ بھی گرتی پڑتی سیڑھیاں اتر کر آ گئی تھیں۔ انہوں نے بہت سیز فائر کروانے کی کوشش میں اپنا دماغ کھپایا تھا۔ لیکن نہ امی رک رہی تھیں۔ نہ تیمور باز آ رہا تھا۔ پھر جاتے جاتے وہ امی کو دھمکا بھی گیا۔

"مجھ جیسا آوارہ ہی آپ کے پلے پڑے گا۔ کسی بینکر، انجینئر کے بس خواب دیکھتی رہ جائیں گی۔" وہ امی کی ہر الٹی بات کا الٹا جواب دیتا بھناتا ہوا باہر نکل گیا تھا، جبکہ امی اگلے ایک گھنٹے تک چیختی رہی تھیں۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی! یہ کمینہ اب میرے پورشن سے گزر کر تو دکھائے۔ میں ٹانگیں توڑ دوں گی اس کی۔" امی کی دھمکیاں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ وہ کمینہ ان کے پورشن تو کیا بیٹی کا بھی مالک و مختار بن گیا تھا۔ لیکن ہوا کیا تھا؟ تب بھلا ہوا کیا تھا۔

"نیلی، او نیلی!" یہ آواز اوپر سے آ رہی تھی اور

پکارنے والا بڑی ڈھٹائی سے پکار رہا تھا۔ نیلم کچن میں بریانی کو دم دے رہی تھی۔ لیکن اس کا سارا دھیان اوپر کی طرف تھا۔ وہ بے بسی سے کبھی اوپر کی پکار پہ دھیان دیتی اور کبھی دزدیدہ نظروں سے تخت پہ بیٹھی فرحت کو دیکھتی۔ فرحت نے اس کی نظروں کا اضطراب دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تخت پہ بیٹھے بیٹھے ہی چمک کر بولیں۔

"اس نواب کی تم نوکر نہیں ہو۔ خبردار، جو باہر نکلیں یا اوپر گئیں۔" ان کے کڑک دار لہجے کی گونج اوپر تک گئی تھی۔ وہ جو تکون میز کے اوپر لگی پلاسٹک پر فارمیکا کی تہہ ہموار کر رہا تھا اور جب میز فٹ ہو گیا تو اس نے اٹھا کر سب سے اوپر سیڑھیوں کے پہلے اسٹیپ پہ رکھ کر پھر سے نیلم کو آواز دی تھی۔

"یہ لو، تایا کا میز فٹ کر دیا ہے۔ مجھے کہہ رہے تھے، کاریگر کو دے آنا۔ میں نے خود ہی ٹھونک دیا ہے۔ اب بتاؤ، نیچے دے جاؤں؟" وہ ریلنگ پہ لٹک کر فرحت کو دیکھتا آنکھ دبا کر نیلم سے مخاطب تھا۔

"اب نیچے آیا تو لوگ ٹانگیں توڑ دیں گے۔" اس نے باقاعدہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا تھا۔

"میں کیسے اٹھاؤں گی، وزنی ہو گا۔ تم خود دے جاؤ۔" نیلم کو بالآخر جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"دیکھ لو، میری ٹانگوں کا بیمہ نہیں ہے۔ پہلے گارنٹی دو۔" وہ ریلنگ پر لٹکا لٹکا اعلان کر رہا تھا۔ نیلم تھوڑا زچ ہو گئی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا تم میز دے جاؤ۔ ابو کا فون آیا تھا۔ ان کا محرر لے جائے گا۔" نیلم نے کچن میں جا کر برنر بند کیا اور وہیں کھڑے کھڑے سامنے اوپر کی طرف آدھے لٹکے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ اور نیلم کو ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے فرحت کو اشارہ کیا۔

"تائی! آپ کے شوہر کا میز لے کر نیچے آ جاؤں؟"

"پہلے تو تائی کی اجازت سے دندناتے ہوتا۔" فرحت نے جلبلا کر جواب دیا تھا۔ وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"تائی آپ بھی نا سچ مچ بڑی سوئیٹ ہیں۔" تیمور نے مسکہ لگایا تھا۔ پھر نیچے آ کر میز رکھ گیا۔ جب وہ جانے لگا تو فرحت نے بے ساختہ اسے روک لیا تھا۔

"زہے نصیب۔" وہ تو واری جانے لگا تھا۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ تیمور!" انہوں نے عینک کے پیچھے سے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ تیمور اچھا بھلا چونک گیا۔

"کیسی حرکتیں؟" وہ معصوم بنا۔ پھر سیڑھیوں پہ چڑھ کر دوبارہ پلٹ آیا تھا۔

"یہی صعود و نزول۔" ان کی ناک پہ غصہ آ گیا۔ یہ پھیرے اور اوپر چڑھنا اترنا ان کی برداشت سے باہر تھا۔

"مطلب؟" اسے اچنبھا ہوا۔ وہ واقعی ہی تائی کے طنز کا پس منظر نہیں سمجھا تھا۔

"یہ اتار، چڑھاؤ۔" انہیں اور بھی غصہ آ گیا تھا۔ تیمور کے آنے جانے پہ انہیں شدید قسم کے اعتراضات تھے اور آج تو اس کا رزلٹ بھی آیا تھا۔ خاصا قابل اعتراض قسم کا۔ انہوں نے اسے آڑھے ہاتھوں لیا۔

"کاش کہ چار جماعتیں پڑھ لیتے۔" تائی بھی طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں۔

"تو پھر کیا ہوتا؟ کیا بینک میں افسر لگ جاتا۔" اس نے آنکھیں گھما کر تائی کو بھی گھمانا چاہا تھا۔ یعنی ان کی بات انہی پہ لوٹا دی تھی۔ فرحت کو غصے نے اور بھی گھیرا تھا۔ نیلم نے جیسے سر پیٹ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی اب دوبارہ سے ٹکراؤ ہونے والا تھا۔

"یہ منہ اور مسور کی دال۔" فرحت نے استہزائیہ کہا۔ ایک تو سوئی میں سے دھاگا نکل گیا تھا اوپر سے اس کی بکواس۔

"تائی! مجھے غصہ مت دلائیں۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"پھر کیا ہو گا؟" تائی فرحت کا استہزا کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے فریم کو ایک طرف رکھ دیا۔

"جو ہو گا، اچھا نہیں ہو گا۔" تیمور کو بھی بے تکی ہانکنے کا شوق تھا۔

"جاؤ میاں! اپنا رستہ ناپو۔" فرحت بیزار ہو چکی تھیں۔ انہوں نے پھر سے فریم اور سوئی دھاگے کو گود میں رکھا۔

"اتنا فارغ نہیں ہوں، جو رستے ناپتا پھروں۔" تیمور کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"تو پھر چوک میں کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی آنکھیں سینکنے کا سبب مل جائے گا۔" فرحت زہر خند لہجے میں بولی تھیں اور بس تیمور کے ضبط کی طنابیں ہاتھ سے جاتی رہیں۔ بولنے پہ آتا تو اس سے بڑا بدلحاظ کوئی نہیں تھا اور اب تو تائی خالصتاً "ذاتیات" پہ اتر آئی تھیں۔ یعنی کہ وہ اسے کیا سمجھتی تھیں "آوارہ" سڑک چھاپ، لچا لفنگا حد تھی یعنی کہ حد تھی۔

اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر نیلم کا دل دہل گیا تھا۔ اب نجانے کیا ہو جاتا۔

"آپ مجھے سمجھتی کیا ہیں؟" وہ جارحانہ انداز میں چیخ پڑا تھا۔ فرحت نے بے نیازی سے نیا ٹانکا چڑھایا۔ جیسے تیمور کے غصے کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔

"اپنے آپ سے پوچھ لو۔" ان کی بے نیازی کا عالم وہی تھا۔

"اپنا آپ تو مجھے بڑا خوب صورت لگتا ہے۔" معاً نیلم کے زرد کپکپاتے چہرے پہ تیمور کی نگاہ پڑی تو اس نے اپنا انداز' لہجہ اور الفاظ تک بدل لیے تھے۔ وہ غصے کو دبا کر سابقہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولنے لگا تھا۔ یوں کہ بس گھڑی بھر کی دیر میں نیلم کے چہرے کی زردی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتری نمی تک سوکھ گئی۔ چہرے پہ ہلکا سا اطمینان پھیل گیا تھا۔ جو تیمور کو اس قدر بھلا معلوم ہوا کہ وہ تائی سے مزید جھگڑنا چھوڑ کر الٹے قدموں سیڑھیاں چڑھتا اوپر غائب ہو گیا تھا۔

اور یہ تو بس گھڑی بھر کی بات تھی۔ پرانی عادتیں چھوٹتے ہی چھوٹتی تھیں۔ نہ امی' تیمور' چاچی اور چاچو کے لیے رام ہوئی تھیں اور نہ تیمور جواب دینے سے باز آتا تھا۔ نہ انہیں غصہ دلانے سے باز آتا تھا۔

اس دن نوشابہ چاچی نیچے آئیں تو امی کو بہانہ مل گیا ان سے تیمور کو ٹھکانے لگانے والے موضوع پہ گفتگو کرنے کا کیونکہ چاچی خود اکیس سالہ تیمور کو بیاہنے کے لیے بے تاب بیٹھی تھیں۔ بس ان کو شوق تھا۔ جوانی میں ساس اور دادی وغیرہ بننے کا۔ یہ تو اس دن چاچی نے امی کو بتایا تھا وہ تیمور کی کیوں جلدی شادی کرنا چاہتی ہیں۔

"تیمور اور نیلم کے بعد ہمارے گھر کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اس گھر کی دیواریں ترس گئی ہیں بچوں کی آوازیں سننے کے لیے' میری بھابی بھی وقاص کے لیے لڑکی ڈھونڈ چکی ہیں۔ آگے پیچھے ان کی شادیاں ہو جائیں گی۔" نوشابہ چاچی نے بڑی خوشی اور حسرت بھرے لہجے میں بتایا تھا تب فرحت زیر لب بڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔

"تم تو بس میکے والوں کی ریس میں بھاگتی رہنا۔" چاچی کے چہرے پہ پھیلی الوہی سی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے فرحت کو اچانک خیال آیا تھا گو کہ خیال تو اچانک نہیں آیا تھا۔ لیکن انہوں نے انداز ایسا ہی اپنایا کہ یوں لگے اچانک خیال آیا ہو۔

"تم نے تیمور کے لیے لڑکی نہیں دیکھی؟"

"لو بھابی! لڑکی ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے۔" نوشابہ نے عادتاً" قہقہہ لگایا تھا۔ فرحت کو اچنبھا سا ہوا۔

"تو کسی بھیڑ بکری سے شادی کرو گی؟"

"اور سن لو جی... حد کرتی ہیں آپ' اپنے گھر میں بچی موجود ہے تو باہر کیوں تلاشوں؟" نوشابہ نے جیسے فرحت کی عقل پہ ماتم کیا تھا اور فرحت کو یوں لگا تھا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ اچھل کر ایک فٹ دور جا بیٹھیں اور نوشابہ کو یوں گھورنے لگی تھیں جیسے نوشابہ کا دماغ چل گیا ہو۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو؟" ایک خدشے کے تحت انہوں نے بات صاف کر لینا ضروری سمجھا تھا۔ فرحت کے انداز کو نظر انداز کر کے فرش پہ پوچا لگاتی نیلم کو میٹھی نگاہ سے دیکھتی نوشابہ نے بڑے پیار سے کہا۔

"اپنی نیلی ہے نا۔ پھر کسی اور کا کیا کروں۔ میرا تو بس نیلی پہ دل ہے۔" نوشابہ کی ملائمت بھری آواز کو فرحت کی تڑخی نے لمحوں میں مسمار کر دیا تھا۔ وہ بھو بجھی سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"دیکھو بی بی! آج میں تمہیں کلیئر کر دوں تاکہ تم لوگ کوئی امید مت رکھو۔ تیمور اس قابل نہیں جو میرا داماد بنے۔ نہ شکل' نہ ہنر' نہ تعلیم... نیلی ابھی بچی ہے بمشکل سولہ کی بھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو پڑھے لکھے گی۔ پھر اس کی کسی انجینئر' بینکر سے شادی کروں گی۔ اگر تیمور بھی کسی قابل ہوتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا۔ ابھی تک باپ کی کمائی کھا رہا ہے۔ کل کو بیوی بچوں کو کہاں سے کھلائے گا' کیا باپ کے سامنے ہتھیلی پھیلا کر۔" فرحت نے انتہائی سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نوشابہ کا منہ بند کروا دیا تھا اور نوشابہ اپنا دھواں دھواں چہرہ لیے الٹے قدموں اوپر گئیں تو پھر نیچے اتری ہی نہ۔

ان کا دل اس توہین اور غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ کیا ان کے بیٹے میں اتنے بڑے سقم تھے جو گھر کی بچی کا رشتہ ملنا بھی محال تھا۔ اور انکار بھی اتنی بے دردی کے ساتھ' ابھی تو وہ باقاعدہ رشتہ لے کر نہیں آئے تھے۔ اگر بھابی کو منظور نہیں تھا تو سبھاؤ سے انکار کر دیتیں۔ اس طرح توہین کرنے کی کیا ضرورت تھی' اتنا ذلیل کرنے کی کیا ضرورت تھی ان کے اکلوتے بیٹے میں کمی کیا تھی جو اس طرح سے ذلیل کر کے انکار کر دیا گیا۔ سوچنے کے لیے لمحہ بھی نہیں لگایا۔ نوشابہ کا کمزور دل اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا اور انہیں انجائنا اٹیک ہو گیا نوشابہ ہسپتال کیا گئیں گھر میں زلزلہ آگیا۔

تیمور' فرحت کے ساتھ اس قدر لڑا کہ حد نہیں۔ وقاص زبردستی اسے کھینچ گھسیٹ کر اپنے گھر لے گیا تھا اور وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"تائی نے میری ماں کو ہسپتال پہنچایا ہے۔ یہی میری ماں کی مجرم ہیں۔" تیمور کی بازگشت نیلم کو پہروں رلاتی تھی اور وہ تکیے میں سر گھسا کر روتی رہتی۔

ان دونوں آشیانہ مکین پہ سوگوار فضا کا سایہ تھا۔ ابو پریشان تھے اور چاچو' ابو سے بھی زیادہ پریشان تھے۔ ابھی چاچی ٹھیک ہو کر گھر بھی نہیں آئی تھیں کہ چاچو کا اچانک بلڈ پریشر ہائی ہوا اور انہیں بھی اٹیک ہو گیا۔ تیمور ان دنوں گھن چکر بنا ہوا تھا۔ گھر' ہسپتال کے درمیان بھاگ بھاگ کر اسے اپنا کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ اس کے ماموں کی فیملی اسے برابر سپورٹ کرتی تھی۔ وقاص کی بیوی سبرین ہی ان کا کچن سنبھالتی اور گھر کی دیکھ بھال کرتی۔ چاچو اور چاچی دونوں بستر سے لگ گئے تھے۔

اسی دوران چاچو کی نہایت شکستہ حالت دیکھ کر وکیل صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک ایسا فیصلہ کر لیا تھا جس میں فرحت کی ذرا سی مرضی شامل نہیں تھی۔ انہوں نے آخری دم تک مخالفت کی تھی آخر تک ضد کی تھی۔ گھر چھوڑ دینے کی دھمکی تک دی' لیکن وہی ہوا تھا جو تقدیر میں لکھا گیا تھا۔ ان کی ہر ضد' ہر مخالفت' ہر غصے' ہر لڑائی کی قیمت تیمور اور نیلم کے نکاح اور رخصتی کی صورت چکانی پڑی تھی۔

یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ فرحت کا دماغ تک پلٹ گیا۔ وہ دم بخود ہو چکی تھیں۔ ساکت اور گم صم ہو چکی تھیں اور کئی دنوں تک ان پہ یہی کیفیت طاری رہی تھی۔

اور نیلم اپنی کتابیں تخت پہ بکھری چھوڑ کر نیچے سے اوپر شفٹ ہو گئی تھی۔

جس قدر اچانک نکاح اور پھر رخصتی ہوئی تھی' ولیمہ چاچو نے بہت شاندار کیا تھا۔ اور ولیمے سے پہلے دونوں پورشن رنگ و روغن کے بعد سجا ڈالے تھے۔

اچھے بھلے بیمار چاچو اور چاچی تیمور کی شادی کے جوش اور خوشی میں بھلے چنگے ہو گئے تھے۔ گو کہ اندرونی طور پر وہ بیمار ہی تھے' لیکن ظاہر یہی کرتے کہ وہ ٹھیک اور تندرست ہیں۔ وہ ہشاش بشاش رہ کر بس تیمور کو خوش کیا کرتے تھے جو اپنے والدین کے لیے اتنا حساس ہو چکا تھا کہ ان کی ذرا سی بے ترتیب سانسیں اس کی اپنی سانسوں کو بے ترتیب کر دیتی تھیں۔

ولیمے والی رات تیمور بڑا خوش تھا اور تب تک نیلم بھی اچانک ہونے والے نکاح اور رخصتی کے جھٹکے سے سنبھل چکی تھی۔ اس رات تیمور بہت ہنس رہا

تھا۔ اور ہنستا ہنستا بستر پر گر گیا۔ اس کی ہنسی نیلم کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ویسے بھی نیلم کی اتنی سمجھ ہی نہیں تھی۔ وہ اتنی نادان، معصوم اور بھولی تھی کہ اسے کوئی جس سمت لگاتا وہ چپ چاپ لگ جاتی تھی اور ابھی بھی تیمور کے ہنسنے پہ مارے گھبراہٹ کے وہ خود بھی ہنسنے لگی۔

اور پھر جب تیمور کی ہنسی کو بریک لگے تب نیلم نے بے ساختہ پوچھ لیا تھا۔

"تم کیوں ہنس رہے تھے اتنا؟" اس کی آنکھوں میں سوال بھی تھا اور ڈھیر ساری معصومیت بھی اور تیمور نیلی نیلی ان آنکھوں کی معصومیت میں جیسے گوڈے گوڈے ڈوب گیا تھا۔

"پہلے تم بتاؤ۔ تم کیوں ہنسی تھی؟" تیمور نے کہنی کے بل سر کو اونچا کر کے نیلم کے سندر روپ کو آنکھوں کے ذریعے اندر اتارا تھا۔ اور ایسے ہی یوں ہی سی اس کے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

"میں تو تمہیں دیکھ کر۔" نیلم نے معصومیت سے کہا تھا۔ تیمور جیسے اس ادا پہ لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

"اور تم۔" نیلم نے سوال کیا تھا۔ شاید وہ بھی یہی جواب دیتا۔ لیکن اس کا جواب اسی کی طرح بہت مختلف تھا۔

"میں تو تائی کو دیکھ کر۔" اور پھر تیمور نے بتانا شروع کر دیا۔

"ہوٹل میں تائی سے کسی نے پوچھا۔ آپ کا داماد کیا کرتا ہے؟ تو تائی نے پتا ہے کیا جواب دیا۔" اس نے آنکھوں میں ڈھیر ساری شرارت بھر کے نیلم کی طرف دیکھا اور بولا، جبکہ نیلم بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی۔

"تائی نے کہا۔ اپنے باپ کے پیسوں پہ عیش کرتا ہے۔" اور پھر تیمور کو ڈھیر ساری ہنسی نے آن گھیرا۔ تائی کے تاثرات اسے اب بھی مزہ دے رہے تھے۔

"بے چاری ایسے ولیمے میں شریک تھیں جیسے کوئی زبردستی باندھ کر لایا ہو اور واقعی ہی تایا ان کو دھمکیاں دے کر ساتھ لائے تھے۔"

نیلم اس کی ہنسی پہ ذرا خفا ہو گئی تھی۔ لیکن تیمور اپنی جون میں لگا ہوا تھا۔

"تائی بے چاری کا ایک خواب تو ٹوٹ گیا۔ مجھے اس پہ بڑا افسوس ہے۔ صبح انہیں ضرور پرسہ دوں گا۔" وہ بڑے شرارتی انداز میں بول رہا تھا۔ اور تصور کی آنکھ سے تائی کا بجھا بجھا چہرہ دیکھا تو وہ بڑا شاد نظر آ رہا تھا۔

"کون سا؟" نیلم نے سادگی سے پوچھ لیا تھا۔ پھر پوچھ کر جیسے پچھتائی تھی۔

"وہ بینکر داماد والا۔ کیا خبر، زندگی کے کسی موڑ پہ تائی کی یہ خواہش پوری ہو جائے۔" تیمور نے اچانک ایک عجیب بات کہہ دی تھی۔ اس قدر عجیب کہ نیلم تک بھونچکی رہ گئی گو کہ اسے سمجھنے میں وقت لگا تھا لیکن پھر بھی۔

"بھلا کیسے؟" نیلم کو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ جانتی بھی تھی تیمور کو بے سوچے بولنے کی عادت ہے۔ لیکن اس کے منہ سے اچانک نکل گیا تھا۔ اور اب کیا ہو سکتا تھا۔

"کیا خبر میں مر جاؤں یا پھر ہماری سپریشن ہو جائے۔" وہ بہت صاف گو تھا لیکن اس قدر سفاک بھی ہو گا؟ نیلم کو اندازہ تک نہیں تھا۔ جب بات نیلم کی سمجھ میں آئی تو وہ اس قدر شدت سے روئی تھی کہ تیمور حواس باختہ ہو گیا۔ پھر آدھی رات تائی تائے میں اور آدھی رات نیلم کے آنسو پونچھنے میں گزر گئی تھی۔ صبح تک تیمور کا سر گھوم رہا تھا۔

"یہ تائی کی بیٹی بھی تائی سے کم نہیں بھیجہ اڑا کر رکھ دیا۔" وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ پھر بے خبر سوئی نیلم کے سرہانے تک آیا۔ اس کے چہرے پہ آوارہ لٹیں بکھر رہی تھیں۔ تیمور نے اس کے بال ہٹائے تو وہ کسمسا کر اٹھ گئی تھی۔ آنکھیں مسلتے ہوئے اس نے بکھرے بالوں کو کیچر میں سمیٹا تھا۔ پھر تیمور کو دیکھ کر اچانک اچھل پڑی تھی۔

"میں یہاں کیسے؟" گویا وہ کچھ دیر کے لیے اپنی پچویشن بھول گئی تھی۔ تب تیمور نے اسے بڑے انداز میں یاد دلایا۔

"آپ آج سے نہیں۔ کافی دنوں سے یہاں ہیں۔"

"میں نے سمجھا کوئی خواب نہ ہو۔" نیلم جھینپ کر مسکرا دی تھی۔ تیمور کو اسے ستانے کے لیے ہتھیار مل گیا تھا۔

"گویا تم مجھے خوابوں میں بھی سوچتی رہی ہو؟" تیمور پیچھے پڑ گیا تھا۔ جواب لیے بغیر جان کیسے چھوڑتا۔ آخر نیلم کو بتانا ہی پڑا تھا۔

"ہاں۔ میرے خوابوں میں تمہارا آنا جانا تو تھا ہی۔" اس کے لبوں پہ الوہی سی مسکان پھیل گئی تھی، جسے کمال محبت سے چنا وہ سرشار ہو گیا تھا۔ کیونکہ جو اس کے دل میں نیلم کے لیے جذبات تھے۔ نیلم بھی ویسے نرم گرم جذبات رکھتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور شادی ہو جانے سے زندگی کا اختتام نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اصل زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ اور ساتھ ذمہ داریوں کی بھی۔ نیلم سے زیادہ جلدی تیمور نے شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کو سمجھ لیا تھا۔ وہ خاصا مدبر ہو گیا۔ اور نوشابہ فخر کا مرقع بنی ہر ایک کو بتاتی تھیں کہ میں نہ کہتی تھی۔ شادی کے بعد تیمور سدھر جائے گا۔ اور واقعی ہی تیمور کچھ نہ کچھ سدھر گیا تھا۔ گو کہ اس میں لاابالی پن جوں کا توں تھا لیکن بہت ساری چیزوں میں وہ سنجیدہ اور خاصا سمجھ دار ہو گیا تھا۔ جن میں سرفہرست اپنے ممی پاپا کو دوائیاں کھلاتا۔ انہیں زبردستی واک پہ لے جاتا۔ انہیں ہسپتالوں کے چکر لگوانے مختلف لیبارٹیز سے ٹیسٹ کروانے۔ وہ اپنے ماں باپ کے لیے بے انتہا حساس ہو گیا تھا۔

جب وہ بیمار ہوئے تو اسے پتا چلا تھا۔ ماں باپ کتنا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اور اس کا قریبی رشتہ بھی وہی ہیں۔ ان کے بعد وہ کس قدر اکیلا ہو جائے گا۔

اور یہی بات نوشابہ کو پریشان کرتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں، ان کی زندگی میں تیمور کی شادی ہو جائے۔ وہ اپنے گھر بار کا ہو جائے۔ ورنہ بعد میں تیمور کا کیا بنتا ان کا اکلوتا نادان بیٹا کہاں دھکے کھاتا۔

نوشابہ کی سوچ ایک ماں والی سوچ تھی۔ اور انہوں نے جیسے تیسے ہی سہی اپنی سوچ اور خواہش کو عملی جامہ پہنا دیا تھا گو کہ فرحت کے بے بہا طعنے بھی سننے کو ملتے تھے۔ وہ انہیں جلی کٹی سناتی تھیں۔

"بس بیماری کا بہانہ تھا۔ مجھے نیچا دکھانے کے لیے ڈرامہ رچایا۔ اور اب بھلی چنگی ہو گئی۔" فرحت آتے جاتے طنز کے تیر پھینکتی تھیں۔ تب نوشابہ پھر سے پہلے کی طرح ہنستی رہتیں۔

"اگر بیماری کا ڈرامہ نہ کرتی تو نیلی میری زندگی کو روشن کرنے کیسے آتی؟" وہ محبت پاش نظروں سے نیلی کو دیکھتی تھیں اور نیلم بے ساختہ جھینپ جاتی۔ اس کی شرم اور جھجک ابھی تک قائم و دائم تھی۔ لاکھ کوشش سے بھی نہ جاتی۔

"اور یہی لوگوں کی مکاریاں ہیں۔ جو ہمیں نہ آئیں۔" فرحت کچوکے لگانے سے باز نہ آتی تھیں۔

"یہ محبت ہے بھابھی!" نوشابہ بحث پہ آجاتی تھیں آخر کس بیٹے کی ماں تھیں۔

"دیکھ لی محبت ہم نے تو۔" ان کا لہجہ زہر آلود ہو جاتا۔

"ہم نے کون سی نفرت کا مظاہرہ کیا۔" نوشابہ پریشان ہو جاتی تھیں۔

"جو پشت میں خنجر چلایا یہ کم تھا کیا؟" فرحت کے پرانے غم جاتے ہی نہ تھے۔ نوشابہ بھونچکی رہ گئیں۔ پھر بمشکل بول پائی تھیں۔

"میں سمجھی نہیں۔" اور واقعی ہی نوشابہ سمجھ نہیں سکی تھیں۔ وہ بڑی حیران نظروں سے فرحت کو دیکھتی رہیں۔ جو بیٹی کو ان کے گھر بیاہ کر بھی دل سے کدورتیں نکال نہیں پائی تھیں۔

"تم کیوں سمجھو گی۔ بہت بھولی ہو تم۔" فرحت کے تیور بگڑ گئے تھے۔ اور ان کی آواز بھی علو تا "بلند ہو گئی تھی۔ اوپر لاؤنج میں تیمور ٹی وی دیکھتا پاپ کارن کھا رہا تھا۔ آوازوں کو بلند ہوتا دیکھ کر ریلنگ سے لٹک کر نیچے دیکھنے لگا۔ نوشابہ اور فرحت لاؤنج میں بیٹھی تھیں اور دونوں کے موڈ خاصے خراب تھے بلکہ خطرناک حد تک خراب لگ رہے تھے۔ تیمور کے چہرے پہ ناگواری پھیل گئی تھی۔

"آپ کھل کر بات کریں۔" نوشابہ کی دھیمی آواز ابھری تھی۔ تیمور بھی رک گیا تھا۔ دراصل وہ فرحت کی آواز سننا چاہتا تھا اور ان کے الفاظ۔

"کیا کھل کر بات کروں؟ کیا تمہاری بیٹی ہوتی۔ کوکھ کی جنی تو تم کسی ویلے نکمے سے بیاہ سکتی تھی؟ بتاؤ ذرا۔"

فرحت کے آگ میں لپٹے الفاظ سن کر تیمور کو ایک ایک بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اور جیسے جیسے وہ سمجھتا گیا اس کا غصہ سوا نیزے پہ پہنچ گیا تھا۔ مارے توہین اور غصے کے اس کی رنگت تانبے کی طرح تپ گئی تھی۔

اور اسے یوں لگا تھا جیسے وہ کھڑے قد سے گر گیا ہے۔

"تم نے جذباتی ڈرامہ رچا کر میرے شوہر کو ورغلایا اور میری بیٹی کا زبردستی نکاح اپنے بیٹے سے کروالیا۔"

اب وہ بھاں بھاں کر کے رو رہی تھیں۔ تیمور کا دماغ سلگ اٹھا۔ اسے اپنی ماں کی فکر پڑ گئی۔ تائی کے الفاظ سن کر وہ پہلے کی طرح بیمار نہ ہو جائیں؟ پھر ہسپتال نہ پہنچ جائیں، وہ کون سا پہلے تندرست تھیں۔ اپنے بیٹے اور بہو کی خاطر بمشکل جی رہی تھیں اور یہی حالت پاپا کی بھی تھی۔

جیسے ہی وہ تن فن کرتا نیچے اترا نوشابہ بیٹے کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئیں۔ اب ان دونوں کا جھگڑا پکا تھا۔ ایک اینٹ تھا تو دوسرا پتھر تھا۔ دونوں میں نرمی اور جھکاؤ نہیں تھا۔ نوشابہ کی جیسے جان پہ بن آئی تھی۔ بڑی مشکل کے ساتھ منتیں ترلے کر کے وہ تیمور کو اوپر لے جانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ لیکن تیمور کا غصہ کسی قیمت نہیں جاتا تھا۔ وہ جب تک سنا نہ لیتا۔ اپنی بھڑاس نہ نکال لیتا۔ اسے چین نہیں آسکتا تھا۔

لیکن پہلے ممی اور پھر نیلم کے لیے اسے چپ ہونا پڑا تھا۔ کیونکہ اسی شام نیلم کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اسے ارجنٹ ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو یہ خوب صورت انکشاف ہوا۔ نیلم امید سے تھی اور یہ خبر ایسی راحت جاں قسم کی تھی، جس نے تیمور کے سارے غصے کو بھلا دیا تھا۔ وہ چہکتا چلاتا آشیانہ ثقلین میں داخل ہوا تھا۔

"تائی، تائی!" وہ انہیں تلاشتا کچن تک پہنچ گیا۔ پھر ہانڈی بھونتی فرحت کو بے ساختہ گھما ڈالا تھا۔

"ارے لڑکے! باؤلے ہو چکے تم۔" تائی گھومتی ہوئی بیزاری اور خفگی سے چلائی تھیں۔ تیمور انہیں مسلسل گھماتا رہا۔

"رکو تو... کیا کرتے ہو؟ دماغ گھما دیا میرا۔" وہ پھر سے چلائی تھیں۔

"آپ کا دماغ آل ریڈی گھوما گھمایا ہے۔ مزید گھمانے کی ضرورت نہیں۔" تیمور ابھی تک انہیں چکر دے رہا تھا پھر اچانک ہی رک گیا۔ تائی بے چاری سر تھام کر اسٹول پہ ڈھے گئی تھیں۔ بڑی دیر بعد انہوں نے سنبھل کر تیمور کو دیکھا تھا پھر اسے وہ کھری کھری سنائیں کہ حد نہیں۔ ان کا دل ابھی تک قابو میں نہیں آرہا تھا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے تمہارا۔" وہ چیخی تھیں۔

"کیا مل گیا تمہیں، جو اس قدر باؤلے ہو رہے ہو تیمور؟"

"ملا نہیں، ملنے والا ہے۔" تیمور چلایا تھا۔

"کیا...؟" فرحت چونکی تھیں۔ پھر تیمور کے پیچھے شرمائی شرمائی نیلم کو دیکھ کر سمجھ گئیں۔ نیلم جلدی سے ماں کے گلے سے آلگی تھی۔

"وہ امی بتانا ہے کیا؟" نیلم ہکلا کر کچھ بولنا ہی چاہتی تھی جب تیمور نے اسے ٹوک دیا۔

"رہنے دو، تم تو پندرہ منٹ خواہ مخواہ ضائع کر دو گی۔ میں بتاتا ہوں۔ تائی! کچھ بتایا ہے یا نہیں بتایا۔ آپ کو

تائی ضرور بنا دیا ہے۔ آپ کی ایک اور عہدے پہ پروموشن ہونے والی ہے۔" تیمور کے سارے انداز ہی جدا تھے۔ ہر بات کا الگ طریقہ تھا۔ اب بھی تائی کو شاک کی کیفیت میں چھوڑ کر اوپر نیلم کا ہاتھ پکڑ کر چلا گیا تھا۔ اور وہ جیسے حق دق دیکھتی رہ گئی تھیں۔

بھلا یہ عمر تھی نیلم کی ماں بننے والی وہ تو ابھی خود بچی اور ناسمجھ تھی۔ وہ کیسے سب کچھ سنبھال سکے گی، ایک ماں ہونے کے ناطے ان کی سوچ درست تھی لیکن طریقہ غلط تھا۔

اس معاملے پہ بھی وہ تیمور کو معاف کرنے پہ تیار نہیں تھیں... جانے کتنی مرتبہ وہ طعنے دے چکی تھیں۔

"ناک پونچھنے کی خبر نہیں... کمانے کی فکر نہیں... ابا بننے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔"

اور پھر تائی کی لاکھ رکاوٹوں، غصے اور تلخی، طعنوں کے باوجود شادی کے دسویں مہینے تک جینا ان کی زندگی میں آچکی تھی اور جینا کے فوراً بعد بیلا بھی۔ لیکن بیلا کی آمد سے پہلے ہی ان کی زندگیوں میں کئی طرح کے بھونچال آگئے تھے۔ چاچو کی جاب ختم ہو گئی تھی۔ سرکاری نوکری تو تھی نہیں۔ جو پنشن کا آسرا ہوتا۔

ان دنوں تیمور بھی سخت پریشان تھا۔ لیکن ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اوپر سے تائی کے لامحدود طعنے۔

ایک دن جینا کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے نیلم نے تیمور کو کہہ ہی دیا۔

"تم امی کو کچھ بن کر دکھا ہی دو۔"

"باپ بن کر تو دکھا دیا ہے۔ اب اور وہ کیا چاہتی ہیں مجھ سے۔" تیمور اندر کی پریشانی چھپا کر ہلکے پھلکے لہجے میں بولا تھا۔ لیکن تیمور کی یہ خوش مزاجی بھی بس چار دن کی مہمان تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگیوں میں سے ہنسی کی جھنکار نکلنے لگی تھی۔

چاچو کی جاب کے ساتھ ہی سارے ٹھاٹ باٹ قائم تھے۔ جاب جاتے ہی سب عیاشیاں خیال ہونے لگی تھیں۔ اوپر سے ایک بچی کی ذمہ داری بھی... چاچی چاچو کی مہنگی مہنگی دوائیں۔ علاج معالجہ گھر کے اخراجات تیمور دنوں میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے اور جمع جتھا کچھ تھا ہی نہیں، تائی کے کہے الفاظ جیسے درست ہو گئے تھے اور پھر ان کے طعنوں کا بھی کوئی انت نہیں تھا۔

تنگ آکر تیمور نے نیلم سے وہ زیورات مانگ لیے تھے جو چاچی نے اسے دیے تھے اور وہ بہت قیمتی زیورات تھے جو نیلم نے اپنی ماں کے پاس رکھوائے تھے۔ لیکن جیسے ہی تائی کو بھنک پڑی۔ تیمور کی نظر زیورات پہ ہے، انہوں نے دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ چاچو کا بائی پاس ہونا تھا جو بہت ضروری تھا۔ گھر کے اخراجات بھی لامحدود تھے۔ اوپر سے مہنگائی کا بھوت۔ تیمور نے کبھی روپے کی تنگی نہیں دیکھی تھی۔ اب ان حالات کو دیکھ کر وہ گھبرا رہا تھا۔ نیلم سب سمجھتی تھی۔ امی کو بہت دفعہ مجبور بھی کیا۔ لیکن وہ مان کے نہیں دے رہی تھیں۔

"یہی تو بچت ہے تمہاری... کل کو بچی بیاہو گی تو اسے ڈال دینا۔ یہ تیمور بھی مال کی طرح کھا اڑا دے گا۔" ان کی اپنی منطق تھی۔ جو کسی اور وقت ہوتی تو شاید درست تھی۔ لیکن اب تو جیسے فرحت کا انکار وبال بن گیا تھا۔

حالات میں پستا تیمور ان دنوں ویسے ہی پارہ صفت بنا ہوا تھا۔ نیلم نے زیورات سے ہاتھ کھینچا تھا تو تیمور کا بلا سبب ہی ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ پھر جو طوفان اٹھا وہ الگ تھا۔ فرحت نے بات اتنی بڑھالی کہ ختم ہی نہ ہوئی۔

نیلم روٹھ کر نیچے شفٹ ہو گئی تھی بلکہ زبردستی فرحت اسے نیچے لے آئی تھیں۔

چاچو اور چاچی نے اسے واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔ لیکن فرحت کی بھی ایک ہی ضد تھی۔

"تیمور خود آئے، معافی مانگے اور نیلم کو لے جائے۔" تیمور نے سنا تو صاف جواب دے دیا تھا۔

"جیسے گئی ہے ویسے خود ہی آئے۔"

یوں انا اور ضد کی عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی۔ فرحت اسے جانے نہیں دیتی تھیں اور تیمور اسے لینے نہیں آتا تھا۔ ان دنوں نیلم کی طبیعت بھی سخت بیزار تھی۔ بیلا کی آمد آمد تھی اور حالات بگڑتے جا رہے تھے۔ تیمور بھی جب ضد پہ آجاتا تو ہٹتا نہیں تھا۔ پھر فرحت کے سارے طعنے اوپر ضرور پہنچتے تھے۔

"اسی لیے تو میں تیمور کو رشتہ نہیں دیتی تھی۔ نکما، وڈا... نہ تعلیم نہ ہنر... ساری عمر بیٹی اور اس کے بچوں کو پالتے رہتا۔" وہ سناتی وکیل صاحب کو تھیں لیکن آواز با آسانی اوپر پہنچتی تھی اور تیمور جانتا تھا یہ سارے الفاظ اس کے لیے کہے جاتے ہیں۔ تب وہ ریلنگ سے لٹک کر کسی شیر کی طرح غراتا تھا۔

"جب کچھ بن جاؤں گا۔ آپ کی مہارانی کے قابل ہو جاؤں گا تو پھر اسے بھیج دینا۔"

"تم جیسے ساری عمر باتیں بناتے ہیں۔ کام دھام نہیں کرتے۔ پہلے تو باپ کے روپے نے عیب چھپا رکھے تھے۔ اب سارے ستم اندھوں کو بھی نظر آتے ہیں۔ ماں نے ساری عمر عیاشی میں روپیہ لٹایا۔ اب آخری عمر رلتی رہے۔ جب بیٹا بھی زمانے بھر کا نکما ہے۔" فرحت برتن اٹھا اٹھا کر پٹختی تھیں۔ اپنی ساری فرسٹریشن بول بول کر نکال لیتی تھیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں۔ سننے والوں پہ ان کے الفاظ کس کیفیت میں اپنا اثر ڈالتے تھے۔

تیمور جب جب سنتا۔ اس کا خون کھول اٹھتا تھا۔ اتنی توہین اس قدر تذلیل...؟

بندوں پہ اچھے برے وقت آتے ہی رہتے ہیں لیکن کوئی کسی کو اس حد تک ذلیل نہیں کرتا ہو گا۔ جس قدر تیمور دن رات ذلت اٹھاتا تھا۔ صبح اٹھتا تو نیچے سے آوازیں آنا شروع ہوتی تھیں۔ پھر رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

فرحت کے ذہن میں ایک پختہ خیال تھا کہ تیمور کچھ نہیں کر سکتا۔ اب ان کے برے دن شروع تھے اور ہمیشہ برے ہی رہنے تھے۔ کیونکہ ثقلین کے پاس سیونگ کے نام پہ دھیلا بھی نہیں تھا۔ پنشن کا سہارا بھی نہیں تھا۔ اور تیمور بھی اس قابل نہیں کہ کچھ کر سکتا؟

لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ اتنا حیران کن، تکلیف دہ اور پر اذیت... سوچا جاتا تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ آج بھی نیلم خیال کرتی تو اسے یقین نہیں آتا تھا... بالکل یقین نہیں آتا تھا۔ کیا تیمور ایسا کر سکتا تھا؟ کیا تیمور اس طرح سے کر سکتا تھا۔

نیلم سوچتی تو خود کو تپتے صحراؤں میں پاتی۔ جلتی بھٹی میں سلگتی؟ دن رات تڑپتی... لیکن چین کہیں نہیں تھا۔

اور جب خیال تیمور کی طرف پرواز کرتا، اس کے دھوکے، بے وفائی کو یاد کرتا تو نیلم کو ایسا تاپ چڑھتا کہ دنوں ہوش نہیں رہتا تھا۔ یوں لگتا، وجود کسی آوے کے شکنجے میں بھل بھل جل رہا ہے۔ کسی بھٹی میں سلگ رہا ہے۔ کسی پھڑ اوہ میں سڑ رہا ہے اور اس کے جسم سے گلے ہوئے ماس اور چربی کی بساند اٹھ رہی ہے... وہ خود کو اتنا ہی ناکارہ اور بے کار سمجھتی تھی جسے تیمور دھتکار کر چلا گیا تھا۔

اور تیمور کے چلے جانے، اسے چھوڑ دینے اور قطع تعلقی کرنے کے بعد نیلم اک طویل مدت تک خود کو اسی کے حصار میں پاتی تھی۔ جس مقام پر، جس موڑ پہ، جس استھان پہ تیمور اسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ ابھی تک اسی بھون پہ سر نیہوڑائے اس کی راہوں پہ نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ تاوقتیکہ اس کی زندگی میں کوئی اور آ گیا۔

آیا یا زبردستی داخل ہوا؟ بات تو ایک ہی تھی۔ نیلم اپنی ماں کے مجبور کرنے پہ یا حالات کی سختیوں سے تنگ آ کر اگر اپنے استھان سے ہٹ گئی تھی تو یہ ہٹنا ہی قیامت تھا۔

اور یہ ہٹنا کوئی معمولی نہیں تھا۔ اسے آگ کا دریا پار کرنا تھا۔ اسے پل صراط پہ چلنا تھا۔ اسے آبلہ پائی کا سفر کرنا تھا۔ سب سے بڑی بات اپنے سچے دل کو تیمور کی یادوں سے خالی کرنا تھا اور یہ بہت کٹھن امر تھا۔ یہ بڑی

دشوار راہ تھی۔ یہ اذیت ناک مرحلے تھے۔

لیکن نیلم بے بس کر دی گئی تھی۔ فرحت نے اسے بہت مجبور کر کے اس دوراہے پہ کھڑا کیا تھا۔ اپنے لیے نہیں، نیلم کے لیے نہیں... اس کی دونوں بیٹیوں کے لیے... فرحت چاہتی تھیں نیلم ان کی زندگی میں ہی اپنی بے کنارہ زندگی کو کنارہ دے لے۔ ورنہ جانے بعد میں حالات کیسے ہوں ان کی جوان بیٹی اور دونوں نواسیوں کو تحفظ کی ضرورت تھی اور یہ تحفظ ایک مرد دے سکتا تھا۔ بہت مجبور کرنے، منتوں، التجاؤں کے بعد انہوں نے نیلم کو بالآخر خرم کے لیے راضی کر لیا تھا۔

لیکن اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا کہ وہ اپنے ہرجائی شوہر کو بھول جائے۔ جس نے اتنے سالوں میں کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ جانے وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا فرحت نے ایک عالم سے مسئلہ بھی پوچھ لیا تھا۔ اور وہ بالا ہی بالا سارے معاملات نمٹا رہی تھیں وہ جلد از جلد نیلم کی شادی کر دینا چاہتی تھیں۔

اور ادھر نیلم یادوں کے تپتے نخلستان سے نکل نہیں پاتی تھی۔ ہر وہ بری، تکلیف دہ اور بھیانک یاد جو بھٹکا بھٹکا کر بھی تیمور کی طرف لے جاتی تھی۔

اور تیمور کے دیے بے وفائی کے گھاؤ، وہ بنا بتائے خنجر چلا دیتا۔ وہ زندہ سلامت درگور کر دیتا کسی کنویں میں دھکا دے دیتا۔

نیلم کو آج بھی وہ دن یاد تھے۔ جب رات رات بھر تیمور گھر نہیں آتا تھا۔ اور وہ آنکھیں نچلے پورشن کی کھڑکیوں سے چپکا کر اس کی راہ تکا کرتی تھی۔ لیکن وہ ان دنوں گھر آتا ہی نہیں تھا۔ جانے کہاں رہتا، جانے کیا کرتا اور پھر نیلم کے صرف پندرہ دن نیچے قیام کے دوران ہی آنا "فانا" تیمور کے باہر چلے جانے کی خبریں اڑنے لگی تھیں۔ اس کے قریبی دوستوں میں سے کسی نے فرحت کو اطلاع دی تھی کہ تیمور نے اپنے کسی کنیڈین دوست کی بیوہ بہن سے شادی کر لی ہے۔ اس کے دوست کی بہن بھی نیشنلٹی ہولڈر تھی۔ یوں دنوں میں ہی تیمور باہر چلا گیا اور صرف باہر نہیں گیا تھا۔ ان کی زندگیوں سے بھی چلا گیا تھا۔ بغیر ملے بغیر بتائے۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹی کو بھی دیکھے بنا، تیمور کے چلے جانے کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی نوشابہ اور ثقلین بھی کینیڈا چلے گئے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے فرحت، نیلم اور اپنی پوتی سے ملنا چاہا تھا شاید، لیکن فرحت نے انہیں منہ توڑ جواب دے دیا۔

جب ان کا بیٹا سارے تعلق ختم کر گیا تھا تو وہ مزید کیوں پچھلے رشتوں کو بحال رکھتیں، آشیانہ۔ ثقلین ان کے چلے جانے سے ایک دم خالی اور ویران ہو گیا تھا۔ ایسا ویران کہ پھر ہمیشہ ویران ہی رہا۔ پھر کئی موسم آتے اور جاتے رہے تھے۔ سے بدلتے رہے، لمحے گزرتے رہے... دن ہفتے مہینے، سال دبے پاؤں کھسکتے رہے۔ جانے والے نہ آئے تھے نہ انہوں نے کوئی رابطہ کیا تھا۔ جانے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔

نہ کوئی خط نہ کوئی فون اور نہ ہی کسی کے ہاتھ کبھی کوئی پیغام آیا تھا۔

نقوی صاحب کے وقاص کا شروع میں نوشابہ اور ثقلین سے رابطہ تھا جو بعد میں ختم ہو گیا تھا۔

بس نیلم اتنا جانتی تھی کہ تیمور نے اپنی الگ دنیا بسالی تھی۔ وہ اپنے بیوی بچوں میں گم ہو کر انہیں بھول چکا تھا۔ اسے کبھی یاد بھی نہیں آیا ہو گا کہ وہ اپنے پیچھے کسے چھوڑ آیا تھا۔ کتنی آنکھوں کو روتا چھوڑ آیا تھا۔ کتنے دلوں کو تڑپتا چھوڑ آیا تھا۔ اور پھر نیلم نے ایک لمبا، کٹھن اور پر اذیت سفر طے کیا تھا۔ لیکن تب وہ ایک اور نیلم کا روپ دھار چکی تھی۔ اس نے خود کو مضبوط کیا تھا۔ اپنے لیے نہیں، اپنی بچیوں کے لیے۔ اپنے ارادوں کو مستحکم کیا تھا۔ اپنے دل کو پائیدار کیا تھا۔ اور ایک ہرجائی کی ہر یاد سے خالی کیا تھا۔ اس کے بعد وقت اتنا تلخ اور مشکل نہیں رہا تھا۔

اس نے فرحت کے بہت مجبور کرنے، احساس دلانے اور ان کی ہزار منتوں کے بعد اپنی تعلیم کو مکمل کیا تھا۔ جانے کب، کیسے، کس طرح جینا بیلا کے بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ نیلم کا ایم اے بھی ہو

گیا تھا اور اسے مقامی بینک میں جاب بھی مل گئی۔

گھر کے حالات پہلے سے کچھ ابتر تھے۔ کیونکہ پہلے وہ ایک کھلانے والی کافی قناعت پسند تھی۔ لیکن اس کی بیٹیاں ذرا بھی صبر اور قناعت نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی فرمائشوں کے سلسلے دن بدن بڑھتے جا رہے تھے۔

اور تب فرحت بے بس ہو کر لڑنے بیٹھ جاتی تھیں۔ نیلم کی تنخواہ اچھی تھی۔ لگ بھگ پچاس ہزار کے قریب۔ لیکن بچیاں اس کی خواہش کے مطابق مہنگے ترین اسکول میں پڑھتی تھیں۔ پھروین کا کرایہ ہی آٹھ ہزار تھا۔ ماہانہ فیس، ٹیوشن فیس اور بقایا اخراجات نکال کر اس کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں بچتی تھی۔ اور جینا بیلا جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھیں۔ ان کی خواہشات کا گراف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ اپنے اردگرد دیکھتی تھیں۔ ویسا خود بھی چاہتی تھیں، انہیں ہر چیز وقاص کی بیٹی سحا جیسی چاہیے تھی، اور وہ اپنی خواہشوں کو دل میں رکھنا نہیں جانتی تھیں۔ بس یہاں پہ نیلم پوری طرح بے بس ہو جاتی تھی۔

پچھلے دنوں سے وہ اپنے باپ کے لیے سوال کر کر کے فرحت کا بھی دماغ کھا رہی تھیں اور نیلم کا بھی۔۔۔ تنگ آ کر فرحت نے کہہ دیا۔ "تمہارا باپ مر چکا ہے۔" اور فرحت نے شاید غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کم از کم ان کے لیے تو باپ مرا ہوا ہی تھا۔ جو انہیں دھتکار کر چلا گیا۔ لاوارث پھینک کر چلا گیا۔ جس نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اپنی الگ دنیا بسا لی تھی۔ وہی مرا ہوا باپ اچانک قبر سے اٹھ کر زندہ ہو گیا تھا۔

اور نیلم تب سے لے کر اب تک بڑی متوحش، متفکر اور بدحواس تھی۔

✲ ✲ ✲

اس نے جلتی دوپہر میں چکر کھاتے ہوئے بڑی بے بسی سے جینا بیلا کے بند کمرے کو دیکھا تھا۔ وہ کل سے نیلم سے ناراض تھیں۔ اور ابھی تک مانی نہیں تھیں۔ بچیاں ناراض ہو تیں تو اسے چین نہیں پڑتا تھا۔ کچھ بھی تھا دونوں بچیوں میں اس کی جان تھی۔

اس کا ذہن بہت الجھ رہا تھا۔ وہ شدید پریشانی میں مبتلا تھی۔ آئندہ آنے والے حالات کو کس طرح سے مینج کرے گی۔ اپنے تئیں بڑے حوصلے صبر اور ضبط کے ساتھ پل صراط سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی زندگی کے لیے ایک فیصلہ کیا تھا۔ جس پہ امی ابو بھی راضی تھے۔ اور پھر بچیوں کو بھی کسی حد تک ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا۔ وہ بھی شاید ذہنی طور پر تیار تھیں۔ بس ایک مرحلہ تھا جس سے نپٹ کر نیلم کی زندگی کو کنارہ مل جاتا۔ پہلے تو شاید خلع کی ضرورت نہ پڑتی۔ وہ تھا ہی لاپتا لیکن اب فرحت کی خواہش تھی۔ سیدھا سیدھا کورٹ سے خلع لے لی جاتی۔ کیونکہ کسی بھی صورت تعلقات کی بحالی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جو نفرتوں کی خلیج ان کے درمیان پہلے سے قائم تھی وہ بڑھتی ہوئی اور بھی دوریوں کا سبب بن چکی تھی۔ اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ کیونکہ نوشابہ، ثقلین اور تیمور "آشیانہ ثقلین" میں باقاعدہ طور پر شفٹ ہو چکے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ایک نیا محاذ کھلنے والا تھا۔ فرحت آگ بگولا تھیں۔ انہوں نے اندرونی سیڑھیوں والا دروازہ بھی لاک کر لیا تھا۔ تاکہ وہ باہر سے گزرتے رہیں۔ اس طرف ان کا تعلق ختم تھا۔ اور بچیوں پہ بھی باہر نکلنے میں سخت پابندی تھی۔ اور وہ ان دنوں گھر کے اندر محصور تھیں اور انتہائی ڈسٹرب بھی۔ جبکہ فرحت ابھی بھی اس کے پاس آدھا گھنٹہ بیٹھ کر اگلے معاملات جلدی سے نمٹانے پہ زور دے کر گئی تھیں۔

کچھ دیر پہلے انہوں نے کوئی دسویں مرتبہ اپنی بات دہرائی تھی۔

"خرم سے کہو اپنی ماں کو بھیجے۔ کیونکہ ہمارا کیس تو پہلی تاریخ پہ ختم ہو جائے گا۔"

"وہ تو ابھی نکاح کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ جو دیر ہے ادھر سے ہے۔" نیلم کنپٹیاں دبا کر بتا رہی تھی۔

"تم نے بات کر لی؟" فرحت کو نجانے کیا پریشانی تھی۔

"ہاں جی ہو گئی۔" نیلم دھیمی آواز میں بولی۔

"تم نے بچیوں کے بارے میں فائنل بات کر لی؟" ان کا انداز بڑا مضطرب قسم کا تھا۔ وہ چاہتی تھیں بس ایک ہفتے کے اندر اندر نیلم اس گھر سے چلی جائے۔ وہ اوپر والوں کا سایہ بھی دوبارہ ان پہ ڈالنا نہیں چاہتی تھیں۔

"خرم کو کوئی اعتراض نہیں۔" نیلم ابھی اور بھی انہیں مطمئن کرنا چاہتی تھی لیکن خرم کی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ نیلم کے لبوں پہ ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا تھا۔

"بے وفا لوگو! کہاں تھے!" خرم مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔

"آپ کے خیالوں میں ہی تھے۔" نیلم بھی شگفتگی سے بولی تھی۔ خرم جیسے بے ہوش ہوتے ہوتے گرنے لگا تھا۔

"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ اس کی شوخیوں پہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"ابھی تمہارا ہی ذکر خیر چل رہا تھا۔"

"اچھے الفاظ میں یا برے الفاظ میں؟" خرم نے شرارتاً پوچھا۔ جب سے نیلم نے باقاعدہ ہاں کر کے مژدہ جاں فزا سنایا تھا تب سے خرم کی چونچالی عروج پہ تھی۔

"ظاہر ہے، اچھے الفاظ میں۔" نیلم نے خفیف انداز میں کہا۔ تب خرم مصنوعی لہجے میں اکڑتا ہوا بولا تھا۔

"بس جی، کبھی غرور نہیں کیا۔" وہ بڑے خوشگوار لہجے میں مسکرا رہا تھا۔

"اچھا اب کام کی بات پہ آجاؤ۔" نیلم نے اس کی شوخیوں کو طویل ہوتے دیکھ کر روکنا چاہا تھا۔ وہ بھی قدرے سنجیدہ ہو گیا۔

"جو حکم؟" وہ اپنے ازلی خالص بے حد ارلنہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ نیلم اس کے انداز پہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا۔ خرم آئندہ زندگی میں بھی اس کے لیے کوئی بڑی پرابلم نہیں بنے گا۔ اس میں لچک تھی۔ اس کے رویے میں لچک تھی۔ وہ جلدی بات سمجھ بھی لیتا تھا اور مان بھی جاتا تھا۔ یہ اس کی اچھی عادتوں میں ایک عادت تھی کہ وہ زیادہ بحث میں بھی نہیں پڑتا تھا۔ اور ہر نفع و نقصان کو ایک طرف رکھ کے جس بات پہ قائم ہو جاتا پھر ہٹتا نہیں تھا۔ نیلم لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ پھر اس نے امی کی خواہش خرم تک ایک مرتبہ پھر پہنچا دی تھی۔

خرم سن کر قدرے خفا ہو گیا تھا۔

"کیا میری بات پہ آنٹی کو اعتبار نہیں۔۔۔ جینا اور بیلا صرف تمہاری نہیں بلکہ اب وہ میری بھی بیٹیاں ہیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتا ہوں۔۔۔ اور وہ پہلے ہیں تم بعد میں ہو۔" اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں نیلم کی تسلی کرا دی تھی۔ گو کہ خرم پہ اسے پورا بھروسہ تھا پھر بھی ایک ماں ہونے کے ناطے اس کو کئی طرح کے خدشات لاحق تھے۔

"خرم وہ دونوں میرے ساتھ ہی رہیں گی۔" نیلم نے ایک مرتبہ پھر واضح لہجے میں بتایا۔

"تم سے الگ وہ کیسے رہ سکتی ہیں ظاہری بات ہے وہ ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔ تم بتاؤ معاملہ کہاں تک پہنچا؟" خرم نے بہت سنجیدگی سے بولتے ہوئے اگلا لائحہ عمل پوچھا تھا۔ تب نیلم بھی سنجیدہ سی فرحت کا پروگرام اس کے گوش گزار کرنے لگی۔

"بس کورٹ کا تھوڑا سا پروسیجر ہے۔"

"وہ تو تمہارے ابو کر لیں گے۔" خرم مطمئن تھا۔ "اور پہلی تاریخ پہ ہی معاملہ ختم ہو جائے گا۔"

"ہوں۔" نیلم کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا تھا۔ وہ کنپٹیاں دباتی ہوئی سیدھی ہوئی تھی۔ جینا اور بیلا کے کمرے کا دروازہ کھل رہا تھا۔ نیلم کچھ چوکنا ہو گئی تھی۔ یہ دونوں کہاں نکل رہی تھیں۔

"اور تم بھی اوپر والوں سے محتاط رہنا۔" خرم اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔

"اور بچیوں کو بھی اوپر مت جانے دینا۔"

"یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک سو رخ

سے دو مرتبہ ڈسوانے والا عقل مند نہیں ہوتا۔ تیمور کیسے سوچ سکتا ہے؟ جیسا سب کچھ وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ پیچھے سب کچھ ویسا ہی ہوگا۔" نیلم کا لہجہ زہر خند ہو گیا تھا۔ خرم نے نرمی اور ملائمت سے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"بھول جاؤ اس بے غیرت ہرجائی کو میں تمہاری زندگی سے ہر دکھ مٹادوں گا۔ کبھی تم پہ آنچ آنے نہیں دوں گا۔" خرم کا انداز بہت مستحکم تھا۔ وہ اس کے لہجے کی سچائی میں کھو سی گئی تھی اور یہی لمحہ بھر کی چوک تھی۔ جینا بیلا چپکے سے کھسک کر باہر نکل گئی تھیں۔ نیلم اپنے ہی دکھوں میں مشغول رہی۔ وہ دونوں گھر میں ہونے والی چہل پہل اور اوپر سے آتی آوازوں کا پیچھا کرتی 'مارے تجسس کے ماربل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلی گئی تھیں۔

اور پھر ان کی نیلی آنکھوں میں تحیر پھیلتا چلا گیا تھا۔

وہاں وائٹ ٹراؤزر اور ریڈ ٹی شرٹ میں موبائل کو کان سے لگائے سوہا کے انکل کسی سے لڑائی کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان دونوں کو دیکھا اور بالکل انہی کی طرح شاکڈ رہ گئے۔

اور پھر دوسرے ہی پل انکل نے چیخ چیخ کر ممی ممی پکارا تھا۔ دوسرے ہی پل گوری چٹی سی ممی افتاں خیزاں چلی آئیں۔ پہلے تو وہ انکل کی طرح متحیر ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا تھا۔ پھر بے ساختہ اپنے بیٹے کی طرح چیخ ماری تھی۔

"جینو' بیلو۔۔۔" انہوں نے دونوں بانہیں پھیلالی تھیں یوں کہ جینا بیلا نے پہلے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا تھا پھر لمحہ بھر کی دیر میں کسی میکانکی قوت کے تحت خواب آگیں انداز میں چلتی ہوئی ممی کی کھلی بانہوں میں سما گئیں۔ اور جیسے سالوں کے فاصلے لمحوں میں مٹ گئے تھے۔ انہوں نے ممتا اور محبت کی عجیب سی ٹھنڈک محسوس کی اور شاکڈ سی رہ گئی تھیں۔ کیونکہ انکل بھی گھٹنوں کے بل ان دونوں بہنوں کے پاس بیٹھے بڑی معصومیت اور لجاجت سے بانہیں پھیلا کر کھڑے تھے۔

"ادھر کانٹے نہیں اگے ہوئے۔ کیا مجھے نہیں ملو گی۔" تیمور نے ہلکی سی سرگوشی نما آواز میں کہا تھا۔ پھر ان دونوں کے ملائم ہاتھ پکڑ کر ہتھیلیوں سے باری باری چوم لیے۔

"انکل!" وہ اس کے قریب آئی تھیں۔ تیمور نے دونوں کے گلابی پھولے پھولے گالوں کو نرمی سے چھوا اور بولا۔

"اوں ہوں۔۔۔ آئی ایم ناٹ یور انکل۔۔۔ پلیز کال می ڈیڈی' آئی ایم یور فادر۔۔۔ کال می ڈیڈی۔۔۔ بولو شاباش' کورس میں بولو۔۔۔" اس نے باری باری دونوں کے لمبے بکھرے بالوں کو سہلایا تھا۔ ان دونوں کی نیلی آنکھوں میں تحیر اڈا' پھیلا اور بہنے لگا تھا۔ سوہا کے انکل کیا کہہ رہے تھے۔ سوہا کے انکل کیا پاگل تھے۔ ان کے ڈیڈی تو مر چکے تھے اور نئے ڈیڈی آنے والے تھے۔۔۔ وہی نیلی کے کولیگ اور اب یہ بھی ڈیڈی نکل آئے؟ کہاں سے؟ بالکل اچانک۔۔۔ کیا اللہ تعالیٰ نے واپس بھیج دیا؟

اور انہوں نے کسی خواب آگیں لہجے میں تیمور کی تقلید میں 'اس کے بار بار مجبور کرنے پہ کورس میں گا کر سنایا اور کہا۔

"ڈیڈی۔" ان کی زبان سے ایک نغمہ سا گنگناتا ہوا پھسل پڑا تھا۔ تیمور اور اس کی ممی نے بے ساختہ خوشی اور جوش کے عالم میں ان دونوں کو پھر سے اپنے گرم سینوں میں سمولیا۔

"ویٹس ویری گڈ۔۔۔ یو آر ویری پریٹی گرلز۔" اس نے دونوں کے ماتھے باری باری چومے تھے۔ پھر ان کی نیلی گہری لمبی آنکھوں میں چھلکتی حیرانی کو ختم کرتے ہوئے بولا تھا۔

"یو بوتھ آر مائی ڈاٹرز۔۔۔"

☼ ☼ ☼

یہ ایک لوہے کا اونچا بڑا سا ڈرم تھا۔ جس کے نیچے چار ٹانگیں نہیں۔ دو ٹانگیں موجود تھیں۔ جس طرف وزن زیادہ ہوتا وہ ڈرم اس طرف سے لڑکھڑانے لگتا

تھا۔ اور جیسے ہی ڈرم لڑکھڑاتا جینا بیلا کی چیخیں دل دہلا دیتی تھیں اور اونچی آواز میں چلاتی اور شور مچاتی تھیں۔

"ہمیں نیچے اتاریں۔" ان کی آوازوں میں خوف' آنسو اور ڈر کی آمیزش تھی۔ قریباً پندرہ منٹ سے یہ شور اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ نیچے سے آتی کربناک چیخیں اس کا بلڈ پریشر ہائی کر رہی تھیں۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اپنے جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ پھر وہ باہر کی طرف جانے کی بجائے اندرونی دروازے تک آیا۔ ثقلین اس سے پوچھ رہے تھے

نیچے کیا ہو رہا ہے؟ اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے!

تیمور نے اشارے سے بتایا اور ہتھوڑا ڈھونڈ کر لے آیا۔ پھر اس نے سیڑھیوں کے دروازے پہ پہلی زوردار ضرب لگائی تھی۔ نیچے سے آتی آوازیں کچھ دب سی گئی تھیں۔

فرحت نے بے ساختہ اوپر کی طرف دیکھا تھا۔ پھر دونوں بچیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جن کے آنسو خوف کے مارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور رنگت لٹھے کی مانند سفید تھی۔ قریب ہی نیلم تخت پر سر جھکائے بیٹھی آنسو پینے میں مصروف تھی۔ کیونکہ جینا بیلا کی چیخوں اور رونے کو برداشت کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

نیلم نے کبھی ان دونوں کو پھولوں کی چھڑی سے نہیں مارا تھا۔ کبھی بہت خوفناک حد تک غصہ نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو شہزادیوں کی طرح رکھا تھا۔ اور امی تک سے اس معاملے پہ ناراض ہو جاتی تھی کہ وہ جینا بیلا کو ہر وقت ڈانٹا نہ کریں۔ وہ دونوں بہت چھوٹی ہیں اور حساس بھی۔

لیکن اس وقت وہ امی کو بھی روکنے سے قاصر تھی۔ کیونکہ ان دونوں سے غلطی بھی تو بہت بڑی سرزد ہوئی تھی۔ کیا ضرورت تھی ان کے منع کرنے' روکنے ٹوکنے کے باوجود اوپر جانے کی؟ اور اگر چلی ہی گئی تھیں تو یہ بڑے بڑے چاکلیٹ کے ڈبے 'کوکیز' کینڈیز کے پیکٹ اٹھا کر لانے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ سارے پیکٹ فرش پہ گرے اپنی بدتقدیری پہ نوحہ کناں تھے۔ جبکہ جینا بیلا کو فرحت نے سزا کے طور پر ڈرم کے اوپر کھڑا رکھا تھا۔ اور نیلم جانتی تھی آج ان کا لنچ بھی بند ہو گا۔

اوپر سے ہتھوڑے کی ضربیں کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں اور ساتھ جینا بیلا کی چیخیں۔

"قسم کھاؤ' اب جاؤ گی اوپر؟ ان منحوسوں سے ملو گی؟ ان کی دی گئی خیرات اٹھا کر لاؤ گی۔" فرحت نے کفگیر کی ڈنڈی سے ان دونوں کی پھیلی ہتھیلیوں پہ ایک ایک ضرب لگائی تھی۔ وہ دونوں پرائمری اسکول کے بچوں کی طرح ہاتھ پھیلا کر کھڑی تھیں اور فرحت کسی جلاد ٹائپ استانی کی طرح کفگیر کو چھڑی بنا کر ان کی ہتھیلیوں پہ نشان ڈال رہی تھیں۔ ہر ضرب جیسے نیلم کے دل پہ پڑ رہی تھی۔ اور وہ ضبط کرتے کرتے عاجز ہو گئی۔ اس نے آنکھیں رگڑ کر بمشکل پھٹی پھٹی آواز میں کہا تھا۔

"اب بس بھی کریں امی! غلطی ہو گئی ان سے۔" فرحت نے کھا جانے والی نظروں سے بیٹی کو دیکھا تھا۔

"اسی لیے سمجھا رہی ہوں کہ دوبارہ غلطی نہ کریں۔"

"اب نہیں کریں گی۔" نیلم نے جیسے منت کی تھی۔

"یہ کیوں اوپر گئی ہیں؟ یہ کیوں ہمارے دشمنوں سے ملی ہیں۔" فرحت کے تیور غضبناک تھے۔ ابھی تک ان کا غصہ نہیں اتر رہا تھا۔

معاً" ہتھوڑے کی ضربیں لگنا بند ہو گئی تھیں۔ دروازہ اچانک کلک کی آواز سے کھلا تھا۔ پھر خوفناک سی چرچراہٹ کے بعد دونوں پٹ وا ہو گئے تھے۔ اور پھر وقت جیسے گھومتا ہوا گیارہ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ وہی تیمور کے اتار چڑھاؤ۔ وہی ریلنگ سے لٹک کر فرحت سے لڑنا۔ اوپر سے فائرنگ کرنی۔ گولے گرانے۔ دوبدو جواب دینے۔ ایک کی دس سنانی اور کبھی بھی لاجواب نہ ہونا۔ بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔ فاتحانہ نظروں سے دیکھنا اور دھپ دھپ کر کے سیڑھیوں پہ چڑھ جانا۔

یوں لگا جیسے گزرا ہوا وقت گھومتا پھرتا واپس آگیا تھا۔ وہی تیمور تھا۔۔۔ وہی اس کی تائی۔۔۔ وہی تخت کے قریب کھڑی پہلے کی طرح ہی گم صم نیلم۔ وہی تائی کا جلال اور وہی تیمور کا جارحانہ انداز۔

ایسے لگ رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ بدلا ہو۔ سب کچھ جوں کا توں ہو۔ لیکن سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ کچھ کردار پہلے سے زیادہ تھے۔ ڈرم پہ کھڑی بلبل بلبل روتی دونوں لڑکیاں ایک واضح اور روشن حقیقت۔۔۔ ایک اٹل ویل ایک مستحکم جواز۔۔۔ جو اپنے ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

اور وقت جیسے لمحہ بھر کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ رک گیا تھا۔ تھم گیا تھا۔

نیلم کی سرخ نیلی نگاہیں اٹھی تھیں پھر جیسے جم کر رہ گئیں۔ وہ سامنے سے جارحانہ تیور لیے سیڑھیاں اترتا نیچے آرہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ریلنگ سے لٹک کر فائر کھولنے کی بجائے نیچے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

کاٹن کا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنے، آنکھوں میں ڈھیروں غصہ۔۔۔ سرخ رنگت۔۔۔ وہ پہلے سے کچھ زیادہ ہینڈسم ہو گیا تھا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو بہت دبلا پتلا تھا۔ بہت سوکھا، لمبا تڑنگا لیکن اب اس کا جسم بھر گیا تھا۔ چہرے پہ آزاد صحت مند فضاؤں اور خوشحالی کی چمک دمک تھی۔ نیلم کو اندر ہی اندر جیسے حسد سا ہوا۔

"اور ہمیں روگ لگا کر کیسی ہری بھری ہے دنیا۔۔۔ ہمیں تو سرتاپا جلا دیا۔" اس کے اندر زہر کی پھوار پڑنے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا ہر چیز کو آگ لگا دے۔

معاً" تیمور کی سلگتی، سرد اور برفیلی آواز نیلم کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر تیمور کو دیکھنے لگی۔ وہ نیلم کی بجائے فرحت سے مخاطب تھا۔

"آپ میری بچیوں کو کس خوشی میں پریشرائز کر رہی ہیں تائی۔۔۔ ان کا جرم کیا ہے۔" اس کی آنکھوں سے سلگتے شعلے نکل رہے تھے یوں کہ فرحت کا دماغ ہی الٹ گیا تھا۔

"تمہاری بچیاں یہ تمہاری کہاں سے ہو گئیں دس سال بعد تمہیں لگا کہ یہ تمہاری بچیاں ہیں۔" فرحت کی تیوری چڑھ گئی تھی۔ غصے کی شدت سے ان کا میٹر گھوم رہا تھا۔

"دس سال پہلے بھی یہ میری بیٹیاں تھیں اور دس سال بعد بھی میری بیٹیاں رہیں گی۔ آپ نے نیلی کے ساتھ انہیں جہیز میں نہیں بھیجا تھا۔" اس نے کمال اطمینان سے فرحت کے چھکے چھڑاتے ہوئے دونوں کو باری باری ڈرم سے اتارا تھا۔ پھر فرش سے تمام بکھرے بکس اٹھا کر زبردستی بچیوں کو پکڑائے۔ نوشابہ ریلنگ سے جھانک رہی تھیں۔ اس نے ممی کو اشارہ کیا۔ وہ نیچے آگئیں تو۔ تیمور نے دونوں بچیوں کے ہاتھ انہیں پکڑا کر کہا۔

"آپ کچھ دیر کے لیے انہیں اوپر لے جائیں۔ میرے لیپ ٹاپ پہ کارٹون لگا دیں۔ میں بھی ان سے دو دو ہاتھ کر کے آتا ہوں۔" اس نے بچیوں کو منظر سے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ جینا بیلا کے سامنے وہ کوئی بھی بات نہ کھولنا چاہتا تھا نہ کرنا چاہتا تھا۔

"انہیں کیوں بھیج دیا ہے۔ روکتے یہاں، اپنے نام نہاد باپ کے کرتوت سن کر جاتیں۔ ایسا باپ جو اچانک آسمان سے گر آیا زمین سے اگا۔" فرحت نے نفرت انگیز لہجے میں کہا تھا۔ تیمور نے آرام سے ان کی بات سن لی تھی۔

"آپ اپنے ہر قول و فعل میں سچی ہیں۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے ابھی کے ابھی آپ اور آپ کی بیٹی کے سارے طبق روشن کرتا جاؤں۔۔۔ لیکن میں کوئی بھی وضاحت آپ کو نہیں دوں گا۔ ہاں، اگر نیلم پوچھے تو یہ اس کا حق ہے۔"

"نیلم تمہیں کیوں منہ لگائے گی؟" تائی حلق تک چلائی تھیں۔ تیمور اتنے کشیدہ ماحول میں اچانک مسکرا دیا تھا۔ ایک تو یہ تائی بھی، نا۔۔۔ بندے کو غصے پہ قائم نہیں رہنے دیتی تھیں۔ ایسی بات ضرور کر دیتی تھیں جو خواہ مخواہ سارے غصے کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیتی۔ حد تھی بھئی۔ نیلم کیوں منہ لگائے گی، وہ جیسے ان کی بات پہ بے طرح لطف اندوز ہوا تھا۔ جیسے اس نے بڑا انجوائے کیا تھا۔

"نیلم کو مجھے منہ لگانا ہی پڑے گا۔ آپ کو پتا تو ہے میں کس قدر مستقل مزاج ہوں۔ جس کام کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ جاتا ہوں اسے تکمیل تک پہنچا کے دم لیتا ہوں۔" تیمور نے بڑے اطمینان سے انہیں ماضی یاد دلایا تھا۔ جب وہ تیمور کو رشتہ نہیں دینا چاہتی تھیں اور اتنے بڑے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔ لیکن ہوا کیا تھا وہ جیسے مسکرا دیا۔

"بھول ہے تمہاری۔ صرف ایک ہفتہ نکل جانے دو۔ تمہاری ساری خوش فہمیاں ہوا ہو جائیں گی۔" فرحت نے تنفر سے سر جھٹک کر کہا۔

"رہنے دیں تائی! آپ کے سارے بوگس دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ نہ اتنی لمبی لمبی چھوڑا کریں۔ جو آپ چاہ رہی ہیں۔ وہ کبھی نہیں ہو گا کم از کم میری زندگی میں تو نہیں ہو گا۔" تیمور نے بالوں میں بے نیازی سے ہاتھ پھیرے تھے۔ فرحت اور نیلم جیسی چونک گئی تھیں۔ تیمور کو کیسے بھنک پڑ گئی؟ اسے خرم کے رشتے کا کیسے پتا چلا گیا وقاص نے بتایا ہے یا پھر دونوں ماں بیٹی کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"آپ کی گڈ لک تائی! بالآخر بینکر داماد آپ کو ملنے ہی والا ہے۔ لیکن لگتا نہیں آپ کی خواہش پوری ہو گی۔ کیونکہ بیچ میں ابھی "ہم" موجود ہیں۔ اب یا تو آپ میرے لاپتہ ہونے کی دعا کریں یا مرنے کی، اس سے پہلے تو آپ کی خواہش پوری نہیں ہو گی۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں شرارت بھرے بہت پہلے والا تیمور لگ رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا، پھلجھڑیاں چھوڑتا۔۔۔ یوں لگا، جیسے بیچ میں دس سال آئے ہی نہ ہوں۔ نیلم ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا گنگناتا ہوا جان بوجھ کر نیلم کے قریب سے گزر کر اوپر جا رہا تھا اور جاتے سمے جو اس نے الفاظ کہے تھے۔ وہ بھی امی کے سامنے۔ اس کا مارے اشتعال توہین اور خفت سے منہ سرخ ہو گیا تھا۔

وہ نیلم کے ٹکر ٹکر دیکھنے پہ ذرا بلند آواز میں بولا۔

"تمہاری اپنی ہی چیز ہوں۔ ڈنکے کی چوٹ پہ دیکھ لو اور اگر دل نہ بھرے تو اوپر آ کے دیکھ لو۔ اپنی اماں جان سے نظر بچا کر۔ میں جانتا ہوں تم بھی مجھ سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہو۔" اس کا انداز انتہائی بے شرمانہ تھا۔ کینیڈا جا کر تو وہ کچھ اور بے حیا ہو گیا تھا۔ نیلم مارے شرم اور اشتعال کے اپنے آپ میں کٹ کر رہ گئی تھی۔

اور پھر تیمور کی خود سریوں کا یہ سلسلہ رکا نہیں تھا۔ بلکہ اگلے آنے والے دنوں میں اس نے فرحت اور نیلم کو ناک کے بانسے تک عاجز کر دیا تھا۔ ہوا کچھ یوں۔

☼ ☼ ☼
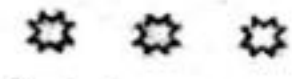
سویرا ہوتے ہی سورج شعلے اگلنے لگا تھا۔ ایسی قیامت خیز گرمی تھی کہ حد نہیں اور ابھی تو صبح کا وقت تھا۔ دوپہر اور سہ پہر میں نجانے کیا ہوتا۔

باہر چبھتی گرمی جسم کو جھلسا رہی تھی۔ سیماں صحن میں جھاڑو لگا کر اوپر چلی گئی تھی۔ جب سے اوپر والا پورشن آباد ہوا تھا سیماں کے وارے نیارے ہو گئے تھے۔ اس نے بھی آنکھیں بدلنے کے ساتھ پارٹی بھی بدل لی تھی۔ اوپر ایسی آسائش تھی۔ جن کا منہ ہی بڑا بائی فائی ہوتا تھا۔ جبکہ نیچے بھوک اور افلاس ناچتی تھی۔ ہر روز کچن میں دال، سبزی، آلو پکے ہوتے۔ سیماں تک ناک بھوں چڑھانے لگی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی یہاں سے کچھ نہ ملا تو اوپر سے دگنا مل جائے گا۔ اور وہ بھی ایسی ایسی قسم کا جو اس نے آج تک نہ دیکھا تھا نہ کھایا تھا۔

آج بھی اسکول سے آ کر جینا بیلا نے تخت پر بیگ پھینکے تھے اور بھوک بھوک چلاتی کچن میں آ گئی تھیں۔ نیلم کا بھی ہاف ڈے تھا۔ آج وہ بھی ٹائم سے گھر آ چکی تھی۔ پھر اس نے آلو کے کباب اور پودینے کی چٹنی گھوٹ لی تھی۔ ساتھ سلاد اور پھلکے تھے۔ اس نے میز لگا کر ان دونوں سے کہا۔

"آ بھی جاؤ کھانا کھا لو۔۔۔" وہ کچن سے آواز لگا رہی تھی۔ بیلا نے آلو کے کباب دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تو جینا نے بڑی بے مروتی سے پلیٹ اٹھا کر پرے کھسکا

دی تھی۔ دونوں کے منہ سوجے اور پھولے ہوئے تھے۔ نیلم جیسے سمجھ گئی۔ یعنی آج بھی کھانا پسند نہیں آیا تھا۔

"بھی تو اچھا والا کھانا پکالیا کریں۔" بیلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"اتنی بھوک لگی ہوئی تھی اور آج پھر آلو۔ ہر روز آلو۔ کبھی آلو میتھی، کبھی آلو پالک، کبھی آلو بینگن، کبھی آلو شملہ۔ ہماری لائف میں اتنے آلو کیوں ہیں؟" خفگی ہوئی یہ آوازیں اوپر تک بھی جارہی تھیں اوپر جہاں لاؤنج تک میں فل ایئرکنڈیشنڈ چل رہا تھا۔ ایل ای ڈی پہ کارٹون لگے تھے۔ نوشابہ کرسٹل کی خوب صورت ٹیبل پہ لنچ کے لوازمات دیکھ رہی تھیں۔ مٹن، بریانی، رشین سیلڈ، زرانقل۔۔۔ چکن کباب۔۔۔ اور ٹھنڈی ٹھار کوک۔۔۔ کارپٹ پہ تیمور لیٹا ہوا تھا۔ کشن سر کے نیچے رکھے۔ سینے کے اوپر لیپ ٹاپ روشن تھا۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پہ تیزی سے حرکت کرتی اچانک رک گئی تھیں۔ جس طرح کھانے کے لیے آواز دیتی نوشابہ رک گئی تھیں۔

"کل کہاں آلو تھے۔ اتنی مبالغہ آمیزی مت کیا کرو۔ کل قیمہ تھا۔" نیلم کی خفگی بھری آواز ابھری تھی۔ اور پھر جینا تنک کر بولی۔

"قیمہ جسٹ نہیں تھا۔ آلو قیمہ تھا۔ یاد رہے آلو زیادہ قیمہ کم۔ نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ امی بس سونگھنے کے لیے قیمہ ڈالتی ہیں۔" جینا کے ترنت، دو ٹوک برجستہ جواب پہ تیمور عش عش کر اٹھا تھا۔

"واہ، میری شہزادی۔۔۔ ایسے تائی کو جواب دیا کرو۔" وہ جیسے سردھن کر رہ گیا تھا۔

"بدتمیزی نہیں چلے گی۔" نیلم نے ذرا ترشی سے ٹوکا۔

"بس دال چلے گی۔ سبزی چلے گی۔" جینا اور بیلا نے کورس میں گا کر سنایا تھا۔ نیلم نے یقیناً "اپنا سر پیٹا ہوگا۔

"بہت لمبی ہیں تمہاری زبانیں۔۔۔ کاٹ ڈالوں گی کسی دن۔" یہ کرخت آواز تائی فرحت کی تھی۔ جیسے سارا مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔ لیکن مزہ کرکرا کہاں ہوا تھا۔ مزہ تو اب آرہا تھا۔ لیکن مزے سے پہلے والا جینا کا جواب؟

"تو کاٹ دیں۔۔۔ کم از کم اپنی اپنی زبان کٹوا کر بھون لیں گے۔ ایک ٹائم اچھا کھانا تو ملے گا۔" جینا کے غصے بھرے الفاظ نے نوشابہ اور تیمور کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے تھے۔

تیمور کا دل بھر آیا۔ کیا اس کی بیٹیاں کھانے تک کے لیے ترستی تھیں؟ ایک اچھے کھانے کے لیے؟ اچھی خوراک کے لیے اور وہ خود نعمتوں کے انبار تلے کس چین سے بیٹھا تھا؟ وہ بے قرار سا ہو گیا تھا۔

"کس بدزبان کی اولاد ہو۔۔۔ آخر اسی پہ جاؤ گی بے فیض لڑکیو! اپنا دل نکال کر بھی تمہیں کھلا دیا تو پھر بھی کہو گی ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملا بھی۔" فرحت کی ترش آواز اسے سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔

"اپنا دل کیوں دیتی ہیں ہمیں۔۔۔ کسی چکن کو بس کھلا دیں۔" بیلا معصومیت سے بولی تھی۔

"منحوسو! کبھی تم نے چکن نہیں دیکھا۔" تائی تو بس پھٹ پڑی تھیں۔

"دیکھتے ہیں مہینے میں ایک بار۔ وہ بھی آدھی آدھی بوٹی۔" جینا نے ترنت جواب دیا تھا۔

"بس آئندہ وہ بھی نہیں ملے گی۔" تائی نے اپنا بے رحمانہ فیصلہ سنا دیا تھا۔ جینا بیلا کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"تو نہ ملے۔ اوپر ممی ہیں نا۔۔۔ وہ ہمیں چوری چوری..." بیلا جیسے ہی پول کھولنے لگی تھی جینا نے فٹ اسے پیر مار کر چپ کروا دیا تھا۔ وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"ایڈیٹ۔" جینا نے اسے گھورا تھا۔ کیونکہ فرحت ان کے ادھورے جملے کا مفہوم سمجھ گئی تھیں اور ان کا غصہ بس آسمان کو چھونے لگا تھا۔

"یہ اوپر والوں سے "دوستانے" بنانے کا خیال چھوڑ دو۔ ورنہ اتنی سزا دوں گی کہ نانی یاد آجائے گی۔" وہ روانی میں بولتی ہوئی جینا بیلا کی ممی پہ رکی تھیں۔ پھر انہوں نے جینا بیلا کو گھور کر دیکھا تھا۔

"نانی کہیں جائیں گی تو یاد آئیں گی۔ جو سامنے ہو اسے یاد کیا کرنا۔" ان کے برجستہ جواب پہ تیمور اور نوشابہ کو بھی ٹوٹ کر پیار آگیا تھا۔

"ارے، باپ کی طرح کسی پوائنٹ کو مس نہ ہونے دینا۔" فرحت نے زچ ہو کر کہا تھا۔

"اس کی بھی اتنی لمبی زبان ہے۔" فرحت نے یقیناً اوپر کی طرف دیکھ کر جملہ پھینکا ہوگا۔

"کیا ڈیڈی کی؟" بیلا نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔ فرحت کو غیض چڑھ گیا تھا۔

"وہ کمینہ تمہارا ڈیڈی کہاں سے ہوگیا؟" ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں کو ایک ایک تھپڑ لگا کر منہ بند کروا دیتیں۔ نیلم شاید فون سننے چلی گئی تھی۔ فرحت نے کھا جانے والی نظروں سے ان "پٹاخوں" کو دیکھا تھا۔

"خود ہی تو کہا ہے۔ اپنے باپ کی طرح کوئی پوائنٹ مس نہ ہونے دینا۔ اور ہمارا باپ تو ڈیڈی ہیں۔ وہ جو بہت لولی اینڈ بیوٹی فل ہیں۔" بیلا نے معصومیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ارے مرچکا تمہارا باپ۔۔۔ دس سال پہلے۔" فرحت نے سفاکی کی انتہا کردی تھی۔

"بٹ اللہ نے ڈیڈی کو واپس بھیج دیا ہے امی! تاکہ سوہا کے پاپا کو دیکھ کر ہم جیلس اور ڈس ہارٹ نہ ہوں۔" جینا نے فرحت کو اپنے تئیں سمجھانا چاہا تھا۔ ساتھ معصومیت سے اپنے دل کا حال بھی بیان کر دیا۔

نوشابہ اور تیمور کے دل جیسے کسی شکنجے میں پھنس گئے تھے۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظر چرالی تھی۔

"بس بک بک لگائے رکھنا۔ کھانا مرنا کچھ نا۔" فرحت اس برجستہ جواب پہ لاجواب ہو کر ان پہ چڑھ دوڑی تھیں۔ پھر بچیاں بھی بحث سے تنگ آگئیں۔ یا بھوک سے نڈھال ہو کر آلو کھانے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔ ان کی آوازیں آنا بند ہوئیں تو نوشابہ نے جلدی سے ایک ٹرے مختلف لوازمات کی سجا کر جالی دار رومال سے ڈھک دی۔ مٹن، بریانی، چکن کباب، زرانقل اور کوک کی بوتل بھی۔

"تیمور! نیچے دے کر آؤ۔ میں گئی تو بھابھی ٹرے میرے منہ پہ الٹا دیں گی۔ تم مقابلہ کر آتے ہو۔ میں نہیں کر سکتی۔" نوشابہ نے آنکھوں کی نمی چھپا کر کہا تو تیمور نے ٹرے اٹھا کر نیچے جانے میں لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔

☆ ☆ ☆

گرمی کا زور آج بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ باہر لو کے تھپیڑے تھے اور اوپر سے لوڈشیڈنگ کا عذاب الگ۔ آج صبح سے لائٹ نہیں تھی اور تپش جان نکال رہی تھی۔

اوپر سے آج چھٹی کا دن تھا۔ اور پھر خرم کی اماں نے اپنی آمد کا بتا کر فرحت کو سخت بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک تو آنے والی خاص مہمان خاتون کی خاطر مدارات کا مسئلہ۔ پھر جینا بیلا کی گھر میں موجودگی۔ وہ تو جان کھا مارتی تھیں۔ اتنا شور، ہنگامہ کرتی تھیں کہ حد نہیں۔ پورا گھر سر پہ اٹھا لیتی تھیں۔

اور اس وقت تو انہوں نے گرمی کا رونا ڈالا ہوا تھا۔

دو مرتبہ نہا چکنے کے باوجود گرمی گرمی چلا رہی تھیں۔ فرحت ان کے بھوں بھوں سے تنگ آکر تھیلا بغل میں دبا کر بازار نکل گئیں۔ خرم کی اماں کے لیے اچھی سی دعوت کا اہتمام کرنا تھا۔ سو راشن اور سودا وغیرہ لینے خود چلی گئی تھیں۔ پیچھے سے نیلم نے سیماں کو ساتھ لگا کر سارا گھر دھو ڈالا تھا۔

جب وہ صفائی کر چکی تو جینا تھکتی ہوئی آگئی۔

"کل پیپر ہے اور آج اس قدر گرمی کے حد نہیں۔ پنکھے کے بغیر کتاب پکڑنے کو دل نہیں کرتا۔ پسینہ کتابوں پہ گرتا ہے۔" جینا کے اپنے مسائل بے شمار تھے۔ نیلم جو جار سے چاول نکال رہی تھی لمحہ بھر کے لیے سوچ میں ڈوب گئی۔ لائٹ تو ابھی آنے والی نہیں تھی۔ پھر کیا کرے۔ اچانک اسے خیال آیا تھا۔

"سوہا کے گھر چلی جاؤ۔ وہاں جنریٹر ہے۔" وہ چاول

چلتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔
"اور تیاری کون کروائے گا؟" جینا چڑ کر رہ گئی تھی کیونکہ نیلی کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔
"میں رات کو کروادوں گی۔"
"اگر لائٹ نہ ہوئی تو؟" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔
"پھر میں کیا کروں۔۔۔ ابھی بیٹھو کروادیتی ہوں۔" نیلی کا پہلے سے الجھا پریشان ذہن کچھ اور پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جانتی بھی تھی خوامخواہ بچیوں پہ اپنی فرسٹریشن نکال رہی ہے۔ پریشانی، الجھاؤ، تفکر کچھ اور تھا، وجہ کچھ اور تھی ڈپریشن کچھ اور تھا، بس زیر عتاب جینا بیلا تھیں۔
"ابھی اتنا پسینہ آرہا ہے۔" جینا نے ٹھنک کر کہا۔
"تو پھر باہر مرو۔ میرا سر کیوں کھاتی ہو۔" وہ چاول بھگوتی نجانے کیوں اس قدر تلخ ہو رہی تھی۔ جیسے دل کہہ رہا تھا۔ جو ہونے والا تھا ٹھیک نہیں تھا۔ جو ہو رہا تھا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اس کا ذہن الجھتا جارہا تھا۔ اوپر سے امی کا دباؤ، خرم کا اصرار، اس کی اماں کا بار بار ڈیٹ لینے کے لیے فون کرنا۔ کیونکہ وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ نیلم کی طلاق ہو چکی ہے یا ابھی ہونے والی ہے۔ ان کے گمان میں علیحدگی کا مطلب مک مکا ہی تھا۔ انہوں نے خرم کو تنگ کر رکھا تھا کیونکہ وہ خود بیمار خاتون تھیں جلد از جلد اپنے فرائض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ خرم کی اماں تو اسی ہفتے میں نکاح چاہتی تھیں اور یہ ممکن نہیں تھا۔ کم از کم طلاق سے پہلے تو نہیں۔۔۔ اور فرحت نے کہا تھا یہ معاملہ وہ خود ہینڈل کرلیں گی۔ جانے کس طرح سے معاملہ ہینڈل ہو سکتا تھا؟ نیلم کو تو حالات پہلے سے بگڑتے نظر آرہے تھے، لیکن فرحت مطمئن تھیں۔ اوپر سے جینا بیلا کا تیمور سے اتنی جلدی گھل مل جانا۔ ان دونوں کا بس چلتا تو اوپر ہی گھسی رہتیں۔ نیچے آتی ہی تب۔ وہاں پلازمہ ٹی وی تھا۔ کارٹونز تھے۔ ہر وقت جنریٹر چلتا تھا۔ پورا پورشن اے سی سے ٹھنڈا رہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر فریج دنیا جہاں کے فاسٹ فوڈ سے بھرا رہتا تھا۔ نوشابہ باؤل بھر بھر کے فروٹس کاٹ کر دیتیں۔ آئس کریم

کھلاتیں۔ تیمور آرڈر پہ گرما گرم پزا منگواتا۔ شوارما، زنگر، ونگز۔۔۔ ان کی تو جیسے موج لگی ہوئی تھی۔ وہ اپنی عالی شان ہنڈا سوک پہ کئی مرتبہ جینا بیلا کو فرحت کی ہزار مخالفت اور رکاوٹوں کے باوجود باہر گھما لایا تھا۔ انہیں ہوٹلنگ کروائی۔ شاپنگ کروائی۔ وہ سارا شہر گھوم کر آئی تھیں۔ اس قدر خوش اور سرشار کہ نیلی نے پوری زندگی میں انہیں اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ اوپر سے سوہا اور اپنی فرینڈز پہ اپنے ڈیڑ ڈیڈی کی دھاک بٹھاتا۔ کیونکہ سوہا کے لیے یہ انکشاف ہی معمولی نہیں تھا کہ اس کے انکل جینا بیلا کے ڈیڈی نکل آئے تھے۔ پھر پورچ میں دو ایک جیسی خوب صورت سائیکل بھی کھڑی ہو گئیں۔ باربی ہاؤس بھی آگیا۔ رنگ رنگ کے ریموٹ سے چلنے والے کھلونے ہیلی، اسپورٹس کار، ہیلی، ہاؤس۔۔۔ تیمور جیسے ان کی ساری محرومیوں کو ایک ساتھ ہی ختم کر دینا چاہتا تھا اور وہ دونوں صبح و شام "ڈیڈی" کے نام کی تسبیح پڑھتی تھیں۔ کیا یہ ٹھیک تھا اور کیا یہ واقعی ہی ٹھیک تھا؟ نیلم اس صورت حال پہ پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی؟ جس طرح تیمور اچانک آکر جینا بیلا کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ جس طرح وہ اپنے باپ سے اٹیچ ہو چکی تھیں، کیا یہ نیلم کے حق میں بہتر تھا؟ ہرگز نہیں۔۔۔ قطعاً "نہیں۔ وہ انہیں کیسے روکتی؟ کس طرح سے روکتی؟ کیونکہ ایک بات تو طے تھی۔ تیمور گنگا میں بھی نہا کر آتا، تب بھی اسے قبول نہیں تھا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں۔ جینا بیلا کے لیے بھی نہیں۔ نیلم اسے اپنے دل سے اکھاڑ چکی تھی۔ اپنے دل سے نکال چکی تھی۔ تیمور کبھی بھی اپنی جگہ پہ نہیں آسکتا تھا۔ اپنا کھویا ہوا مقام بحال نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل کی راجدھانی پہ دوبارہ قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ جس طرح وہ انہیں دھتکار گیا تھا۔ نیلم بھی اسے دھتکار دینا چاہتی تھی اور اس وقت نیلم کا دماغ جل رہا تھا۔ وجود جل رہا تھا۔ وہ جب جب تیمور کے بچیوں سے بڑھتے التفات دیکھتی اس کا وجود کسی تندور میں بھل بھل جلنے لگتا تھا۔ اسے اب خیال آیا تھا؟ اب احساس ہوا تھا؟ کیا وہ جینا بیلا کو اپنی لمارات اور

وسائل کی زنجیر میں جکڑ کر نیلم سے دور کر لینا چاہتا تھا؟ کیا وہ اس سازش کے تحت آیا تھا؟ کیا وہ جینا بیلا کو نیلم سے چھیننے کے لیے آیا تھا؟ اور چھین تو وہ چکا ہی تھا۔ ان پہ عنایات کی برسات کر کر کے۔ اب جینا بیلا کو نیلم کا لایا کچھ پسند نہیں آتا تھا۔ اس کا پکایا بھی پسند نہیں آتا تھا۔ نچلا پورشن بھی پسند نہیں آتا تھا۔ تو گویا تیمور جس مقصد کے لیے آیا تھا۔ اس نے اپنا مقصد پالیا تھا؟ کیا یہ سوچوں کے اژدھام کم تھے جو خرم کی اماں فرحت سے مہینہ۔۔۔ بعد کی تاریخ زبردستی لے کر چلی گئی تھیں اور فرحت نے بھی حالات کو پلٹتا دیکھ کر تاریخ دے دی تھی۔ کیونکہ عدالتی کارروائی اسی ہفتے کے دوران ہو جانی تھی۔ تیمور کو آج نہ سہی۔۔۔ کل تک ضرور نوٹس مل جاتا۔ پہلی تاریخ پہ یہ مک مکا ہو جانا تھا اور نیلم کا دماغ ان دنوں اذیت ناک حد تک سوچوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ کیا کرتی؟ خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیتی؟ جو امی کر رہی تھیں بس آنکھیں بند کر کے ان کے کہے پہ چلتی رہتی۔۔۔ کیا یہ بہتر تھا؟ نیلم کے لیے بہتر تھا؟ وہ رات رات بھر پریشان رہتی تھی۔ اس کی بے چینی ختم نہیں ہوتی تھی۔ اضطراب جان نہیں چھوڑتا تھا۔ نیلم انتہائی چڑچڑی اور بے زار ہوتی جارہی تھی اور فرحت نے چپکے چپکے اس کے عقد ثانی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ تو کیا خرم، تیمور سے بڑھ کر اس کی بیٹوں کا باپ ثابت ہو سکتا تھا؟ خرم جتنا اچھا ہوتا، لیکن بچیوں کا محرم تو نہ ہوتا؟ اور اس صبح جینا بیلا کا آخری پیپر تھا۔ رات بھی تیمور انہیں تیاری کروانے کے لیے اوپر لے گیا تھا۔ نیچے لائٹ نہیں تھی۔ فرحت نے تو بہت باتیں سنائی تھیں، لیکن نیلم خاموش ہو گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کم از کم آخری پیپر کی تیاری ٹھیک سے ہو جائے۔ ویسے بھی روکنا بے فائدہ تھا۔ اگر وہ حق جتانے آگیا تھا تو پھر کورٹ سے ملنے ملانے کا سرٹیفکیٹ اور صبح صبح ایک مرتبہ پھر آشیانہ ثقلین کے نچلے پورشن میں ہنگامہ بپا تھا۔ آج وین والے نے چھٹی کرلی تھی۔ اچانک وین خراب ہوئی اور آئی ہی نا۔۔۔

پہلے پتا ہوتا تو وقاص ہی چھوڑ آتا، لیکن وقاص آؤٹ آف سٹی تھا۔ یوں سوہا بھی گھر میں تھی۔ اسکول نہیں جاسکی اور ادھر جینا بیلا نے قیامت اٹھا رکھی تھی۔ وہ پیپر کسی طرح بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سوہا تو ایوریج اسٹوڈنٹ تھی، جبکہ یہ دونوں برائٹ اسٹوڈنٹس میں شمار ہوتی تھیں۔ اب وین کے نہ آنے میں بھی نیلم کا ہی قصور تھا۔
"کہا بھی تھا چھوٹی سی مہران لے لیں۔۔۔ لیکن آپ کو ہماری پروا ہی نہیں ہے۔" جینا بیلا ہمیشہ کی طرح پاؤں پٹختی غصے میں چیخ رہی تھیں اور ان کی پکار اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔
"میں رکشہ پہ چھوڑ آتی ہوں۔" نیلم نے ہاتھ میں پکڑا پیڑا واپس رکھا اور جلدی سے چادر لینے چلی گئی۔
"رکشہ دو گھنٹے میں چھوڑے گا۔ تب تک اسکول گیٹ بند ہو چکا ہو گا۔ انکل اندر نہیں جانے دیں گے۔" بیلا روہانسی ہو رہی تھی۔ اوپر ان کی آوازوں پہ تیمور خود ہی چابی اٹھا کر نیچے آنے لگا تھا۔
"تو پھر نہ جاؤ۔" نیلم چڑ گئی تھی۔ تب فرحت کمرے سے باہر نکل کر آئیں۔ اوپر کی طرف منہ کر کے ذرا اونچی آواز میں بولی تھیں۔ "اس نواب آف کالا باغ سے کہو چھوڑ آئے۔ ویسے تو پورا شہر اس کے کندھوں پہ چڑھ کر گھومتی ہو۔ اسکول نہیں چھوڑ کر آتا۔" فرحت کی بات ابھی نامکمل ہی تھی جب نواب آف کالا باغ سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔ کچھ دیر پہلے سبرین کی بھی کال آئی تھی کہ سوہا کو اسکول چھوڑ آئے۔ اس نے تخت پر سے بیلا جینا کے بیگ اٹھائے تھے۔ پھر دونوں کے بازو پکڑ کر باہر جاتے ہوئے خاص طور پر فرحت اور نیلم کو سناتا ہوا باہر نکلا تھا۔
"نواب آف کالا باغ سے بہتر آپ کو کوئی نہیں ملے گا۔ سارے دور کے ڈھول سہانے ہیں۔ جو ٹھوکر لگی تو سمجھ میں بات میری آئے گی۔" وہ دھیمی سلگتی آواز میں بولتا ہوا گیا تھا۔ یوں کہ نیلم سن سی ہو گئی تھی۔ تیمور کے جاتے ہی فرحت نے خوامخواہ سر جھٹکا اور نیلم کے سر ہو گئی تھیں۔ پھر جو انہوں نے بات کی

تھی۔ نیلم کا دماغ گھوم کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور آواز حلق سے چیخ کی مانند نکلی تھی۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں امی!" صدمے کے مارے نیلم کا سر چکرانے لگا تھا۔ "کچھ غلط نہیں کہا۔ تمہاری ٹینشن دور ہو جائے گی۔ لڑکیاں اپنے باپ کے پاس رہیں گی۔ تمہارے سر سے بلائیں اتر جائیں گی۔ تمہیں اور کیا چاہیے؟" فرحت نے بڑے طریقے سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ لیکن وہ ایسے بدک گئی تھی جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہوا۔

"میں ان کی ماں ہوں امی۔۔۔ ناگن نہیں اور مجھے شادی کا کوئی شوق نہیں چڑھا تھا۔ میں نے اگر زہر بھرا یہ گھونٹ بھرنا بھی چاہا ہے تو محض اپنی بیٹیوں کے لیے اور اگر بچیاں تیمور کو ہی دینی تھیں تو پھر مجھے دوبارہ ڈولی چڑھنے کا شوق نہیں۔" اس کی قطعیت بھرے دو ٹوک الفاظ پر فرحت چپکی رہ گئی تھیں۔ پھر دوبارہ انہوں نے اس موضوع پہ بات ہی نہیں کی تھی اور یہ اسی دوپہر کا قصہ تھا۔ قریب گیارہ بجے کے بعد ڈاکیا ڈاک دے کر گیا تو دوسرے ہی لمحے تیمور آگ بگولا سا وکیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ثقلین اور نوشابہ بھی آگے تھے۔ اس ڈاک میں خلع کا نوٹس تھا جو نیلم کی طرف سے تیمور کو بھیجا گیا تھا۔ وکیل صاحب اس معاملے میں بے بس تھے۔ کیونکہ کار مختار یہ دونوں ماں بیٹی تھیں۔ وکیل صاحب کو بتاتا تو دور بھنک تک پڑنے نہیں دی تھی۔ پھر ثقلین، نوشابہ کی معافی تلافی کے باوجود فرحت کی اکڑ کم نہ ہوئی تھی۔ وہ نہ ان کی بات سن رہی تھیں۔ نہ انہیں بولنے کا موقع دے رہی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی وضاحت لینے پہ تیار تھیں۔ تیمور نامایہ اپنا غصہ اور بھڑاس نکال کر نیلم کو ڈھونڈتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ نیلم غیر متوقع تیمور کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ پھر تیمور نے نوٹس کو پرزہ پرزہ کر کے نیلم کے منہ پہ دے مارا تھا۔

"تمہیں اتنا آگے تک جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ مجھ سے دو ٹوک بات کر لیتی۔۔۔ تمہیں آزادی چاہیے تھی؟" تیمور آگ بگولا سا بھڑک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا اور ماتھے کی رگ شدت ضبط سے پھڑک رہی تھی۔ اس نے بمشکل خود پہ کنٹرول کر رکھا تھا۔ ورنہ تو نیلم کا منہ توڑ دینے کو دل کر رہا تھا۔

"تمہیں اس قدر گرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے بغیر بھی تمہاری تمنا پوری ہو سکتی تھی۔" وہ چیخ چیخ کر اور بول بول کر تھک گیا تھا۔ پھر اس کا لہجہ بھی دھیما پڑ گیا۔ الفاظ میں بھی ملائمت آ گئی تھی اور لہجہ شدید شکستہ قسم کا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر پلنگ پہ بیٹھ گیا۔ جیسے اسے نیلم سے اس انتہائی قدم کی امید نہیں تھی۔ پھر کئی لمحے خاموشی سے پھسلتے چلے گئے تھے۔ کمرے میں دبیز سکوت چھایا رہا۔ نیلم کو ایک دم گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ پھر وہ تیمور کی موجودگی سے شدید الجھن محسوس کر رہی تھی۔ نیلم اٹھ کر باہر نکلنے لگی تو تیمور سرعت سے نیلم کے سامنے آ گیا تھا۔

"تم میری بات سے بغیر نہیں جا سکتی۔" وہ اس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ نیلم کچھ دیر کے لیے سوچتی رہی تھی۔ پھر اس نے بلا کے سرد اور برفیلے لہجے میں محض اتنا کہا۔

"بولو۔۔۔ تمہارے پاس دس منٹ ہیں۔" وہ گھڑی پہ نگاہ جما کر کھڑی تھی۔ تیمور کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ اس کی بات سننے کے لیے رک چکی تھی۔ ورنہ ایسی کئی کوششیں وہ پہلے بھی کر چکا تھا۔ نیلم نے دل میں ایسی گرہ لگائی تھی کہ اسے کھولنے کے لیے بھی ہاتھ آگے بڑھنے نہ دیتی۔ اس وقت تیمور کے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ نیلم دس منٹ کے لیے ہی سہی رک ضرور گئی تھی اور تیمور کو سوچنے کے لیے تمہید باندھنے کے لیے بھی وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ ایسے ہی غیر متوازی لہجے اور بے ترتیب الفاظ سے بولتا رہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں؟ اچانک نکاح اور شادی سے؟ پاپا پہ بننے والے غبن کے کیس اور جھوٹے الزام سے؟ یا ممی پاپا کی اچانک بیماری اور بدلتے حالات سے؟ میری زندگی میں بہت اچانک تکلیف دہ موڑ آئے تھے۔ پاپا پہ غبن کا جھوٹا الزام لگا اور ان کی جاب چھوٹ گئی تھی۔ سرکاری نوکری تو تھی نہیں جو جی پی فنڈ یا پنشن کا سہارا ہوتا۔ پاپا کو صدمے سے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور ان سے پہلے ممی کو تمہاری امی نے ٹارچر کر کے ہسپتال پہنچا دیا۔ پھر میرا نکاح شادی اور بچوں کی آمد کا سلسلہ۔۔۔ میں دنوں میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ جمع جتھا تھا کوئی نہیں۔ حالات اتنے خراب ہو جائیں گے میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔

یہ سب حالات تو تمہارے سامنے تھے۔ انہیں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل قصہ تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پہ تائی کے طعنوں، کوسنوں نے ذلت کی انتہا پہ پہنچا دیا تھا۔ وہ مجھے نکمے پن کے طعنے مار مار کر تھکتی نہیں تھیں۔ اوپر سے جو کچھ تھا وہ ممی پاپا کے علاج پہ خرچ ہو رہا تھا۔ نہ میرے پاس ہنر تھا، نہ تعلیم جو کہیں اچھی جاب پہ لگ جاتا۔ اوپر سے سرمایہ تھا نہیں کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کر لیتا۔

حالات دن بدن بگڑتے جا رہے تھے۔ نوبت فاقوں پہ آ رہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں اگر یہاں رہا تو کچھ کر نہیں پاؤں گا۔ یہاں بیروزگاری تھی۔ افلاس تھی۔ کوئی موقع بھی نہیں تھا۔ سبب کہاں سے لگتا؟ پھر ان ہی دنوں میرا ایک ایجنٹ سے رابطہ ہوا۔ اس نے مجھ سے لاکھوں کے حساب سے رقم مانگی۔ وہ مجھے اٹلی کا پکا ویزہ دے رہا تھا۔ میں نے تم سے زیورات مانگے تو تم نے انکار کر دیا۔ مجھے تم پہ شدید غصہ آیا۔ تم ان حالات میں میری مدد کرنے کی بجائے الٹا مجھے ستا رہی تھی، مجھے غصہ آیا اور میں نے تمہیں تھپڑ مار دیا اور بس اس تھپڑ کے بعد میری بدبختی کے دن شروع ہو گئے تھے۔

میں آج بھی اس تھپڑ پہ پچھتاتا ہوں۔ میں آج بھی اس وقت پہ پچھتاتا ہوں۔

مجھے لگتا تھا کچھ تمہیں خود بھی مجھ پہ غصہ تھا اور کچھ تمہیں تائی نے بھڑکا رکھا تھا۔ تائی کا اول روز سے ہی ممی کے ساتھ کلیش تھا۔ وہ مجھے بھی پسند نہیں کرتی تھیں اور میں نے تائی کی ناپسندیدگی کے ساتھ کمپرومائز کر لیا تھا۔ میں جانتا بھی تھا، تائی کی عادت کو، مگر پھر بھی ان کے طعنے مجھے آگ بگولا کرتے تھے۔ مجھے جنون چڑھا ہوا تھا کچھ بن کر دکھانے کا اور اپنے حالات پہلے کی طرح بہتر کرنے کا اور اس کے لیے مجھے وقت درکار تھا۔ محنت بھی۔۔۔ مواقع بھی۔۔۔ سرمایہ بھی۔۔۔ پھر یوں ہوا میں نے ایک دوست سے لمبا چوڑا ادھار پکڑا اور غیر قانونی رستے سے یونان کی طرف نکل گیا۔ اس دوران میں نے کتنی مشکلیں اٹھائے، کتنی تکلیفیں جھیلیں اور کتنے کتنے دن بے ہوشی میں "لانچوں" کے قبر نما کونوں کھدروں میں بے ہوشی کے عالم میں سفر کیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ اس کو سن کر کیا کرو گی؟ یہ بڑی صبر آزما تکلیف دہ یادوں میں ڈوبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر میں نے یونان تین سال بغیر کسی شناخت ویزے اور لیگل سرٹیفکیٹ کے چھپ کر کام کیا اور پیسے جمع کرتا رہا۔ میری قسمت کچھ یہاں پہ تھوڑا ساتھ دیتی رہی اور مجھے اٹلی جانے کا سبب مل گیا۔ گو کہ میں اٹلی بھی غیر قانونی رستوں سے گیا۔ اگلے دو سال میں نے اٹلی میں چھپ چھپ کر گزارے تھے۔ لیکن اٹلی آنے سے پہلے میرے کینیڈین دوست نے میرے بہت اصرار اور منت سماجت پہ میرے ممی، پاپا کو کینیڈا نہ صرف اسپانسر کیا بلکہ ان کا علاج بھی کروا لیا اور انہیں اپنے گھر پورے چھ سال رہائش بھی دی۔ ان کا خیال بھی رکھا۔ میں عمر بھر اس کا احسان نہیں اتار سکتا۔ جو اس نے میری ذات پہ کیا تھا اور ایک غیر قومیت، نسل اور غیر مذہب کے انسان نے کیا تھا۔ وہ مجھے اپنوں سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اپنوں نے تو زیورات تک چھپا لیے تھے۔ میں نے اپنے دوست کو یونان کے ساحل سے ایجنٹ کے موبائل سے آخری کال کی تھی۔ جس میں اپنے ماں، باپ کے بارے میں التجا کی اور گھر کا ایڈریس وغیرہ لکھوایا۔ مجھے ممی، پاپا کی بہت فکر تھی۔ ان کا علاج، ان کی بیماری، یوں ممی، پاپا میرے دوست پال کی مدد سے کینیڈا تو پہنچ گئے، مگر پورے کینیڈا میں اپنے بیٹے کو تلاش کرتے پاگل ہونے لگے تھے۔ وہ دن بڑے عذاب ناک تھے ان کے لیے۔ میں ان دنوں یونان میں دھکے کھا رہا تھا۔ پھر تین سال اٹلی رہا۔ وہاں سے جڑی

مشکل اور کٹھن صورت حال سے گزرتا میں کینیڈا پہنچا اور وہاں سے گرفتار ہو گیا تھا۔

چھ سال بعد میں ممی' پاپا سے ملنے کا جنون لے کر جیسے ہی کینیڈا آیا۔ وہاں مجھے پولیس نے پکڑ لیا۔ ڈیڑھ سال میں جیل میں زیر حراست رہا اور یوں مجھولا پتا رہا۔ بس پال مجھ سے ملنے آتا تھا اور اسی کی مہربانی سے میرا کیس بھی کچھ مضبوط ہوا اور بالآخر قید سے رہائی مل گئی تھی۔

پھر آگے کی مشقت بھری کہانی کیسے سناؤں۔ یہ دس منٹ تو ان دس سالوں کی اذیت کے لیے بہت کم ہیں۔ مجھے دس سال اور بھی لگیں تب بھی اپنے دکھوں' محنت' مشقت اور جدائیوں کی اس داستان کو سنا نہ پاؤں۔ اگلے دو سال میں سنے پال کے قرض اتارے اور اس دوران میں نے گھر ایک سو اکہتر فون کیے۔ پہلا ڈرافٹ وقاص کے نام سے بنوا کر بھیجا جو تائی نے وقاص کے منہ پر دے مارا تھا۔ پھر اگلے سات ڈرافٹس بھی ایسے ہی پرزہ پرزہ ہوتے رہے تھے۔ میں نے اٹلی اور یونان میں قیام کے دوران جتنی مرتبہ کال کی اتنی مرتبہ تائی نے کال ڈراپ کر دی۔ نہ تم سے بات کروائی' نہ بچیوں سے۔ میں بڑے مشکل حالات میں چھ چھ ماہ بعد کال کیا کرتا تھا اور تائی ہر دفعہ یہ ہی جواب دیتی تھیں۔

"میں کسی تیمور کو نہیں جانتی۔ تیمور ہمارے لیے مر چکا ہے۔"

اس کے باوجود میں کبھی بھی تم لوگوں سے لاتعلق نہیں رہا۔ تم جو ایک تھپڑ کو ایشو بنا کر ایسی روٹھیں کہ ابھی تک مان کے نہ دیں۔ اس وقت میں جس ذہنی دباؤ کا شکار تھا۔ مجھے ہر بات غلط اور بری دکھائی دیتی تھی۔ لیکن اللہ کی قسم! تمہیں اس تھپڑ کو مارنے کی بڑی لمبی سزا بھگتی ہے۔ اتنے سال وطن بدر رہا ہوں۔ خوار ہوتا رہا ہوں اور تائی کو کچھ بن کے دکھا دینے اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے چکر میں بڑی خواری اٹھائی ہے۔ پھر وقاص نے مجھے بتایا۔ ادھر تائی کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ مجھے جلدی واپس آجانا چاہیے اور پھر میں سب کچھ سمیٹ کر واپس آگیا۔ اب تمہارے سامنے ہوں۔ جو چاہے سزا دو۔ مگر جدائیوں کی سزا مت دینا۔ بڑی لمبی جدائی کاٹ کر آیا ہوں اور حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی دوست کی بیوہ بہن سے شادی نہیں کی۔ بلکہ مجھے شادی کرنے کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ اگر ملتا تو شاید کر ہی لیتا۔" وہ تھکن سے ٹوٹتے لہجے میں اپنی داستان مشقت کو دس منٹوں میں سنا تا لمحہ بھر کے لیے آخر میں شوخ ہوا تھا' لیکن نیلم کے مزاج اور چہرے کی سنجیدگی سے قدرے پریشان ہو گیا۔ وہ جو سمجھ رہا تھا کہ نیلم کی بدگمانی اب تک دور ہو جائے گی۔ اس کے تاثرات دیکھ کر پریشان اور غم زدہ ہو گیا۔ نیلم پہلے کی طرح ہی سنجیدہ تھی۔ برف کی طرح سرد تھی۔ وہ پہلے کی طرح ہی لاتعلق اور اکھڑی اکھڑی تھی۔ یعنی نیلم کا دل صاف نہیں ہوا تھا؟ نیلم کو تیمور کی کسی بات پہ یقین نہیں آیا تھا؟ وہ اپنا اعتبار کھو چکا تھا؟ یعنی وہ نیلم کے دل سے اپنی محبت کو کھو چکا تھا؟ تیمور کو بڑا زوردار دھچکا لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیلم کو دیکھتا رہا۔

"بس یا کچھ اور؟" نیلم نے اتنی دیر کی خاموشی کو توڑ کر کہا بھی تو کیا؟ تیمور کو ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ یہ نیلم تو کوئی اور تھی۔ یہ نیلم وہ نہیں تھی جسے تیمور چھوڑ کر گیا تھا۔ نیلم بدل گئی تھی؟ یا وقت بدل گیا تھا؟

"تم کیا سمجھتے ہو؟ چار مکالمے بول کر میرا دل جیت لوگے اور میں تمہیں صبح کا بھولا سمجھ کر خوش آمدید کہوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ کل کورٹ میں پہلی اور آخری تاریخ ہوگی۔ اگر دل چاہے تو کورٹ میں آجانا۔ ورنہ یہاں۔ مجھے تمہاری طرف سے فیصلے کا انتظار رہے گا۔ تحریری فیصلے کا۔" نیلم نے ایک سلگتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہاں دیوار کے پاس ایک سایہ تھا۔ وہ فرحت تھیں جو تیمور کے ہر ہر سچ پہ شرمندہ اور پشیمان کھڑی تھیں۔ انتہائی شرمسار' جھکے ہوئے سر کے ساتھ "اپنی بہت سی غلط بیانیوں اور جھوٹوں کے ہمراہ۔ مگر ان کی بیٹی ان ہی کی طرح ایک غلط فیصلہ کرنے جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ فرحت کی ہی بیٹی تھی۔ کچھ اچھا فیصلہ کس طرح سے کرتی۔

☼ ☼ ☼

کورٹ میں دس بجے "پکار" تھی۔ نیلم نے بینک سے چھٹی کرلی تھی۔ لیکن وہ صبح ہی صبح پرس اٹھا کر گھر سے نکل آئی۔ لیکن آنے سے پہلے فرحت نے نیلم کو بے ساختہ روک لیا تھا۔ وہ رات تیمور سے ہونے والی باتیں ڈسکس کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن نیلم کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے ان کی کوئی بات نہیں سنی تھی اور وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔ اس نے بینک بھی نہیں جانا تھا اور کورٹ کا بھی ابھی وقت نہیں تھا۔ پھر وہ کہاں جا رہی تھی؟ پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ اونچی نیچی تنگ گلیوں میں بمشکل پہنچی تھی۔ پھر ایک خستہ حال تین مرلے پہ پھیلے مکان تک جیسے تیسے پہنچ گئی۔ یہ ایک ٹوٹا پھوٹا غلیظ اور گندا مکان تھا۔ پورے صحن میں مرغیوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ نیلم کا جی متلانے لگا۔ الٹی آنے لگی۔ وہ تو بہت صفائی پسند تھی۔ اس قدر گندگی پہ جی الٹنے لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ دوپٹہ ناک پہ رکھ لیا اور مرغیوں کی فرش پہ پھیلائی تازہ غلاظت اور فضلات سے بچتی بچاتی اندرونی بند دروازے تک پہنچ گئی۔ جس کے آگے بدرنگ چق پڑی تھی۔ اس نے ابھی چق کو ہٹانا ہی چاہا تھا جب اندر سے ایک کرخت آواز نیلم کی سماعتوں میں پڑی۔ اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔

"تیرا تو کام ہی اٹک گیا پپو! بڑے ماٹھے نصیب ہیں تیرے' لگتا تا ہی' ہاتھ آئی لکشمی ہمارے پاس آوے۔" یہ مردانہ آواز تھی۔ کسی بزرگ کی۔ ابا ٹائپ بزرگ اور اس کے بعد آوازوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ نیلم پہلے سن ہوئی۔ پھر گم صم ہوئی' پھر بدحواس ہوئی اور پھر جیسے حواسوں میں آگئی۔

"سونے کی مرغی ملے گی۔ دو سفید چوزیوں کے ساتھ۔ یہ سارا گند اٹھا کر باہر کروں گی۔ انڈا انڈا بیچتے تھک گئی ہوں۔ دیکھنا تو پپو کے نصیب کیسے چمکیں گے۔ چٹی دودھ زنانی۔ دو چٹی دودھ کڑیاں۔" یہ آواز بہت جانی پہچانی تھی۔ بہت سنی سنائی تھی۔ لیکن تب اس لہجے میں شہد گھلا ہوا تھا اور اب۔؟

"گورچٹی دودھ زنانی کے ساتھ بنا بنایا اتنی خوب صورت کالونی میں مکان۔ ذاتی اپنا۔ نہ کرائے کا جھنجٹ' نہ مالک مکان کی گالیاں سننے کا عذاب۔" یہ پپو کا بھائی تھا۔ خوشی سے پھٹا ہوا۔

"زنانی بھی تنخواہ دار۔ اتنی لمبی چوڑی تنخواہ والی۔ پورے ہزار۔" پپو کی اماں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ پھر کوئی لڑکی دور کی کوڑی لائی تھی۔

"وہ اپنی لڑکیاں ساتھ لائے گی؟" کسی لڑکی نے چہک کر پوچھا۔

"تو کیا پھینک آئے گی؟" پپو کی اماں غصے سے تڑخی تھی۔

"پپو تو فائدے میں رہے گا۔ کبھی زنانی ہاتھ آئے گی' کبھی اس کی لڑکیاں۔" کسی بے غیرت نے زوردار قہقہہ لگایا تھا' جس میں پپو یعنی خرم کی مکروہ آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

"اب مرغی پھنسی پھنسائی۔ اپنے بندے سے طلاق لے گی آج۔" خرم اپنے گھر والوں کو مژدہ جاں فزا سنا رہا تھا۔ وہ لوگ اب لمبی چوڑی پلاننگ میں مصروف ہو چکے تھے' لیکن نیلم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی اور اس کے سر پہ آسمان آن گرا تھا۔ وہ الٹے قدموں اس غلیظ گھر سے نکل رہی تھی۔ وہ آنسو روکتی' چیخیں دباتی بھاگ رہی تھی۔ اندھا دھند' بغیر پیچھے دیکھے۔ جیسے اگر پیچھے دیکھے گی تو بڑے بڑے ناگ اسے ڈس لیں گے۔ ان کا زہر اسے نیل نیل کر دے گا اور وہ کھڑے کھڑے صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ گندی گلی کا موڑ مڑتے ہوئے صاف سڑک کی طرف بھاگتے وہ اب بھی پیچھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ مکروہ لوگ اور مکروہ آوازیں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ اب نیلم سڑک اور ستھرے رستے پہ کھڑی تھی۔ بمشکل سنبھلتی ہوئی۔ بمشکل اپنی سانسیں رواں کرتی

ہوئی۔ بمشکل اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے خود کو حواسوں میں لاتے ہوئے۔ اس نے اپنے چہرے پہ کئی مرتبہ ہاتھ پھیرا تھا اور اپنے پیر کئی مرتبہ جھاڑے تھے۔ وہ اس گندی گلی اور گندے مکروہ لوگوں کی ہر غلاظت سے بچ کر آئی تھی۔ یہ نیلم کے لیے مقام شکر تھا۔ خرم نام کا عفریت، جو اس کی ماں کے اصرار اور ضد سے نیلم کے پیچھے پڑا۔ آج اس کی اصلیت اس پہ کھل گئی تھی۔ وہ خرم، جو اس کے بینک میں معمولی کیشیئر تھا۔ وہ خرم جو بظاہر بڑا نیک، باخلاق، تہذیب یافتہ بنا تھا۔ در حقیقت اندر سے اتنا غلیظ، گندا اور دوغلا تھا۔ نیلم کو یقین نہیں آرہا تھا۔ بالکل یقین نہیں آرہا تھا، ساری زندگی اپنی ماں کے الٹے سیدھے ہر فیصلے پہ سر جھکانے والی نیلم کو یقین آتا بھی کیسے؟ اس کی ماں اپنی نام نہاد انا، ضد اور بلاوجہ کی اکڑ کے پیچھے اس کی زندگی برباد کرنے تلی ہوئی تھی اور نیلم ایسی ناسمجھ تھی جو آنکھیں بند کرکے ان کی ہر بات مانتی چلی جارہی تھی۔ لیکن یہ بھی نیلم کا ایک انتقام تھا۔ شاید اپنی ماں سے یا خود سے۔ آخر وہ اتنی احمق، بدھو یا پاگل کیوں تھی؟ آخر کس عمر میں اسے عقل آنی تھی؟ جب تیمور اس کی زندگی میں آیا تب بھی وہ ناسمجھ تھی۔ جب وہ اس کی زندگی سے اچانک چلا گیا تھا وہ تب بھی ناسمجھ تھی۔ لیکن اب تو وہ سمجھ دار تھی۔ باشعور تھی۔ تیمور کی واپسی کے بعد تیمور میں در آنے والی تبدیلیوں، اس کے التفات اور اس کی معذرتوں پہ اتنا کیوں کر اکڑتی رہی؟ تیمور کی وضاحتوں کو پیر کی ٹھوکر سے اڑا دیا تھا۔ محض خرم کی وجہ سے؟ کیا واقعی ہی خرم کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ وہ محض تیمور سے بدلہ لے رہی تھی۔ ان دس سالوں کو جو اس نے تیمور کی یاد میں تڑپتے ہوئے گزارے تھے۔ جتنا تیمور نے اسے تڑپایا تھا۔ اتنا خود بھی تڑپتا۔ اتنا خود بھی جلتا۔ وہ اس کے دس سالوں کا پہلے حساب دیتا، لیکن وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ خرم کے گھر کیوں آئی تھی؟ اس صاف ستھری سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر وہ بڑی حیرت سے خود کو مخاطب کرتی سوال کر رہی تھی۔ پھر اسے یہ سوال اپنے اندر سے ہی مل گیا تھا۔

اسے آشیانہ ثقلین سے یہاں تک تقدیر کھینچ کر لائی تھی۔ تاکہ ایک ایسی ٹھوکر کا انجام دیکھ سکے۔ اگر یہ ٹھوکر اسے لگ جاتی تو کیا ہوتا؟ اگر وہ خرم کے گھر نہ آتی تو کیا ہوتا؟ اگر وہ کورٹ سے خلع لے لیتی تو کیا ہوتا؟ وہ اپنی اور اپنی بیٹیوں کی زندگی محض ماں کی انا، ضد اور اکڑ کے پیچھے نہیں ان کے غلط فیصلوں کے پیچھے تباہ کر لیتی۔ نیلم اس وقت صاف ستھرے روشن رستے کی طرف جارہی تھی۔ وہ رستہ جو اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ وہ رستہ جو تیمور کی طرف جاتا تھا۔ جدائیوں کے وہ سمندر جو تیمور پار کرکے اس تک آیا تھا۔ اب نیلم کو خود آگے بڑھ کے اس ہلکی سی خلیج کو ختم کرنا تھا اور وہ ختم کر سکتی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب اس کی امی اس کے گھر اور زندگی میں بے جا مداخلت نہیں کریں گی اور وہ تیمور کے ساتھ مل کر اپنی زندگی کے فیصلے کرے گی۔ ہر آلودگی اور ہر بدگمانی سے ہٹ کر جو امی نے بلاسبب اس کے دل اور دماغ میں تیمور کے خلاف بھر دی تھی۔ زندگی میں بس ایک ہی لمحہ ایسا ہوتا ہے، جو یا تو زندگی بنا دیتا ہے یا زندگی تباہ کر دیتا ہے اور نیلم کی زندگی میں وہ ایک لمحہ بڑے خوش گوار انداز میں داخل ہوا تھا۔ جس کی آمد سے وہ ایک بڑی ٹھوکر سے بچ گئی تھی اور نیلم بد قسمت ہونے سے بچ گئی تھی۔ وہ پیچھے بکھری گندگی، غلاظت، بساند اور بو سے بھی بچ گئی تھی اور واپس اپنے گھر کی طرف رواں دواں نیلم بڑے خوش گوار انداز میں سوچ رہی تھی۔ زندگی میں بھی کبھی ایک "بدبودار" لمحہ بھی قیمتی ہوتا ہے۔

✽

اُمِ طیفور

چاند کے پار چلو

"آجا نظر۔ آجا۔ کب سے کھڑا ہوں مگر میرا چاند دکھائی نہیں دیا۔ اب تو آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے ہیں۔!"

"بیٹا جی۔ تارے! جس دن چاند کے ابا جی نے تجھے تاڑتے دیکھ لیا ناں تو تجھے آنکھوں کے آگے صرف "بلیک ہول" دکھائی دے گا۔ سمجھا۔!"

"ابے ہٹ۔! مجھے کیا بلیک ہول دکھائیں گے وہ۔ خود وہ پچھلے مہینے "مین ہول" میں گر گئے تھے تو واحد میں ہی تھا جس نے انہیں اس ہول سے نکالا تھا۔"

"ہاہاہا۔ ہاں مگر میری جان! تیری یہ حرکت ہرگز قابل معافی نہیں ہے۔ سیدھی طرح آنٹی کو بلا کر سامنے والوں کے گھر بھیج کر قصہ تمام کر۔ ورنہ اگلے مہینے تو "مین ہول" سے برآمد ہوگا۔!"

"ہونہہ! چھوڑ یار۔ چاچی بھلا کیوں میری شادی کروانے لگیں۔ ان کی ہتھیائی جائیداد کو مزید خطرات نہ لاحق ہو جائیں گے۔ اور ویسے بھی فکر نہ کر، میں

سنجیدہ ہوں۔ بس ذرا میں بھی اس لطف کا "لطف" لینا چاہتا ہوں جو لوگوں کو تاڑنے میں آتا ہے۔"

"خود تو پٹے گا، میری بھی "چھترپریڈ" کروائے گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تیرے پاس پٹنے کا مارجن ہے۔ کچھ کرنا ہے تو کر ورنہ اس سوراخ کو بند کر۔ اور اب ذرا ادھر آجاؤ اور آکر ملک شیک پی لو۔ میں دوبارہ نیچے برف لینے نہیں جاؤں گا۔ گرم ہی پینا پڑے گا۔"

رومان نے پلٹ کر کینہ توز نظروں سے بابر کو دیکھا اور ایک ٹھنڈی سانس بھرتا، لکڑی کی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسی پہ آبیٹھا۔ تھوڑی دیر میں چھت پر دونوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی سنگت میں یونہی انجوائے کرتے تھے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے انسیت کا زمانہ گواہ تھا۔ وہ دوست کم "بھائی" تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں بچپن کے نہیں لڑکپن کے ساتھی تھے۔ رومان اور اس کی بڑی بہن زینیا جب بے آسرا ہو کر چچا کے گھر پہنچے تھے تو رومان محض بارہ سال کا تھا۔ اور ڈیڑھ ہفتے پہلے ان کی ماں مر گئی تھی۔ جبکہ باپ کو چار سال ہو چکے تھے دوسری شادی کرکے اٹلی گئے۔ ماں کے دو بھائی ضرور تھے مگر سوتیلے۔ انہیں بھلا سوتیلی بہن کے بچوں سے کیا ہمدردی ہوتی۔ دونوں نے انکار کر دیا رکھنے سے۔ پتا نہیں۔ کس گھڑی چچا کا دل پسیجا اور ساتھ لے آئے۔ یہاں پر وہی روایتی کہانی تھی۔ چچی کے لیے وہ دونوں ناقابل برداشت اور چچا بے خبر۔ کوئی سزا تھی جسے ان دونوں بہن بھائی نے جھیلا تھا۔ ایسے میں چچا کے محلے میں رہنے والا بابر نہ جانے کیسے اس کے اس قدر قریب ہوا کہ دن کا بیشتر وقت وہ وہیں صرف کرنے لگا۔ ویسے بھی بابر کے گھر میں تھا ہی کون! دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں شادی شدہ تھیں۔ بابر ان سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ گھر میں ماں، باپ اور دادا تھے۔ اس لیے دونوں کو بھرپور وقت میسر رہتا ایک دوسرے کی سنگت میں گزارنے کے لیے۔

دو ماہ تو رومان کو چچا نے اسکول ہی داخل نہیں کروایا تھا۔ پھر بابر کے دادا نے ہی زور دیا تو انہیں ماننی پڑی۔ وہ بزرگ تھے اور پرانے محلے دار بھی لہٰذا چچا ان کی عزت کرتے تھے۔ اس طرح رومان اور بابر ایک ہی اسکول اور کلاس میں رہے۔ اور اس امر نے دونوں کی دوستی کو مزید مضبوط کیا۔ زینیا کو بمشکل میٹرک کرنے کے بعد چچی نے گھر بٹھالیا، رشتے والی مائی کو رشتے کے لیے کہہ دیا گیا۔ اور جو پہلا رشتہ وہ لائی "اسی کو ہاں کہہ دیا گیا" لڑکا موٹر مکینک تھا۔ واجبی سا کماتا تھا گھر تک اپنا نہیں تھا۔ رومان صبر کا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ ابھی تو سولہویں میں لگا تھا۔ سب کی نظر میں ایک بچہ ہی تھا۔

اب یہ زینیا کی قسمت کہ شادی کے چھ ہفتے بعد ہی اس کے میاں توقیر کا جیک لگا اور وہ قطر چلا گیا۔ شادی کو سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ دھن برسنے لگا۔ ساس سسر نے زینیا کو سر آنکھوں پر بٹھالیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ خود بھی میاں کے پاس قطر شفٹ ہو گئی اور آج تک وہیں تھی۔ تین بیٹوں کے بعد تو اس کی زندگی مصروف تر ہو گئی۔ اس نے بہتیری کوشش کی کہ رومان کو بھی قطر بلالے مگر وہ کبھی نہیں مانا۔ وہ بابر کو کسی قیمت خود سے دور کرنے پر تیار نہیں تھا۔ مگر اتنا ہوا کہ اس کی خالی جیب بھری رہنے لگی۔ زینیا ہر ماہ باقاعدگی سے اس کو جیب خرچ بھیجتی۔ جو اتنا ہوتا کہ اس کی پڑھائی کے اخراجات کے علاوہ بھی دیگر کئی چھوٹی موٹی ضروریات پوری ہو جاتیں۔ کتنا عرصہ۔ چچی غم کی تصویر بنی رہی تھیں۔ یہ کوئی کم دکھ تھا کہ زینیا عیش کر رہی تھی بلکہ اس کا بھائی بھی اب چچا کا دست نگر نہیں رہا تھا۔

گزرتا وقت رومان اور بابر کے ہاتھ میں ان کے مستقبل کی کنجی تھما گیا۔ جیسے ہی دونوں کا ایم بی اے مکمل ہوا۔ بابر کے آرمی آفیسر بہنوئی کی سفارش پر دونوں کو ملٹی نیشنل کمپنی میں بہترین نوکری مل گئی۔ مگر انہیں شہر بدر ہونا پڑا۔ رومان کو تو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ آخر اس کا چچا اور ان کے گھر والوں سے تعلق ہی واجبی سا تھا مگر بابر کی امی کو ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ کسی

صورت اکلوتے بیٹے کو نظروں سے دور، دوسرے شہر بھیجنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ اور پھر ہر بار کی طرح ایک بار پھر دادا نے کام دکھایا اور امی کو منایا حالانکہ وہ بضد تھیں کہ بابر شادی کرکے بیوی کو بھی ساتھ لے کر جائے، جو اس کے کھانے وغیرہ کا دھیان کرے گی۔ بابر بے چارے نے سوچ لیا کم از کم وہ خود پہلے اپنی جاب میں سیٹ تو ہولے۔ کچھ کما تو لے۔ وہ گزشتہ تین سال سے منگنی شدہ تھا۔

بڑی مشکل سے امی کو بہلا پھسلا کر ایک ڈیڑھ سال تک کے لیے ٹالا گیا۔ یوں یہ دونوں دوست آنکھوں میں مستقبل کی خوشنما تصویر لیے نئے شہر چلے آئے۔ فوری طور پر رہائش کا بندوبست انہیں خود ہی کرنا تھا۔ دو تین دن تو ایک درمیانے سے ہوٹل میں گزار لیے، پھر ایک کولیگ کی مدد سے متوسط طبقے والے علاقے میں ایک مناسب سا مکان مل گیا۔ تین کمروں کا گھر تھا۔ ساتھ میں اٹیچڈ باتھ اور کچن۔ چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ ان دونوں کی ضرورت کے لحاظ سے انتہائی معقول تھا۔ محلے دار بھی اچھے اور ملنسار تھے۔ ایک دو آنٹیوں نے چھڑے چھانٹ دیکھ کر اچھی سلام دعا بحال کی تھی۔ پتا چلا کہ گھر میں جوان بیٹیاں ہیں۔ ان ہی آنٹیوں کے فیض سے دودھ والا، دھوبی اور صفائی والی تینوں میسر ہو گئے تو مانو بس گھر والیوں کی کمی رہ گئی۔ اور یہ کمی بھی وہ آنٹیاں پوری کرنے کے لیے بخوشی تیار تھیں بس اشارہ ملنے کی دیر تھی۔

ہر روز کسی نہ کسی آنٹی کی سلیقہ مند بیٹی۔ کچھ نہ کچھ نیا ٹرائی کرتی اور سجی سجائی ٹرے ان کے گھر موجود ہوتی۔ دونوں کی موج ہی آئی ہوئی تھی۔ کچھ پکانے کا جھنجھٹ ہی نہیں کرنا پڑتا۔

اس دن غضب کا موسم تھا۔ سارے دن کے چلچلاتے سورج کو دھکا مار کر بادلوں نے پرے کیا اور خوب برسے۔ رومان، بابر کو پکوڑے تلنے پر لگا کر خود چھت پر چلا آیا۔ کچھ دیر بھیگتا رہا۔ تیز برستی بارش جب پھوار میں بدلی تو چھت پر ٹہلتے ٹہلتے سڑک پر جھانکنے کے خیال سے منڈیر پر جا کھڑا ہوا۔ اور یہ کھڑا ہونا ہی غضب ڈھا گیا واللہ!

سورج چھپا تو چاند نکل آیا تھا۔ اور وہ مجسم چاندنی ہی تو تھی۔ سامنے والے گھر کے صحن میں آج شاید کپڑے دھلے تھے جو بروقت اتارے نہیں جاسکے تھے۔ اور اب جب کہ بارش ذرا تھمی تھی تو وہ لڑکی تیزی سے تار سے کپڑے کھینچتی ہلکان ہو رہی تھی۔ مکمل سیاہ لباس میں اپنے چاند سے چہرے کے گرد سیاہ دوپٹا لپیٹے وہ رومان کو کوئی رومانوی کردار ہی لگی۔ اس کا تو ہاتھ بھی دوپٹے میں چھپا تھا۔ ایسی ملفوف دلکشی کس کو نہیں بھاتی۔ سو رومان میاں بھی دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔ یہ تک احساس نہیں رہا کہ وہ ایک نہایت نامناسب حرکت کر رہا ہے۔ یکدم پلٹتے پلٹتے اس لڑکی کا دھیان اس کی طرف گیا۔ جھٹ سے بقیہ چہرہ بھی دوپٹے کی آڑ میں کیا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ جاتے جاتے ایک انتہائی ناگوار نظر اس پر ڈال گئی تھی جس نے اس کے دل میں تاسف پیدا کر دیا۔

"کیا تھا جو خود پر کنٹرول رکھتا۔ پتا نہیں کیا سوچا ہو گا۔ پہلی نظر۔ پہلا چھلا (پھٹکار!) والی بات ہو گئی یہ تو۔"

رات کو بستر پر لیٹ کر قسم کھائی کہ اب دوبارہ اس گھر میں نہیں جھانکے گا۔ مگر صبح ہوتے ہی وہ قسم بھول گیا۔ شام کو چھت پر گیا تو سرہانے کر منڈیر کی جڑ سے ذرا اوپر سے اینٹ نکال دی۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی بڑی "حرکت" کرتا اور بابر کو خبر نہ ہوتی۔ بابر نے خوب لتے لیے۔ بہتیری شرم دلائی مگر جب اسے نہ آئی تو خود بے شرم ہو کر چپکا بیٹھ گیا۔ کچھ بھی تھا وہ جانتا تھا کہ رومان نظرباز قسم کا لڑکا نہیں، نہ ہی لوفرانہ اطوار تھے، سو کچھ تو معاملہ سیریس ہی ہو گا۔ جب ہی وہ اتنا اتاولا ہوا جا رہا تھا۔ لہٰذا ساتھ دیتے ہی بنی۔

پھر تو روز کا قصہ ہو گیا۔ شام ہوتے ہی دونوں چھت پر چلے آتے۔ رومان اپنی "گدی" سنبھالتا اور بابر ساتھ لائی چائے پر سے چسکیاں اڑاتا۔ رومان نے تو کسی نہ کسی بہانے اس لڑکی کے باپ سے بھی سلام دعا بحال کی تھی۔ تین چھوٹے بھائی تھے۔ ایک کالج میں، دو اسکول

میں۔ ان کو بھی ہائے ہیلو کرنا نہیں بھولتا تھا۔ اس لڑکی کے والد صاحب بھی بہت خوب تھے۔ نام تو مسکین رضا تھا مگر بلا کے "خرانٹ" تھے۔ سگریٹ کے شوقین تھے۔ رومان نے دو تین دفعہ اچھے برانڈ کو منہ لگوایا۔ وہ جو پہلے کے۔ ٹو کے سوٹے لگاتے تھے۔ اب فون کرتے اور بڑی مسکین سی آواز میں فرمادیتے۔

"او بیٹا۔! ذرا آتے ہوئے اپنے اسٹینڈرڈ کا سگریٹ لیتے آنا۔"

اور رومان میاں کو ان کا اسٹینڈر گلے پڑ گیا تھا۔ ایک موقعے پر تو رومان نے انہیں اپنا احسان مند کر ہی لیا تھا۔ صفائی کی غرض سے "مین ہول" کے ڈھکن ہٹے ہوئے تھے۔ مسکین رضا مہنگے سگریٹ کا لمبا سا کش لیتے چلے آرہے تھے کہ یکدم خود غائب ہوگئے اور کش فضا میں لہراتا رہ گیا۔ رومان کی گناہ گار آنکھوں نے نظارہ دیکھا تو عش عش کر اٹھا۔ کیا کمال کا کرتب تھا۔!

دو منٹ گزر گئے، جب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بھی دیکھنے سے مسکین رضا نہ دکھائی دیئے تو رومان کو فکر لاحق ہوئی۔ بھاگم بھاگ جائے وقوعہ پر پہنچا تو دیکھا مسکین رضا مین ہول کے لوازمات کے ساتھ مدغم ہوئے پڑے ہیں۔ ایک لمحے کو دل کیا کہ پھوٹ لے۔! مگر دوسرے ہی لمحے اپنے دل کو "فٹے منہ" کہا اور اسے کڑا کر کے مسکین رضا کو آواز دی۔ پھر جس جگہ سے آواز آئی۔ اس کا تعین کر کے، سانس روک کر۔ بڑے عذاب جھیل کر انہیں کھینچ نکالا۔ یہ اور بات کہ شاباشی لینے کے لیے بھی نہیں رکا۔ سیدھا اپنے واش روم میں پہنچ کر شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہوا۔ دو دن بعد جب "مینڈنگ" شاباشی لینے ان سے ملا تو جی چاہا کہ دوبارہ مسکین رضا کو مین ہول میں دھکا دے دے۔ بلکہ اوپر ڈھکن رکھنے کا کام بھی خود ہی کرے۔ فرمانے لگے۔!

"میاں۔! تم نے میرے گٹر میں گرنے کا قصہ کسی سے کہا تو نہیں۔"

"ارے نہیں، نہیں انکل! کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کی کوئی بات کسی سے کیسے کر سکتا ہوں۔" رومان کی سعادت مندی قابل ستائش تھی۔

"او۔ ہو۔!" مسکین رضا کی او ہو میں بہت سے معنی چھپے تھے۔ "بھلا مجھے پتا ہوتا کہ تم میری سوچ جتنے "خبیث" نہیں نکلو گے تو میں پورے محلے کو یہ نہ بتاتا کہ تم مین ہول میں جاگرے تھے اور بس مرنے ہی والے تھے کہ میں نے تمہیں بچالیا۔"

رومان کی آنکھیں صدمے اور حیرت سے پھٹنے کے قریب تھیں کس قدر چالو نکلے تھے "مسکین رضا" صاحب۔!

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ کا پردہ رکھا اور آپ نے مجھے ہی ننگا کر دیا۔"

"ارے کچھ ہوش کے ناخن لو میاں۔! میں بھلا تمہیں کیوں۔ توبہ توبہ۔!"

"میرے کہنے کا مطلب تھا کہ۔" رومان نے سٹپٹا کر کچھ کہنا چاہا۔

"چھوڑو یار مطلب کو۔ بس میں نے جو کہا، حفظ ماتقدم کے طور پر کہا۔ سوچا! اس سے پہلے کہ تم بتادو میں ہی سارے میں مشہور کیے دیتا ہوں۔ اور اب ذرا یہ اپنی "ڈڈو" مارکہ آنکھیں تھوڑی اندر کر لو۔ نیچے گر جائیں گی اور اگر نیچے گر گئیں تو میں ہرگز انہیں اٹھا کر تمہارے "روشن دانوں" میں دوبارہ فٹ نہیں کروں گا۔ چلو شاباش۔! آدھے گھنٹے تک میری بیٹھک میں آجاؤ۔ تمہیں چائے کے ساتھ "سوپر" بسکٹ کھلاتا ہوں۔ اور آتے ہوئے اپنا پسندیدہ برانڈ لے آنا۔ دو سوٹے میں بھی لگاؤں گا۔"

ایک زور دار دھپ اس کے کندھے پر مار کر، مسکین رضا تو نکل لیے، مگر رومان سوچ رہا تھا کہ یہ شخص سسر بن کر کس طرح اس کا جینا حرام کرے گا۔ اس کم بخت دل نے بھی کہاں منہ مارا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا، جیسا ہو گیا تھا۔ وہ مسکین رضا کے گھر سے بہترین ذائقے دار چائے کے کپ کے ساتھ دس روپے والا سوپر بسکٹ کا نمکی پیک کھا کر خاصا "مسپر" ہو کر نکلا تھا۔ کچھ بھی تھا، مسکین رضا صاحب کی کمپنی میں بندہ فریش ہو جاتا تھا۔ وہ بھی ساری کلفت بھول گیا تھا۔

اگلے دن صبح جب وہ اور بابر ناشتے سے فارغ ہو کر آفس جانے کی تیاریوں میں تھے تو محلے کا نائی چلا آیا۔ دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد سارا مدعا کہہ سنایا۔ مسکین رضا نے اپنی بیٹی کا رشتہ بھیجا تھا۔ رومان کے لیے۔ رومان کو تو خوشی کے مارے غش پڑ گئے۔ بابر گرم چائے کے چھینٹے ڈال کر ہوش میں لایا۔ وہ تو دوبارہ بے ہوش ہونا چاہتا تھا مگر ٹل گیا کیونکہ اب کے بابر نے ہاتھ میں جوتا پکڑ رکھا تھا جو یقیناً" اسے سنگھانے کے لیے تھا۔

مسکین رضا نے رومان کو گھر والوں کو بھیجنے کا پیغام بھجوایا تھا۔ بابر کے اصرار کے باوجود رومان چچا اور چچی کو نہیں بلوانا چاہتا تھا۔ قطر فون کر کے زینیا سے این او سی لیا اور بابر کی امی کو بلوا بھیجا۔ وہ بھاگم بھاگ پہنچ گئیں۔ انہیں بھی بے حد خوشی تھی کیونکہ رومان ان کے لیے بیٹے کی طرح ہی تھا۔ جب ہی اس کی دلہن کے لیے نیگ کا سامان ساتھ لائی تھیں۔

چار افراد پر مشتمل یہ ٹولا شام کی چائے پر مسکین رضا کے گھر پہنچ گیا۔ رومان، بابر۔ اس کی امی اور ایک بڑی بہن، مسکین رضا گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ بڑی خوش اخلاقی سے لا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ رومان کو آج وہ قدرے چپ اور الجھے الجھے سے لگے۔ مسکین رضا کی ہی منشا پر وہ خود بھی آج سب کے ہمراہ تھا، کیونکہ مسکین رضا چاہتے تھے کہ رومان بھی ایک نظر لڑکی کو دیکھ لے۔ جسے وہ بار بار چاند کہہ کر پکار رہے تھے۔ رومان کے اندر سرشاری سی پھیل گئی، وہ خود بھی تو ہمیشہ اس لڑکی کو چاند ہی کہا کرتا تھا، نہیں جانتا تھا کہ اس کا نام ہی یہ نکل آئے گا۔ اور وہ سچ میں چاند ہی تو تھی۔ جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو سب کی نظروں میں بے پناہ ستائش تھی۔ آج وہ کاسنی لباس میں غضب ڈھا رہی تھی۔ آج بھی اس نے اپنے چہرے کو ایک سائیڈ سے ڈھک رکھا تھا۔ شرم و حیا کا پیکر اور حسن و دلکشی کی مورتی۔

وہ بیٹھ چکی تو مسکین رضا کی آواز نے سب کا ارتکاز توڑ دیا ورنہ سب کے سب اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ بابر کی امی نے فوراً" چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور بیگ سے انگوٹھی نکال کر اجازت طلب نظروں سے مسکین رضا اور ان کی بیوی کو دیکھا۔ وہ خاتون تو نظر چرا گئیں مگر مسکین رضا بے تاثر لہجے میں بولے۔

"ایک منٹ، بہن جی۔!"

سب کے سب ٹھٹک گئے۔ رومان کو پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ پوچھتا، مسکین رضا اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئے۔

"چاند بیٹی۔!"

چاند بدلی کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ چاند کے چہرے سے پردہ ہٹ گیا۔ سب ہی اپنی جگہ پتھر سے بنے بیٹھے رہ گئے۔ وہ سچ میں چاند ہی تھی۔ خوب صورت، ٹھنڈی روشنی لٹاتا مگر گرہن زدہ چاند۔!

رومان ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور بغیر کچھ بولے، کسی کی طرف نگاہ ڈالے، وہاں سے چلا گیا۔ اس کے پیچھے مجبوراً" باقی سب کو بھی اٹھنا پڑا۔ جاتے ہوئے بابر نے سر جھکائے بیٹھے مسکین رضا کے کندھے پر ہاتھ دھر کے گویا دلاسا دیا تھا۔ ڈرائنگ روم خالی ہو چکا تھا۔ جو وہاں بیٹھے تھے وہ بھی دکھ اور غم کے مارے مردے لگ رہے تھے۔ صرف مدھم سی سسکیوں کی آواز تھی جو سنائی دے رہی تھی۔ مسکین رضا آج سچ میں "مسکین" دکھائی دے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ایک گمبیر خاموشی نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سب ہی یوں ڈھیری ڈھائے بیٹھے تھے جیسے کسی ماتم سے واپسی ہوئی ہو۔ بابر اس سے مسلسل نظر چرائے ہوئے تھا۔

"پاگل! بھلا یہ کیوں شرمندہ ہوتا ہے۔ خوامخواہ میں، میرے لیے اتنی خواری کی۔" رومان نے ایک نظر اس

پروڈالی کر دل میں سوچا تھا۔ دوسری نگاہ بابر کی ای پر پڑی تو ان کے چہرے پر خفگی کی جھلک صاف دکھائی دی۔

"بے چاری آ میرے لیے اتنی دور سے یہاں آئیں اور آگے کتنا بڑا دھوکا ہو گیا۔ سچ میں ماں بن گر گئی تھیں میرے ساتھ۔!"

روہان کے دل کو افسوس کے ساتھ ساتھ ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔ صاف لگ رہا تھا کہ مسکین رضا کے اس دھوکے پر سب ہی کو غصہ ہے اور سب کی ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔ وہ تسلی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور آنٹی کے گھٹنوں کے قریب نیچے بیٹھ گیا۔

"آپ پریشان نہ ہوں آنٹی۔! مجھے معلوم ہے آپ کو صدمہ ہوا ہے۔ آپ اتنی دور سے۔!"

ہاں! مجھے واقعی صدمہ ہوا ہے۔!" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر اس کے گھٹنے پہ دھرے ہاتھ کو پرے جھٹک دیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا بیٹا اس قدر ہلکی سوچ کا ہو گا۔ وہ اس قدر لاابالی ہو گا۔ وہ اس قدر بے حس ہو گا کہ کسی کے بھی جذبات کو روند سکتا ہے۔ مجھے واقعی صدمہ ہوا ہے۔"

آنٹی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ حیرت سی حیرت تھی۔ روہان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اسے کہا گیا ہے۔ آخر اس نے کیا 'کیا' تھا۔ اس نے پلٹ کر بابر کو دیکھا تو بابر نے منہ پھیر لیا۔ بابر کی آپی کی آنکھوں میں بھی بیگانگی تھی۔ اس نے یک دم بے چین ہو کر آنٹی کا ہاتھ تھاما تھا۔

"آنٹی! مجھے بتائیں تو سہی کہ آخر مجھ سے کیا غلطی ہو گئی۔ ایک تو دھوکا بھی ہمارے ساتھ ہوا اور قصوروار بھی مجھ کو ہی ٹھہرایا جا رہا ہے۔ کس کے جذبات کو روندا ہے میں نے۔؟ کب وعدے وعید کیے میں نے اس لڑکی سے۔ اور۔ اور آپ مجھے بتائیے کہ کیا آپ بابر کی شادی ایسی لڑکی سے کر دیتیں۔ بتائیے۔!"

"ہاں۔ کر دیتی۔!" وہ جو جذباتی سا بولا چلے جا رہا تھا' آنٹی کے سرد سے جواب پر چپ کا چپ رہ گیا۔

"ماہم کا ایک ہاتھ ناکارہ ہے روہان۔ اور ماہم میری بہو بننے جا رہی ہے۔"

ایک لہر سی تھی جو روہان کے پورے جسم میں پھری تھی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"اور شاید کبھی نہ کرتی۔ ہر ماں کی طرح حوروں کو شرماتی بہو ہی لے کر آتی' اگر میں نے اپنی بیٹی کا دکھ سہا نہ ہوتا۔ میری اتنی خوب صورت والی عبیرہ کے لیے جس طرح سسک سسک کے میں نے رشتہ لیا تھا۔ یہ بس میں جانتی ہوں اور میرا رب۔ میری سب سے پہلی اولاد تھی۔ مجھے پیاری بھی بہت تھی مگر لوگوں کو نہیں لگتی تھی۔ صرف رنگ ہی تو سانولا تھا۔ نہ کوئی معذوری نہ پھوہڑپن۔ مگر میں نے ناکوں چنے چبائے' اس کے رشتے کے لیے۔ اس تمام عرصے میں اٹھایا جانے والا غم میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اسی لیے جب ماہم کا کار ایکسیڈنٹ میں بایاں ہاتھ مفلوج ہوا۔ اس کی منگنی ٹوٹی' تو میں فوراً" بابر کی بات وہاں ٹھہرا آئی تھی۔ میں نے ماہم کے ماں باپ کو بیٹی کے غم میں راتیں کالی کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ اور آج وہی لڑکی ہے جو مسلسل علاج سے اس قابل ہو چکی ہے کہ گھر کے کتنے کام نمٹاتی پھرتی ہے۔ اور چاند۔ چاند کے چہرے پہ گرہن ہی تو ہے روہان۔! مجھے تو کل ہی وہ بچی بے حد بھائی تھی۔ جو اگر۔"

"کل۔ کل کب؟" روہان نے حیرت سے پوچھا کیونکہ کل ہی تو بابر انہیں جا کر یہاں لایا تھا۔

"ہاں کل۔ کل جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو میں نے بابر کو وہیں کہہ دیا کہ گھر بعد میں چلیں گے پہلے میں اپنی بہو دیکھوں گی۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا وہاں۔ چاند کو دیکھ کر لمحہ بھر کو میں بھی ٹھٹک گئی تھی۔ مسکین رضا ایک طرح سے ہمارے قدموں میں ہی بیٹھ گئے۔ ہم شرمندہ ہوئے جا رہے تھے اور وہ بتاتے جا رہے تھے۔

"جس روز۔ میرے گھر چاند کی پیدائش ہوئی تو سارے میں گویا دھوم مچ گئی تھی۔ بچی اس قدر خوب صورت تھی کہ نظر نہیں ہٹتی تھی اور پھر کچھ ہی دیر میں

گھر کی عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ پھر پتا چلا کہ بچی کے چہرے پر گرہن کا نشان ہے۔ میں جھٹ کمرے میں پہنچا تو بیٹی کا جمال دیکھ کر جی ٹھنڈا ہو گیا مگر جب گود میں لیا تو دل بیٹھتا چلا گیا۔ دائیں گال پر کان کی لو کے قریب سے لے کر نیچے گردن کے کچھ حصے تک سیاہ کالا ابھرا ہوا نشان تھا۔ بے انتہا گوری بچی کے چہرے پر وہ کچھ اور بھی عجیب دکھ رہا تھا۔ چاند کو گرہن لگنا کسے کہتے ہیں' میں نے اس دن جانا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی بیٹی کا نام چاند ہی رکھا کیونکہ اس کے عیب پہ اس کی خوب صورتی نے پردہ ڈال دیا تھا۔ مگر میں غلط فہمی کا شکار تھا۔ پردہ اس کے عیب پہ نہیں ہماری آنکھوں پر پڑا تھا۔ ہمیں نہیں دکھائی پڑتا تھا ورنہ دنیا تو دیکھتی ہی اس داغ کو تھی۔ اور پھر جب رشتوں سے انکار ہونا شروع ہوا تو ہماری نیندیں اڑنے لگیں۔ ایسے میں گھر کے بالکل سامنے دو جوان لڑکوں کی رہائش نے مجھے نئے سرے سے امید بندھائی۔ میں نے جانچ کروائی تو روہان ہی میرے مطلب کا نکلا۔ بابر کی منگنی ہو چکی تھی۔ نہ بھی ہوتی تب بھی میرا جھکاؤ روہان کی طرف ہوتا۔ میں سوچتا تھا کہ اکیلا ہے۔ اچھا ہے' ورنہ جتنے رشتے دار ہوں گے' میری بیٹی کو مشکل میں ڈالیں گے۔ میں نے روہان کا جھکاؤ محسوس ہوتے ہی اسے اپنے سے قریب ہونے کا موقع دیا۔ باپ ہوں۔ بچہ نہیں جو سمجھ نہ پاتا کہ روہان میرے گھر کے پھیرے کیوں لگاتا ہے مگر کیا کرتا بیٹی کا مستقبل داؤ پر لگا تھا۔ اس لیے مجھے داؤ کھیلنا پڑا۔ اور اب بازی تقدیر کے ہاتھ میں ہے۔ میں صرف دعا ہی کر سکتا ہوں۔!"

میں اور بابر تو گویا سکتے میں بیٹھے رہ گئے۔ بابر کی آپی ناجیہ نے بڑے مان سے مسکین رضا کو تسلی دی کہ روہان اس رشتے سے کبھی منع نہیں کرے گا۔ اور میں نے بھی بڑے بھروسے سے اپنے بیٹے کی گارنٹی دی تھی کہ وہ ہرگز ایسا نہیں ہے کیونکہ وہ ہرگز اپنے باپ پر نہیں پڑا۔"

آنٹی کے آخری لفظ کسی برچھی کی مانند اس کے جگر کے پار ہوئے تھے۔ خود بابر بھی بوکھلا گیا تھا' اس نے ماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا کہا مگر وہ نظرانداز کر گئیں اور بدستور سر جھکائے بیٹھے روہان کو گھورتے ہوئے بولیں۔

"مگر۔ میں غلط تھی۔ روہان تم بالکل اپنے باپ پر پڑے ہو۔ اور مجھے اس بات کا افسوس ہمیشہ رہے گا کہ میں تمہیں اپنا بیٹا کہتی تھی۔!"

ان کا جملہ مکمل ہوتے ہی روہان ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ دروازہ لاک ہونے کی آواز صاف سنائی دی۔ بابر نے اس کے پیچھے جانا چاہا مگر ماں نے ہاتھ پکڑ کر منع کر دیا۔ اس وقت وہ روہان کو مکمل تنہائی دینا چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

چیخ کی زوردار آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ تیزی سے بستر چھوڑ کر باہر بھاگا تھا۔ وہی ہر دوسرے روز کا منظر تھا۔ اس کی ماں دائیں ٹانگ کو گھٹنے کے قریب سے زور سے بھینچے تڑپ رہی تھی اور اس کی بہن آنسو بہاتی اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کو وہاں سے دبا رہی تھی جہاں اسے درد ہی نہیں تھا۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر نیچے بیٹھ گیا اور اپنی ماں کو روتا دیکھنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے جس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے بچے نے انتہائی کوفت سے ماں کے بے بس وجود کو دیکھا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہوتی تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کے ساتھ مل کر ماں کو دلاسا دے رہا ہوتا۔ اس کے آنسو پونچھ رہا ہوتا۔ مگر اب اگر اچانک اس کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی۔

اس نے ہمیشہ اپنے باپ کو ماں کے ساتھ لڑتے ہی دیکھا تھا۔ اس کا باپ جتنے گھنٹے بھی گھر پر گزارتا تھا۔ اس کا ہر ہر لمحہ اذیت تھا۔ ایک گھڑی کو بھی وہ خاموش ہوئے بغیر اس کی ماں کو طعنے دیتا تھا۔ بے توقیری کی انتہا تھی جو وہ کرتا تھا۔ اس کی ماں زبان نہیں چلاتی تھی مگر خود کو پٹنے سے بچاتی ضرور تھی۔ پتا نہیں اس کا باپ کیسی مار مارتا تھا کہ اس نے اپنی ماں کو ایک دفعہ پلنگ کے نیچے چھپے دیکھا تھا جب اس کا باپ ٹوٹے وائپر کا

ڈنڈا لے کر اسے مارنے کو تلاشتا پھر رہا تھا۔ اس سارے عرصے میں وہ دونوں بہن بھائی کبھی بھی باپ کا پیار نہیں پا سکے تھے۔ جب کبھی اس کا غصہ بیوی پر اتر نہ پاتا تھا تو وہ بچوں کے پیچھے پڑتا تھا۔ اور ان کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ مار کھا کر سوج جاتا تھا۔ اور پھر رومان کے کچے ذہن نے دھیرے دھیرے اسے یہ باور کرایا کہ اس ساری مصیبت کی وجہ اس کی ماں ہے۔ اسے ماں میں وہ تمام عیب دکھنے لگے جو اس کا باپ گنوایا کرتا تھا۔ اور ان عیبوں کی وجہ سے اسے بھی اپنی ماں سے نفرت آمیز چڑ چڑھ گئی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی ماں کے وجود کو حقارت سے دیکھنے لگا۔

اس کی ماں پیدائشی معذوری کا شکار تھی۔ بقول اس کے باپ کے "عیب دار" تھی۔ اس کی ماں کی داہنی ٹانگ' دوسری سے قدرے چھوٹی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اچھا خاصا لنگڑا کر چلتی تھی اور اس چیز نے اس کے قد پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس کا قد درمیانے سے قدرے چھوٹا تھا۔ وہ اس کے باپ کی بغل تک بمشکل پہنچتی تھی بلکہ شاید وہاں تک بھی نہ تھی۔ اس کا باپ' اس کی ماں کو بونی کمہ کر پکارتا تھا۔

اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کو پسند کر کے شادی کی تھی۔ گھر والوں سے جھگڑا مول لیا تھا۔ کیونکہ اس کی ماں حسین بے حد تھی۔ اگر اس کی ٹانگ بے عیب ہوتی اور قد کچھ بہتر ہوتا تو شاید اس کے باپ جیسی معمولی صورت کے آدمی کو وہ خود انکار کرتی۔ دونوں بچوں کے بعد جیسے ہی ذرا سا وقت سرکا۔ تو اس کے باپ کو احساس ہوا کہ وہ تو اپنے ہمراہ "سالم شرمندگی" لیے پھرتا ہے۔ اسے لوگوں کی سادہ نظر بھی پھبتی کستی محسوس ہوتی۔ دھیرے دھیرے وہ اس احساس کے زیر اثر اپنی بیوی سے بیزار ہوتا چلا گیا۔ ایک دم چھوڑ دینے کی جرات نہ پکڑ سکا جس نے اسے ڈپریشن میں دھکیل دیا۔

اور اسی کیفیت کے زیر اثر جب اس نے ایک دفعہ ہاتھ اٹھایا تو پھر نچا کرنا بھول گیا۔ ایسی ظالمانہ مار مارتا تھا کہ اس کی ماں کئی کئی دن تکور کرتی تھی۔ اپنی نہ جانے کس حیوانی صفت کی تسکین کرتا تھا جو اس عورت کی معذور ٹانگ پر وار کرتا۔ جو چیز ہاتھ لگتی اس کو گھٹنے کے جوڑ پر یا ٹخنے پر دے مارتا۔ اس کی ماں کی چیخیں گونجا کرتی تھیں۔ اور وہ دونوں بہن بھائی بے بسی سے سنا کرتے۔ مگر اب آ کر باپ کی بے مروتی نے جو جذبہ اس کے اندر پروان چڑھایا تھا۔ اس کا سارا بار بھی اس کی ماں کو ہی اٹھانا پڑا۔ جو چڑ اور بے زاری اسے ماں سے محسوس ہوتی تھی' اب اس کا عملی اظہار کرنے میں وہ ذرا بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ دن بھر ستاتا تھا اور ساری رات جگاتا تھا۔ جس گھڑی بھی آنکھ کھلتی یک دم گلا پھاڑ کر رونا شروع کرتا تو روئے چلا جاتا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب ان کا باپ انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ صرف کوئی خبر آجاتی یا پھر ضرورت کے چند نوٹ۔ اس کی ماں نے اسے اپنے ساتھ سلانا شروع کیا تو جیسے ہلکا سا چھینٹا پڑا تھا جس نے اس کے اندر سوئی ماں سے محبت کو جھنجوڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ اور یہ محبت پوری طرح بیدار ہو جاتی جو ایک دن انہیں باپ کی دوسری شادی کی اطلاع نہ مل جاتی۔ اس دن اس نے کھل کر ماں سے نفرت کا اظہار کیا۔

"آپ کی وجہ سے بابا گئے۔ آپ کیوں ہیں ایسی؟ آپ اگر لنگڑی تھیں تو بابا سے شادی کیوں کی۔ آپ کی وجہ سے انہوں نے مجھے بھی کبھی پیار نہیں کیا۔ کبھی گود میں نہیں بٹھایا۔ مجھے نہیں اچھی لگتیں آپ۔ میں بھی چلا جاؤں گا آپ کو چھوڑ کر۔"

راستے میں آئی کرسی' پیڑھی سب ٹھوکر سے اڑا کر وہ باہر نکل گیا۔ صحن میں صبر کے گھونٹ بھرتی ماں اور شدت سے روتی نینا رہ گئیں۔

مگر قدرت کو اس کی ماں پر رحم آیا اور یہ دکھ زیادہ عرصہ اسے جھیلنا نہیں پڑا۔ آنتوں میں رسولی بنی اور رسولی کینسر بن گئی۔ دوا دارو کیا مگر کینسر معمولی بیماری تھوڑی تھی۔ بھاری علاج کے لیے بھاری رقم درکار تھی لہٰذا حکیم بدرالدین کی دی ہوئی پڑیاں کھاتی رہی اور قبر کا فاصلہ مٹاتی رہی۔ صرف اتنا ہوا کہ ماں کی بیماری نے رومان کو اس سے قریب کر دیا۔ یک دم اور

اچانک! جس روز اس کے سوتیلے ماموں نے سفاکانہ انداز میں اس کے گوش گزار کیا۔

"تمہاری ماں مہینے سوا کی مہمان ہے۔ تم دونوں بہن بھائی ابھی سے سوچ لو کہ کہاں ٹھکانا کرنا ہے کیونکہ ہم تو نہیں رکھیں گے۔ اس لیے ماں کے قبر میں جانے سے پہلے ہی بندوبست کر لو۔"

اور ماں کے قبر میں جانے کے خیال نے ہی اس کا دل پھیر دیا۔ گھر آکر ایسا لپٹ کر رویا کہ سنبھالا نہ جاتا تھا۔ اس کے بعد جتنے دن ماں زندہ رہی کسی نے بھی رومان کو ماں کی پٹی سے الگ نہ دیکھا۔ اس کی ماں اس کے طور اطوار دیکھ کر اکثر کہا کرتی تھی کہ۔

"رومان تو بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے۔"

اور وہ فخر سے تن کر گردن مٹکاتا تھا۔ مگر آخری چند گھنٹوں میں جو اس نے اپنی ماں کا ہاتھ تھام کر گزارے تھے۔ اس کی ماں نے اس کا چہرا اپنے سینے پر جھکا لیا تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بڑی یاسیت سے بولی۔

"رومان! میرے بچے' میں نہیں چاہتی کہ تو اپنے باپ کی طرح کا نکلے۔ انسان کو انسان سمجھنا۔ رنگ روپ ہو یا کوئی ہنر' سب کی حقیقت مٹی کی ڈھیری ہے۔ بے عیب صرف رب کی ذات اور پھر اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس لیے کسی کو بھی حقیر جاننے سے پہلے اپنی لنگڑی ماں کو یاد کر لینا جس نے ساری عمر اپنی مجروح ٹانگ پر چھڑیاں کھاتے گزار دی۔ میرے پیچھے کوئی بھی تم کو یہ نہ کہے کہ "رومان تو بالکل اپنے باپ پر پڑا ہے۔" یہ لفظ نہیں کوڑے ہوں گے جو تم میرے مرنے کے بعد میری روح پر برساؤ گے۔ میری بات یاد رکھنا۔ میری بات بھولنا مت۔ یاد رکھنا۔ یاد رکھنا۔!"

☼ ☼ ☼

کسی اندھیری گھاٹی سے اس کا وجود جیسے یک دم روشنی میں آیا تھا۔ اس نے وحشت سے اردگرد دیکھا۔ وہ اپنے ہی کمرے میں تھا۔ شاید وہ سو گیا تھا۔ ہاں! وہ اپنی امی کو یاد کرتے کرتے سو گیا تھا۔ بلکہ وہ دانستہ اپنی امی کے سنگ بتائے وقت کے الجھے گولے کی گرہیں سلجھانے نکلا تھا۔ مگر وہ گرہیں بڑی کچی تھیں' ہاتھوں کی دی ہوئی تھیں' دانتوں سے بھی نہیں کھل پا رہی تھیں۔

آج بابر کی امی نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ یہی بات۔ یہی بات! اس کی ماں نے اسے نصیحت کی تھی اور نادانستہ اس کے ہاتھوں وہی حرکت سرزد ہو چکی تھی۔ اسے اپنی ماں کی روح کلبلاتی محسوس ہوئی۔ شکوہ کناں اور زخمی!

اور یہ تمام زخم اسی کے دیے ہوئے تھے۔ آج ایک اور تازیانہ مری ماں کی نذر کر چکا تھا۔ اس کم فہم کی عقل میں کبھی یہ بات آئی ہی نہ تھی کہ جس بات کا وعدہ اس کی ماں نے اس سے لیا تھا۔ وہ آزمائش کی صورت مجسم اس کے سامنے آکھڑی ہو سکتی تھی۔ اور وہ فیل ہو چکا تھا۔

وہ واقعی اپنے باپ پر پڑا تھا۔ یہ اس نے ثابت کر دکھایا تھا۔ جس اذیت میں اس کی ماں ساری عمر رہی۔ آج اسی اذیت سے وہ بھی کسی کو آشنا کروا آیا تھا۔ حالانکہ اس نے دانستہ اپنے اندر سے ہر وہ بات۔ چاہے وہ صفت کی صورت ہو یا برائی کی۔ ختم کرنے کی لڑکپن سے کوشش کی تھی جو اسے اپنے باپ جیسا ثابت کرے۔ مگر وہ مات کھا گیا۔ اس نے شدید رنج و تاسف کے عالم میں اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔

وہ نڈھال سا کارپٹ پر پڑا تھا۔ سامنے دیوار گیر قد آدم آئینے میں اسے اپنی شکل میں اپنے باپ کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بار بار نظر چراتا رہا۔ تنگ آکر ہاتھ بڑھایا۔ سائیڈ ٹیبل پر پیپر ویٹ دھرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھاما مگر اس سے پہلے کہ آئینے پہ دے مارتا۔ ایک سوچ نے بجلی کی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا ابھرا تھا۔

"او تیری۔ اخبیث! یہ شیشہ ٹوٹ گیا تو تیری ہونے والی بیوی اپنا چاند چہرہ کس میں دیکھے گی۔"

اس نے بے اختیار خود کو لتاڑا تھا۔ جس طرح تپتی بلتی زمین پر پانی کے چند چھینٹے زندگی کی رمق اجاگر

کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح منفی سوچوں کی کال کوٹھڑی میں مثبت انداز فکر کی معمولی سی روشن لکیر اندھیرا چھٹنے کا سبب بن جاتی ہے۔ کوئی ایک لمحہ' کوئی ایک گھڑی جذبات کے منہ زور گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر اسے معمول پر لے آتی ہے!

بس بہت ہوگئی لفاظی۔! سیدھی سیدھی سی کہانی پڑھو آپ۔!

رومان میاں کی ساری شوخیاں اور نخرے ایک طعنے نے ناک کے رستے نکال باہر کیے۔ وہ بڑے جوش و عزم کے تحت۔ شیشے میں دیکھ دیکھ کر' جذبات کی عکاسی کرتے' چہرے کے زاویے بناتا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر زور دار کراہ حلق سے خارج کرتا واپس وہیں ٹک گیا۔ گود میں دھرا پیپر ویٹ کھڑے ہونے پر سیدھا پاؤں کے انگوٹھے پہ مہر محبت ثبت کر گیا۔ دو چار سینسر کے قابل موٹی موٹی گالیاں بک کر انگوٹھے کو سہلا کر دوبارہ کھڑا ہوگیا کیونکہ وقت ضائع کرنے کا بالکل بھی وقت نہیں تھا۔ اسے ابھی آنٹی کے پاس جانا تھا تاکہ وہ جائیں اور مسکین رضا صاحب کو ان کا اصل چولا اوڑھائیں

کیونکہ مسکین رضا خرانٹ ہی بھلے لگتے ہیں۔ "برانڈڈ سوٹ" لگانے والے چرب زبان سے "مسکین رضا۔"

☼ ☼ ☼

وہ بڑی دیر سے مسکرا مسکرا کر تصویریں بنوا رہا تھا۔ مسکرا مسکرا کر تھک گیا تھا۔ اب تو وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اردگرد کھڑے مہمانوں نے اس کے دانتوں کی گنتی بھی کرلی ہوگی۔

آج اس کا نکاح تھا۔ قدرے سادگی سے ہونے والے نکاح میں پورا محلہ شریک تھا۔ بابر کی امی نے صاف کہہ دیا تھا کہ نکاح پر زیادہ تام جھام نہیں ہوگا' وہ اپنے بیٹے کا ولیمہ' اپنے شہر جاکر دھوم دھام سے کریں گی۔ مگر نہ کرتے بھی اتنے مہمان ہوگئے تھے کہ کمرہ چھوٹا پڑ رہا تھا۔

نکاح ہوئے آدھا گھنٹہ بیت گیا تھا مگر اس کا پہلو ابھی بھی خالی تھا۔ جہاں اس کے چاند کو اترنا تھا۔ ہاں محلے کی آنٹیاں باری باری بیٹھتیں اور دانت پیس پیس کر اس کے منہ میں مٹھائی کا سب سے بڑا ٹکڑا ٹھونس دیتیں۔ یقیناً" یہ ان کی بیٹیوں کی دال نہ گلنے کا غصہ تھا۔ اب وہ بھی کیا کرتا' چاند تو ایک ہی ہوتا ہے ناں۔!

یہی سوچتے ہوئے اس نے نگاہ اٹھائی تو نگاہ کو جھکنے کا یارا نہ رہا۔ تمام تر خوب صورتی و رعنائی کے ساتھ وہ سجی سجی چلتی خوشنما چکیلی ڈال کی مانند اس کے برابر میں آکر ٹک گئی۔ آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی' یا رومان کی آنکھوں نے پارس چھولیا تھا کہ آج اس کے چہرے کا بدنما دھبہ بھی اس کی نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ دل میں پھوٹتی مستی دھیرے دھیرے گنگنانے لگی۔

"چلو دلدار چلو' چاند کے پار چلو۔"

اس نے بابر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو اس کے کان میں بولا۔

"چاند کے پار چلو والا گانا لگا دے کر۔"

"بیٹا! چاند کے پار تو "بلیک ہول" ہوتا ہے۔ کیا ادھر لینڈ کرے گا؟" بابر ابھی تک بھولا نہیں تھا۔

"ہاں۔! اپنے چاند کے ہمراہ میں "بلیک ہول" میں بھی کھو سکتا ہوں۔ پیارے۔!"

رومان نے ایک جذب کے عالم میں کہا۔ آنکھیں میچ کر!

"تو دلا رے۔! "مین ہول" وچ چھال کذ مار! کم از کم پتا تو چلے کہ اندر کیا ہے۔"

اس سے پہلے کہ رومان بابر کو مکا کذ مارتا۔ وہ اچھل کر فوراً" ڈیک کے پاس پہنچ گیا۔ کمرے میں حواسوں پہ چھاتے بول گونج اٹھے۔

"چلو دلدار چلو۔ چاند کے پار چلو۔

ہم ہیں تیار' چلو۔!"

اس نے پورے مان اور بھروسے سے پہلو سے لگی چاند کا ہاتھ تھاما۔ اسے کیا ضرورت تھی چاند کے پار جانے کی۔ اس کا چاند تو ہمیشہ کے لیے اس کے آنگن میں اتر آیا تھا۔

چھوٹی نند

مہناز یوسف

وہ اور ہی مائیں ہوتی ہوں گی جو اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی نند کی برائیوں میں ہاں میں ہاں ملاتی ہوں گی' یہاں تو اس کے لیے صرف نصیحت ہی ہوتی۔

"شازیہ! تم ایک فضول سی بات کا ہوا بنا رہی ہو۔ کام نہیں کرتی ہانیہ' تو نہ کرے۔ تمہارا تو گھر ہے' تمہیں تو کرنا ہی ہے۔ تمہارے میاں اور سسر کی وہ لاڈلی ہے۔ گھر کا ماحول خراب نہیں کرو ذرا سی بات کو لے کر۔" یہ کہنے والی اس کی امی تھیں جن کا خیال تھا کہ وہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہے۔

"تو بتاؤ' اتنی سی بات کا ٹینشن لے کر بیٹھی ہیں محترمہ۔ مجھے بتاؤ جب ہانیہ کی شادی ہو جائے گی تو کیا پھر تم پورے گھر کا کام نہیں کروگی؟ جو عورتیں کام چور ہوتی ہیں وہی کام کو ایشو بناتی ہیں۔" یہ اس کی بڑی باجی تھیں' جن کا خیال تھا کہ وہ کام چور ہے' اس لیے اپنی ایک عدد معصوم سی نند کو بٹھا کر نہیں کھلا سکتی۔

اور شازیہ بڑے دل سے ایک ہی دعا مانگنے لگتی۔

"یا اللہ! جلدی سے ہانیہ کی شادی ہو جائے تاکہ سسرال جانے کے بعد اس کی کام چوری کا سب کو پتا چلے گا۔ جب سسرال میں آئے دن فضیحتے ہوں گے تب ہی سب کو یقین آئے گا۔"

شازیہ جب شادی ہو کے اپنے سسرال آئی تو اس کی چھوٹی نند ہانیہ محض دس سال کی تھی۔ ساس کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ سسر صاحب ماشاء اللہ صحت مند و توانا تھے۔ تین افراد کے مختصر سے گھرانے میں اس کی شادی کرتے وقت اس کی امی بہت خوش تھیں کہ ان کے غریب گھر میں ان کی بیٹی کے لیے اتنا اچھا رشتہ آیا جو کہ ساس نندوں کے جھنجٹ سے تقریباً" پاک ہی تھا۔ نند ہانیہ صرف دس سال کی تھی۔

سسرال جاتے ہی شازیہ نے اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھانا شروع کر دیں کہ اس کی امی نے اس کی اچھی تربیت کی تھی۔

شادی کے دو ماہ بعد وہ باورچی خانے میں کام کر رہی تھی کہ گرمی کی شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ سامنے صحن میں کھیلتی ہانیہ کو آواز دے ڈالی۔

"ہانیہ! ایک گلاس پانی لا دو فریج سے نکال کر۔" وہ بول کر دوبارہ روٹیاں پکانے لگی۔

تھوڑی دیر بعد باورچی خانے سے جھانک کر صحن میں دیکھا تو ہانیہ بدستور کھیلنے میں مصروف تھی۔

"لو ہوا اس نے تو سنا ہی نہیں چلو کوئی بات نہیں۔" شازیہ چولہا ہلکا کر کے باہر آئی فریج سے بوتل نکالی، گلاس میں پانی ڈال کر پیا پھر واپس آکر روٹیاں بنانے لگی۔ اس کے بعد اس نے متعدد بار محسوس کیا کہ ہانیہ کو وہ جب بھی کسی کام کا کہتی وہ ان سنی کر دیتی۔ شازیہ کو تو عادت تھی گھر پر بھی چھوٹے بہن بھائیوں سے کتنے ہی چھوٹے موٹے کام کرواتی تھی۔ مثلاً "پانی کی بوتلیں بھروانا" کھانا لگوانے میں مدد کروانا وغیرہ۔ شازیہ نے سوچا چھوٹی ہے اور اسے کام کہنا ہی بند کر دیا۔ پر جب وہ بڑی ہو گئی تب بھی اس کا رویہ یہ ہی رہا۔ اب وہ میٹرک کلاس کی طالبہ تھی سولہویں سال میں تھی۔

"آلو پالک کیوں پکایا، میں نہیں کھاؤں گی مجھے انڈا فرائی کر دیجیے۔ پیاز اور ہری مرچوں والا۔" ہانیہ اسکول سے آکر کھانا دیکھ کر ناک منہ بنانے لگی۔

"پیاز اور ہری مرچ باریک باریک کاٹیے گا آپ بہت موٹی کاٹتی ہیں۔" شازیہ کو تو ہانیہ کی بات پر آگ ہی لگ گئی۔ پر کچھ بولی نہیں غصہ تو بہت آیا۔ کیونکہ وہ دوبارہ ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ بڑی بیٹی ملائکہ پانچ سال کی ہونے والی تھی اس کی طبیعت گری گری رہتی تھی۔ پھر بھی خاموشی سے پیاز اور ہری مرچیں کاٹنے لگی۔

ہانیہ ٹی وی کھول کر دیکھنے لگی اسکول یونیفارم بھی نہیں بدلا اور کیوں بدلے، دھونے والی بھابھی تھیں نا۔ دل میں جلتے بھنتے ہانیہ کے لیے انڈا بنایا۔ ہانیہ نے کھانا کھا کر برتن یوں ہی چھوڑے، بیگ وہیں رکھا رہا اور اپنے کمرے میں سے کپڑے نکال کر نہانے گھس گئی۔ وہ روزانہ کپڑے بدلتی تھی۔ شازیہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے سامان سمیٹنے لگ گئی۔

اس کو ہانیہ پر حیرت ہوتی تھی، وہ کھانا کھا کر جگہ سے برتن بھی اٹھانا گوارہ نہ کرتی تھی اگر ہانیہ کو کبھی وہ کہہ دیتی کہ "ہانیہ دو چار بوتلیں بھر کر فریج میں رکھ دو۔" تو وہ اپنے آپ کو ٹی وی میں اس حد تک مگن ظاہر کرتی گویا سنا ہی نہ ہو، وہ کچن میں کھانا بنا رہی ہوتی ہانیہ کو کہتی کہ فریج میں سے ٹماٹر لا دو تو وہ آرام سے فریج کے پاس سے گزر کر کمرے میں چلی جاتی۔

وہ سوچتی "چلو چھوڑو نہیں کرتی تو کیا ہوا جلنے کا کیا فائدہ۔" وہ سوچتی تو تھی پر اپنے آپ کو جلنے کڑھنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

وہ ہانیہ کے رویے کو کبھی تو بے حسی اور کبھی ڈھٹائی کا نام دیتی۔

پھر وہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی۔ اس کی زچگی کے دنوں میں بھی ہانیہ کا وہ ہی حال تھا مجال ہے جو کوئی کام کر لے۔ اس نے اپنی بڑی باجی کی بیٹی کو بلا لیا، کیونکہ ان کے مالی حالات ماسی رکھنے جیسے نہ تھے۔

ساتویں دن وہ بھی چلی گئی۔ آٹھویں دن سے شازیہ دوبارہ سے اپنے فرائض پورے کرنے لگ گئی۔

"شازیہ، کام کا کیا ہے۔ کام تو ہو ہی جاتا ہے۔ کام کے پیچھے کیا لڑائیاں کرنا۔"

باجی نے کہا تو اس نے ایک نظر ان کی چار مہینے پہلے بیاہی بہو کو اور چھوٹی بیٹی کو کچن میں کام کرتے دیکھا پھر آرام سے بیٹھی اپنی باجی کو دیکھا۔

"ارے ایک ہماری نند تھی، توبہ توبہ کیا گز بھر کی زبان تھی۔۔۔ ایسی منہ بھر بھر کے گالیاں دیتی تھی اور جو اپنے بھائی کو پٹیاں پڑھائی تھی کہ اس کے پیچھے تو تمہارے بہنوئی نے مجھ پر ہاتھ بھی اٹھا دیا تھا۔"

اب باجی کا نند نامہ شروع ہو چکا تھا اور وہ اپنی پندرہ سال پہلے شادی ہو کر چلی جانے والی نند کے وہ وہ جوہر بتا رہی تھیں کہ اپنی خوبیوں کی بنا پر باجی کی نند شیطان کو بھی مات دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ شازیہ نے تو ہانیہ کے بارے میں صرف کام کی شکایت کی تھی، جبکہ باجی کے پاس تو ماشاء اللہ بوریاں بھری رکھی تھیں برائیوں کی، جو کہ خالی ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

"ایسی لڑاکا تو نہیں ہے نا ہانیہ۔" آخر میں باجی بولیں ان کا سانس پھول رہا تھا شاید اپنی نند کی ڈھیروں برائیاں کرنے کی وجہ سے، یا پھر پرانے دن یاد آنے کی وجہ سے۔ بہرحال واقعی ایسی تو نہیں تھی ہانیہ۔ باجی کی نند کے مقابلے میں تو یقیناً "ہانیہ بہت اچھی تھی۔

ان کی کبھی دوبدو لڑائی تو نہیں ہوئی تھی پر اس کی بڑی وجہ بھی شازیہ کی خاموشی ہی تھی، لیکن ان دونوں کے رشتے میں نفرت نہ تھی تو محبت بھی نہ تھی، وجہ وہی تھی ہانیہ کی ڈھٹائی۔

شازیہ کتنی ہی بیمار ہوتی کبھی اس کا چھوٹا بیٹا بیمار ہوتا، پر ہانیہ جوں کی توں رہتی، کسی کام کو ہاتھ نہ لگاتی، اس لیے شازیہ کے دل میں جو تھوڑی بہت جگہ پہلے ہانیہ کے لیے تھی کہ چھوٹی ہے، بچی ہے، وقت کے ساتھ عقل آجائے گی۔ پر اب ہانیہ کے لیے اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا۔

پھر شازیہ نے اپنے شوہر اور سسر سے ہانیہ کے بارے میں بات کی کہ اب وہ بڑی ہو گئی ہے۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام کروانے میں اس کی مدد کیا کرے۔ اس کے بچے چھوٹے ہیں پریشانی ہوتی ہے، لیکن اس کی اس بات سے گھر میں جو طوفان آیا کہ الامان الحفیظ۔

ہانیہ نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ "میری ماں ہوتی تو ایسا نہ ہوتا۔"

سسر صاحب الگ طیش میں "ہانیہ کی صرف ماں مری ہے باپ ابھی بھی زندہ ہے۔"

میاں جی کے تو کیا ہی کہنے "چار کام کرتے تمہارے ہاتھ ٹوٹتے ہیں خبردار جو میری بہن پر ظلم کرنے کی کوشش کی۔" اور اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے کہ آئندہ کبھی ہانیہ کو گھر کے کاموں میں مدد کرنے کی نہیں کہنا۔

ایک دن باجی، شازیہ سے ملنے اس کے گھر آگئیں۔ ہانیہ اتنے پیار سے باجی سے ملی کہ باجی تو واری صدقے جانے لگیں۔ تھوڑی دیر باجی کے پاس بیٹھنے کے بعد ہانیہ کمرے میں پڑھائی کا کہہ کر چلی گئی۔

"بے چاری پڑھائی میں مصروف رہتی ہے کام کیسے کرے۔" باجی کو ہانیہ بہت بے چاری لگتی تھی۔

"جی بہت مصروف رہتی ہے۔ یہ تو اس کا رزلٹ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے۔" شازیہ سے برداشت نہ ہوا۔ بہن میری اور حمایت ہانیہ کی۔

"پڑھائی میں کمزور ہے اس لیے تو زیادہ پڑھنا پڑھتا ہوگا اسے۔ ذہین لڑکیاں تو ایک دفعہ پڑھتی ہیں اور سب یاد ہو جاتا ہے۔" باجی نے عجیب ہی وجہ پیش کی۔

"دیکھو تو کتنے پیار سے ملی مجھ سے۔ ایک میری نند تھی۔ ذرا جو میرے میکے سے کوئی آیا نہیں اور اتنے برے برے منہ بناتی تھی کہ کیا بتاؤں۔"

کیا بتاؤں کہتے کہتے باجی پھر سے بتانا شروع ہو گئیں اور یقیناً "اب اسے بھی ہانیہ اچھی لگنے لگے گی بھئی باجی کی اتنی بری نند کے آگے تو دنیا کی ہر نند ہی اچھی لگے گی۔

ایک دن ہانیہ ناشتا کرنے آئی تو پراٹھا بنا ہوا ملا اسے پر انڈا شازیہ نے نہیں بنایا بلکہ کہہ دیا کہ خود بنا لو۔

نتیجتاً "جب اس نے دوبارہ باورچی خانے میں آکر دیکھا تو ایک انڈا بنانے میں ہانیہ نے ڈھیروں برتن گندے کر دیے تھے اور پورا کچن بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ دوسرے دن شازیہ نے خود ہی ہانیہ کے لیے انڈا بھی بنا دیا۔

جب کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی تو سب کے کپڑے دھوئے ہانیہ کے نہ دھوئے، جب ہانیہ نے کپڑوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہہ دیا کہ لائٹ چلی گئی تو مشین بند کر دی۔ بعد میں دھو دوں گی۔ پھر ایک دو بار اور اس نے ایسا ہی کیا ہانیہ سمجھ گئی پھر اپنے کپڑے خود ہی دھونے لگی، لیکن اب دو تین دن تک ایک ہی سوٹ پہنتی تھی۔

"دیکھ لو تم نہیں دھوتیں تو خود ہی دھو لیتی ہے اپنے کپڑے۔ تین تو سوٹ ہیں صرف۔" اس کے میاں شہباز نے اسے جتایا اور شازیہ نے الگنی پہ سوکھتے تین سوٹ دیکھے۔

جب وہ ہانیہ کے کپڑے دھوتی تھی تو سب سے زیادہ کپڑے الگنی پر ہانیہ کے ہی ہوتے تھے۔ اب بھی

ہانیہ کے پلنگ کی چادر اور تکیوں کے غلاف تو شازیہ ہی دھوتی تھی جو کہ ہر دوسرے دن ہانیہ بدل کر گندے کپڑوں میں رکھ دیتی تھی۔

اسے یہ تو معلوم تھا کہ ظالم بھابھیاں اپنی مظلوم نندوں پر گھر کے کام کروا کروا کے ظلم و ستم کرتی ہیں، لیکن ظالم نندیں مظلوم بھابھیوں پر کام نہ کرکے ظلم کرتی ہیں یہ اسے اب معلوم ہوا تھا۔

"جلدی سے اس کی شادی ہو جائے تو جان چھوٹے۔" لیکن ابھی تو شادی کے آثار ہی نظر نہ آتے تھے۔

بیس سال کی ہو چکی تھی شکل و صورت اچھی تھی، جیسے تیسے بی اے بھی کر ہی لیا تھا تو ہر رشتے میں کیڑے نظر آتے تھے۔

"جب شادی ہوگی نا اور سسرال میں جا کے یہ حرکتیں کرے گی تو پتا چلے گا باپ بھائیوں کو ابھی تو بڑی حمایتیں لیتے ہیں۔"

اب شازیہ اپنی دس سالہ بیٹی ملائکہ سے کتنے ہی چھوٹے موٹے کام کروانے لگی تھی۔ شازیہ کا خیال تھا کہ اس طرح ہانیہ کو کچھ شرمندگی ہوگی اور وہ بھی کچھ کام کرنے لگے گی کہ اتنی سی بچی کام کر رہی ہے تو مجھے بھی کرنا چاہیے۔

"ملائکہ بیٹا! میں برتن دھو رہی ہوں آپ کمرے کی جھاڑو لگا دوگی۔" وہ خاص طور سے ہانیہ کے سامنے کہتی۔

"جی امی ابھی لگاتی ہوں۔" ملائکہ دوڑ کر جھاڑو اٹھا لائی۔

اس نے ایک جتاتی ہوئی نظر ہانیہ پر ڈالی کہ اس پر بھی کچھ اثر ہو اور واقعی ہانیہ پر اثر ہو گیا۔

"ملائکہ! میرے کمرے کی جھاڑو لگا دو۔" ہانیہ بھی ملائکہ کو حکم دینے لگی۔ "جی پھوپھو"

"ملائکہ مجھے پانی لا کر پلا دو۔"

"ابھی لائی پھوپھو!"

"ملائکہ یہ میرے کپڑے ٹب میں رکھ دو۔"

"اچھا پھوپھو۔" اور شازیہ نے واقعی سر تھام لیا۔

پھر معلوم نہیں ہانیہ کے دل میں کیا سمائی وہ ٹی وی پر کھانا پکانے کے چینلز دیکھنے لگی۔ کھانا بنانے کی ترکیبوں والی کتابیں لا لا کر نئی ڈشز بناتی، جب گھر میں ہانیہ کی پسند کی ڈش نہ پکی ہوتی تو وہ گوشت نکال کر کبھی کباب بناتی، کبھی چکن پکاتی۔ وہ اتنی کم چیز بناتی کہ وہ اور اس کے سسر اور شہباز ہی بمشکل کھا پاتے۔ کبھی شازیہ اور اس کے بچوں کے لیے نہ بچتا۔ ہانیہ اور اس کے باپ بھائی خوب تعریفیں کر کرکے کھاتے، شازیہ اور اس کے بچے وہی سالن کھاتے جو گھر میں پکا تھا۔

"اندازہ نہیں ہوا کہ کتنا پکانا ہے۔" ہانیہ کہتی اور شازیہ کچن کا بکھیڑا سمیٹنے اور ڈھیر سارے برتن دھونے میں مصروف ہوتی۔

ہانیہ کے اس نئے شوق سے جہاں شازیہ کا کام بڑھ گیا تھا وہیں گھر کا بجٹ بھی کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا، جبکہ اس کے میاں اور سسر صاحب تو پھولے نہ سماتے۔ "دیکھا ہم کہتے تھیں نا کہ کام نہیں کرتی۔ اب دیکھو کتنا کام کرتی ہے کھانا بھی پکاتی ہے، کپڑے بھی دھوتی ہے، اپنے کمرے کی صفائی بھی کرتی ہے۔" شہباز بڑے فخر سے کہتے وہ خاموش ہی رہتی کہ ہانیہ کے ہاتھ کا پکا اس نے تو کبھی نہ کھایا تھا۔

میاں جی سے بولا کہ اب ہانیہ گھر سنبھالنے لگ گئی ہے اس لیے دو دن کے لیے امی کی طرف جا رہی ہوں، اس نے سوچا کہ اب پتا چلے گا باپ بیٹے کو، تیسرے دن شام کو واپس آئی تو سارا گھر بکھرا ہوا تھا نہ کھانا پکا ہوا اور کچن میں برتنوں کا ڈھیر جمع تھا اور ہانیہ مزے سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

شازیہ آکر باورچی خانے میں گھس گئی۔ کھانا بنانے لگی جب شہباز اور اس کے سسر آئے تو گھر کا حال خراب تھا۔

"یہ گھر کا حال کیا ہو رہا ہے۔ جھاڑو بھی نہیں لگائی تم نے۔" شہباز نے غصہ کیا۔

"میں تو کھانا پکانے لگ گئی آتے ہی، میں دو دن کے لیے کیا گئی گھر کی حالت ہی خراب ہوگئی۔" شازیہ نے شہباز کو جتایا تاکہ اسے بھی شازیہ کی قدر ہو۔

"گھر کی حالت دو دن سے بالکل ٹھیک تھی گھر بھی صاف تھا اور باورچی خانہ بھی۔

کھانا بھی وقت پر مل رہا تھا۔ تم نے آتے ہی گھر تتر بتر کر دیا۔ برتن بھی ڈھیروں جمع کر دیے۔ کھانا بھی ابھی تک نہیں بنایا۔"

"اونہہ بہن کے حمایتی، اپنی بہن کی برائی تھوڑی کریں گے۔" اس کے بعد وہ جب بھی امی کے ہاں جاتی۔ دوپہر کو ہی واپس آجاتی کیونکہ گندا گھر اور برتنوں کا ڈھیر اس کے انتظار میں ہوتے۔

اللہ اللہ کرکے ہانیہ اور اس کے باپ بھائی کو ایک رشتہ سمجھ آ ہی گیا۔

"اب پتا چلے گا جب شادی کے بعد آئے دن لڑائیاں ہوں گی۔" شازیہ سوچ سوچ کر خوش ہوتی۔

شازیہ تیسری بار ماں بننے والی تھی، لیکن ہانیہ کی شادی کی تیاریوں میں آگے آگے تھی کہ اچھا ہے جلدی سے جان چھوٹے۔

پھر ہانیہ شادی ہو کر اپنے سسرال چلی گئی اور وہ اس کے سسرال سے آنے والی شکایتوں کا انتظار کرنے لگی۔ وہ تو ہانیہ کے سسرال نہیں جا سکتی تھی کہ اس کے ڈلیوری کے دن قریب تھے۔ ہانیہ بھی ایک ہی بار آئی اپنے شوہر کے ساتھ کہ اس کے سسرال میں بھی دعوتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔

شازیہ کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی۔ شازیہ اور مصروف ہو گئی اور ہانیہ کے سسرال نہ جا سکی بس اس کے سسرال سے کسی قسم کی شکایت آنے کا انتظار کرتی رہی جو کہ نہیں آئی۔ شہباز اور اس کے سسر سے ہانیہ مستقل رابطے میں رہتی تھی۔ "کیا معلوم کوئی شکایت کی ہو شہباز سے، وہ مجھے تھوڑی بتائیں گے اپنی بہن کی برائی۔" وہ اپنے دل کو تسلی دیتی۔

بالآخر ہانیہ کی شادی کے چھ ماہ بعد وہ خود شہباز اور بچوں کے ساتھ ہانیہ کے سسرال چل دی۔ انہیں دیکھ کر ہانیہ اور اس کی ساس بہت خوش ہوئیں۔ ہانیہ کی ساس بہت خوش مزاج تھیں۔ اس کے دو دیور تھے اور نند جیسی کوئی چیز ہانیہ کے سسرال میں نہ تھی۔ شازیہ والوں کی نسبتاً ہانیہ کے سسرال کے مالی حالات بھی اچھے تھے۔ شازیہ انتظار کرنے لگی کہ کب ہانیہ کی ساس ہانیہ کی برائیاں کرتی ہیں۔

"بھئی ماشاء اللہ بہت سگھڑ ہے ہانیہ۔ آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا۔ کھانا تو بہت ذائقے دار بناتی ہے۔ صفائی ستھرائی میں بھی آگے۔ حالانکہ صبح ماسی آتی ہے صفائی اور برتنوں کے لیے۔ پھر بھی ہانیہ شام کو بھی صفائی کرتی ہے۔ برتن بھی ہاتھ کے ہاتھ دھوتی ہے کچن بھی چمکا کے رکھتی ہے۔"

ہانیہ کی خوش مزاج ساس ہانیہ کی تعریفیں کر رہی تھیں اور شازیہ سوچنے لگی کہ شہباز صحیح کہتے تھے کہ اس کی غیر موجودگی میں ہانیہ بہتر طریقے سے گھر کو سنبھالتی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ بہن کی حمایت میں ایسا کر رہے ہیں۔ ہانیہ جان بوجھ کے اس دن برتنوں کا ڈھیر لگا کر رکھتی تھی اور صفائی بھی جان کے نہیں کرتی تھی۔

وہ حیرت سے کبھی ہانیہ کی ساس کو دیکھتی، کبھی پھرتی سے کھانا لگاتی ہانیہ کو۔ اب گھر جا کے شہباز کی باتیں بھی سننی تھیں۔

"دیکھا کتنی سگھڑ ہے میری بہن، تمہیں تو ہمیشہ میری بہن کی خامیاں ہی نظر آتی تھیں۔ ہانیہ اگر اتنی کام چور ہوتی تو اس کی ساس کیوں اس کی تعریفیں کرتیں۔"

ہانیہ واقعی بہت چالاک تھی اسے سب کام آتے تھے صرف اسے جلانے، تنگ کرنے اور رلانے کے لیے وہ ایسی لاپروائی کا مظاہرہ کرتی تھی۔

اس نے جل کر ہانیہ کو دیکھا، ہانیہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

ایمل رضا

آغوشِ حُب

وہ دلہن کے لباس میں تھی اور بدحواس سی گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی شہرام کے گھر پہنچی تھی۔ اس سے پہلے وہ سینٹرل پارک اور فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں اسے تلاش کرچکی تھی' وہاں نہیں ملا تو اس کے گھر پر آئی تھی۔ یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔ لینڈلیڈی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ملک البانیہ واپس جاچکا ہے۔

بیانکا شہر کی مقبول ترین ڈی جے تھی۔ بظاہر خوش باش نظر آنے والی بیانکا کی روح میں گہرے زخم تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہرام اس کے ہوٹل میں آیا اور ایک اتفاقی حادثے میں زخمی ہوگیا' تو اس کے بازو کی ہڈی میں فریکچر آگیا۔

بیانکا شہرام سے پہلی نظر میں متاثر ہوجاتی ہے۔ وہ اسپتال میں اس کے لیے پھول رکھ کر جاتی ہے۔ شہرام جو محبت میں ناکام ہوکر بری طرح شکستہ ہے۔ اس مہربانی پر چونک جاتا ہے۔

بیانکا نے مختلف گانوں کے ردھم سے ایک میش اپ تیار کیا تھا۔ جوزف کا خیال تھا اس میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ یہ رنگ بیانکا کا اصلی رنگ تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بیانکا کے والد الیاس احمد پاکستان سے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے یہاں محنت کرکے اپنا مقام بنایا پھر لبنان کی حیفہ سے شادی کرلی۔ اب دونوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیانکا' ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔

مکمل ناول

الیاس احمد نے پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بھی امریکا بلالیا تھا۔ الیاس احمد کی اچانک وفات ہوجاتی ہے۔ ان کے گلے پر ایک سرخ لکیر ہوتی ہے۔

الیاس احمد کی وفات کے بعد ان کے بھائی حیفہ اور بیانکا کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام منتقل کردیں۔ ان دونوں کے انکار پر وہ انہیں تہ خانے میں بند کردیتے ہیں۔ بیانکا کا چچازاد احمد میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔ بیانکا کو شک ہے کہ وہ انہیں کھانے میں کچھ غلط دوائیں دے رہا ہے۔

شہرام سیرین کو ٹوٹ کر چاہتا تھا، وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے بعد شہرام پڑھنے کے لیے امریکا چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو سیرین بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شادی، محبت ہر چیز سے منکر ہوجاتی ہے۔ شہرام کو یقین ہوجاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لڑکا ہے۔ وہ اس کا پتا لگا کر اسے مارنے کا تہیہ کرلیا ہے۔

حیفہ اور بیانکا کو اس کے چچاؤں نے تہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔ حیفہ مام کی خراب حالت دیکھ کر بیانکا دستخط کرنے کی ہامی بھرلیتی ہے۔ بیانکا کو نشہ آور دوا کھلا کر یونین آفس لے جا کر جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروالیتے ہیں اور بیانکا اپنے پلان کے مطابق کچھ نہیں کرپاتی۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ حیفہ مام مرچکی ہیں اور ڈیڈ الیاس کی قبر کے برابر میں دفن ہیں۔ ذہنی اذیت بیانکا سے اس کا ذہنی توازن چھین لیتی ہے۔ وہ ایک ماہ کے علاج کے بعد ہوش میں آتی ہے اور سب سے پہلے کینی سے رابطہ کرتی ہے اور اسے ساری روئیداد سناتی ہے۔

سیرین شہرام کو بتادیتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ وہ یہ رشتہ توڑنا چاہتی ہے۔ شہرام کو پتا چلتا ہے کہ "کوئی اور" اس کا اپنا بھائی حسنی ہے۔

بیانکا کینی کے کہنے پر پولیس کی مدد لیتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے چچا کی فیملی وہ گھر بیچ کر کہیں اور چلی گئی ہے۔

بیانکا کے بار بار پوچھنے پر کینی اسے آریز کے بارے میں بتاتی ہے کہ آریز نے اس سے تعلق ختم کردیا ہے اپنے والدین کے کہنے پر کیونکہ بیانکا کا اسٹیٹس اب ان کے برابر نہیں رہا اور پھر کینی کی ہی مدد سے وہ اس کلب کو جوائن کرلیتی ہے D.J (ڈی جے) کے طور پر۔

شہرام سچائی جان لینے کے بعد خودکشی کی کوشش کرتا ہے، لیکن طامیر عین موقع پر پہنچ کر اسے بچالیتا ہے۔ شہرام واپس امریکا آجاتا ہے۔

بیانکا کا میشاپ ریلیز ہوتا ہے لیکن بیانکا کو کامیابی نہیں ملتی۔

تیسری اور آخری قسط

کینٹی اور اس کا باس ایڈون۔ مشہور زمانہ قابل وکیل، یہ دو وہ کڑیاں تھیں جو بیانکا کو اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کرسکتی تھیں۔

ایڈون اٹلی نژاد امریکی تھا۔ دس افراد پر مشتمل اس کا خاندان چالیس سال پہلے اٹلی سے مستقل طور پر امریکہ آکر آباد ہوگیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خاندان امریکہ کے ہی مختلف حصوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اور نیویارک میں بس ایڈون ہی اکیلا رہ گیا۔

سنہری مونچھوں اور اطالوی خدوخال کا حامل ایڈون بچپن سے ہی تنہائی پسند اور کم گو واقع ہوا تھا۔ اس کی عجیب وغریب طبیعت اس کے والدین کے لیے بچپن سے ہی تشویش کا باعث بنی رہی تھی۔ کھلونوں سے کھیلنے کے بجائے ___ اسے ان کے کل پرزے الگ الگ کرکے پرکھنے کا شوق رہا کرتا تھا۔

والدین کی ساری تشویش کسی طور درست بھی ثابت ہوئی تھی۔ وہ خاندان جو پھیلتا پھیلتا امریکہ کے ہی عوام میں رچ بس گیا تھا۔ اس خاندان کی نسل بندی ایڈون پر آکر ہوئی تھی۔

پچپن سال کا ہوجانے اور وکالت میں کامیاب وکیل بن جانے کے باوجود بھی ایڈون ابھی تک قومی اور موسٹ وانٹڈ کنواروں کی فہرست میں سب سے اول نمبر پر شمار ہوتا تھا۔ ایڈون نے کچھ عرصہ سیاست میں بھی شمولیت اختیار کی تھی۔ اور تب ہی وہ میڈیا کی نظروں میں آیا تھا۔ سیاست سے کنارہ کشی کیے ہوئے ایڈون کو بیس سال گزر چکے تھے۔ لیکن میڈیا والے ابھی تک اس سے منسلک خبروں کو چٹ پٹی بنا کر پیش کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

میڈیا والوں کی ان حرکات کی کچھ وجہ خود ایڈون ہی تھا۔ ایڈون کا غیر ضروری اور اوپرا سا مسخراپن خصوصاً" اپنے ابھی تک کنوارے ہونے کا جواب تو وہ اس قدر برجستہ اور ہر بار نئے انداز سے دیا کرتا تھا کہ سننے والوں کو تھیٹر کا مشہور مزاحیہ کردار ہانوچ یاد آجاتا تھا۔

ایک طبقے کا خیال تھا کہ دراصل اسے لڑکیوں میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔ جبکہ بعض کا خیال تھا کہ اپنے مزاح بھرے جوابات کے پیچھے وہ نجانے کس کس غم کو چھپاتا پھرتا ہے۔ اور چند ایک کا خیال تھا کہ بچپن میں ہوئے کار ایکسیڈنٹ نے اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ شادی کرسکے۔

ایڈون نے آج تک ان میں سے کسی بھی بات کا سنجیدگی سے جواب نہیں دیا تھا۔ بیانکا نے اپنے مقدمے کے لیے ایڈون کا انتخاب کیا تھا۔ بہت ساری وجوہات میں سے ایک وجہ تو ایڈون کی شہرت تھی۔ دوسرا کینٹی کا اس کے گھر میڈ کی حیثیت سے کام کرنا۔ ایڈون اپنی تیس سالہ سروس میں آج تک کوئی مقدمہ نہیں ہارا تھا۔ ججز اس کے بہترین دوست تھے اور پولیس اس کا عملہ۔ اس کی کامیابی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس نے آج تک کوئی ایسا کیس نہ لڑا تھا جس میں وہ کسی مجرم کے تحفظ کی حمایت کرے۔

ان تمام باتوں کے باعث بیانکا کی نظر انتخاب اس پر آکر کہیں اور نہ ٹک سکی تھی۔ دوسرا جو چھوٹے بڑے دوسرے وکیلوں سے اس نے بات کی تھی تو ان میں سے آدھے تو بیانکا کا مقدمہ لڑنے سے سرے سے انکاری تھے اور باقی آدھوں سے بیانکا خود مطمئن نہیں تھی۔

بیانکا کا خیال تھا کہ شاید کینٹی کی رہنمائی اور طرف داری حاصل کرکے وہ اپنے مقدمے پر ہونے والے اخراجات میں کمی کروالے گی۔ مگر یہ بیانکا کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ ایڈون اپنے اصولوں کا اپنے کنوارے پن کی طرح پکا تھا اور کسی بھی شخص کے لیے وہ اپنی فیس میں سے ایک پینی بھی کم کرنے کا روادار نہ ہوتا تھا۔ بیانکا کو مایوسی ہوئی تھی اور بڑے دنوں وہ مایوس ہی رہی تھی۔

وہ اپارٹمنٹ سمیت ہر چیز بیچ دیتی اگر اسے اپنے دربدر ہوجانے کا خوف لاحق نہ ہوتا۔ دوسرا ایڈون کی فیس ان پیسوں کے ذریعے بھی پوری نہ ہونے والی تھی۔ بیانکا نے اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی میشاپ پر اجاڑ دیے تھے۔

اب اس کے پاس ایک ہی طریقہ بچا تھا۔

یہ تیر اگرچہ اندھیرے میں چلنا تھا، لیکن آزمانے میں حرج ہی کیا تھا۔ اندھیروں سے بے خوف ہوئے اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ اپنی انگلیوں کا جادو وہ دیکھ چکی تھی۔ جو سب کو دیوانہ کردیتا تھا۔ اب اسے اپنے حسن کا جادو جگانا تھا، وہ اس میں کتنی طاق تھی اسے یہ دیکھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بیانکا! کیا تم رولنگ ڈم نامی جگہ کو جانتی ہو؟"

فون پر اسے شہرام کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دی تھی۔ شہرام نے صبح کے دس بجے اسے کال کی تھی اور بیانکا رات کی لیٹ نائٹ ڈیوٹی کے بعد صبح اتنی جلدی اٹھنے کی عادی نہیں تھی۔ اس کے سوکر اٹھنے کا وقت دن کے شام کی طرف گامزن ہونے کا وقت ہوتا تھا۔ کسل مندی سے آنکھیں کھول کر اس نے شہرام کی کال تو اٹینڈ کرلی تھی، لیکن وہ

اپنے اعصاب نہیں حاضر کرپائی تھی۔

"کیا۔ ہشہرام۔ کون سی جگہ؟"

"وال اسٹریٹ سے منسلک ایک سڑک ہے۔ لیستھو یارڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"نام سن رکھا ہے میں نے۔ لیکن کبھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیوں خیریت؟" وہ مکمل طور پر جاگنے کے لیے مزید کوششیں کرتے ہوئے بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"وہاں ایک قابل نام کا ریسٹورنٹ ہے بیانکا۔ تم نے جو ٹریٹ آج مجھ سے لینی ہے وہ تم اسی ریسٹورنٹ میں لے لو۔"

"اسی ریسٹورنٹ میں کیوں؟" وہ اب مکمل جاگ گئی تھی۔

"اس بات کا فیصلہ تو میں کروں گی کہ میں نے اپنی ٹریٹ کہاں لینی ہے۔" وہ کسی قدر شوخی سے گویا ہوئی تھی۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بیانکا! کہ تمہیں وہاں آکر مایوسی نہیں ہوگی۔ بلکہ تم میرے ٹیسٹ کی داد دو گی۔ اس ریسٹورنٹ کا باربی کیو بہت زبردست ہے۔"

"تو تم وہاں جا بھی چکے ہو۔"

"ہاں۔ کل رات۔ ایک خوشبو مجھے وہاں لے گئی تھی۔"

"کیا خاص بات ہے اس ریسٹورنٹ میں۔"

"مجھے نہیں پتہ۔ دراصل میں جان ہی نہیں سکا۔ شاید تم کچھ اندازہ لگا سکو۔ مجھے تو وہاں کے شیف نے صرف ایک ہی بات بتائی ہے کہ وہ باربی کیو کرتے وقت میپل کی سوکھی لکڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن صرف ایک درخت کی لکڑی کی وجہ سے تو ایسی خوشبو، ایسا ذائقہ پیدا نہیں ہو سکتا نا؟ جیسا۔ جیسا۔؟"

بیانکا چونکی تھی۔ شہرام کی آواز میں کچھ تھا۔ بھیگا ہوا سا۔ بھگو دینے والا سا۔

"شہرام! تم ٹھیک تو ہو۔؟"

"یہاں کے کباب بالکل نتھو یہ لال کے بنائے کبابوں کی طرح ہوتے ہیں۔ پیار اور لگن سے بنائے ہوئے۔" اس کا سوال نظر انداز کر کے وہ بولتا چلا گیا تھا۔

بیانکا چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکی تھی۔ اپنے دوست کے غمگین لہجے پر اسے دکھ ہوا تھا۔

"تو کیا تم آؤ گی بیانکا؟" اس کے بولنے کا انتظار کرتے کرتے وہ خود ہی پوچھنے لگا تھا۔

"ہاں۔ شہرام!" بیانکا انکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے، آج شام پانچ بجے تک یہاں پہنچ جانا۔؟"

"ٹھیک ہے۔" فون بند کر کے وہ اٹھی تھی۔ اور غسل خانے میں چلی گئی تھی۔

شہرام کی طرف سے دی جانے والی یہ دعوت اس دن سے التوا پر چلی آرہی تھی۔ جس دن شہرام نے ایک معمولی سے اسٹور میں جاب شروع کی تھی، جاب شروع کر کے اس نے گویا اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ زندگی کی طرف دوبارہ واپس آگیا ہے۔ بیانکا کو شہرام کی ذات کی یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ بقول شہرام کے اس زندگی کی طرف لانے والی کوئی اور نہیں خود بیانکا تھی۔ جوان دنوں خود کو بمشکل زندوں میں شمار کرتی تھی۔

کچھ دن میش اپ کی تیاری، ریلیزنگ، بعد کی امیدوں اور پھر میش اپ کے ایک طرح فلاپ ہو جانے کی نذر ہو گئے تھے۔ اب بڑے دنوں بعد اندر ہی اندر نئے فیصلے کر لینے اور نئی امیدوں کے سہارے وہ ذرا سنبھلی تھی تو اس نے ٹریٹ کے لیے آج کا دن منتخب کیا تھا۔

اس ٹریٹ پر جانے کی تیاری خود بخود ہی ہوتی چلی گئی تھی۔

چند ہفتے پہلے کی گئی خریداری میں سے ایک خوب صورت ڈریس بیانکا نے ابھی تک صرف اس لیے نہیں پہنا تھا کہ وہ اسے شہرام کے ساتھ دعوت والے دن پہن کر جانا چاہتی تھی۔ جوتے اور جیولری کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ ہوا تھا۔ پارلر سے وہ اپنے بالوں کو کٹوانے کا کام بھی بڑے دنوں سے ٹال رہی تھی۔ سو اس کام کو پورا کرنے کا فیصلہ بھی اس نے آج ہی کر لیا۔

پارلر سے واپسی پر اسے کافی دیر ہو گئی تھی۔ سارے آسمان پر سواتی مٹی کا خاکستری رنگ چھا گیا تھا۔ سرد ہواؤں میں ڈوبا ہوا سورج چاند کی طرح ٹھنڈا سرد اور پگھلے ہوئے سونے کی مانند سیال آمیز تھا۔

پھولوں کی کیاریوں کے درمیان بنی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے وہ اپنے اندر ایک نیا جوش نیا ولولہ محسوس کر رہی تھی۔ نجانے کیوں۔ حالانکہ آج کا دن بھی تو باقی دنوں کی طرح کا ہی تھا۔

کسی انجانی خوشی میں گم وہ اپنا ہی میش اپ گنگناتے ہوئے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تھی۔ اب اس کے پاس تیاری کے لیے بہت کم وقت بچا تھا۔ شہرام نے اسے پانچ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ اور اس ساری تیاری میں چار بج چکے تھے۔

"تم ریسٹورنٹ کا پتا نوٹ کر لو بیانکا۔ کہیں تمہیں وہاں پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔"

سیل فون کان اور کندھے کے درمیان جکڑ کر اس نے پتا نوٹ کیا تھا۔ اور پھر اس کاغذ کو نوٹ پیڈ سے علیحدہ کر کے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا، باہر شام، رات کے قالب میں ڈھلنے لگی تھی۔ کھڑکی سے نظر آتی Fuchsia کی بیل کے بڑے پتے کاہی رنگ میں رنگنے لگے تھے۔ جب وہ مکمل تیار ہوتی تھی۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ لاک کرتے وقت اسے خیال آیا کہ وہ اپنا ہینڈ بیگ تو اندر ہی بھول گئی ہے۔ لاک دوبارہ کھول کر وہ واپس اندر آئی تھی۔

وہ اسے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہوا نظر آیا تھا۔

ایک اچٹتی سی نگاہ ہینڈ بیگ کو اٹھاتے وقت اس نے دوبارہ اپنے سراپے پر ڈالی تھی۔ اور اپنی ہی تعریف پر کی گئی اپنے ہی اوپر فدا ہو جانے والی معصومانہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تھی۔

تیار ہو کر تو میں واقعی سالے جریم سے کم خوب صورت نہیں لگتی۔

اس نے ہفتہ بھر پہلے خود سے بولا گیا فقرہ دوبارہ ذہن نشین کیا تھا۔ پھر اپنی ہی سوچ پر بھرپور انداز میں ہنستے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

اور تب ہی۔ تب ہی۔ اچانک ایک دم سے اس نے اپنے دل کو گھبراہٹ کے پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ پل بھر میں اس کی ہنستی چال میں واضح جھول آگیا تھا۔ اور کسی انجانی پریشانی کے باعث کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے اس کی دونوں بھنوؤں میں گرہ سے پڑ گئے تھے۔

"میں آج اتنی تیار کیوں ہو گئی ہوں؟"

اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہا تھا۔

"خود کے لیے۔" کانپتے وجود کے ساتھ اس نے خود کو جواب دیا تھا۔

"نہیں۔ شہرام کے لیے۔" اندر کے بت طناز کی صدائے کوہ بڑی دور تک پھیلی تھی۔

"وہ تو صرف میرا اچھا دوست ہے۔"

اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ یہ جھوٹ تھا۔ کہیں اندر ہی اندر وہ جانتی تھی۔

"اگر وہ ایسا نہ سمجھتا ہو تو۔؟" بت طناز قلب کے سارے امراض کا ماہر تھا۔

"تو پھر یہ سراسر اس کا قصور ہے۔ میری منزل کچھ اور ہے۔ مجھے اپنے مام ڈیڈ کو دوبارہ بچانا ہے۔ ان کے قاتلوں سے ان کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی اور راستے پر نہیں چل سکتی۔ خواہ وہ راستہ ان گنت رنگوں اور خوشبوؤں والے پھولوں سے ہی کیوں نہ سجا ہو۔"

"نادانی میں کسی سے روا رکھے گئے ظلم کی سزا ابھی ایسی نہیں ہوتی جیسے سوچ سمجھ کر کیے گئے گناہوں کی سزا۔ پھر تمہارا احساب کتاب تو بے باق ہے؟"

"میں نے آج تک اس سے کوئی ایسی بات نہیں

کی۔ نہ اپنے کسی رویے سے ظاہر کی۔"

"اور اگر وہ آج کچھ کہہ دے تو۔ کوئی رویہ ظاہر کردے تو۔ پر امید ہو کر۔ تمہاری باتوں نے اور تم نے اسے مایوسی سے نکالا ہے۔ تمہارا وجود اس کے لیے آس ہے۔ اور انسان آس کو کبھی ختم ہونے نہیں دینا چاہتا۔ یہاں تو وہ درخت بھی نہیں جہاں تخجر مار کروہ اپنا غصہ نکال لے۔"

پرے ہوتے ہوئے وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ کمرے کی خاموش فضا پلک جھپکتے میں قبر کی طرح ہیبت ناک ہو چکی تھی۔ بیانکا کا سانس اکھڑنے لگا تھا۔ اور اس میں اتنی طاقت ہی کہاں بچی تھی کہ وہ اٹھ کر کھڑکی ہی کھول سکے۔

"شہرام!" نکار میں دل کی دھڑکن قید تھی۔ اور یہ قید تہہ خانے کی تھی۔ جس سے اسے ابھی تک رہائی نہ مل سکی تھی۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے ہی بیانکا نے بہت سارے فیصلے کرلیے۔

ہینڈ بیگ سے فون نکال کر اس نے شہرام کو کال کی تھی۔

"بیانکا! کیا تمہیں جگہ ڈھونڈنے میں مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔ شہرام۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔

"تو پھر کیا تم ابھی گھر سے ہی نہیں نکلی ہو۔"

"میں آج نہیں آسکتی شہرام۔" بڑے کڑے لہجے میں اس نے کہا تھا۔

"خیریت۔ اچانک کیا ہوا؟"

"معذرت نہیں کروں گی کہ کہتے ہیں کہ اچھے دوستوں میں لفظ معذرت نہیں ہوتا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا پڑ رہا ہے۔ میں ایک دو دن کافی مصروف رہوں گی۔ میرا سیل فون بھی آف رہے گا۔ میں واپس آکر تمہیں خود ہی فون کرلوں گی۔ خدا حافظ۔"

بنا شہرام کی بات سنے اس نے فون بند کردیا تھا۔ اور خود کو دو دن تک کمرے میں بند رکھنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔ اس کے اعصاب ابھی سے تھکنے لگے تھے۔ نہ جانے اس نے صحیح کیا تھا یا غلط۔ وہ اس بات کی کشمکش میں مبتلا نہیں تھی۔ نہ جانے آگے کچھ صحیح ہوگا بھی کہ نہیں۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔

دور بہت دور۔ خالی ریسٹورنٹ کی ٹیبل پر منتظر شہرام فون کان سے لگائے جیسے وہیں آہنی ساخت میں بدل گیا تھا۔ اس آہنی مجسمے میں سے دل کے بڑی زور زور سے دھڑکنے کی آواز آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼
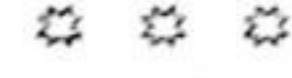
مسٹر ایڈون کو متاثر کرنے اور اپنے غیر معمولی تعارف کے لیے بیانکا کے پاس کافی ضروری اور اہم مواد اکٹھا ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی ذات کی ایک نئی دنیا کھوج چکی تھی اور اب مکمل طور پر اس دنیا میں گم تھی۔ اب وہ مسٹر ایڈون سے اپنی ایک الگ اور مضبوط شخصیت کی حیثیت سے ملنے والی تھی۔

اس نے ٹوٹل پانچ ڈراموں کا انتخاب کیا تھا۔

دو برازیلین ڈرامے تھے۔ el clon (زہر) اور Dark circule (تاریک دائرہ)

دو اسپینش ڈرامے Santa Diabla (شیطان مقدس) اور Prohabita Pasion (ممنوعہ جنون)

اور ایک امریکی ڈرامہ Revenge (انتقام) تھا۔

شہرام کو پانچوں ڈراموں کے نام اور ان کے مطلب جان کر تھوڑا عجیب لگا تھا۔ پانچوں ناموں میں اذیت، انتقام اور منفی جذبے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ خاص کر بیانکا کے منہ سے Revenge ڈرامے کا نام سن کر شہرام کو ہلکا سا شاک لگا تھا۔ یہ وہ ڈرامہ تھا جس میں ہیروئن اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے آتی ہے۔ شہرام کو تھوڑا دکھ بھی ہوا تھا۔ بیانکا اس فیز سے باہر نہیں نکل پا رہی تھی۔ لیکن پھر اسے اپنے پچھلے دن یاد کرکے محسوس ہوا کہ اس طرح سوچنے میں وہ کس قدر غلط ہے۔ بیانکا تو پھر ظاہری طور پر نارمل حالت میں

تھی، جبکہ وہ تو تقریباً" تقریباً" پاگل ہی ہوچکا تھا۔ اپنے اور بیانکا کے حالات وہ واقعات کا موازنہ کرنے کے بعد شہرام نے دل ہی دل میں بیانکا کی ہمت کو داد دی تھی۔ شہرام کا صرف دل ٹوٹا تھا، جبکہ بیانکا تو اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بالکل ہی تباہ ہو چکی تھی۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر ایک اور میش اپ تیار کروانے کا مشورہ شہرام کا ہی تھا۔ بیانکا کو یہ خیال اچھا لگا تھا۔ آج تک اس طرح سے نہیں سوچا گیا تھا۔ وہ کچھ ایسا ہی انوکھا کرنا چاہتی تھی۔ شہرام نے یہ بیانکا پر چھوڑ دیا کہ وہ امریکا میں ریلیز ہوچکے ملکی یا غیر ملکی ڈراموں کی لسٹ اپنی پسند سے تیار کرے کہ وہ میوزک کے بارے میں اس سے زیادہ جانتی ہے۔

بیانکا نے دن رات لگا کر ایک ہفتے کے اندر اندر یہ کام کیا تھا۔ اس نے پانچ مشہور ڈراموں کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک سن کر نہیں بلکہ ان کے ناموں کی وجہ سے۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے نام اس کے دل کو بھائے تھے، ویسے ہی ٹریک بھی اس کے من چاہے نکلے تھے۔ جو کچھ بھی تھا ان پانچ ڈراموں کے مجموعی ساؤنڈ ٹریک کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ صرف سانتا ڈی آبلہ کے ہی تیس آفیشل ساؤنڈ ٹریک تھے اور یہ تمام کے تمام ڈرامے امریکا میں بہت پسند بھی کیے گئے تھے۔

اس نے میش اپ میں سربراہی کرسی پر سانتا ڈی آبلہ کو بٹھایا تھا۔ کیونکہ یہ وہ ڈرامہ تھا جس نے امریکا میں اپنی شہرت کے جھنڈے پچھلے سارے ہسپانوی ڈراموں کی نسبت سب سے زیادہ اونچائی پر گاڑے تھے۔

اس نے بینک سے لون لیا تھا۔ اب وہ قرض دار بھی ہوچکی تھی۔ لیکن اس نے سارے مراحل بڑے سوچ سمجھ کر طے کیے تھے۔ وہ خود کو بدلنے جارہی تھی۔

اپنے جہاں کو تبدیل کرنے کا تہیہ کرچکی تھی اور نئے عالم، نئی دنیا میں جانے کے لیے جو دروازہ کھلا تھا۔ وہ کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے والوں کے لیے نہیں بنا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس بار کے میش اپ کی ویڈیو میں وہ خود کام کرے گی۔

اسے اپنی ذات کا الگ تعارف بنانا تھا اور یہ کام اس کے لیے اب اتنا مشکل بھی نہیں رہا تھا۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر میش اپ بنانے کا یہ طریقہ اگرچہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن بیانکا نے اپنے میش اپ کو کچھ اس طرح متعارف کروایا تھا کہ یہ ایک نئے اور نہ ختم ہونے والے ارتقا کی پہلی سیڑھی ضرور ثابت ہونے والا تھا۔

مختلف فیشن انڈسٹری کے میگزین اور اخبارات کے تھرڈ پیج پر اس کے میش اپ کے تذکرے پڑھنے کو ملنے تھے۔ چند اہم اور غیر اہم تجزیہ نگاروں نے اس نئے عمل کو پیچھے سے سراہا تھا۔ سارے حالات مکمل طور پر بیانکا کے حق میں گئے تھے۔ اس بار کی خوش بختی سے نہ صرف اسے فائدہ ہوا تھا بلکہ خوشی بھی حاصل ہوئی تھی۔

ایک اچھی خاصی رقم چھوٹے بڑے حصوں کی صورت میں اس کے ہاتھ آنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنی کامیابی کا کریڈٹ کس چیز کو دے۔ کیا واقعی میش اپ اعلا تیار ہوا تھا یا اس کی کامیابی کے سارے اسباب اس کے بدلے ہوئے روپ نے پیدا کیے تھے۔ ایسی سوچوں کو وہ یہ کہہ کر

اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہی ہے' اپنے مام ڈیڈ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے ہی کر رہی ہے۔

اس کا بینک کا لون بھی ادا ہو گیا تھا اور اس کی سیونگ بھی دن بدن بڑھنے لگی تھی۔

لیکن یہ ساری رقم ایڈون کو راضی کرنے کے لیے بہت کم تھی۔ درحقیقت اس کی کھو چکی پراپرٹی میں سے اگر ایڈون کی فیس ادا ہوتی تو باقی کا جو کچھ بیانکا کے پاس رہ جاتا تھا اتنا تو تقریباً" اس وقت بھی اس کے پاس تھا۔

لیکن اصل مسئلہ صرف پراپرٹی کی واپسی کا ہی تو نہیں تھا۔ اس کے دل کا قرار ان پانچوں کے انجام سے جڑا تھا۔ وہ ان پانچوں کو اس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی جو انسانی قدموں سے بہت بہت نیچے ہوتا ہے۔ وہ انہیں روند ڈالنا چاہتی تھی۔

انہوں نے حیضہ مام اور بیانکا کو قید کرنے کے لیے ہر طرح کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس طرح کہ بیانکا لاکھ کوششوں کے باوجود بھی سب کچھ ہاتھ میں لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اب بیانکا کی باری تھی۔ اسے کہیں ذرا سی بھی غلطی نہیں کرنی تھی۔ کوتاہی کی گنجائش نہیں تھی۔ ورنہ وہ لوگ پھر بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکتے تھے اور بیانکا ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیانکا کو اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اس پر اس قدر مہربان بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا کی روح جیسے اس کی رفیق بن گئی تھی اور سارے عوامل مل کر ہر مشکل کام کو اس کے لیے آسان کرنے لگے تھے۔

وہ ایک فیشن میگزین تھا۔ جسے ایڈون کے نفیس ہاتھوں نے کافی دیر سے تھام رکھا تھا۔

ڈراموں کے ساؤنڈ ٹریک کو لے کر بنائے گئے میش اپ کے اوپر لکھا گیا بمشکل ایک صفحے کا آرٹیکل پڑھنے میں اسے صرف چند منٹ ہی لگے تھے۔ لیکن اس آرٹیکل کے درمیان میں جو دو تصویریں دی گئی تھیں وہ تصویریں گھنٹہ بھر گزر جانے کے باوجود بھی اس سے پڑھی نہیں جا رہی تھی۔

ایک تصویر میں بیانکا نے ہیڈ فون لگا رکھا تھا اور Pioneer پر جھکی تھی۔ دوسری تصویر پروفائل اسٹائل میں لی گئی تھی۔

ایڈون کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ مشرق وسطیٰ کے حسن کی انھان اپنے اندر کیسی قیامت خیز رمزیں رکھتی ہے اور گھنٹے بھر بعد میگزین کو سائیڈ ٹیبل پر رکھنے تک ایڈون پر یہ احساس پوری طرح سے غالب آچکا تھا کہ اس نے ساری زندگی بغیر کسی وجہ کے تنہائی میں کیوں گزار دی۔

"کیٹی۔۔۔" اس نے توقف کیا تھا۔

"میڈ کیٹی کو بھیجئے میرے پاس۔" قریب کی ٹیبل پر جوس کا گلاس رکھتی میڈ سے اس نے بڑے پرسوچ انداز سے کہا تھا۔ اس کی یادداشت کمزور ہوتی تو بیانکا سے ہوئی چھ ماہ پہلے کی ملاقات کو یاد کرنے میں اسے زمانے بیت جاتے۔ لیکن وہ ملک کا مشہور و معروف وکیل ایسے ہی تو نہیں بنا تھا۔

"جی سر۔۔۔ آپ نے بلایا۔"

کیٹی تھوڑی دیر بعد ہی حاضر ہو گئی تھی۔

"تمہاری۔۔۔ ایک دوست تھی بیانکا۔۔۔ جس سے ایک بار ملاقات ہو چکی ہے۔"

"جی سر!" کیٹی کا چہرہ خود بخود ہی روشن ہوا تھا۔

"کیا اس نے اپنا کیس کسی اور وکیل کو دیا تھا؟"

"نہیں سر!"

"تو پھر تم اسے دوبارہ بلاؤ۔۔۔ میرے خیال سے اس کے مسئلے میں میں اس کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

کمال مہارت سے ایڈون نے اپنے تازہ اندرونی جذبات چھپاتے ہوئے سنجیدہ اور ہمیشہ والے بردبار لہجے میں کہا تھا۔

"وہ خود بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے سر۔" خوشی کے باعث کیٹی کی زبان سے پھسلا تھا۔

عین اسی وقت اس جگہ سے میلوں دور اوک بلڈنگ کے نیم اندھیرے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے شہرام نے اپنی گردن میں لٹکتے تعویذ کی لکڑی کو اپنی انگلی کی پوروں سے چھوا تھا۔ مسکراہٹ بھرے مگر بڑے پرسوچ انداز میں۔

"نہیں بیانکا یہ مجھے اس طرح واپس نہیں کرے گی۔ جس طرح سیرین نے کیا تھا۔" شہرام نے خود سے کہا تھا۔

بادل آج بڑے عرصے بعد اسے اجلے اجلے اور دودھیا پانیوں سے بھرے ہوئے نظر آئے تھے۔ وہ پچھلے چھ ماہ سے بیانکا کے ساتھ تھا اور یہ بات اس کے دل نے خود ہی طے کر لی تھی کہ بیانکا بھی اس کے لیے وہ ہی احساسات رکھتی ہے۔ جواب خود اس کے بھی تھے۔

باہر روشن دن میں ست بھرائی چڑیوں کا غول وی کی شکل میں اڑتا اڑتا قریب سے قریب آنے لگا تھا اور جب وہ غول بے انتہا قریب سے آکر گزرا تو شہرام نے دیکھا کہ ان کے پروں پر ان گنت رنگوں والے پنکھ تھے۔ مور کے پنکھوں سے بھی زیادہ لشک دینے والے۔

اس کے کمرے میں موجود مصنوعی اور بوسیدہ پھولوں کی تازہ خوشبو پھیلتے پھیلتے باہر کو لپکنے لگی تھی۔

البانی نژاد معصوم شہرام۔۔۔ محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ایک بار پھر۔۔۔ بیانکا کی محبت میں۔

☼ ☼ ☼
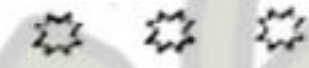
چراغ سے نکلتے دیو کی طرح گاڑھا دھواں آسمان پر چڑھ کر کسی نازنین کے تخیل کی طرح گم ہو جاتا تھا۔ وہ رات قہقہوں سے پیدا ہوئی لگتی تھی۔ بدقسمتی سے جس کے اختتام پر آنسوؤں کا سمندر موجزن تھا۔ بیانکا کبابوں کو ساس میں ڈپ کر کے پوری رغبت سے کھا رہی تھی۔ شہرام نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ مایوس نہیں ہو گی اور اس کے ذوق انتخاب کی داد دے گی۔ آج وہ نہ جانے کتنا کھا چکی تھی۔

بھاپ چھوڑتے کبابوں کو وائٹ یوگرٹ اور چلی سوس کے ساتھ مکمل بے اختیار ہو کر کھاتے ہوئے

شہرام کو وہ آٹھ نو سال کی ایک معصوم بچی لگ رہی تھی جو دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز و بے پروا ہوتی ہے۔

"کیسا لگا سب؟" شہرام نے فخریہ انداز سے پوچھا تھا۔

"فن ٹاسٹک۔۔۔ سوپر۔۔۔"

چٹخارے سے کھاتے ہوئے اس نے انگوٹھے اور انگلی کا گول دائرہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"ارجیر والوں کے نفیس ذوق کو ماننا پڑے گا۔ میں نے اس خوشبو اور ذائقے کے ذریعے آنٹی نتھویہ تک ایک ادھورا سفر مکمل کیا ہے۔"

شہرام کے چہرے کی خوشی پلک جھپکتے میں غائب ہوئی تھی۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ضرور نم ہو گئی تھیں۔ بیانکا جان گئی تھی کہ وہ آنٹی نتھویہ کے نام سے افسردہ ہو گیا ہے۔

"کیا تم اب کبھی البانیہ واپس نہیں جاؤ گے شہرام۔" ٹشو سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"جاؤں گا۔۔۔ لیکن وقت کا اندازہ نہیں کہ وہ وقت کون سا ہو گا۔"

"وہ تمہیں یاد کرتی ہوں گی۔"

"وہ مطمئن ہوں گی کہ وہاں رہ کر میں کسی طرح کی اذیت میں مبتلا نہیں ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا ہے۔۔۔ ان کا تصور اسی طرح بندھا رہے تو ٹھیک ہے۔۔۔ ایسی حالت میں میری وہاں موجودگی ان کے لیے کسی دھچکے سے کم نہیں ہو گی۔ وہ خوشی سے بڑھ کر اداس اور غمگین ہو جائیں گی۔"

"میرین اور حسنی نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا۔ اس میں آنٹی نتھویہ کا تو کوئی قصور نہیں۔"

"جانتا ہوں۔۔۔ لیکن میرے ساتھ جو ہوا، اس میں میرا بھی تو کوئی قصور نہیں تھا۔"

"کیا تم انکل زلاری سے بھی ناراض ہو کہ انہوں نے تم سے دونوں کا تعلق چھپائے رکھا۔"

"نہیں، ان کے بتانے یا نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ میری تقدیر میں ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔"

"ایبنٹ لیسٹ۔۔۔ تم آنٹی نتھویہ سے فون پر تو بات کر ہی سکتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ کروں گا۔۔۔ بہت جلد۔۔۔"

شہرام نے بظاہر سامنے لیکن نہ جانے کس طرف دیکھتے ہوئے ایک خاص انداز میں اور کسی بات کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا۔ بیانکا کو اس کے لہجے میں کوئی چیز پوشیدہ نظر آئی تھی۔

"مجھے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے شہرام۔۔۔"

"وہ ہیں ہی اتنی اچھی۔۔۔ دراصل شاید دنیا کی ساری مائیں ان کے جتنی ہی اچھی ہوتی ہیں۔۔۔ ماؤں کی محبت میں ایک عنصر درخت کی جڑ جیسا ہوتا ہے۔"

جڑ کو پتا ہوتا ہے کہ اس کی کس شاخ کو اس وقت پانی کی ضرورت ہے۔ مائیں ساری زندگی کے لیے اپنے وجود سے بنے وجود کے اندر مقیم رہتی ہیں؟"

"تمہیں درختوں کے بارے میں بھی کتنا علم ہے نا شہرام۔"

بیانکا نے موضوع بدلنے کے لیے کہا تھا۔ یہ باتیں ایسی اور ایسے جذباتی انداز میں ادا کی جا رہی تھیں کہ لحاتی طور پر بیانکا، پھر سے اس تہ خانے میں بند ہو گئی تھی۔ اسے حیفہ مام ٹوٹ کر یاد آئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ لیکن بابا زلاری سے زیادہ نہیں۔"

"تو بتاؤ شہرام۔۔۔ کیا پیڑ صرف استعارے ہیں۔۔۔ صرف تشبیہات ہیں، جذبوں کی یا ان کے اندر بھی راز چھپے ہوتے ہیں۔"

"ان گنت۔۔۔ ہماری سوچ سے زیادہ۔۔۔ اور ہم سے بھی زیادہ یہ زندہ ہوتے ہیں۔"

"تو کیا ان سے منسوب استعارے جھوٹے ہیں۔"

"نہیں وہ استعارے بھی تو پیڑوں سے محبت کرنے والوں نے ایجاد کیے ہیں۔ وہ ان کی زبانیں جانتے تھے۔"

"مثلاً"۔۔۔ بتاؤ مجھے۔"

"مثلاً۔۔۔" وہ ذہن پر زور دے کر بہت کچھ یاد کرنے لگا تھا۔

"مثلاً"۔۔۔ جند، خوب صورت ترین درخت۔۔۔

پیپل، انجیر کا ہم راز۔۔۔ خراش، مہربان دوست۔۔۔ ارجن، باغوں کا محافظ۔۔۔ دیودار۔۔۔ غازی۔۔۔ سپاہی۔۔۔ اشوک۔۔۔ محبت کا گلدستہ۔۔۔ املتاس۔۔۔ مشرقی شاعری کا دل پسند۔۔۔ امید کا درخت۔۔۔ کجری، عطردان۔۔۔ برگد درویش درخت۔۔۔ بوڑھا۔۔۔ سحر کار۔۔۔ کدام۔۔۔"

وہ رکا۔۔۔ اچانک سے ٹھٹکا یا شاید الجھ گیا۔

"کدام۔۔۔؟"

اور چپ ہو گیا اور کہیں کھو بھی گیا۔۔۔ بیانکا سمجھ گئی تھی کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے۔

"اور یہ۔۔۔؟"

اس نے اسے متوجہ کیا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے آگے کو جھک کر شہرام کی گردن پر دھرے تعویذ کو چھوا تھا۔ ایسے کہ بیانکا کا ہاتھ شہرام کے سینے پر آ گیا تھا۔

اب کے شہرام مزید شدت سے چونکا تھا اور اس کا دل گویا پاتال سے نکل کر دھڑکا تھا۔ اگر اور صندل سے مہکا ہوا، پورا کھیت اس کے سینے پر ایک نقطے کی شکل میں آ گیا تھا۔ آخری بار اس نے اپنے دل کی دھڑکن ارجیر کی پہاڑی اترتے وقت سنی تھی اور آج اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ ہمالیہ بھی سر کر لے گا۔

"یہ چینار (درخت) ہے۔۔۔ اپنی جڑ سے محبت کرنے والا۔"

شہرام کی نظریں خود بخود ہی جھکتی چلی گئی تھیں۔ بیانکا نے ایک جھٹکے سے ہاتھ اس کی گردن پر سے اٹھایا تھا۔ دونوں میں لمحوں کی خاموشی آ گئی تھی۔ جو بڑی طویل ثابت ہوئی تھی۔ بیانکا پر محسوسات کے جہان کا ایک نیا در کھلا تھا۔ اسے خود کو نارمل کرنے میں بڑے جگ بیت گئے تھے۔

"بیانکا۔۔۔"

شہرام نے پکارا تو بیانکا نے بڑی آہستگی سے پلکیں اٹھائی تھیں۔

"کیا تم۔۔۔ کیا تم مجھ سے۔۔۔؟"

شہرام نے سختی سے تعویذ کو اپنی مٹھی میں دبا کر بیانکا سے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"مسٹر ایڈون کو جانتے ہو۔ مشہور لائر تھے امریکا۔"

بیانکا نے اس کی بات کاٹی تھی۔ جو ادھوری بات شہرام کے لبوں میں دب کر دم توڑ چکی تھی۔ وہ مکمل اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ ایسی باتیں اکثر اوقات زبانوں کے تکلف کی محتاج نہیں ہوتیں۔ بیانکا کے اندر کے بہت محتاط کی پیش گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی۔ شہرام واقعی کچھ کہہ دینے والا تھا۔ اسی لیے بیانکا نے فوراً "اور بروقت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"مسٹر ایڈون کو کون نہیں جانتا؟"

شہرام نے نرمی سے کہا۔ موضوع بدل جانے پر وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔ اس کے سارے خوش گوار منصوبوں کی جیسے دھجیاں اڑ گئیں۔ لیکن اس کی جھنجلاہٹ میں ایک گونہ اطمینان بھی تھا۔ اسے اپنے دل کی بات کرنے کے لیے مزید مہلت مل گئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ بہتر ماحول اور خوب صورت موضوع گفتگو میں یہ بات کر سکتا تھا۔

"وہ میرا مقدمہ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔"

بیانکا نے دھماکے کی صورت انکشاف کیا تھا۔

"مذاق کر رہی ہو۔" شہرام نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"مجھے اس کی ایگزیکٹ فیس کا تو علم نہیں۔۔۔ مگر اتنا اندازہ ضرور ہے کہ اگر تم پانچ چھ سال مسلسل کلب کی تنخواہ خرچ کیے بغیر جمع کرتی رہو تو شاید تب ہی اس کی فیس ادا کرنے کے لیے پیسے اکٹھے کر سکو گی۔"

"پیسے اکٹھے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ میرا مقدمہ مجھ سے فیس لیے بغیر لڑے گا۔"

"رئیلی۔۔۔؟"

"بالکل۔۔۔"

"مگر یہ بات سچ ہے تو مجھے حیرت ہے۔۔۔ کیا وہ اکثر اوقات اسی طرح کی فیاضی کا مظاہرہ کرتا ہے۔"

"بقول کیتھی کے یہ اس کی زندگی کا پہلا مقدمہ ہے، جسے وہ فری آف کاسٹ کرنے کے لیے تیار ہوا ہے۔"

"پھر تم یہ بات کسی کو بتانا مت۔" شہرام ہنسا تھا۔
"ورنہ یہ معاملہ اخباروں کے پہلے صفحے کی زینت بن جائے گا اور بنا رہے گا۔ شاید تم بھی رپورٹرز کو مطلوب ہو جاؤ اور اپنے دونوں میش اپ کی نسبت زیادہ شہرت حاصل کرلو۔"
"ہاں۔۔۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔۔۔ اخباروں میں میرا ذکر تو آئے گا ہی۔۔۔ میگزین بھی میرے انٹرویو کے لیے وقت مانگیں گے۔ ٹی وی پر میری فوٹیج بار بار چلے گی۔۔۔ سوشل میڈیا میری گفتگو، میرے سراپے سے بھرا ہوگا۔۔۔ میرے مقدمے کی ایک ایک روداد لوگوں کو ازبر ہو جائے گی۔ درحقیقت یہ مقدمہ سے زیادہ زبان زدعام ہونے والا ہے۔ موجودہ وقت میں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔"
بیانکا نے کہہ کر ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا تھا اور اس کے چہرے پر اداسی پھیل گئی تھی۔
"نہیں، ایسی بھی بات نہیں ہے۔۔۔ تم تو کچھ زیادہ ہی سوچ کر بیٹھی ہو۔"
"تم نہیں جانتے۔۔۔ میں آنے والے وقت کو دیکھ رہی ہوں۔"
"تم یہ مقدمہ ضرور جیتو گی بیانکا۔" شہرام نے ہمدردی سے کہہ کر اس کا ہاتھ دبایا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ضرور۔۔۔ یا شاید۔۔۔ لیکن کچھ اور بہت سا ہار جاؤں گی۔"
"مطلب۔۔۔؟"
وہ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔ بیانکا لمحہ بہ لمحہ روپ بدلنے والی لڑکی تھی۔ بات کرتے کرتے وہ ایک دم سے اداس ہو گئی تو شہرام حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔
"چلتے ہیں۔۔۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔"
بیانکا اپنا ہینڈ بیگ پکڑ کر کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سیٹ کی پشت پر پڑا فر کا کوٹ پہنا تھا اور دونوں ہاتھ اس کی جیبوں میں ڈال لیے تھے۔
دونوں چلتے چلتے فالی ریسٹورنٹ کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔
"پہلے ٹیکسی مجھے ڈراپ کرے گی۔ پھر تم اپنے فلیٹ جاؤ گے۔" بڑی دیر کے بعد بیانکا کا موڈ پہلے جیسا ہوا تھا۔ لیکن ابھی ٹیکسی بڑی سڑک پر آئی ہی تھی کہ بیانکا کو جیسے کچھ یاد آگیا۔
"ڈینم بلاک چلیے۔"
بیانکا نے ایک پوش علاقے کا نام لے کر ڈرائیور کو وہاں چلنے کا کہا تھا۔ کیٹی نے اسے بڑے پُرجوش انداز میں ساری تفصیل بتا تو دی تھی۔ جسے سن کر وہ صبح سے ہی کافی خوش تھی لیکن پھر نہ جانے کیوں وہ شام تک ساری بات بھول گئی۔
"مجھے ایڈون سے ملنا ہے۔" شیشے سے باہر کی تاریک سرد رات کو دیکھتے ہوئے اس نے شہرام کو بتایا تھا۔
"یہ آفس ٹائم تو نہیں۔"
"مجھے اس کے گھر میں اس سے ملنا ہے۔ کیٹی کی وجہ سے میری تین چار ملاقاتیں ایڈون کے گھر میں ہی ہوئی ہیں۔"
پھر ٹیکسی جس جگہ رکی۔ اس جگہ کے لیے بنگلے کا لفظ بھی کہیں بہت چھوٹا اور دور پیچھے رہ جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
"امید ہے مجھے واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"
بیانکا کہتے ہوئے اتری تھی اور پھر شہرام کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر چلی گئی تھی۔ شہرام وہیں گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس میں آتے خدشات اسے بے چین کرنے لگے تھے۔
سرد رات مدتوں سے کبھی ایک جگہ پڑے ہوئے پتھروں کی طرح ساکن تھی۔ وقت رکا ہوا یا شاید قطب شمالی کی طرح جما ہوا تھا، گھنٹوں کی سوئیاں بہت عجلت کا شکار ہو گئی تھیں، جبکہ سیکنڈوں کی سوئیاں اپنی جا جم سے آگے نہ بڑھ پا رہی تھیں شہرام کے لیے یہ وقت کاٹنا مشکل تر ہو گیا تھا۔
بیانکا بہت خوشگوار موڈ میں واپس آئی تھی۔
"چلیے۔۔۔" اس نے ڈرائیور سے کہا تو شہرام کو اس کی آواز میں گہرے سمندروں کا سا شور سنائی دیا تھا۔

"مجھے اپنے مقدمے کے سلسلے میں اس سے ملنا تھا۔"

بیانکا نے شہرام کو بتایا۔ جبکہ شہرام کی نظریں چاند کی طرح چمکتے ہیرے پر اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ہیرے کا ایک چھوٹا ذرہ بیانکا کی شہادت کی انگلی میں پرویا ہوا تھا۔ شہرام کو اچھی طرح یاد تھا کہ ریسٹورنٹ میں جس وقت بیانکا نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی گردن میں جھولتے تعویذ کو چھوا تھا تب وہ ہاتھ اور انگلیاں مکمل طور پر خالی تھیں۔

ہمت رکھنے اور بات کو بے ضرر جاننے کے باوجود بھی وہ بیانکا سے اس کے متعلق پوچھ نہ سکا۔

بیانکا نے اندر کی ملاقات کا احوال سنانے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کی نظریں افق پار کے دھاروں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی منزل اس کے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ نفرت، غصے اور انتقام کا تناور درخت زمین پر اپنی جڑیں پوری طرح پھیلا چکا تھا۔ اسے اب وہاں زہریلا پھل لگنے کا انتظار تھا اور یہ انتظار بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔

باہر کے تاریک مناظر تارکول کی طرح کچھ زیادہ ہی تاریک ہو چکے تھے۔ قمقموں کی روشنیاں اپنی کم مائیگی کے احساس پر شرمساری تھیں۔

ٹیکسی اپارٹمنٹ کی بلڈنگ کے آگے رکی تو وہ بنا کچھ کہے باہر نکلی تھی۔ لیکن اتر کر اور چند قدم آگے بڑھ کر وہ واپس پلٹی اور کھڑی تھی اور شہرام کی طرف والی کھڑکی پر اس نے اپنا چہرہ ٹکایا تھا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے اپنا دایاں ہاتھ شہرام کو دکھایا شہادت کی انگلی کو آگے بڑھا کر۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟"

"کوئی پاگل بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ رنگ ہے گو رہ یہ اس کے اندر ایک بیش قیمت ہیرا فکس ہے۔"

"تمہیں۔۔۔ کیا تم نے اسے پرچیز کیا؟"

"نہیں۔۔۔ یہ مجھے ایڈون نے دی۔"

بیانکا نے کہا تو گھنے جنگلوں کی ہیبت شہرام کے چہرے پر آئی تھی۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ ایڈون کی فیس میں کیسے ادا کروں گی؟"

وہ بات جسے سارے سفر کے دوران شہرام کو بتانے کی وہ اپنے اندر جرات نہیں رکھتی تھی اب نجانے کیسے بتا رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔!"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔۔۔ میں نے اس کا پرپوزل قبول کر لیا ہے۔ میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔۔ اس مقدمے کی جیت ہی میری شادی کا گفٹ ہو گی۔"

بیانکا نے کس قدر خوشی اور ادا سے کہا تھا' یہ بات الگ کہ کہتے ہوئے اس کی آواز میں ظافر یوسف کی موسیقی کا سارا درد سمٹ آیا تھا۔

شہرام کے چہرے کے تاثرات کیا ہوئے تھے۔ وہ نہ جاننے کی غرض سے ہی بیانکا نے فوراً" چہرہ پرے کیا تھا۔ اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ بلڈنگ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شہرام ابھی تک بے حس و حرکت اسے پیچھے سے دیکھ رہا ہو گا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر وہ دھم سے صوفے پر بیٹھی تھی۔ جیسے ماؤنٹ ایورسٹ سر کر کے آئی ہو۔ یا جیسے مریخ کے لمبے اور تھکا دینے والے سفر سے واپس لوٹی ہو۔ عجیب بات تھی۔ وہ بات جب صرف اس تک محدود تھی تب بھی اسے پریشان کر رہی تھی۔ اور اب جب اس نے وہ شہرام کو بتا دی تھی تو اس کی بے قراری پھر بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

اسے اس طرح بیٹھے بیٹھے کافی لمحے گزر گئے تھے۔ جب خاموش فضا میں گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز کسی بسمل پرندے کی کراہ کی طرح گونجی تھی۔

صوفے پر ساکن بیٹھی بیانکا جانتی تھی کہ یہ اس گاڑی کے انجن کے چلنے کی آواز ہے۔ جس میں شہرام بیٹھا ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

ایڈون بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

بے چینی اور اضطراب کی حالت میں اس کی یہ صورت حال آج پہلی بار ہو رہی تھی۔ ورنہ اپنی پوری زندگی میں وہ کسی مقدمے یا اپنی ذاتی زندگی کو لے کر جب بھی پریشان ہوا تو بند کمرے میں موم بتیاں روشن کر کے تنہائی میں وقت گزارنے کا عادی تھا لیکن آج کی پریشانی میں قدموں نے وہ سفر پکڑ لیے تھے جن کی شروعات تو امید و آس سے ہوئی تھی اور اختتام یقیناً" خوشی پر ہونے والا تھا۔

"خدا کا شکر کہ تم آ گئے جوڈتھ!"

ایڈون نے دور سے ہی جوڈتھ کو آتے دیکھ کر اونچی آواز میں کہا تھا۔ جوڈتھ کا چہرہ کامیابی کی خوشی سے دمک رہا تھا۔

"یہ دیکھیے۔"

جوڈتھ نے قریب آ کر سرگوشی سی کی تھی۔ اور پھر شاپنگ بیگ میں سے ایک مضبوط ڈبے میں بند مخملی ڈبیہ کھول کر ایڈون کے آگے رکھ دی تھی۔

"میں غلط نہیں ہو سکتا۔۔۔ اور کوئی مجھے جھٹلا بھی نہیں سکتا کہ نیویارک مال میں کوئی رنگ اس سے بڑھ کر بھی موجود تھی۔"

ایڈون انگوٹھی کو مخملی ڈبیہ سے نکال کر اشتیاق سے دیکھنے لگا تھا۔ جوڈتھ نے اپنی بات میں مزید اضافہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"اس کے انتخاب میں میں نے گھنٹوں کا وقت صرف کیا ہے۔۔۔ میں لیڈی نہیں ہوں لیکن پھر بھی میرا دل اسے پہننے کو کر رہا ہے۔۔۔ مس بیانکا کو یہ یقیناً" بہت پسند آئے گی۔" جوڈتھ خوشی کے مارے بولتا چلا گیا۔

"اتنی وضاحتیں مت دو پیارے۔۔۔ کیا میں اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تمہاری نظر انتخاب کتنی دیر کے بعد اس پر ٹکی ہو گی۔۔۔ یہ واقعی۔۔۔ یہ بہت خوب صورت ہے۔۔۔ اتنی کہ اس کے لیے خوب صورتی کا لفظ بھی بہت چھوٹا ہے۔"

"مس بیانکا خود بھی اتنی حسین ہیں کہ ان کے آگے خوب صورتی کے سارے الفاظ معمولی ہو جاتے ہیں۔"

ایڈون نے بالآخر شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ وہ بات تھی جس نے تیس سالہ ایڈون کے پرانے اور چہیتے ڈرائیور جوڈتھ سمیت سارے محل کو خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ نجانے کیسے یہ بات گھر کے ملازموں اور میڈ تک بھی پہنچ گئی تھی اور آج کیتھی سمیت سب کو بیانکا کی آمد کا انتظار تھا۔

ایڈون نے انگوٹھی واپس نہیں رکھی تھی وہ تصور ہی تصور میں اس منظر میں کھو گیا تھا کہ جب وہ یہ انگوٹھی بیانکا کو دے کر پرپوز کرے گا تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے۔

وہ سیدھی سادی سی لڑکی نجانے کیوں فیشن میگزین کے صفحے پر ایڈون کو بہت پیاری لگی۔ حالانکہ وہ اس سے براہ راست ایک ملاقات کر چکا تھا۔ جس میں اسے ہر ساعت یہ لگتا رہا کہ یہ لڑکی بس ابھی رو دے گی۔ تب وہ کسی حد تک ایک بکھری ہوئی لڑکی تھی۔ جسے کسی چیز نے مجبوراً" سمیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی جو کہانی بیانکا نے ایڈون کو سنائی اس نے ایڈون کو زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں ایسے لاتعداد کیس ہینڈل کیے اور سنے تھے۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی یا شاید بیانکا کو اپنا مدعا صحیح طرح بیان کرنا ہی نہ آیا کہ ایڈون کو اس ساری کہانی میں غلط بیانی نظر آئی۔

اس طرح پہلی ملاقات ناکام رہی تھی۔

جرمنی سے واپسی پر اس کی بیانکا سے دوسری ملاقات ہوئی تھی۔

وہ بکھری ہوئی لڑکی اب کے پورے طمطراق سے آئی تھی۔ جیسے وہ مس ورلڈ ہو اگر نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔۔۔ ایڈون گویا سکتے میں آ گیا تھا۔

"یہ خوب صورتی مجھے پہلی ملاقات میں کیوں نظر نہ آئی۔" اسے خود پر شبہ ہوا تھا کہ وقت گزرنے اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر بھی کمزور ہونے لگی

ہے شاید۔

خود بیانکا کی گفتگو کے ساتھ نظروں کا آنے والا ہر ہر ترکش تھا۔ ان ترکش تیروں کی بھرمار سے ایڈون بھلا کیسے بچتا۔ بیانکا کی سنائی کہانی کے سارے جھول خود بخود ہی ختم ہو گئے۔

ایڈون نے اسے اگلے دن پھر آنے کا کہا تھا۔

وہ سارا دن اس نے گھر میں گزارا تھا۔ اپنی موجودہ اور ماضی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے۔ سوائے دولت کی فراوانی کے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کی بنا پر وہ خود کو کامیاب مرد تصور کر سکتا۔ سنگل ہونے اور رہ جانے کے باعث وہ اب تک ایک ناکام زندگی بسر کرتا آیا تھا۔ ویسے اس بات کا اعلان تو اس کی بہن بھی ہر فون کال پر کرتی تھی لیکن یہ احساس آج خود ایڈون پر بڑی شدت سے غالب آیا تھا۔

"جوڈتھ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بیانکا سے ہوئی تیسری لمبی ملاقات کے اختتام پر اور بیانکا کے جانے کے بعد اس نے اپنے چہیتے ڈرائیور سے کہا تھا۔

"کیا؟ کس سے۔۔۔ کون ہے وہ سر؟"

"یہ جو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔۔۔ لیکن پھر بھی یہاں ہی ہے۔۔۔ بیانکا سے۔۔۔"

ایڈون نے بتایا اور جوڈتھ کا دل کیا کہ وہ خوشی سے چلا چلا کر پورا محل سر پر اٹھا لے۔

☼ ☼ ☼
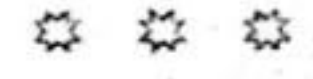
"جوڈتھ! تم کیتھی سے کہو کہ وہ بیانکا کو کال کرے۔۔۔ کہیں وہ بھول ہی نہ گئی ہو کہ اسے آج یہاں آنا ہے۔۔۔ کہیں وہ آج کی ملاقات کو بھی عام ملاقات نہ سمجھ رہی ہو۔" ایڈون آج اس بچے کی مانند تھا جو کسی مذہبی تہوار میں اچھے اور مہنگے کپڑے پہن کر اپنی خوشی میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔

"وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے سر۔۔۔ کوئی بھی لڑکی یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔"

"لیکن میں نے اسے ابھی تک کوئی اشارہ بھی تو نہیں دیا۔"

"لڑکیوں کو اشاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔۔۔ وہ نظر التفات کو مردوں کی نسبت زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہیں۔"

"جوڈتھ۔۔۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔۔۔؟" ایڈون نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تھا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو یہ مس بیانکا کی بدقسمتی ہو گی۔"

"اچھا۔۔۔ تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی کہتے ہو گے۔" ایڈون صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

پھر بڑی دیر کے بعد رات میں بیانکا کی آمد کی خوشبو آئی تھی۔

"وہ آ گئی ہیں سر۔۔۔ مس بیانکا۔"

جوڈتھ نے آکر اسے اطلاع دی تھی۔

"اوہ۔۔۔" ایڈون جیسے نیند سے جاگ کر اٹھا تھا۔

"تو تم پھر جاؤ یہاں سے۔۔۔ تمہارے سامنے میں یہ بات بھلا کیسے کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" جوڈتھ ہنستا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔

ایڈون خود کو بڑے ضبط سے اپنے مستقل رعب والے سراپے میں لانے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ لیکن جوں ہی بیانکا اندر داخل ہوئی ایڈون کو یہ ضبط کہیں کھوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"آپ نے کچھ ضروری باتیں کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔"

بیانکا کا لہجہ ایک کسٹمر جیسا تھا۔ حالانکہ کیتھی نے اسے سارے حالات بڑی وضاحت سے بتا دیے تھے۔ اور وہ جانتی تھی کہ ایڈون نے آج اسے یہاں صرف کسٹمر کی حیثیت سے نہیں بلایا۔

"غفار جلال کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ فلوریڈا میں بگال یارڈ نامی علاقے میں رہتے ہیں۔۔۔ اب وہ لوگ زراعت کے شعبے سے منسلک نہیں ہیں۔۔۔ انہوں نے اسٹور خریدا ہے بہت بڑے لیول کا اور وہ تینوں اسے ہی رن کر رہے ہیں۔ یہ چیز ان کے خلاف جاتی

یہ ہے کہ انہوں نے محکمہ زراعت سے کس وجہ کے تحت غلط بیانی کی کہ وہ پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔۔۔ جبکہ وہ فلوریڈا آباد ہونے کی سوچ رہے تھے دوسرا یہ کہ اتنے بڑے لیول کا اسٹور خریدنے کے لیے ان کے پاس رقم کہاں سے آئی۔"

"انہوں نے ڈیڈ الیاس کی پراپرٹی کو سیل کر دیا تھا جو میں ان کے نام کر چکی تھی۔"

"میں نے یونین کے آفس سے ریکارڈ حاصل کر لیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہو پایا' دراصل تم نے اپنے اثاثے غفار جلال یا احمد کے نام منتقل نہیں کیے تھے۔ بلکہ کسی انجان آدمی کو بیچے تھے دستاویزات میں اس آدمی کا نام مائیکل ہے۔ مائیکل غفار کا دوست تھا اور اسے فوت ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔" بیانکا کو شاک لگا تھا' مکار لوگوں نے کس طریقے سے ساری کارروائی کی تھی۔

"یہ وہ واحد چیز ہے جو ان کے خلاف سب سے بڑا ثبوت بن سکتی ہے۔ نہ جانے انہوں نے یہ حرکت کیوں کی؟ شاید سارے معاملے سے خود کو دور رکھنے کے لیے لیکن مائیکل کی موت کا راز کھل جانے کے بعد اب وہ اس میں بری طرح پھنس جائیں گے' غفار مائیکل نامی شخص کو نہیں جانتا۔ اس کے لیے یہ بات ثابت کرنا مشکل ترین بلکہ ناممکن ہے۔۔۔ جبکہ یونین کے آفس میں نصب کیمروں سے یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ تم ان تینوں کے ساتھ ہی آفس میں آئی تھیں۔۔۔ تمہارا اٹارنی بھی ساری سازش میں شامل رہا ہے۔ وہ بھی بچ نہیں سکے گا۔ مزید شواہد اکٹھے کرنے کے لیے ہمیں دولت کا سہارا لینا پڑے گا۔ دولت کی طاقت تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی ہو۔۔۔ جو انسان اچھے ہوتے ہیں صرف موقع کے فقدان کی وجہ سے اچھے ہوتے ہیں جیسے ہی انہیں برائی کرنے کا موقع ملتا ہے' وہ بڑے انسانوں کو بھی مات دے جاتے ہیں۔"

ایڈون نے کہا تو بیانکا نے سر کی جنبش سے ساری بات کا جواب دیا تھا۔ وقتی طور پر وہ افسردہ ہو گئی تھی۔ یہ وہ قصہ تھا جو جب بھی سنایا جاتا تھا اسے لہولہان کر جاتا تھا۔

"میں تم سے ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں بیانکا۔۔۔ در حقیقت میں نے آج تمہیں اس لیے بلایا ہے۔" جذبات سے عاری لہجے میں فقرہ ادا ہوا تھا۔

"آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔" اس نے حیفہ مام کی بات حیفہ مام کے لہجے میں ہی ادا کی تھی۔

تھوڑی دیر ایڈون خاموش بیٹھا رہا تھا۔ پھر اٹھ کر کارنس کی طرف گیا تھا۔ جہاں کرسٹل ویز کے ساتھ مخملی ڈبیہ رکھی گئی تھی۔ بیانکا کے لیے اس ساری صورت حال کا کوئی پہلو بھی نیا نہیں تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی بیانکا؟"

یک لخت پلٹ کر اور کھلی ڈبیہ میں جگمگاتی انگوٹھی بیانکا کی طرف بڑھا کر ایڈون نے پوچھا تھا۔

"تم اگر مجھ سے شادی کر لو تو یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہو گی۔" بیانکا کے لیے سب غیر متوقع تو نہیں تھا جس رات وہ اپنے حسن کے جام میں موجود شہد اور زہر کے عنصر سے واقف ہوئی تھی اس رات ہی اس نے بڑے گہرے فیصلے کر لیے تھے۔ اس کا پہلا ہی ہدف ایڈون تھا۔ وہ کامیاب ہوئی تھی۔ اس نے ایسا ہی سوچا تھا۔۔۔ جیسا اب ہو رہا تھا۔۔۔ پھر بھی اس کے چہرے پر سوچی سمجھی مسکراہٹ نہ آ سکی تھی۔

کمرے سے باہر دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑے جوڈتھ اور کیتھی سمیت دوسری میڈز کو ایڈون سے بھی زیادہ اس سوال کے جواب کا انتظار تھا۔ سب کے چہرے انجانی خوشی سے دمک رہے تھے۔

بیانکا نے ایک نظر۔۔۔ تراشے گئے ہیرے کو دیکھا تھا۔

اس ہیرے کی چمک ایسی تھی جیسی تہ خانے کے اندھیرے میں چمکتے حیفہ موم کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی۔۔۔ اس ہیرے کی چمک ایسی تھی جیسی کول روزن سے آتی سورج کی ترچھی اور پھر ترچھی ہوتی بنفشی شعاعوں کی۔

بیانکا نے بہت ساری روشنیاں اکٹھی کر لی تھیں

اور پھر اپنے آگے کے راستوں کو تلاش کرتا تھا۔ اس ہیرے کی چمک کم از کم اتنی تو ضرور تھی کہ اب وہ اندھیروں سے ڈر نہیں سکتی تھی۔ ڈیڈ الیاس کی گردن پر ثبت سرخ لکیر کے مضبوط تصور کو بھول سکتی تھی۔

"بولو بیانکا... میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔"

"ہاں...!" آنکھوں کو... پلکوں کو... کافی دیر سے ساکت رکھے اور بنا چہرے کو ہلائے وہ نجانے کس رخ سے بولی تھی۔

ایڈون کو گو اسی بات کی توقع تھی پھر بھی اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ انگوٹھی نکال کر اس نے بیانکا کو پہنا دی تھی۔ جسے پہن کر وہ ایک طرح سے آدھی کامیاب ہو گئی تھی۔

اس کی خاموشی اور اداسی کے اسبابوں کی وجہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی کیا وہ یہ ہی سب نہ چاہتی تھی۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

چند منٹ کی مزید گفتگو کے بعد بیانکا نے کہا تھا اور ایڈون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھی تھی۔

باہر نکلنے سے پہلے اس نے بڑی احتیاط سے رنگ کو اپنی انگلی سے اتار کر ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا... لیکن لمبی روش کو پار کرتے وقت اس نے دوبارہ ہینڈ بیگ کھول کر رنگ کو واپس پہن لیا تھا۔

"یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے کسی صورت راز میں رکھنے کی ضرورت ہے... خصوصاً" شہرام سے۔"

ٹیکسی میں شہرام بیٹھا اس کا منتظر تھا۔ اس لیے اس نے وہاں تک پہنچنے سے پہلے اپنے چہرے پر بہتے بے تحاشا آنسوؤں کو بڑی نفاست سے صاف کر لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"اپنے کیریئر کا آخری ٹریک میں تمہارے نام کرتی ہوں... مارٹا۔"

ہیڈ فون کو کانوں سے لگا کر بیانکا نے کہا تھا۔ جواب میں مارٹا دل سے مسکرائی تھی۔ پھر چند ہی لمحوں بعد بیانکا نے چار گانوں کی جنگل بیٹ شروع کی تھی۔

"بالآخر وہ دن آنے ہی والا ہے جب میں پہلی بار سکون سے سوؤں گی۔" وہ Delay (ایک ایفیکٹ) کا استعمال کرنے لگی تھی۔

جب وہ لوگ جیلوں میں سڑیں گے تو کیا کیا جانتیں نہ ہو جائیں گی ان سب کی... تب وہ لوگ جان جائیں گے کہ قید کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ تب وہ اس جائیداد کو بھی ترسیں گے جو پہلے سے ہی ان کے پاس تھی اور جس پر وہ خوش نہ رہ سکے۔ وہ مجھ سے معافی مانگیں گے لیکن میں انہیں ہرگز معاف نہ کروں گی... کیا انہیں معاف کرنے کے لیے میں نے اتنی مشکلوں کا سامنا کیا ہے۔ یہ اذیت انہیں جھیلنی ہو گی... وہ خدا سے معافی مانگیں گے گڑگڑائیں گے... خدا چاہے گا تو انہیں معاف کر دے گا۔ لیکن کوئی ایسا معجزہ نہیں ہو گا جو ان لوگوں کو سزاؤں سے بچا سکے... کس قدر خوب صورت منظر ہو گا وہ جس دن میں ان سب کو سلاخوں کے پیچھے دیکھوں گی... کسوف گرفتگی آفتاب سے بھی گہرا منظر... میں روز جاؤں گی ان سے ملنے... یہ دنیا کا خوب صورت ترین نظارہ ہو گا اور میں اس سے روز فیض یاب ہوا کروں گی... اپنے دل کو روز تسکین دیا کروں گی... جیسے روز میں نے خود کو یہاں اذیت دی ہے۔ اتنی کہ اذیت میری ذات کا حصہ بن گئی ہے... لیکن اب اس خود اذیتی کے دن پورے ہو گئے۔ اب میری باری آ گئی... کھیل کے دوسرے حصے کی... جس میں سارے مہرے بھی میرے ہوں گے اور ساری چالیں بھی میری ہوں گی...

گانے کے بول۔

خود کو جان لو... پہچان لو
تم فاتح ہو جاؤ گے

"ہاہا... ہاں میں نے خود کو جان لیا... اور اب میں فاتح ہوں... اس فتح کے لیے خود سے جنگ کرنا بڑا مشکل تھا۔

ہمارا انجان رہنا ہمارے لیے نقصان کا باعث تھا اور مجھے خدا پر کامل یقین تھا کہ کامیابی آخر میری ہی ہو گی۔

دلدل میں دفن ہونے سے بہتر ہے کہ
سفر ختم کر دیا جائے

وولی اور ڈی کے بٹنوں کو اوپر نیچے کرنے لگی تھی۔

"وہ آ گیا ہے۔"

مارٹا نے اس کے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشی کی تھی۔

"کون؟"

"تمہارا دوست... شہرام۔"

"کہاں ہے۔"

"وہاں... نیچے دیکھو۔"

مارٹا نے اشارہ کیا تو بیانکا نے اسی سمت دیکھا تھا۔ وہاں شہرام کھڑا اوپر بیانکا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ بیانکا نے اپنی پوری جان لگا کر اسے ہائے کیا تھا۔ شہرام اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن وہ مسکرا نہ سکا تھا۔

جب ہم مایوس نہ ہونے کا ارادہ کرتے ہیں
اور پا لیتے ہیں بالآخر جو چاہتے ہیں

میوزک کا ردھم ہلکا ہوا تھا۔ بیانکا مزید کوئی ایفیکٹ استعمال نہیں کر سکی تھی۔ اسے شہرام کا اس طرح سنجیدہ رہنا عجیب لگا تھا۔ ایڈون سے شادی والی بات کے بعد سے وہ اسے آج نظر آیا تھا۔ پورے ایک ہفتے کے بعد... وہ شاید ان دنوں اس قدر مصروف رہا تھا کہ نہ ہی بیانکا سے مل سکا تھا اور نہ ہی اس کی کال کا جواب دے سکا تھا۔

پھر بھی ہم ادھورے سے کیوں رہ جاتے ہیں۔

بیٹ جنگلنگ کم ہوتے ہوتے کنارے سے لگنے لگی تھی۔ بیانکا نے ہیڈ فون اتار کر اسٹینڈ پر رکھا تھا۔

"الوداع پیاری مارٹا... تم نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر جانا چاہتی تھی۔

"سنو بیانکا...!" مارٹا نے پکارا تو بیانکا واپس پلٹی تھی۔

"تیرس پر آج تمہارا آخری دن تھا... یہ سوچ کر اداس ہو یا کوئی اور وجہ ہے۔"

بیانکا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپا تھا۔ جیسے اس کی کوئی چوری واقعی میں پکڑی جا چکی ہو۔

"کیا کہہ رہی ہو مارٹا؟"

"وہی جو تمہارے چہرے... تمہاری چال سے عیاں ہے۔"

"جاب پر آخری دن ہے... شاید اسی وجہ سے۔"

وہ خود بے یقینی سے بولی تھی۔

"چند دنوں میں تمہاری شادی ہونے والی ہے... شادی کی خوشی کبھی کبھی اداسی سے زیادہ ہوتی ہے۔"

بیانکا نے اپنی جھکی پلکیں اٹھا کر مارٹا کو دیکھا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو۔" اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آ گئی تھی۔

بڑی دیر تک نظریں دوڑانے کے بعد بھی شہرام اسے وہاں کھڑا نظر نہیں آیا تھا جہاں وہ آ کر کھڑا ہوا تھا۔

"وہ واپس جا چکے ہیں۔"

ویٹر نے اسے کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے دیکھ کر کہا تھا۔

"کب...؟"

"چند لمحوں پہلے"

"لیکن وہ چند لمحوں پہلے ہی تو آیا تھا۔"

یہ فقرہ اس نے ویٹر سے زیادہ خود سے کہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے داخلی دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ لیکن دروازہ پار کرنے سے پہلے ہی اس کی چال سست ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اتنے سے وقت میں کہاں گیا ہو گا لیکن اب وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اذیت بھی تو دینا نہ چاہتی تھی۔

"کیونکہ بعض اوقات چیزیں کھو دینے کا فن اچھا ہوتا ہے۔" اسے بہت پہلے کی پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آئی تھی۔

"جب چیزیں ہماری دسترس میں آتی ہیں اور ہم سے دوبارہ کھو جاتی ہیں تو پھر ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ وہ چیزیں ہمارے لیے نہیں ہیں یا ہم ان کے لیے نہیں بنے۔"

اسے ڈیڈ الیاس کی ایک بات یاد آ گئی تھی۔

"تم جیسی لڑکی تم اتنی خود غرض کیسے ہو گئیں؟"

وہ داخلی دروازے سے واپس آ رہی تھی جب مارٹا

نے نیا ٹریک شروع کیا تھا۔ اس ٹریک میں اسے اپنے لیے ایک طنز کا تیر کمان میں اٹکا ہوا نظر آیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دنیا کے ان تمام شاعروں پر لعنت بھیجی تھی جو ایسی بے معنی شاعری کرتے ہیں۔

"اچھی لڑکی تم اتنی خود غرض کیسے ہو گئیں۔"

آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔ وہ ان الفاظ کو سننا نہیں چاہتی تھی پھر بھی ٹریک کی آواز نے ڈریسنگ روم تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼
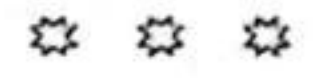
مصنوعی جھیل کے باسی پانی کی لہریں سنہری تھیں۔ شہرام کو اندازہ نہیں تھا کہ سنہری رنگ کبھی اتنا ظالم بھی ہوا ہے۔

Edwan with Bianca

انویٹیشن کارڈ کے باقی مندرج اس سے پڑھے نہیں جاتے تھے۔ وہ ان دو لفظوں کے مہاجال سے باہر ہی نہیں نکل پا رہا تھا۔

بیانکا کی نظریں بظاہر جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ ترچھی نظروں سے شہرام کے تاثرات جاننے کی ہی کوشش کر رہی تھی۔

"تم نے ایڈون سے شادی کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا ہے ناکہ وہ تمہارا مقدمہ لڑے۔" وہ جو بڑی دیر سے خاموش تھا۔ اب بولنے پر آیا تو بالکل ہی براہ راست ہو گیا۔

"میرے فیصلے میں یہ وجہ سب سے اول تھی۔" بیانکا نے صاف گوئی سے جواب دیا تھا۔

"میرے خیال میں... مجھے لگتا ہے بیانکا کہ یہ مس میچ ہے... عمروں کا فرق اور۔"

"میرے ساتھ جو کچھ ہوا اس سب کا بھی میری عمر کے ساتھ مس میچ ہی تھا۔" بیانکا کے لہجے میں دبا ہوا غم اور غصہ تھا۔

"لیکن... اس طرح۔"

"دنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے شہرام... کیا تم نے یہ ساری باتیں کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟"

"نہیں..." شہرام اداس ہو گیا تھا۔ "جو بات کرنے کے لیے بلایا تھا وہ تو میں کہہ ہی نہیں پا رہا۔" بیانکا اپنی انگلیوں کے ناخنوں میں کھو گئی تھی۔

"کیا تمہیں دولت عزیز ہے بیانکا؟"

"نہیں... لیکن میں اپنے ڈیڈ کے بنائے اثاثوں کو کسی اور کے پاس نہیں دیکھ سکتی... میں ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔" بیانکا جذباتی ہونے لگی تھی۔

"خدا بننے کی کوشش مت کرو بیانکا... یہ اختیار اللہ کے پاس ہے... اس کے پاس ہی رہنے دو۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو شہرام!" بیانکا ہنسی تھی۔ شہرام اس کی ہنسی میں چھپے طنز کو جان گیا تھا۔

"ہاں... کیوں کہ بابا نے ٹھیک کہا تھا کہ وقت آنے پر ہم اپنی ایسی سوچوں پر ضرور پچھتاتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے... یہ موقع مجھے اللہ نے ہی دیا ہو شہرام۔"

بیانکا کو اپنی استہزائیہ ہنسی پر ندامت محسوس ہوئی تھی۔

"جب سیرین نے مجھے چھوڑا مجھے لگا کہ میں اب کبھی بھی کسی سے بھی محبت نہیں کر سکوں گا۔ مجھ میں محبت کرنے کی قابلیت 'ہنر سب ختم ہو گیا ہے' لیکن ... لیکن پھر میں تم سے ملا اور میں نے جانا کہ اپنے دل کی لگامیں ہم کبھی بھی اپنے ہاتھوں میں نہیں تھام سکتے۔"

بیانکا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے پیروں کے نیچے خشک تنکوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر کرنے لگی تھی۔ اس حالت میں بیٹھی ہوئی وہ شہرام کو سیرین کی طرح دکھائی دے رہی تھی 'جو ارجیر کی پہاڑی پر کدام کے درخت کے نیچے ایک ٹیلے پر ایسے ہی بیٹھی اپنی بے وفائی کی آدھی ادھوری وجہ بیان کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں بیانکا۔"

"کہو شہرام... کب سے تم ہی تو کہہ رہے ہو اور میں صرف جواب دے رہی ہوں۔"

"تو پھر اس آخری بات کا بھی جواب دے دو۔"

"میں سن رہی ہوں۔"

"مجھے... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے بیانکا۔" شہرام نے کہہ دیا جیسے اس نے سیرین سے کہہ دیا تھا کہ اس کے بغیر وہ مر جائے گا' حالانکہ آج کی ہی طرح تب بھی اسے اندازہ تھا کہ سیرین کو اب وہ کبھی نہیں پا سکے گا۔

"اتنی محبت کہ اتنی محبت تو شاید تم... تمہیں خود بھی خود سے نہ ہو گی۔"

"ان باتوں کا اب کیا فائدہ شہرام... پندرہ دنوں کے بعد ویسے بھی میری شادی ہے... اپنی کامیابی کے اتنے قریب پہنچ کر میں واپس نہیں پلٹ سکتی شہرام... تم میرے اچھے دوست ہو... ہمیشہ رہو گے... دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق یا دونوں محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں... اور اچھے دوست ایسے مسئلوں کو پڑھے لکھے لوگوں کی طرح بہت خوش اسلوبی سے حل کر لیتے ہیں۔"

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں بیانکا؟"

شہرام نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا تھا۔ وہ لا حاصل گفتگو کر رہی تھی۔ بیانکا خاموش ہو گئی۔

"میرے مشاہدے کو اتنا بے مول تو نہ کرو۔"

شہرام نے کہا تو بیانکا اپنی جگہ پر سن سی ہو گئی "تو کیا یہ سب جانتا ہے؟" وہ سوچنے لگی۔

"ہے... لیکن ایک دوست کی حیثیت سے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میرا سچ بولنا بھی اب بے کار ہے۔"

"تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے۔"

"مجھے ہر صورت ان لوگوں سے بدلہ لینا ہے... فی الحال میں اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتی اور نہ ہی سوچنا چاہتی ہوں۔"

وہ سیرین کی طرح باغیانہ انداز سے بولی تھی۔

"کیا تم اپنے بدلے کو اللہ کے حوالے نہیں کر سکتیں... وہ ہر صورت بہتر حالات بنا لیتا ہے۔"

"اور تب تک میں کیسے زندہ رہوں... بولو... مجھے سانس کیسے آئے گا۔"

"اگر تم سب اللہ کے حوالے کر دو گی تو وہ تمہیں صبر دے گا۔"

"تمہارے لیے کتنا آسان ہے شہرام... تم اس فیز سے آگے بڑھ آئے ہو تم کیسے جانو گے 'جب میں نے پہلی بار ٹی وی پر احمد کو دیکھا تھا تو میری کیا حالت ہوئی تھی... اگر میں کسی طرح اس کا گلا دبا سکتی تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی تھی... اور کوئی سزا مجھے ڈرا نہیں سکتی تھی۔

تم میری ان فیلنگز کو کیسے جانو گے شہرام جب میں ڈیڈ کے اثاثوں پر کسی اور کو قابض دیکھتی ہوں... ایک ایک چیز ڈیڈ اور مام نے کس قدر لگن اور محنت سے بنائی ہے تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے... اور تم ان ساری باتوں کو کبابوں کے جل جانے سے نسبت دے رہے ہو۔"

بیانکا روانی میں بولتی چلی گئی تھی۔ اس کی آواز قدرے تیز ہو گئی تھی۔ اور آخری بات کہہ چکنے کے بعد اسے گہرا افسوس ہوا تھا۔ شہرام کے چہرے پر تاریک رنگ آ کر ٹھہر گئے تھے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا شہرام... میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا میں تمہاری محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں... لیکن میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔"

شام میں پرندوں کے غول اپنے اپنے بسیروں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ نجانے ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی نوعیت متغیر تھی یا پروازوں میں فریب 'مشابہت حد سے بڑھ گئی تھی کہ بدیسی اور دیسی پرندوں میں فرق کرنا ستاروں کی روشنی اور خم کی طرح مشکل ترین ہو گیا۔

اس منظر پر ٹکٹکی باندھے شہرام کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"وقت آگیا ہے ہجرت کر کے آئے ہوئے پرندوں کے واپس لوٹ جانے کا۔" اس نے خود سے کہا تھا۔

"لما جا! آپ کی ساری دعائیں قبول ہو گئی ہیں... آپ کا بیٹا واپس آ رہا ہے... اگرچہ جس حالت میں گیا

تھا اس سے بھی بدتر حالت میں۔"

مغرب کے زعم میں ڈوبے دن کے کنارے کی طرف پرواز کرتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے شہرام نے کہا تھا۔ یہ پرندے یقیناً "اس کا پیغام اماں زینو یہ تک لے جانے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

تاروں سے سجی رات میں Fuchsia کی بیل بھی اپنے چنچل رنگ کھو چکی تھی۔ بیانکا نے کھڑکی کی زیریں سردں پر اپنے دونوں ہاتھ ٹکائے تھے۔

فانوسی پھول رات کی کرم نوازی کے باعث بند ہوئے پڑے تھے۔ نجانے کس کس پھول میں شہد کی کون کون سی مکھی بند تھی۔ مرنے کے بالکل قریب۔۔۔ یا مرچکی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

قدرت کے نظام میں ان گنت سوالیہ نشان کیوں ہیں۔ قدرت کے نظام میں اتنے ہی جواب کیوں نہیں ہیں۔

"دعا کرو۔ دیر سے ہی سہی ' وہ آج گھر واپس آجائے۔" اسے حیفہ مام کا رندھا ہوا لہجہ اور بھیگا ہوا چہرہ یاد آیا تھا۔

"خیریت؟۔۔۔ اس کے لیے ہی تو دعا کر رہی ہوں۔"

"میرے دل کے خوف خدا کرے بس یہ پورے نہ ہوں۔"

"میں اپنی دعاؤں کو اور وقت کو تھوڑی مزید مہلت دینا چاہتی ہوں۔"

"ہم تو بس دعا ہی کر سکتے ہیں۔ تم دونوں جلدی یہاں پہنچو۔"

پھر اس کے تصوّر میں چچا جلال کی آواز کی بازگشت دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

"دروازہ کھولیے۔"

"یہ دروازہ اتنے آرام سے نہیں کھلے گا۔"

"اب یہاں بیٹھ کر تسلی سے سوچو کہ تمہیں دستخط کرنے ہیں کہ نہیں۔"

"حرام زادی کرو دستخط۔۔۔"

"الیاس کے دائیں طرف حیفہ کی قبر ہے۔"

اس کی خود کی اپنی زندگی میں بھی اس رات کے تاروں کی طرح ان گنت سوال تھے۔۔۔ ایسا کیوں ہوا۔۔۔ میرے ساتھ ہی کیوں۔۔۔ کسی ایک کا بھی جواب نہیں تھا' صرف بے چینی تھی۔ اضطراب تھا۔

"اور تم چاہتے ہو شہرام! کہ میں ان سب کے بدلے میں تم کو فوقیت دوں۔۔۔ اپنے دل کی سنوں۔۔۔ دماغ کی نہیں۔۔۔ میں دل کی سن لوں اگر میری یادداشت کہیں گم ہو جائے۔۔۔ میں تمہاری بات مان لوں۔۔۔ سب کچھ خدا پر چھوڑ کر صبر کرلوں اگر حالات رفتہ رفتہ میری سماعت مجھ سے نہ چھین رہے ہوں تو؟" کھڑکی بند کرکے وہ واپس پلٹی تھی۔

بیڈ پر مختلف برانڈز کی مہنگی ترین چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے سیل فون اٹھا کر شہرام کو کال کی تھی۔ حسب معمول اس کا سیل فون آف تھا۔

"ٹھیک ہے شہرام۔۔۔ تمہارا ناراض ہونے کا پورا حق بنتا ہے۔۔۔ میں دوستی کے ناتے تم سے تمہارا یہ حق نہیں چھینوں گی۔"

سیل فون اس نے واپس بیڈ پر اچھال دیا تھا اور ایڈون کی طرف سے بھیجی جانے والی اشیاء میں سے سفید برائیڈل گاؤن کو اسٹریپس سے پکڑ کر دیکھا تھا ڈریس بلاشک و شبہ بے انتہا خوب صورت تھا۔

کیٹی نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جو ڈتھ اس کے لیے کس قدر مہنگی مہنگی اور جاذب نظر اشیا اکٹھی کر رہا ہے۔

"تم خوش قسمت ہو بیانکا۔" کیٹی نے آخری فقرہ چلاتے ہوئے کہا تھا۔

اور اب وہ بیڈ پر بکھری ہوئی چیزوں کو تاسف سے دیکھ رہی تھی۔

ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں تھی جو اس کو وقتی خوشی ہی دے سکتی۔

☼ ☼ ☼
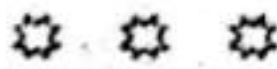
دو موسموں کے سنگم کا دوغلا ماہ اپنے وسط میں تھا

فریبی موسم کی کرنیں جا بجا پھیلی ہوئی تھیں۔۔۔ مایوسی' یاسیت' اداسی اور خودکشی کرلینے والے موسم کی کرنیں۔۔۔ فضا میں کف دریا کی آمیزش تھی اور دن کی روشنی میں بے نوری کا ماتم۔۔۔

بیانکا نے نظریں اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور خود سے بھی زیادہ کسی تیسری چیز کو۔۔۔

برائیڈل گاؤن ہیروں سے دمکتے زیورات اور گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک۔۔۔

"دیکھیے مام ڈیڈ۔۔۔ آپ دونوں کی روحوں کو ایصال ثواب پہنچانے کا میں نے پورا پورا انتظام کرلیا ہے۔"

اس کی قدرتی کاجل لگی آنکھیں دکھنے لگی تھیں۔

"اور یہ کیسی شادی ہے کہ جس میں میرا اپنا کوئی بھی نہیں۔۔۔ اور خود میں بھی آج اپنی نہیں۔" وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"شہرام! صرف ایک تم ہی تو میرے اپنے تھے۔۔۔ اور تمہیں بھی آج ہی ناراضی نبھانے کا خیال آیا۔۔۔"

اس تباہ کن روپ کے ساتھ وہ افسردہ ہو رہی تھی ماہر بیوٹیشن نے اس کے تراشے ہوئے سراپے کو مزید نکھار دے دیا تھا۔

"بیانکا!" کیٹی دروازے میں کھڑے کھڑے ہی چلائی تھی۔ بیانکا نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا اس کے تصورات کی دنیا گڈمڈ ہوگئی تھی۔

"لوگ آگئے ہیں۔۔۔ تم تیار رہنا۔۔۔ جلد ہی تمہیں بھی بلا لیا جائے گا۔" کیٹی خوشی سے کہتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

بیانکا نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک دم سے بڑھتا ہوا پایا تھا۔

"مس بیانکا۔۔۔ یہ آپ کے لیے آئے ہیں۔"

میڈ نے اسے پھولوں کا ایک گلدستہ پکڑایا تھا۔ بیانکا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گلدستہ تھام لیا تھا۔ میڈ نے نوٹ رجسٹر بیانکا کے آگے کیا تھا۔ سینڈر نیم (بھیجنے والے کا نام) شہرام تھا جس کے آگے اس نے "ویل وشڈ فرینڈ" لکھ دیا تھا میڈ رجسٹر لے کر باہر چلی گئی تو وہ تفصیل اور محبت سے گلدستے کو دیکھنے لگی۔

ہری ہری کٹی ڈنڈیوں کے اوپر لگے سرخ گلاب اور پیلے لالے کے پھولوں کا گلدستہ۔۔۔ جیسے دنیا کے سارے حسین منظروں کی عکاسی کر رہا تھا۔

گلاب اور لالہ۔۔۔ محبوب اور رقیب۔

نجانے شہرام اس استعارے میں چھپ کر مجھے کیا کہنا چاہتا ہے۔

گلدستے کے اندر ایک خط بھی موجود تھا۔ بیانکا نے خط کو باہر نکال لیا۔ بند کاغذوں میں چھپی تحریریں ویسے بھی بہت خوف زدہ کر دیتی تھیں ایک بار پہلے بھی اسی طرح کے بند کاغذ کے کھلنے نے اس کی دنیا ویران کر دی تھی۔

"خدا کرے تم خیریت سے ہو شہرام۔"

نجانے کیوں بیانکا کا دل گھبرانے لگا۔ خط چاک کرتے وقت یہ دعا خود بخود ہی اس کے لبوں سے نکلی تھی۔ تب ہی کاغذ کی تحریر کے ساتھ وہ تعویذ بھی برآمد ہوا تھا جسے شہرام ہر وقت اپنے گلے میں پہنے رکھتا تھا اور جس نے بیانکا کو پہلی ہی بار میں بڑی بھیانک پریشانی سے دوچار کر دیا تھا۔

"بیانکا۔۔۔! تم سے محبت کرنے کے بعد خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اپنے ساتھ کیا ہوا عہد توڑ دیا ہے تو میں خود بھی ٹوٹ گیا ہوں اور تم تو جانتی ہو کہ جب جب وعدے یا عہد ٹوٹتے ہیں تو کسی ایک فریق کا دہرا نقصان ہوتا ہے۔ میں یہ نقصان برداشت کر رہا ہوں۔ میں واپس جا رہا ہوں۔ الپائنیہ۔

ہو سکے تو میرے تعویذ کو میری نشانی سمجھ کر پہن لینا ورنہ دل نہ مانے تو پھینک دینا۔ میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ اب یہ میری محبت کے پاس ہے۔

شہرام"

"بیانکا! جلدی آؤ۔۔۔ اب صرف تمہارا ہی انتظار کیا جا رہا ہے۔" یہ کیٹی کی آواز تھی۔

"تو میرا خوف صحیح نکلا۔۔۔ بند کاغذوں کی تحریریں واقعی میری دنیا ویران کر دیتی ہیں۔"

"ایکسیوز می مس بیانکا۔۔۔ مجھے آپ کا لباس درست کرنا ہے۔" بیوٹیشن نے اسے بلایا تو اس نے اپنا چہرہ اوپر

اٹھایا تھا۔

"مس بیانکا آپ رو رہی ہیں۔"

"او گاڈ بیانکا۔ خدا کے لیے اتنے پیارے میک اپ کا ایسا حشر تو نہ کرو یار۔ یہ ماتم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ باہر ایک عالم تمہارا منتظر ہے۔ میڈیا والے بھی آچکے ہیں۔"

"میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں۔"

"بس جلدی آجاؤ اب تم بیانکا۔"

کیٹی بھی باہر نکل گئی تو وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ یہ میری محبت کے پاس ہے۔"

"تم سے محبت کرنے کے بعد میں خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"میں واپس جارہا ہوں۔ البانیہ۔"

بیانکا نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے تھے اور اپنی آواز کو کہیں روپوش کرلینا چاہا تھا۔

"شہرام! تمہیں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے آج کا دن ہی ملا تھا۔ کیا اب تم مجھے کبھی نہ مل پاؤ گے۔"

پہلے وہ یہ سوچ رہی تھی کہ شہرام اس سے ناراض ہے۔ لیکن اب اس پر یہ احساس بری طرح غالب آگیا کہ وہ اسے کھو رہی ہے۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تھا اور اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایڈون کو کچھ زیادہ ہی فیس ادا کرنے جارہی ہے۔

"یہ لیں مس بیانکا!" میڈ نے اس کی طرف پانی کا گلاس بڑھایا تھا اس نے گلاس نہیں پکڑا تھا۔ وہ ایک دم سے اٹھی تھی اور باہر کی طرف چلنے لگی تھی ہر بات سے قطع نظر کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس وقت اس کے ذہن میں شہرام سے ملنے کی سوچ کے علاوہ اور کوئی سوچ نہیں تھی۔

"مس بیانکا کہاں جارہی ہیں آپ۔ آپ نے ایسے نہیں جانا۔ یہ پھول۔ یہ پھول پکڑ کر جانا ہوگا آپ کو۔"

اس نے اپنے پیچھے یوٹیشن کو چلاتے ہوئے سنا تھا۔

وہ ہال کی طرف نہیں جارہی تھی۔ بلکہ عقبی دروازے سے باہر کی طرف نکل رہی تھی۔

"مس بیانکا!" ایک بار پھر چلا کر اسے پکارا گیا تھا۔ اس کے قدم مزید تیز ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

السائی ہوئی دھوپ میں خوابیدہ انگڑائی کا خمار تھا۔ تاجدار سورج اپنی تمام تر تابانی سمیت "حب" کے سارے عکس نکلے نصف النہار کے زاویے سے آگے کی اور سرک چکا تھا جب وہ ہال سے باہر نکلی۔

"مس بیانکا!" جوڈتھ نے حیرت سے بیانکا کو دیکھا تھا وہ مزید آنے والے مہمانوں کو ریسیو کررہا تھا اور اب خود بھی ہال کے اندر ہی جارہا تھا۔

"مجھے کہیں جانا ہے جوڈتھ۔ بہت ضروری۔ ابھی اسی وقت۔"

"لیکن مس بیانکا۔"

"لیکن نہیں جوڈتھ۔ میرے پاس وضاحت دینے کا وقت نہیں ہے۔ پلیز تم جلدی کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ ٹھہریئے میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔"

جوڈتھ کہہ کر گیا تھا اور پھر چند لمحوں بعد ہی واپس آگیا تھا۔ بیانکا وائٹ لیموزین میں اپنے برائیڈل گاؤن کے ساتھ اندر بیٹھ گئی تھی۔ جہاں ہر سو ایڈون کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔

اندر بیٹھتے ساتھ ہی اس نے جوڈتھ کو اوک بلڈنگ کا پتا سمجھایا تھا۔ لیکن ابھی گاڑی نے اسپیڈ ہی پکڑی تھی کہ وہ جیسے چونکی۔

"نہیں۔ پہلے سنٹرل پارک چلو۔ وہ وہاں نہ ہو۔"

جوڈتھ نے بیک ویو مرر سے بیانکا کو عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ بیانکا نے جوڈتھ کے اس طرح دیکھنے کو بڑی خود غرضی سے نظرانداز کردیا تھا۔

گاڑی سنٹرل پارک کے مین گیٹ پر رکی تو وہ جوڈتھ کے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی باہر نکلی تھی اور پارک کے ان گوشوں میں گئی تھی۔ جہاں وہ اور شہرام اکثر و بیشتر بیٹھا کرتے تھے۔ جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور جہاں آخری بھی۔ وہ یہاں نہیں تھا۔

وہ اس چیز کو بھی خاطر میں نہ لائی کہ لوگ اس کو اس سراپے میں ادھر سے ادھر بھاگتے ہوئے کیسی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

"فالی ریسٹورنٹ چلو۔ وال اسٹریٹ۔ اینتھو یارڈ۔"

گاڑی میں دوبارہ بیٹھ کر اس نے کہا تھا۔ جوڈتھ نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی بلکہ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے مس بیانکا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا۔ فالی ریسٹورنٹ چلو۔ تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتے' ورنہ میں ابھی گاڑی سے نیچے اتر جاؤں گی۔"

اس نے دھمکی دی تھی۔ جو کام کر گئی تھی۔ جوڈتھ نے گاڑی اسٹارٹ کرکے موڑی تھی۔ ریسٹورنٹ بند تھا۔ یہ دن کا وقت تھا اور باربی کیو آئٹم رات کے لیے مختص تھے۔ بیانکا مایوس ہوگئی تھی۔

"اوک بلڈنگ۔"

اس نے پھر تیزی سے کہا جوڈتھ نے سر جھٹک کر حکم پر عمل درآمد کیا تھا۔

اوک بلڈنگ کے آگے کی سڑک پگھلی ہوئی برف کی نمی کے باعث کچھ مزید کالی دکھتی تھی' درمیانی ہیل والے اس کے سنگ جراحت کے سے سفید جوتوں جن میں نقرئی پن کی جھلک تھی نے سڑک سے برف اور برف سے Oak بلڈنگ کے دروازے تک کی سیڑھیوں کا فاصلہ بڑی عجلت میں طے کیا تھا۔ اس کے سفید برائیڈل گاؤن کے دامن سے نمی اور میلا پن جھلکنے لگا تھا۔ اس کی لاپروائی خود غرضانہ ہو رہی تھی۔

یہ تیسری جگہ تھی۔ ایک طرح سے آخری بھی۔

وہ جانتی تھی کہ پھر اس کے بعد کیا تھا۔ صرف رہ گزر کی خاک اور لامتناہی تنہائی۔

شہرام کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اس بات کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ اگرچہ اس کا دل پہلے ہی اس کی گواہی دے چکا تھا۔

لینڈلیڈی کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اطلاعی گھنٹی کو دبایا نہیں تھا بلکہ دبائے ہی رکھا تھا۔

وہ اتنی بے چینی اور بے قراری کی حالت میں تھی کہ اسے یقین تھا کہ اگر اب۔ ہاں اب اگر وہ کسی بھی کسی غلطی یا کوتاہی کی مرتکب ہوئی تو وہ شہرام کو دوبارہ اپنی پوری زندگی میں نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔

لیکن غلطی کرنے کا وقت آنے والا نہیں تھا۔ بلکہ وہ وقت آکر جاچکا تھا۔ اور وہ شہرام سمیت بہت کچھ کھو دینے والی تھی۔

دروازہ کھلا اور لینڈلیڈی اہمنڈا گھنٹی کے اس غیر مہذبانہ استعمال پر اپنی ناگواری چھپا نہ سکیں۔

"فرمایئے۔" بیانکا کو پہچاننے میں انہیں چند ہی لمحے لگے تھے۔ یہ چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ چند لمحے بھی صرف اس وجہ سے لگے کہ وہ آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

بیانکا کو دیکھ کر۔ اور اس حالت میں دیکھ کر ان کی ناگواری نے حیرت کی صورت اختیار کرلی تھی۔

"شہرام۔ شہرام کہاں ہے۔"

وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور مایوس واپس آئی تھی۔ اس کے باعث اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سوال اس نے بمشکل مکمل کیا۔

لیڈی اہمنڈا کا منہ اتر گیا اس سوال کا جواب یقیناً بیانکا کو مزید پریشان کردینے والا تھا' وہ ایک ٹک اس کا سراپا دیکھے گئیں۔

وہ وائٹ برائیڈل گاؤن میں ملبوس۔ تازہ کھلے زخم کی مانند گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور مہنگے ہیروں سے دمکتے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ وہ کہاں سے آرہی تھی۔ کیا چھوڑ کر آرہی تھی۔ ان سارے

سوالوں کے جواب اس کے تن سے لپٹی ایک ایک چیز دے رہی تھی۔ برعکس ہربات کے اس روپ میں وہ اتنی دلکش اور اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اگر اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اُڑ رہی ہوتیں تو لیڈی ایمنڈا اسے گلے سے لگا کر بے تحاشہ چوم ڈالتیں۔

"وہ چلا گیا ہے۔" انہوں نے سچ بتا دیا اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

"کہاں۔۔۔؟" زمین اس کے پیروں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح کانپنے لگی۔

"واپس اپنے ملک۔۔۔ البانیہ" ایمنڈا نے اداسی سے کہا۔

"کب؟"

"کل صبح۔۔۔ اس نے سارا حساب کتاب چکتا کر دیا تھا اور وہ اپنا سارا سامان لے گیا ہے۔ میں نے خود اس کا ایئر ٹکٹ دیکھا تھا۔"

آخری بات کا افسانہ انہوں نے لیول کیا تھا کہ بیانکا یقین کرلے کہ وہ کل صبح چلا گیا ہے۔

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔

گرنے سے بچنے کے لیے بیانکا نے سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھاما تو ایمنڈا کو پتا چل گیا کہ اس کی بات کو سچ مانا گیا ہے۔

دہلیز اور سڑک کے درمیان کی ساکت سیڑھیوں کو اس نے پشت کی طرف سے طے کیا تھا جیسے واپسی کے سفر میں بھی آگے ہی جانے کی خواہش مند ہو اور چکنی سیڑھیوں سے پھسلتے خود کو سنبھالنے کا اس نے تردد ہی نہیں کیا تھا اب اس سے زیادہ وہ اور کہاں گرے گی۔ کھائی میں گرنے والے کے پاس ایک اطمینان تو ہوتا ہے اگرچہ لمحے بھر کے لیے ہی سہی کہ اب وہ اس کے بعد مزید نیچے کہاں جائے گا۔

شاید وہ اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی یا خود کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئی تھی۔ یا شاید زمین کی کشش اس قدر بڑھ گئی تھی جو اس کے پورے وجود کو آگئی کہ وہ برف کی پتلی تہہ چڑھے آخری زینے پر ڈھتی ہی چلی گئی۔۔۔ سارے مشکل امتحانوں کے بعد یہ آسان امتحان اس کی زندگی میں ابھی باقی تھا۔ جس میں وہ پہلے سے ہی فیل ہو چکی تھی۔

اس کا نم گاؤن مزید گیلا ہونے لگا اور ٹھنڈے ماربل نے برف کی یخ بستگی کو اس کے پورے وجود میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا بھر گیا تھا۔ جیسے مدتوں ان آنکھوں نے سورج نہ دیکھا ہو۔

"شہرام!" اور یہ لفظ اس کے لبوں سے یوں ادا ہوا جیسے وہ سالوں سے ظلم کا شکار ہی چلی آرہی ہو۔

گھٹنوں میں منہ دے کر اس نے وہ آسن جما لیا جو کسی کو ابدی طور پر پالینے کے لیے رواں رکھا جاتا ہے۔

"شہرام۔۔۔ اب تم مجھے کیسے ملو گے شہرام؟"

"اب میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈوں شہرام۔"

خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس نے زوال آلود سورج سے کہا۔ اور فریبی موسم نے نہ بدلنے کی جیسے بے شمار قسمیں اٹھالیں۔

"مس بیانکا اب چلیے۔" جوڈتھ نے قریب آکر بنا کسی تاثر کے عاری لہجے میں پوچھا تھا۔

بیانکا نے سر اٹھا کر جوڈتھ کو دیکھا اور اس کھوکھلے لہجے میں بھی اس نے اپنے لیے چھپے ہوئے طنز کو پالیا تھا۔

"ہمیں دیر ہو رہی ہے۔۔۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

خاموشی کے طویل لمحوں میں بیانکا جوڈتھ کے پیچھے کے دھاری دار آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔

"ہاں چلو!" وہ جیسے کوئی فیصلہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ڈریس تبدیل کرنے کے بعد اس نے اپنی شادی میں شرکت کی تھی۔

پھر تقریب کے بعد دیر تک چلنے والی پارٹی نے اسے تھکا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼
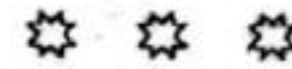
رات میں وہ ڈینیم بلاک میں واقع ایڈون کے گھر آئی تھی۔ اپنے نئے گھر ایک سال بعد۔۔۔ چار رتوں کے آنے اور جانے کے بعد۔

نیچے ڈانس فلور پر سارے لڑکے لڑکیاں اس کی آمد کے بعد شور مچاتے چلے گئے تھے۔

بیانکا نے ہیڈ فون کانوں سے لگایا تھا اور اس کے بعد وہ مزید کانوں کو بلے کیا تھا۔

جب میں خود کو آئینے میں دیکھتی ہوں۔

محسوس کرتی ہوں ایک خوشبو۔

جس میں تمہاری راحت پنہاں ہے

یہ مجھ پر کبھی خواب کی طرح وارد ہوتی ہے۔

بیانکا نے اپنے گلے میں پڑے تعویذ کو ہاتھ لگا کر چھوا تھا اور محسوس کیا تھا۔

"تمہاری محبت نے چیڑ جیسے مضبوط درخت کو بھی مات دے دی ہے شہرام! دیکھو اب اس میں سے چیڑ کی جڑ کی خوشبو نہیں آتی۔۔۔ بلکہ تمہارے وجود کی باس اٹھتی ہے۔"

ایک آنسو اس کی آنکھ میں آیا تھا اور پھر بہتا چلا گیا تھا۔

میں نہیں جانتی تھی کہ محبت کیا ہے۔

لیکن اب میرا دل محبت سے بھر گیا ہے۔

صرف تمہاری محبت سے

تو کیا شاعر بھی اس کے دل کا حال جانتا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے ہٹ میکنگ کرنے لگی

"کیا تمہیں دولت عزیز ہے بیانکا۔"

"میں ان لوگوں کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہوں۔"

"خدا بننے کی کوشش مت کرو بیانکا۔۔۔ یہ اختیار اللہ کے پاس ہے۔۔۔ اس کے پاس رہنے دو۔" وہ اس کے بٹن کو اوپر کرتی چلی گئی تھی۔

"خدا بننے کی کوشش مت کرو۔۔۔ مت کرو۔۔۔ مت کرو۔" Scratching تیز سے تیز تر ہونے لگی تھی۔

بارش نہیں برسے گی۔۔۔ نہیں برسے گی۔۔۔ نہیں برسے گی' بے تحاشا آنسو بیانکا کی آنکھوں میں آگئے تھے۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میرے مشاہدے کو اتنا بے مول تو نہ کرو۔" نیچے ڈانس فلور پر لڑکے لڑکیاں پاگل ہو گئے تھے۔

"کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

ہماری غلطیاں ہمیں لے ڈوبتی ہیں
یہ ڈوبتا بہتا پانی کے ڈوبنے جیسا ہے

"بولو بیانکا۔"

اور آنسوؤں نے اس کی دونوں آنکھوں سے بہنا شروع کر دیا۔ ہونٹ بھینچ کر وہ بڑے ضبط سے اپنا غم پیتی رہی۔

"تم سے محبت کرنے کے بعد میں خود سے محبت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔"

"میں واپس جا رہا ہوں۔"

Delay (ایفکٹ) نے آواز کو افریقہ کے بڑی آنکھوں والے جادوگروں کی آوازوں کی طرح پراسرار کر دیا تھا۔

میں جا رہا ہوں۔۔۔ جا رہا ہوں۔۔۔ جا رہا ہوں۔

اور وہ چلا گیا۔

بے وفائی کے بعد یادوں کو
آگ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے

"میرے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ یہ میری محبت کے پاس ہے۔"

گلے پر ہاتھ پھیر کر اس نے دوبارہ تعویذ کو چھوا تھا۔

D'B اور A کے بٹن انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ ساؤنڈ سے نکلتی تیز آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔ لوگ etc کے نشے میں نیم پاگل ہو گئے تھے۔ جیسے بہت سارے بندر چھوٹی سی جگہ پر ناچ رہے ہوں۔ یہ تیز آوازیں اس کے لیے کارآمد تھیں۔ کوئی اس کے رونے کی آواز کو نہیں سن سکتا تھا۔

"بیانکا میری جان۔"

مارٹا نے چلاتے ہوئے اسے پکارا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ بیانکا پچھلے دو منٹ سے مسلسل جنونی انداز سے

Scratching کر رہی تھی۔ مارٹا نے اس کے دونوں ہاتھوں کو تھاما تو وہ چونک گئی تھی۔

"میری جان بس کرو۔"

مارٹا اس کا آنسوؤں سے لبریز چہرہ دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔

"خود پر اتنا ظلم مت کرو ڈیئر!" اس نے اسے دونوں کندھوں سے تھاما تھا۔ ایک سال ہو گیا تمہارا غم کم کیوں نہیں ہوتا۔۔۔ تم نے اسے خود کھویا ہے وہ تو تمہارا ہی تھا۔ پر اپنی غلطی کی خود کو اتنی بڑی سزا تو مت دو جان۔۔۔ ہائے اللہ۔۔۔ یہ خوب صورت چہرہ جب آنسوؤں سے تر ہوتا ہے تو۔۔۔ تو یقین جانو میرا دل خودکشی کر لینے کو چاہتا ہے۔۔۔ لگتا ہے دنیا جیسے ختم ہو گئی۔"

اسے گلے سے لگائے اور دلاسا دیتے دیتے مارٹا خود بھی افسردہ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
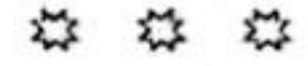
"بیانکا!"

وہ دھوپ سے دھلا ایک اجلا دن تھا جب کسی نے اسے پکارا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں میں کچھ سبزیاں پھل اور گھر کی دوسری اشیاء لیے چلی آرہی تھی جب اس پکار پر اس نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا تھا اور دونوں ہاتھوں میں موجود شاپر اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر نیچے زمین پر گر گئے تھے۔ سڑک پر پھل، سبزیاں اور مختلف کین بکھر کر لڑھکنے لگے تھے۔

"کیسی ہو بیانکا؟" نرم آواز سے مسٹر ایڈون نے پوچھا تھا۔

بیانکا پورے چار ماہ بعد ایڈون سے مل رہی تھی۔

بیانکا کی موجودہ زندگی کی کتاب میں سے اگر کلب کی ہنگامہ خیز جاب کے صفحہ کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا تو یہ زندگی ایک بوڑھی کشور بیوہ کی سی زندگی تھی۔ ایسی بوڑھی بیوہ جس کے پانچ جوان بیٹے پانچ مختلف براعظموں میں رہائش پذیر ہوں اور وہ روز بلاناغہ گھر سجا کر ان کی آمد کا انتظار کرتی ہو۔

بدقسمتی سے ایک دن ان پانچوں کے انتقال کی خبر آجائے۔

چار ماہ پہلے وہ اپنا مقدمہ جیت چکی تھی۔ اسے اس کے اثاثے واپس مل گئے تھے۔ اگرچہ وہ اس پراپرٹی کا قبضہ حاصل نہ کر سکی تھی جو ڈیڈ الیاس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی لیکن اس کی خوشی کے لیے یہ بات ہی کافی تھی کہ وہ ان لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا چکی ہے۔

یہ کام اتنا آسان نہیں تھا اور بہت زیادہ مشکل بھی نہیں۔

کیتھی نے ٹھیک کہا تھا کہ چور اور قاتل اپنا سراغ کہیں نہ کہیں ضرور چھوڑ جاتے ہیں اور مسٹر ایڈون کی بات بھی درست ثابت ہوئی تھی کہ دولت اپنی طاقت دکھا کر رہتی ہے اس طرح کے اچھے لوگ بھی بُرے بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

اس کے مقدمے میں تین چار چیزیں فائدے مند ثابت ہوئی تھیں۔

غفار جلال کی محکمہ زراعت سے غلط بیانی پھر اس طرح پر اسرار طریقے سے روپوش ہو جانا۔۔۔ اور مائیکل کی بیوہ۔۔۔ جو اس سارے معاملے میں ان ڈائریکٹ ملوث رہی تھی۔۔۔ اگرچہ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی کہ غفار جلال اس کے شوہر کے نام سے کیا کیا کر رہے ہیں تاہم ایک بڑی رقم کے عوض اس نے وہ کیا تھا جو ان دونوں نے اسے کہا تھا۔

مائیکل کی بیوہ کے سامنے آنے کے بعد کیس الجھتا ہی چلا گیا تھا۔

کچھ اس مسئلے پر مسٹر ایڈون کے نام کی دہشت تھی دوسرا یہ مقدمہ ایڈون کی نئی نویلی جواں سال بیوی کا تھا۔ ان دو باتوں نے مخالف سمت سے کیس اور موقف دونوں کو بہت کمزور کر دیا تھا۔

عدالت کی ہر کارروائی کے بعد وہ مام ڈیڈ کی قبروں پر جاتی تھی انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کرتی تھی۔ وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہتی تھی۔ اتنی تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اب۔۔۔ وہ روتی نہیں تھی۔۔۔ بلکہ مسکرا

مسکرا کر انہیں ساری باتیں سناتی تھی۔

اسے اپنے جیت جانے کا کامل یقین تھا۔

وہ پچھلے ایک سال سے دعائیں کر رہی تھی اسے زندگی کے اندھیروں کا روشنی میں بدل جانے کا انتظار تھا۔ حیفہ مام کی نصیحت غلط نہیں ہو سکتی تھی۔

آٹھ ماہ بعد انتظار سے پتھرائی اس کی آنکھوں کو قرار آیا تھا۔ وہ مقدمہ جیت گئی تھی اخبارات اور میگزین نے اسے۔۔۔ Tishri Ioud کی مالک ڈی جے بیانکا کو اس کی جیت کی مبارک باد دی تھی۔ اور اس دوران میں ان کو اس مشہور ڈی جے کی ذات کے تاریک پہلوؤں کا اندازہ ہوا تھا۔

الیاس احمد کے قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا لیکن حیفہ مام کا قتل ثابت ہو گیا تھا۔ ان سب کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ تایا غفار، چچا جلال، تائی شہناز اور چاچی فیروزہ اور احمد جس کا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ بھی کھو بیٹھے تھے۔

وہ یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ نہ تو وہ مسٹر ایڈون کی وجہ سے یہ مقدمہ جیت سکی ہے۔ اور نہ ہی غفار جلال کی غلطیوں کی وجہ سے۔۔۔ وہ خود سمجھتی تھی کہ کیس اس کی طرف سے اس قدر جھول دار تھا کہ اللہ کی رضا اور مدد کے بغیر وہ کبھی بھی فاتح نہیں ہو سکتی تھی۔

جس دن وہ یہ مقدمہ جیتی تھی اسی دن اس کی ایڈون سے آخری بار بات چیت ہوئی تھی اگرچہ یہ تعلق بہت پہلے کا ہی ٹوٹ چکا تھا۔ شادی کی پہلی رات سے ہی۔

شہرام کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب وہ مایوس ہو کر جوڈتھ کے ساتھ واپس گاڑی میں بیٹھی تھی تو اس نے اسی وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اب آگے اپنی زندگی میں کیا کرنا ہے۔

ڈینم بلاک مسٹر ایڈون کے گھر آ کر اس نے اپنی گھبراہٹ پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔

"مجھے تم سے ڈائیورس (طلاق) چاہیے ایڈون۔۔۔ ابھی۔۔۔ وضاحت نہیں دوں گی کہ میرے پاس وضاحت دینے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔۔۔ اور میری خطا اس قدر بڑی ہے کہ ساری رات بھی معافی مانگتی رہوں تو تسلی نہ ہو گی۔"

"بیانکا یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"وہی جو تم سن رہے ہو ایڈون۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی۔ اس بات کا اندازہ تو تمہیں بھی ہو گا۔ پر مجھے تم سے نفرت بھی نہیں تھی۔ مجھے لگا تھا تمہارے ساتھ زندگی بہتر گزر جائے گی۔ لیکن افسوس میرے پاس اب تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا۔ نہ محبت۔۔۔ نہ خلوص۔۔۔ نہ وفاداری۔"

"بیانکا۔ تم؟" ایڈون نے حیرت اور منت سے پکارا تھا۔

"نہیں ایڈون! تمہارا کوئی بھی لفظ مجھے جانے سے نہیں روک سکتا۔ اور میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم اتنے اچھے ہو کہ تمہارے آگے میں خود کو ہمیشہ داغ دار سمجھتی رہوں گی۔"

"تمہیں وہاں ہی انکار کر دینا چاہیے تھا بیانکا۔"

ایڈون تاسف سے بولا تھا۔

"وہاں انکار اس لیے نہیں کیا کہ میں میڈیا والوں کے سامنے تمہارا تماشا نہ لگوانا چاہتی تھی۔ اب بھی ایسا نہیں چاہتی۔ تم جب تک چاہو اس طلاق کو راز میں رکھ سکتے ہو۔ چاہو تو ساری زندگی۔ میرا نہیں خیال کہ تمام عمر اب میری زندگی میں کوئی آنے والا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے اس رات ایڈون سے کہے تھے۔ پھر وہ جوڈتھ کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ آ گئی تھی۔

"دلوں کے ملا دینے کا وصف اللہ کے پاس ہے۔ وہ یہ کام وقت آنے پر بخوبی کرے گا۔" اسے اللہ پر یقین تھا۔

ایک ہفتے بعد ایڈون اس کے اپارٹمنٹ آیا تھا۔

"میں تمہارا مقدمہ ضرور لڑوں گا بیانکا۔ بنا کسی فیس اور جذبات کی بھیک کے۔" بیانکا چند لمحے خاموشی

سے لیڈون کو دیکھتی رہی تھی۔
"اگر اچھائی کوئی روپ لے لے تو وہ روپ یقیناً" تمہارا ہو گا لیڈون" بیانکا نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ زندگی کی ساری آسائشیں اسے واپس مل گئی تھیں۔ لیکن دل کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی غار کی طرح تاریک اور خالی تھی۔ ایسا غار جہاں برسوں سے کسی ذی روح نے سانس تک نہ لیا ہو۔

☆☆☆

"ایک سال ہو گیا بیانکا۔ تمہارا کوئی میش اپ نہیں آیا۔ میرا نہیں خیال کہ اب دولت کی کمی اس چیز کے آڑے ہو گی۔" ڈرائننگ روم میں بیٹھتے ہوئے لیڈون نے ہنس کر کہا تھا۔

"آپ کافی لیں گے یا کچھ اور؟" وہ تھیلیوں میں سے مختلف چیزیں نکال کر کچن کاؤنٹر پر رکھ رہی تھی۔ درحقیقت وہ لیڈون کے سامنے بیٹھنے سے گریزاں تھی۔

"یہاں بیٹھو۔ بیانکا۔ میرے ساتھ۔" لیڈون کے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ نا چاہتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"بہت عرصہ میں یہی سمجھتا رہا کہ تمہاری نیت مجھے دھوکا دینے کی ہی تھی۔ یہ شادی ہو بھی جاتی تو تم نے مقدمہ جیت لینے کے بعد مجھ سے طلاق لے لینی تھی۔ مگر میں غلط ثابت ہوا۔ تمہیں سمجھ نہیں سکا۔ تم کسی اور کو چاہتی ہو' یہ بات میں کیوں نہ جان سکا۔" لیڈون نے پوچھا تھا۔

"مجھے خود اس بات کا اندازہ بہت بعد میں ہوا کہ میں اسے چاہتی ہوں۔ اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"پھر اب تم اکیلی کیوں ہو بیانکا۔ اس کے ساتھ کیوں نہیں ہو۔ کیا وہ تم سے ناراض ہے۔ خفا ہو گیا ہے۔ ساں نہیں رہا ہے۔"

"وہ مجھ سے کھو گیا ہے۔" پلکیں جھکا کر آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے اس نے افسردگی سے کہا تھا۔

"غلطی میری بھی ہے۔ مجھے اب تک طلاق کا اعلان کر دینا چاہیے تھا۔ شاید وہ ابھی تک یہ ہی سمجھ رہا ہو کہ تم میرے ساتھ ہو۔"

لیڈون نے کہا تو بیانکا چونکی تھی۔ ہاں۔ ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے آج تک اس رخ سے کیوں نہ سوچا۔

"حیران مت ہو بیانکا۔ بلکہ خوش ہو جاؤ۔ وہ مل گیا ہے۔ یہ دیکھو۔" لیڈون نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بیگ میں سے ایک پارسل نکالا تھا۔

"یہ اس نے تمہیں تمہارے مقدمے کی جیت اور ہماری شادی کی پہلی سالگرہ کے گفٹ کے طور پر بھیجا ہے۔ وہ شادی جو۔ خیر چھوڑو۔ اب آکر مجھے اندازہ ہوا کہ۔"

"کیا۔" بیانکا چلائی تھی۔

"کیا واقعی۔؟"

اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ لیڈون اپنی روانی میں کیا بولتا جا رہا ہے۔ اور جب اسے یقین آیا تو اس نے چیختے ہوئے پیکٹ کو تقریباً" چھینا تھا۔

ایک شفاف کرسٹل گلوب۔ بٹن دبانے سے جس کے اندر برف باری ہوتی ہے اور میوزک چلتا ہے۔ بیانکا کو نجانے کیوں یہ میوزک دنیا کا سب سے خوب صورت ترین میوزک لگا۔

اس نے جلدی جلدی سے خط کو پڑھا تھا۔ مقدمے کی جیت پر شہرام نے اسے مبارک باد دی تھی۔

"اور شادی کی پہلی سالگرہ بھی مبارک ہو بیانکا۔ تنہائی میں جینے والے تمہاری دعاؤں کے منتظر ہیں۔

شہرام"

آخری لائن پڑھ کر بیانکا ہنسی تھی۔ اور ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

"یہ لائن تم نے نہیں لکھی شہرام۔ بلکہ یہ اللہ نے تمہارے ہاتھوں سے لکھوائی ہے۔" پارسل کے باہر پتا لکھا ہوا تھا اور یہ پتا ہی اب اس کی متاع جان تھا۔

لمحے بھر میں بیانکا نے خود کو دنیا کے تمام حسین باغوں کا محافظ تصور کر لیا تھا۔

"خوش ہو بیانکا؟"

"ہاں۔ لیڈون۔ تمہاری شکر گزار بھی ہوں۔"

"میں اس طلاق کا اعلان اب جلد ہی کر دوں گا۔"

لیڈون کے جانے کے بعد اس نے تین چار ائیرلائن کمپنیوں کے آفس فون کیا تھا اگر آپ یہ پروسسنگ میں میری ذمہ داری خود ہینڈل کریں تو میں جانے کے لیے آپ کی ائیرلائن کا ہی ٹکٹ لوں گی۔

اس نے تین چار ائیرلائن کمپنیوں کو ایسا کہا تھا۔

یہ طریقہ کار اگرچہ کافی پرانا ہو چکا تھا لیکن دولت کی طاقت تو آج بھی اتنی ہی تھی۔

☆☆☆

ارجیری کی فضا میں کائنات بننے کے پہلے دن کی خاموشی تھی۔ بیانکا نے اپنے دل کو بری طرح دھڑکتے ہوئے پایا تھا۔ مدریسا ایرپورٹ سے یہاں تک کا سفر اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز سے تیز تر کر رہا تھا۔ کل رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بھی اسے بھوک نہیں تھی۔ وہ سوئی بھی نہیں تھی۔ اور اسے نیند بھی نہیں آرہی تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک طویل اور خوشگوار سانس اندر کھینچا تھا۔ جنگلی درختوں سے ٹکرا کر آتی ہوا میں خون کو مصفیٰ کر دینے کی طاقت تھی۔ اس گہرے سانس نے اس کے سفر کی ساری تھکن کو پلک جھپکتے میں دور کر دیا تھا۔ وہ مسکرائی۔ شہرام کی نقل آنار نافائدہ مند ثابت ہوا تھا۔

اس نے چاروں طرف نظر گھمائی۔ اونچے اونچے درخت۔ بل کھاتی پگڈنڈیاں' ڈھلوانی سڑکیں۔ اور دور تک پھیلا چھوٹے بڑے سبز پہاڑوں کا سلسلہ۔ یہ دیس شہرام کی باتوں سے زیادہ مسحور کن تھا۔

اپنا مطلوبہ پتا ڈھونڈنے میں اسے صرف کچھ ہی دیر لگی تھی۔ "مہمان ذائقہ" کا بورڈ دور سے ہی چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتی گئی اور زمین اسے پیچھے کو کھینچنے لگی تھی۔ کشش ثقل الٹ ہو گئی تھی جو اس کے قدموں کو زمین پر ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ ریسٹورنٹ کے آگے جا کر اس نے بمشکل خود پر قابو پایا تھا۔

"مجھے شہرام سے ملنا ہے۔"

اس نے داخلی دروازے پر کھڑے ایک لڑکے سے کہا تھا۔ دوسری بولی میں پوچھے گئے سوال کے باعث لڑکا بیانکا کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اپنے سوال کو مزید ٹھہر ٹھہر کر دہرانے کا سوچ ہی رہی تھی جب اس نے اپنے دائیں طرف سے ایک آواز سنی تھی۔

بی۔ آن۔ کا۔ (بیانکا)

آواز میں نسوانیت اور خوشی کی پھوار پھوٹتی تھی اور چاروں طرف پھیلتی چلی گئی تھی پھر بیانکا نے داخلی دروازے کے ساتھ بابلی کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ایک عورت کو اپنی طرف تیزی اور جوش سے بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس عورت کے سر پر سفید کسابہ بندھا ہوا تھا۔ اور سفید ایپرن اس کے پورے وجود کو ڈھک نہیں پا رہا تھا۔

دعائے مغفرت

مقبول مصنفہ نعیمہ ناز کی والدہ زاہدہ خاتون طویل علالت کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔
اناللہ وانا الیہ راجعون
ماں کی دائمی جدائی بہت بڑی محرومی ہے۔ انسان کو عمر کے ہر دور میں ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نعیمہ ناز کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نعیمہ ناز اور دیگر اہل خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔
ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین
قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☼ ☼ ☼

اماں نتھوبیہ اپنی زندگی میں بہت سے سیاحوں سے مل چکی تھیں۔ اکثر سیاح ان سے ترکیب وغیرہ پوچھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں کی چھوٹی بڑی کترنیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ ایسے میں بیانکا سے بات چیت میں ان کو ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔

وہ جو شہرام کا پوچھتے وقت تجسس اور اشتیاق سے لبریز تھی اب ان کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

"میں۔ میں بہت بری ہوں۔ آنٹی نتھوبیہ۔ میں نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"نہیں۔ تو بری نہیں ہے۔ وقت برا تھا۔ جس نے تجھ سے یہ فیصلہ کروایا۔" وہ پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔

"اور کیا کیا بتایا اس نے میرے بارے میں۔"

"سب کچھ۔ جتنا وہ ایک وقت۔ ایک رات کے اندھیرے میں بتا سکتا تھا۔ اور پھر صبح ہوتے ہی وہ چلا گیا۔"

"آپ نے اسے کیوں جانے دیا۔ آپ اسے روک لیتیں۔"

"وہ وقت بھی برا تھا۔ روکتی تو اس کے دل میں کسک رہ جاتی کہ اس نے ماں کا حکم نہیں مانا۔ اب جہاں ہوگا اس کسک سے تو بے پروا ہوگا۔"

"لیکن وہ چلا کیوں گیا؟"

"سیرین اور حسنی کے بیٹے کا عقیقہ تھا اس دن۔"

"تو کیا۔ کیا وہ اب بھی سیرین سے۔"

بیانکا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"کچھ نئے زخم پرانے زخم بھی جگا دیتے ہیں بیٹی۔ تو پریشان نہ ہو۔"

"میں اسے کہاں ڈھونڈوں گی اب۔ میں تو پچھلے ایک سال سے متلاشی ہوں۔ اتنے بڑے دیس میں۔ اتنے بڑے ہجوم میں۔ میں اسے کہاں کہاں تلاش کروں گی۔"

"تو ڈھونڈے گی۔ جن سے محبت ہوتی ہے، ان کا چہرہ ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں بھی پہچانا جاتا ہے۔"

"اگر وہ لاکھوں کے مجمعے میں موجود نہ ہو تو۔ اگر وہ اس دیس میں ہی نہ ہو تو؟"

"ابھی میری سانسیں ہموار ہیں۔ جب یہ اکھڑنے لگیں گی تو میں سمجھ جاؤں گی کہ اب اس کے قدموں تلے ایک نئی دھرتی ہے۔ جیسا پچھلی بار ہوا تھا۔"

"اور اگر میں اسے پھر بھی نہ ڈھونڈ سکی تو۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تو کبھی نہ کبھی تو وہ یہاں واپس آئے گا ہی۔ اور پھر میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جائے گا۔ یہاں۔ تجھے محسوس کرنے کے لیے۔"

اماں نتھوبیہ نے اشتیاق آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو بیانکا نے ایک جھٹکے سے اپنا سر ان کی گود سے اٹھایا تھا۔ شاید اس کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ خود بھی تو کتنی دیر سے یہ ہی کر رہی تھی۔ ان کی گود میں سر رکھے وہ شہرام کے وجود کی مہک کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

زمردی ذرے اڑاتی دھوپ چار اطراف کی راجدھانی پر قائم و دائم تھی۔ سورج کی شعاعوں میں ٹھمری کے وہ راگ قید تھے جس میں طنبورے کی گونج توت انجیر کے سفید پتوں کی طرح کڑک ہوتی ہے۔

ٹرین سے اتر کر وہ پلیٹ فارم سے باہر نہیں گئی تھی، بلکہ وہیں ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تاتاریوں کے پیش گوئیاں کرنے والے رمالوں کی آنکھوں والی چمک اور اداسی تھی۔

البانیہ میں رہتے ہوئے اسے پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ شہرام کو تلاش کرتے کرتے پورے تیس دن۔

اور اب وہ واپس جا رہی تھی۔ وہ تھکی نہیں تھی، اگر کوئی اسے یہ بتا دیتا کہ شہرام فلاں پہاڑ پر موجود ہے جہاں جانے کا راستہ ایک سال میں مکمل ہوتا تو وہ بنا سوچے سمجھے اس پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیتی۔ لیکن یہ تلاش بے تلاش تھی۔ وہ تو خدا سے صرف یہ ہی دعا کر سکتی تھی کہ شہرام اماں نتھوبیہ سے جلد ہی مل لے۔ یہ ملاقات ہی اس کے لیے زندگی کے نئے پیغاموں کی پیامبر بن سکتی تھی۔

اماں نتھوبیہ سے ملنے کے اگلے دن وہ کوریئر سروس والوں کے آفس گئی تھی۔ پالیسی میں تبدیلی کی وجہ سے بھیجنے والے کو اپنا نام اور پتا لازما" لکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس چیز پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی کہ ایڈریس کس جگہ، کس شہر کا لکھا جا رہا ہے۔

"آپ سیریل نمبر دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ پارسل ازمیر سے بھیجا گیا ہے یا کسی اور جگہ سے؟" بیانکا نے کہا تو ریسپشنسٹ لڑکے نے پارسل لے کر کمپیوٹر پر سیریل نمبر لکھا۔

"یہ پارسل تیرانا شہر سے بھیجا گیا ہے۔"

اور اسی دن وہ تیرانا شہر آگئی تھی۔ اس نے شہرام کو تلاش کیا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں، لمبے لمبے بازاروں میں اور اونچے اونچے مالوں میں۔ وہ تیرانا کے تمام پارکوں میں گئی اور جاتی رہی۔ اس نے فوک فیسٹیولز میں شرکت کی اور سارا سارا دن بلا مقصد سڑکوں پر گھومتی رہی۔ اسے نہیں ملنا تھا اور وہ نہیں ملا۔ ابھی شاید اللہ کی مرضی نہیں تھی۔ شاید اسے اس چیز کے لیے بھی مسلسل نماز حاجت پڑھنی تھی۔ کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ جس کے پاس محبت نہ ہو اس کے پاس پھر کچھ نہیں رہتا۔

سر اٹھا کر اس نے ایک نظر پیلے آسمان کو دیکھا۔ سونا پگھل کر کندن کی شکل میں سارے آسمان پر بچھا پڑا تھا۔ وہ بڑے عرصے بعد آفتاب سے نظریں چار کر رہی تھی۔

حنیفہ ماں کہا کرتی تھیں۔

"ممبل کے درخت پر جب جب بہار آتی ہے سارے درختوں میں سب سے خوب صورت درخت

لگتا ہے۔ لیکن اس کی لکڑی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ انسان کی مثال بھی ایسی ہے یہ اوپر سے کسی قدر خوشنما کیوں نہ ہو جب تک محبت کرنے کے فن سے ناآشنا ہے، سمبل کی طرح بے کار ہے۔"

"محبت کرنے کا فن ہم سیکھ جاتے ہیں مام۔ لیکن محبت حاصل کرنے کے ہنر میں کبھی بھی ماہر نہیں ہوپاتے۔" اس نے خود سے کہا اور کھینچ کر گلے سے تعویذ نکال لیا تھا۔

"تم سمجھ نہیں سکے شہرام۔ تم اتنی سی بات نہ سمجھ سکے کہ یہ تعویذ دراصل منحوس ہے۔ یہ جس کے پاس ہوتا ہے وہ محبت سے محروم ہوتا ہے۔"

تعویذ کو آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے اس نے اس کی چمک دار سطح کو دیکھا۔ ایک آٹھ نو سال کی بچی جو اپنے ننھے ہاتھ کے مکے کے اوپر ٹھوڑی ٹکائے اپنی آب دار آنکھوں میں کسی اجنبی جذبے کا انتظار لیے نہ جانے کس طرف دیکھتی نظر آتی ہے۔

"بابا زلاری سے کسی نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس طرح کی شبیہہ اس پر کندہ کریں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ "حب" تعویذوں پر ازل سے پھولوں اور راج ہنسوں کا راج ہے۔ پھر آخر انہیں یہ مختصر خاکہ گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے تعویذ کو آخری بار دیکھا اور پھر پرے ہوا میں اچھال دیا۔

کوئی نئی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رکی اور رش بڑھنے لگا۔

بیانکا نے ستون کے ساتھ سر جوڑ لیا۔ البانیہ میں آخری دن اور یہ آخری لمحے اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ دوبارہ اس جگہ پر بلاوا اسے نہ جانے کب آئے گا۔ پہاڑوں سے گھرے اس دیس میں، جس کی فضا میں شہرام کی سانسوں کی مہک تھی۔ بے تحاشا رش میں اس نے اپنا سامان پکڑ کر باہر نکل جانے کا ارادہ باندھا، لیکن وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ اس متحرک ہجوم میں ایک چیز تھی جو ساکن تھی۔ گہرے منجمد پانیوں میں مدتوں سے پڑی ہوئی بند صدف کی طرح۔

ٹرین کے اندر کھڑکی کے پار بیٹھا وہ پانی کو اس قدر آہستگی سے پی رہا تھا کہ گلاس کے اندر کا سیال کسی بے رنگ جیلی کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کی شیو بنا اسٹائل کے بڑھی ہوئی تھی اور سات آٹھ دنوں کی بڑھی شیو کے بال اس کے سرخی مائل گالوں کے نیچے کی لو کے قریب دو دائرے بناتے تھے۔

بیانکا نے ان دائروں کو کھوجا اور خود کہیں کھو گئی۔ ٹرین نے چلنے کا اشارہ دے دیا اور بیانکا وہیں ستون کے ساتھ سر جوڑے حیرت سے اسے گھورتی رہی۔ شہرام کو دیکھ لینے کی خوشی شاید اس قدر زیادہ تھی کہ وہ ستون کے ساتھ بت بن کر کھڑی رہی اور ٹرین نے رفتار پکڑ لی۔

☆ ☆ ☆

شہرام نے جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ستون خالی تھا۔

"میرے تخیل۔ نہ جانے یہ میرا پیچھا کب چھوڑیں گے۔"

افسردگی سے اس نے خود سے کہا۔ بیانکا تو اسے ہر وقت، ہر جگہ نظر آتی ہی تھی۔ اس گزر چکے سال کا کوئی دن ایسا نہیں تھا جو اس کی یاد کے بغیر گزرا ہو۔ وہ اس سے روز ملتا تھا، سڑکوں پر، بازاروں میں وہ اسے ہر جگہ نظر آتی تھی۔ لیکن آج اس کا تخیل اس قدر بھیانک کیوں تھا۔ وہ حسن جس کی صرف ایک بوند پورے سمندر کے پانی کا رنگ بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی آج ہمیشہ سے مختلف عکس کیوں دے رہی تھی۔

شہرام کو Owen Sni کی ابوالہول یاد آگئی۔ جس میں ایک لڑکی ابوالہول کے پیچھے کھڑی ہے، اس کا سہارا لیے، اس کو پناہ بنائے۔ جس کی بھنووں میں پریشانی کے باعث گڑھے پڑ چکے ہیں۔

"نہیں، میرا تخیل غلط ہے۔ اب بھلا اس کو کسی سہارے کی کیوں ضرورت ہوگی۔"

شہرام نے دکھ سے سوچا اور کھڑکی سے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔

انٹرنیٹ پر وہ دونوں کی شادی کی تصویریں دیکھ چکا تھا۔ پھر مقدمے کی روداد بھی وہ وقتاً "فوقتاً" حاصل کرتا تھا۔ خود وہ بیانکا سے بھی زیادہ بیانکا کے لیے دعاگو تھا۔ چار ماہ پہلے بیانکا مقدمہ جیت گئی تھی اور شہرام کو سچی خوشی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن قرار نہیں۔ اس کی زندگی ایک بار پھر منتشر ہو چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر اپنے گھر والوں سے دور تھا۔ اماں نتھو یہ سے 'بابا زلاری سے۔ طامیر سے۔

اسی طرح ایک دن بازار میں بے مقصد ٹہلتے ہوئے شہرام کو ایک کرسٹل گلاب پسند آگیا تھا۔ جس میں بٹن دبانے سے برف باری ہوتی تھی اور میوزک چلتا تھا۔

آگے جو ہوا اس میں اس کا ارادہ شامل تھا، نہ سوچ۔ کسی تیسری قوت نے اس سے یہ کام کروایا تھا۔ شہرام نے ساتھ ایک خط بھی لکھ کر ایڈون کے پتے پر ارسال کر دیا تھا۔ جس میں بیانکا کو اس کے مقدمے کی جیت پر مبارکباد دی گئی تھی۔

"بیانکا کی زندگی بہت آگے نکل گئی ہے۔ شاید میں اب اسے یاد بھی نہ ہوں۔"

یہ سوچ کر شہرام نے اپنا موجودہ پتا بھی نہیں لکھا تھا۔

اور آج وہ جس انداز میں اسے ستون کے ساتھ کھڑی نظر آئی تھی اس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"خدا کرے تم خیریت سے ہو بیانکا! تمہیں کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔" اس نے دعا کی۔

"شہرام۔" ایک پکار جس میں جھرنا بہنے کی سی جھنکار تھی نے پورے ڈبے میں بازگشت کی۔

"تو کیا یہ بھی میرا وہم ہے۔" شہرام چونکا۔

"میں آگئی ہوں شہرام۔ ہمیشہ کے لیے۔"

شہرام جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ فریب اور حقیقت میں فرق نہیں کر پا رہا تھا۔ کیا یہ فریب شباہت تھا یا خیالات کا بکھر جانا۔ بیانکا شوخی سے مسکرا رہی تھی اور یہ ادا گزرے سال کے تمام تصورات سے بڑھ کر تھی۔ دل کی دھڑکن تیز کر دینے والی۔

"یہ لو۔" بیانکا نے اسی طرح مسکراتے ہوئے تعویذ حب شہرام کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔

"اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے پہنا دو۔" اس نے ایسے کہا جیسے سوتے جاگتے وہ اسی ایک جملے کی مشق کرتی رہی تھی۔ اور شہرام نے جانا کہ حقیقت تخیل سے نکل آئی ہے اور جو بے پایاں اور فسوں گر ہے۔ وہ بیانکا کی طرف بڑھا۔

بیانکا دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگی تھی کہ البانیہ کی ٹرینیں امریکہ کی ٹرینوں کی طرح پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتیں۔

تعویذ کو ڈھونڈنے میں اسے چند لمحے لگے تھے اور پھر وہ تیزی سے ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔

شہرام نے مسکراتے ہوئے تعویذ کو بیانکا کے ہاتھ سے لیا، کیونکہ سب ہی وضاحتیں بیانکا کی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھیں اور بیت چکے وقت کی کہانیاں بھی کہ وہ ایسے کتنے ہی ستونوں سے ٹک کر اس کی راہ دیکھتی رہی ہے۔

ٹرین ایک سرنگ میں داخل ہونے لگی تو بیانکا نے شہرام کے ہاتھ کے لمس کو اپنے ہاتھ سے ٹکراتے ہوئے محسوس کیا۔

جب کے تعویذوں پر پھول نقش ہو، راج ہنس یا مختصر نگاہیں، انہیں صرف پہننے والے ہی اپنی محبتوں کی طرح امر کر سکتے ہیں۔ چند لمحوں بعد ٹرین تاریک سرنگ سے باہر نکلی تو اس نے شہرام کی روشن آنکھوں میں دیکھا۔ ان آنکھوں میں بدھا کی بند آنکھوں کے اسرار و کشف کی الوہیت تھی۔

اس کی خالی گردن خالی نہیں رہی تھی۔ اس کا بنجر دل آباد ہو گیا تھا۔ وہ حب کے تعویذ کی مالک بن گئی تھی۔ ٹرین کے باہر تابعدار سورج نصف النہار کے زاویے سے آگے بڑھتے حب کے سارے عکسوں کو جا بجا بکھیر رہا تھا۔

☆

دھنک خوشبو سے بھرے آنگن

نعیمہ ناز

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں بھنویں اچکا کر تیز نظروں سے ساس صاحبہ کو دیکھا۔ "پال پوس کر ہم نے بڑا کیا، پڑھایا، لکھایا، ہزاروں روپے خرچ کیے، کھانے لائق ہوئی تو ماں باپ حق جتانے پہنچ گئے۔ چوتھی بیٹی تھی، آٹھویں تو نہیں۔ آپ کے داماد صاحب کے ماتھے پر ایسے بل پڑے کہ لگتا تھا، بس ابھی قصہ پاک کر کے اس عظیم الشان خرچے سے نجات حاصل کر لیں گے اور آپ کی سمدھن، سویرا کی دادی ان کی تو وہ حالت تھی کہ اب گریں کہ تب گریں۔ ہارٹ اٹیک بس ہوا ہی ہوا۔ دل پہ ہاتھ رکھے بیٹھی تھیں۔ ہم نے تسلی اور ہمدردی کے دو بول کہے تو جھٹ سے ہماری گود میں ڈال دی کہ تم لوگ بے اولاد ہو، تم ہی اپنے گھر لے جاؤ۔ وہ دن آج کا دن ایک دن کی بچی کو جو کلیجے سے لگایا تو آج کتنے برس ہونے کو آئے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ بیٹی کہا ہی نہیں بنا کر رکھا۔ اب درخت نے پھل دینا شروع کیا تو ہمارا حق ختم۔ دوسروں کا شروع۔ واہ بھئی واہ۔"

ساس کا بوڑھا چہرہ تفکر کی جھریوں سے بھر گیا۔ ایک طرف بہو دوسری جانب داماد۔ دونوں ہی تیز مزاج اور زبردست۔ موقع شناس بھی، مطلب پرست بھی۔ ابھی ابھی بہو صاحبہ نے جو تقریر دل پذیر فرمائی تھی اس میں آدھا سچ اور آدھی مبالغہ آرائی تھی۔ مگر ان کے منہ پہ یہ بات کہنا گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔

"آپ تو سن ہی نہیں رہیں میری بات۔ آپ کے بیٹے بھی اپنے دونوں کان باہر چھوڑ کر ہی گھر آتے ہیں۔ ان سے کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے بلکہ

بھینس تو پھر بھی کم از کم نظر اٹھا کر بین کو دیکھ لیتی ہے، اس خدا کے بندے کو تو یہ توفیق بھی نہیں ہوتی۔ اب کیا دیواروں سے دل کی بات کہوں؟ کہاں جا کر سر پھوڑوں۔"

"جن دیواروں سے دل کی بات کہو گی۔ ان ہی سے سر پھوڑ لینا۔" ساس کو یہ آئیڈیا قابل قبول لگا۔ مگر کچھ کہتا؟ پھر وہی بھڑوں کا چھتا۔

"کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ سب منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے ہیں۔ آنے دو جناب باسط صاحب کو میں خود ہی بات کر لوں گی۔" انہوں نے اپنی موٹی موٹی انگلیوں والا سخت کرارا سا ہاتھ لہرا کر دھمکی آمیز لہجے میں کہا کہ خود بات کرنے سے مراد خود نپٹ لوں گی۔

"جیسے تمہاری مرضی ہو کرو ہم کیا مشورہ دیں۔" ساس نے اس بار واضح طور پر اپنی بے زاری دکھائی۔ ممتاز بیگم کو پتنگے لگ گئے۔ گھور کر ساس کو دیکھا۔ خود تو یہ معاملے سے الگ تھلگ ہو کر جاء نماز پہ بیٹھ جاتی ہیں۔ اب ان کے دامادوں سے بھی ہم ہی نبٹتے پھریں۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا بیٹا! ایسے کیوں بیٹھی ہو، تھک گئیں کیا؟" یہ باسط صاحب تھے۔ اس کے ابو اس کے قریب کھڑے بڑی تشویش سے پوچھ رہے تھے۔

"جی بس تھک گئی ہوں آج۔" سویرا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پیشانی مسلی۔

"سدرہ کومل کہاں ہیں سب کی سب۔ بہن تھکی ہاری کام سے آئی ہے، یہ نہیں کہ اسے ایک گلاس پانی ہی پلا دیں۔ ہر وقت بس ٹی وی کے آگے ڈٹی رہتی ہیں منحوس ماریاں۔ آگ لگا دوں گا اس نحوست کو۔" وہ زور سے دھاڑ رہے تھے۔

اسکول کی کاپیاں چیک کرتی پروا اپنا کام چھوڑ کر کھڑی ہوگئی پانی لا کر بہن کو دیا۔ جو سویرا نے غٹاغٹ چڑھا لیا۔

کپڑے تبدیل کر کے وہ فریش ہو کر کمرے میں آئی۔ امی مشین پر جھکی کچھ سی رہی تھیں۔

"کیا سی رہی ہیں؟" وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"سدرہ کی قمیص ہے۔ کھونچا لگا کر لے آئی، وہی ٹھیک کر رہی تھی۔"

"امی!" سویرا نے کچھ کہنے کے لیے تمہید باندھی تھی کہ ابو اندر آگئے۔

"چائے بنوا رہا ہوں تمہارے لیے، پیو گی نا۔"

"جی پی لوں گی۔" اس نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

اسے اندازہ تھا کہ وہ آگے کیا کہنے والے ہیں۔ امی سے جو بات اسے کہنی تھی وہ آئندہ کے لیے اٹھا کر رکھ دی۔ امی بدستور لاتعلقی سے مشین پر جھکی تھیں۔ ابو صاحب جلدی جلدی سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔ کڑوا ناگوار دھواں کمرے میں پھیلنے لگا۔ سویرا کا دل چاہا اٹھ کر چلی جائے۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ابو نے اپنی مچی مچی آنکھوں سے سویرا کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اس کے موڈ کا اندازہ کر رہے تھے۔

"تمہیں سیلری کب تک مل جائے گی؟" بالآخر انہوں نے آغاز کر ہی دیا۔

"اگلے چار پانچ روز میں مل جائے گی۔" تھکی تھکی سی سویرا کی آنکھوں میں بے بسی کی شام اتر آئی۔

"دراصل دکان کے کرایے کی رقم پوری نہیں ہوئی ابھی، تھوڑی سی کم ہے۔ اوپر سے یہ کم بخت بجلی والے، اتنے لمبے چوڑے بل، بنا کر بھیج دیتے ہیں جیسے ہم نے گھروں میں کارخانے کھول رکھے ہیں۔ دیکھا تم نے اس مہینے کا بجلی کا بل کتنے کا آیا ہے؟"

"نہیں ابو! میں نے دیکھا نہیں ہے۔" اس نے اپنے پیروں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سیلری مل جائے تو کچھ رقم اپنی امی کو دے دینا۔ ہمارا حال تو تمہارے سامنے ہی ہے۔ ایک اکیلا میں کمانے والا۔ اتنی جانیں کھانے والی۔ تمہارا بھائی ابھی چھوٹا ہے، وہ کسی قابل ہو تو کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا لیتا میرا، تب تک تو تم ہی ہمارا سہارا ہو۔ ہماری بیٹی نہیں بیٹا ہو۔"

وہ بڑی لجاجت سے بول رہے تھے۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک کمال تھا۔ جب اور جہاں چاہتے ان کے لہجے میں کروفر، طنطنہ اور غصہ آجاتا اور موقع محل کی مناسبت سے یہ غصہ اور کروفر، عاجزی اور انکسار میں بھی بدل جاتا تھا۔

"اور ہاں! بات سنو۔" انہیں اچانک کچھ یاد آیا۔ "تمہاری ممانی نے کچھ کہا تو نہیں۔"

"جو آپ نے کہا ہے، وہی انہوں نے بھی کہا ہے۔" سویرا نے سچ بتا دیا۔

"کیا مطلب۔ اسے بھی رقم چاہیے؟ میاں اچھا خاصا کما رہا ہے۔ سنا ہے کہ اب بیٹا بھی کام سے لگ گیا۔ ہم سے آدھا کنبہ ہے، پھر بھی تمہارے پیسوں پہ نظر ہے اس کی، لالچی عورت۔ خبردار، جو ایک پائی بھی اسے دی تو شمار دن محنت کرتی ہے میری بچی اور حق دار تو دیکھو کہاں کہاں سے نکل کر آرہے ہیں۔ پڑھائی پر تو کوئی خرچا نہیں کیا ان دونوں میاں بیوی نے، کیسا اکا کر لیا تھا کہ بس بارہ کلاسیں پڑھا دیں کافی ہے اب تو چونی بھی نہیں دے سکتے آگے پڑھانے کے لیے۔ اب کس منہ سے تمہاری کمائی کے حق دار بنتے ہیں۔"

"جس منہ سے آپ حق دار بنتے ہیں۔ مدد تو آپ نے بھی نہیں کی تھی۔" اس نے طنز نہیں کیا تھا۔ سادگی سے سچ بیان کیا تھا۔

"ارے۔ تو ہمارے پاس تھا ہی کیا؟ ہم تو کل بھی فقیر تھے آج بھی فقیر ہیں۔ سب تو معلوم ہے تمہیں۔ کہاں سے انتظام کرتے اتنی رقم کا۔ ہم تو روز کے روز کنواں کھود کر پانی پینے والے لوگ ہیں۔ تمہارے ماموں تو موٹی اسامی تھے۔ اتنا تو کر سکتے تھے۔ کرنے نہیں دیا ہماری سمدھن نے۔ یہ کہہ دیا کہ لڑکیوں کی پڑھائی پہ اتنا پیسہ لگانا بے وقوفی ہے۔ لڑکے تو کما کر کھلاتے ہیں۔ یہ تو شادی ہو کر پرائے گھر چلی جائیں گی۔"

ابو جان نے حرف بہ حرف درست آموختہ سنایا تھا۔ ممانی نے یہ ہی الفاظ کہے تھے۔ ڈٹ کر کہے تھے اور سب کے سامنے کہے تھے۔ سینہ ٹھوک کر بقلم خود۔ وہ ایسی ہی تھیں۔ نہ ڈرنے والی، نہ دبنے والی، نہ جھکنے والی۔ وہ ڈرتی نہیں تھیں، ڈراتی تھیں۔ دبتی نہیں تھیں۔ جھکتی نہیں تھیں، جھکنے پر مجبور کر دیتی تھیں اگلے بندے کو۔ سویرا اچھی طرح جانتی تھی اور اس کے ابو میں بھی تو کم و بیش یہ ہی خوبیاں تھیں۔

اس نے کچھ کہنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ خاموشی بھی اچھی خاصی بھلی شے ہے۔ بہت سے معاملات اس کے ذریعے نپٹ جاتے ہیں۔

"دیکھا۔ اس کی ممانی نے بچی کے دل و دماغ میں کیسا زہر بھرا ہے ہمارے خلاف۔ سگے ماں باپ سے شکایت ہو گئی ہے ہماری بیٹی کو۔" ابو نے اپنی بیگم کو مخاطب کر کے گلہ کیا۔

"چھوڑیں۔ ختم کریں سب معاملے کو، بلاوجہ بات بڑھانے سے فائدہ۔" انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی کچھ بولتا نہیں ہے نا ہمارے گھر ہے، اسی لیے یہ نوبت آگئی ہے۔ خیر میں بھی اتنی آسانی سے نہیں بخشوں گا۔" دھمکی آمیز لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے منہ پہ ہاتھ پھیرا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹا! دھیان رکھنا ذرا، جو کچھ کہا ہے میں نے یاد رکھنا، ٹھیک ہے۔" ابو نے نہ حکم دیا تھا نہ درخواست کی تھی بس ان دونوں کے بین بین کی بات کی تھی۔

"کس کس کی باتوں کو دھیان میں رکھے؟ جنہوں نے جنم دیا یا جنہوں نے پرورش کی۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔

زندگی شاید شروع سے ہی بے چاری تھی اس کی۔ جب سے، جب وہ دنیا میں آئی۔ پہلے دن، پہلے گھنٹے سے بلکہ نہیں، وہ تو جب سے قابل رحم تھی جب ابھی ماں کے پیٹ میں ہی تھی۔ جب پتا بھی نہیں تھا کہ کوکھ میں جو جان پل رہی ہے وہ کیا ہے۔ آیا کہ بیٹی جس کے

لیے دعائیں کی جا رہی تھیں کہ مزید نہ ہوں کیہ پہلے سے ہی تین کافی ہیں یا بیٹا جس کی شدید خواہش تھی اور شدت سے دعائیں بھی 'تو وہ جب سے ہی کچھ ان چاہی سی ناپسندیدہ سی تھی۔

پھر وہ دنیا میں آ گئی۔ سب بچوں کی طرح وہ بھی روتی ہوئی آئی تھی۔ مگر اسے دیکھ کر ابھی ابھی تخلیق کا کرب سہنے والی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس ان چاہی بچی کی کتنی ناقدری ہوتی ہے۔ اور بہت سے معاملات زندگی کی طرح اس معاملے میں بھی ہمارے دہرے معیار ہیں۔ ہم اکثر اپنی دعاؤں میں اللہ سے اس کی رحمت مانگتے ہیں 'گڑگڑا کے مانگتے ہیں 'کثرت سے مانگتے ہیں اور جب وہ اپنی رحمت سے ہماری جھولی بھر دیتا ہے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ منہ بناتے ہیں۔ خرچا آ گیا 'کہہ کر پذیرائی کرتے ہیں تو یہاں بھی یہ ہی کچھ ہو رہا تھا۔

گورنمنٹ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں وہ کئی گھنٹے اپنے شوہر کے اندر آنے کا انتظار کرتی رہیں 'مگر انہوں نے یہ خوش خبری سن کر اندر آنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ پہلے ہی گھر میں تین لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ چوتھی کو دیکھ کر کیا کرتے۔ سو وہ گھر واپس چلے گئے۔ بیوی کے پاس اس کی ماں موجود تھیں۔

چھٹی ہوئی 'گھر آ گئیں 'گھر آ کر بھی شرمندہ شرمندہ سی تھیں 'جیسے ان سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ لگاتار بیٹیوں کی پیدائش ایک جرم ہی بن جاتی ہے اور مجرم کہلاتی ہے ماں 'تکلیفیں سہ سہ کر انہیں جنم دینے والی۔ اب میڈیکل سائنس تو یہ کہتی ہے کہ بچے کی جنس کا ذمے دار مرد ہے۔ لڑکی کی پیدائش کا سبب مرد ہوتا ہے اور لڑکے کی پیدائش کا سبب عورت بنتی ہے۔ مگر خیر جدید ریسرچ اور میڈیکل سائنس کچھ بھی کہتی رہے 'ہم تو انہیں ہی مانتے ہیں جو روایات اور خیالات نسلوں سے اور صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ بیٹا نہ ہو 'بیٹیاں زیادہ ہوں یا اولاد نہ ہو تو مرد ہی ہمیشہ دوسری تیسری شادی کرتا ہے۔ عورت نے کبھی ان معاملات کے پیچھے اپنے شوہر سے طلاق یا خلع نہیں لی۔ وہ بے چاری قصوروار ہوتی ہے نا 'وہ کیسے یہ سب کر سکتی ہے۔

اچھا خیر! بات ہو رہی تھی بچی کی 'جسے ابھی تک نہ باپ نے دیکھنے کی زحمت کی تھی نہ دادی نے ویسے۔ ماں نے بھی کون سا غور سے دیکھا تھا۔ وہ بے چاری خود ڈری سہمی سی ہو رہی تھی۔ ہاں البتہ بڑی بہنیں 'جو خود بالترتیب چھ 'چار اور دو سال کی تھیں 'ضرور گھیرا ڈال کر اپنی ننی بہن کے گرد بیٹھ گئی تھیں اور بڑی مسرت حیرانگی اور غور سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

ساس اپنے سر پہ پٹی باندھ کر اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ ان کے سر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ (گھر میں ایک اور درد سر کا اضافہ ہو گیا تھا۔) شوہر صاحب گھر سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ چھوٹی نند نے آ کر بچی کو گود میں لیا تھا۔ پیار کیا تھا۔ وہ خود بھی ابھی بچی ہی سی تھی۔ اٹھارویں سال میں لگی تھی۔ عادت 'مزاج' حرکتیں سب ابھی تک بچوں والی۔ اسے شعور ہی نہیں تھا کہ یکے بعد دیگرے گھر میں صرف لڑکیوں کا اضافہ ہونا کتنی تشویش بلکہ کسی حد تک دکھ کی بات تھی مگر خیر اسے کیا۔ وہ تو ایک پیاری سی 'چھوٹی سی منی کو دیکھ کر بڑی خوش تھی۔

"اس کا نام کیا رکھیں گے؟" اس نے بڑے اشتیاق سے بچی کے موہنے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"تم بتا دو۔" بھاوج کو اس کی بے خبری اور معصومیت پہ ہنسی بھی آئی اور رشک بھی آیا۔

"سوچتی ہوں۔" ایک بہت اہم ذمہ داری پا کر حرا سوچ میں پڑ گئی۔

آخر بچے کا نام رکھنے کا معاملہ تھا۔ اچھا سا پیارا سا نام ہونا چاہیے تھا 'جیسی کہ بچی خود ہے۔ حرا نے کئی نام بتائے اور بتا کر خود ہی مسترد کر دیے۔ بالآخر ناموں کی ایک طویل لسٹ بنانے کے بعد وہ ایک نام پر مطمئن ہو گئی۔

"سویرا! منی کا نام سویرا رکھیں گے۔ میرے نام کے ساتھ ہی مل رہا ہے۔ ٹھیک ہے نا۔" اس نے تائید کے لیے بھابھی کی طرف دیکھا۔

"اچھا نام ہے 'یہ ہی رکھ دیتے ہیں۔" انہوں نے حرا کے خلوص اور محبت کا جواب محبت ہی سے دیا۔

رات میں بھائی 'بھاوج آئے تھے ملنے کے لیے۔ برابر گلی میں ہی تو میکہ تھا۔ مبارک باد دی تو ساس طنزیہ ہنسی ہنس دیں۔

"ہاں بھئی! آپ کو بھی چوتھی بھانجی مبارک ہو۔ دعائیں تو بہت کی تھیں کہ اس بار اللہ پوتے کا منہ دکھا دے 'مگر خیر 'جو مرضی مولا کی۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔

"اللہ کا شکر ہے اس نے صاحب اولاد تو کیا۔ چاہے بیٹیاں ہی سہی 'ہمیں دیکھیں 'ہم تو اس سے بھی محروم ہیں۔" بھاوج نے یاسیت سے کہتے ہوئے نومولود بچی کو گود میں لیا۔

"تو تم ہی لے جاؤ اسے پال لینا 'تمہارے بھی آنگن میں رونق ہو جائے گی۔ میرے بچے پر سے ذمہ داری کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جائے گا۔"

ان کے یوں اچانک بول پڑنے پر سب ہی ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بہو ان کی بات سن کر تڑپ اٹھی۔ نو ماہ اپنے وجود کے اندر ایک جان کی پرورش کی 'سارے کٹھن دنوں سے گزر کر زندگی موت کے درمیان جھولتے تخلیق کا کرب سہا۔ ابھی تو تکلیف بھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

"جہاں پہ تینوں پل رہی ہیں۔ وہاں یہ بھی پل جائے گی۔" انہوں نے دبی زبان سے مخالفت کی 'گو کہ جانتی تھیں کہ ان کا پلڑا بہت کمزور ہے کیونکہ شوہر یقیناً اس معاملے میں ماں کا ساتھ دیں گے۔ انہوں نے تو بچی کو دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا۔

"ہاں بی بی! پل تو جائے گی یہ بھی 'مگر کیسے پلے گی ان تینوں کے ساتھ 'تمہیں اندازہ تو ہو گا۔ پھر پڑھائی کے خرچے 'شادی بیاہ کے خرچے 'اس کے بعد دوسرے خرچے۔ لڑکی ذات تو بس اخراجات کا دوسرا نام ہے '

تمہارے بھائی بھاوج کے گھر کم از کم اچھے طریقے سے تو رہ لے گی 'پھر بے اولاد کی گود بھرو گی 'کتنا ثواب ملے گا تمہیں 'کیوں بھئی؟" انہوں نے اخلاقی حمایت اور تائید کے لیے جملہ حاضرین کی طرف دیکھا۔

"اگر سب راضی ہوں تو ہمارے لیے خوشی کی بات ہو گی۔" بھائی نے ٹھہر ٹھہر کر انہیں جواب دیا۔ بیوی بھی ان کی ہم نوا تھیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ تھا بچی کو گود لینے میں 'اگر ماں 'باپ کو اعتراض نہ ہو تو۔

تو پھر سویرا اپنے ماموں 'ممانی کے زیر سایہ پلنے لگی۔ گھر میں نانی تھیں 'ماموں 'ممانی (نئے امی ابو) کے علاوہ ایک پھپھو اور دو ماموں اور تھے۔ اگلے چار سالوں میں ان تینوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔

ماموں کے گھر بڑے چاؤ چونچلے اور اہتمام کے

ساتھ پل رہی تھی وہ۔ سات برس کی عمر تک اس نے یوں ہی پرورش پائی' ناز و نعم میں۔ لاڈ اٹھوائے۔ ہر فرمائش پوری ہوئی۔ کپڑے' جوتے' کھلونے' رنگ برنگ ہیر کلپس' اسکول کی اسٹیشنری کی پیاری پیاری چیزیں' کھانے پینے کا سب کچھ من پسند۔

پھر ایک معجزہ ہو گیا۔

ممانی کی بنجر کوکھ ہری بھری ہو گئی۔ شادی کے پندرہ برس بعد اولاد کی خوش خبری نے بے اختیار آنسو چھلکا کر سر سجدے میں جھکا دیا کہ واقعی رب کی رحمت لامحدود اور قدرت بیکراں ہے۔ پھر اگلے آٹھ برس میں اللہ نے چار بچوں سے نوازا۔ دو بیٹے' دو بیٹیاں۔ جیسے جیسے بچوں کی تعداد اور عمروں میں اضافہ ہوتا گیا' سویرا کی قدر و منزلت میں' اہمیت میں اور محبت میں بھی کسی قدر کمی آگئی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس سے کوئی سوتیلوں والا سلوک ہو رہا تھا یا کوئی ناانصافی' کوئی زیادتی یا کوئی ظلم اس کے ساتھ کیا جا رہا تھا' مگر پھر بھی ایک غیر محسوس طریقے سے قطار میں وہ چاروں بچوں سے پیچھے آگئی تھی۔ اپنی کئی ضرورتوں کے لیے اسے کئی بار یاد دہانی کروانی پڑتی تھی۔ بار بار بولنا پڑتا تھا اور جواباً "ہاں بیٹا یاد ہے' کرتے ہیں کچھ نہ کچھ" جیسا جواب پا کر وہ خاموش ہو جاتی تھی مگر کچھ ضرورتیں فوری اور اشد ہوتی تھیں' مثلاً" جیسے ابھی اگلے ہفتے اس کی بورڈ کی فیس جانی تھی۔ وہ اب نویں جماعت میں تھی۔

گورنمنٹ اسکول میں تھی۔ پرائمری تک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھایا تھا ماموں نے پھر مہنگائی اور اخراجات میں اچھا خاصا اضافہ ہو جانے کے باعث چھٹی جماعت سے اسے سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کمروں والے دس جماعت پر مشتمل پرائیویٹ اسکول سے نکل کر اتنی ساری کلاسز والے بڑے بڑے برآمدوں اور وسیع و عریض گراؤنڈ مشتمل سرکاری اسکول میں آکر سویرا کو کوئی خاص برا نہیں لگا۔ اچھا ہی لگا۔ پڑھائی میں اچھی تھی۔ رزلٹ اچھا لاتی تھی۔ شروع کی تین پوزیشنز میں سے کوئی بھی ایک۔ سب کی حوصلہ افزائی اور شاباش ملنے پر اگلی بار اور محنت سے جی لگا کر پڑھتی یوں ہی نویں جماعت میں آگئی۔

اس نے سائنس کے مضامین لیے تھے۔ تو معاملہ تھا امتحانی فیس کا۔ پاپا' مما دونوں کو بتا دیا تھا۔ اب تین دن رہ گئے تھے فارم جانے میں' ٹیچر روزانہ یاد دہانی کراتیں' جن بچیوں کی فیس جمع نہیں ہوئی' جلد از جلد جمع کرا دیں۔ گھر آکر یہ ہی یاد دہانی سویرا' مما' پاپا کو کرواتی۔ (ماموں نے خود کو پاپا اور ممانی کو مما کہلوایا تھا۔)

"پاپا! آج ٹیچر نے لازمی فیس منگوائی ہے۔ ورنہ وہ بریک میں گھر بھیج دیں گی۔ کل فارم چلے جائیں گے۔ فیس نہیں دی تو پورا سال ضائع ہو جائے گا۔" صبح ناشتے کے وقت سویرا نے سارا سبق فرفر سنایا۔

"ہوں!" ماموں نے پراٹھے کا لقمہ بناتے ہوئے ہنکارا بھرا' پھر کچھ سوچ کر بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"تمہارے پاس ہے کچھ رقم تو دے دو' میں بعد میں لوٹا دوں گا تمہیں۔"

"میرے پاس کیا خزانے دھرے ہیں؟ میں خو جیسے تیسے گھر چلا رہی ہوں۔ ابھی تو حفیظ (بھائی) کی شادی سے فارغ ہوئی ہوں۔ جو تھوڑی بہت جمع پونجی تھی سب ہی خرچ ہو گئی۔ آپ کے سامنے ہی ہے سب کچھ۔ تین' چار بار بچی فیس کے بارے میں بتا چکی ہے۔ پہلے ہی انتظام کر دیتے کہیں سے' اب عین وقت پر مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔" بیگم نے اپنے کرارے لہجے میں صاف صاف جواب دیا تھا۔

"وہ جو میں نے راشن کے لیے رقم دی تھی اس میں سے دے دو۔" ماموں جان نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا۔

"تو راشن کہاں سے منگواؤں گی؟"

"ارے اللہ کی بندی کل ول منگوا لینا' میں رات میں دے دوں گا پیسے۔" وہ جھنجلائے۔

سویرا سر جھکائے ناشتا کرتی رہی۔ اندر ہی اندر ادھیڑبن کا عمل جاری تھا۔ ناشتا کر کے جوتے' موزے پہنے۔ بیگ کاندھے سے لٹکایا تو ممانی نے فیس کی نوٹ رقم لا کر اس کے ہاتھ پر رکھی۔

"بستے میں رکھ لو احتیاط سے لے کر جانا' گر نہ جائے کہیں۔ اسکول پہنچتے ہی سب سے پہلے فیس نکال کر ٹیچر کو پکڑا دینا' اچھا۔"

ڈھیروں نصیحتوں کی پوٹلی اور دل میں اطمینان لیے وہ گھر سے نکلی تھی۔ شکر ہے فیس تو جمع ہو جائے گی آج۔

رات میں ماموں' ممانی کے درمیان زوردار جھڑپ نے ایک چھوٹی سی جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ماموں حسب وعدہ رقم کا انتظام نہیں کر سکے تھے۔

"اب کیا کروں میں' بتایا تھا گھر میں راشن بالکل ختم ہے۔ آج بھی بس جیسے تیسے گزارا کیا ہے۔ کل کیا کروں گی؟ کیسے منگواؤں گی سامان؟" وہ بری طرح برس رہی تھیں۔

ماموں چپ تھے۔ ادھار کا مشورہ بھی نہیں دے سکتے تھے کہ بیگم ادھار کی بالکل قائل نہیں تھیں۔ نہ وہ معاملات اور رویوں میں ادھار کی قائل تھیں۔ خود ہی جواب دے کر معاملے کے ساتھ ساتھ اگلے کی طبیعت بھی صاف کر دیتیں۔ خریداری کے معاملے میں بھی ان کا وطیرہ نقد کا تھا۔

"ادھار میں تو یہ ہی ہوتا ہے کہ پانچ کی جگہ دس کی چیز خرید لو۔ پھر ادھار کا کھانا پھونس کا جلانا ہے۔ برکت تھوڑی ہوتی ہے ادھار کھانے میں۔" ان کے اقوال زریں تو شوہر سمیت سب کو ازبر تھے۔

"اب بتاؤ مجھے میں کیا کروں؟" وہ پھر دھاڑیں۔

"تم اس وقت یہ کرو کہ ذرا دیر چپ ہو جاؤ بس۔" ماموں نے دانت پیس کر انہیں دیکھا۔ مجال ہے جو یہ عورت کبھی صبر و تحمل یا برداشت کا مظاہرہ کر لے۔

"اماں بھی یہاں نہیں ہیں جو ان سے مانگ لیتا۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

"وہ کیوں رہیں گی یہاں غریب بیٹے کے پاس' ان کا دل تو وہیں لگتا ہے بڑے بیٹے بہو کے تر مال جو ملتا ہے۔ یہاں تو انہیں کچھ دینے کے بجائے آئے دن تم ہی ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے رہتے ہو۔" ممانی نے انہیں آئینہ دکھایا۔

"میں نے چپ رہنے کو کہا تھا تم سے۔" ماموں نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"ہاں اس تابع داری کے لیے تو رہ گئی ہوں۔" وہ چیخ کر بولی تھیں۔

سویرا کو ان کی جھڑپ سنتے سنتے جانے کب نیند آئی' مگر ایسی آئی کہ صبح پھر گئی تو اذانوں کے بعد ہی آنکھ کھلی۔ سو دراصل فیس کی کئی دنوں کی ٹینشن کے بعد وہ آج بے فکری اور سکون کی نیند سوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال کے شعبہ فارمیسی میں جاب کرتے ہوئے اسے پانچ مہینے گزر چکے تھے مگر سوائے رسمی علیک سلیک کے اس نے خود ہی کسی سے زیادہ راہ و رسم نہیں بڑھائی تھی۔ یہاں ایک قارینہ تھی جو بلا کی بنس مکھ اور اتنی ہی باتونی تھی۔ سویرا کی خاموشی کا نوٹس لیے بغیر اس کے سنجیدہ مزاج کو خاطر میں لائے بغیر خود ہی کچھ نہ کچھ بولتی رہتی۔ اس بے چاری کی مجبوری یہ تھی کہ وہاں لڑکیاں وہ تین ہی تھیں۔ علینہ تھی گپ شپ کرنے کے لیے اس کے پاس ایک عدد منگیتر موجود تھا۔ لہٰذا لے دے کے ایک سویرا ہی رہ جاتی جس کے وہ کان کھاتی رہتی تھی۔ بے چاری۔

"خیریت تو ہے آج بڑی ہو مک رہی ہو؟" قارینہ نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"اچھا!" سویرا نے حیرت سے پہلے اسے دیکھا پھر اپنے سراپے پہ ایک نظر ڈالی' بنفشی رنگ کا نیا سوٹ آج پہلی بار پہنا تھا۔

"نیا سوٹ؟"

"ہاں!" سویرا مسکرا دی۔

"خاصی اچھی لگ رہی ہو اس کلر میں۔" قارینہ کا انداز توصیفی تھا۔

"ہاں میری سسٹرز بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ یہ کلر بہت سوٹ کر رہا ہے مجھ پر۔" سویرا نے عام سے لہجے

میں بولتے ہوئے اپنی سیٹ سنبھالی۔
"اچھا! کتنی بہنیں ہو تم لوگ؟" فارینہ ماہر تھی، بات سے بات اور جواب سے سوال نکالنے میں۔
"ہم لوگ۔" سویرا نے ایک گہری سانس لی۔
جب تک وہ ماموں کے گھر تھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ اسکول میں دوستوں کے گروپ میں یہ سوال اکثر آجاتا۔
"دو پاپا کی اور چھ امی کے گھر کی۔" وہ حساب لگاتی۔
"ہم نو بہنیں ہیں" وہ ملا کر تعداد بتا دیتی۔
"نو بہنیں۔" حیرت بھری نظر اور چیخ یقیناً "سب کا حق تھی۔
"اور بھائی؟" اگلا سوال لازمی اور فطری تھا۔
"دو پاپا کے ایک امی کے گھر کا۔" دوبارہ حساب جوڑتی "تین بھائی ہیں۔"
"ایک درجن پورے ہیں۔" لڑکیاں قہقہہ مارتیں۔
"یار! کیسے رہتے ہو تم لوگ ایک ساتھ۔ ہم تین بہن بھائی ہیں اور اتنی لڑائی ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں گھر چھوٹا پڑ جاتا ہے لڑنے کے لیے۔" ایک سہیلی ہنستی۔
"ہم ایک ساتھ تھوڑی رہتے ہیں، امی کے گھر کے بہن بھائی الگ ہیں، مما پاپا کے الگ۔" وہ وضاحت کرتی۔
"ہیں!" اسکول کی بچیاں بے چاری ہونق ہو جاتیں۔
"دراصل مجھے میرے ماموں نے ایڈاپٹ کر لیا تھا، تو ان کے جو چار بچے ہیں دو بیٹے دو بیٹیاں، وہ بھی میرے بہن بھائی ہیں اور میری جو سگی امی ابو ہیں، وہاں میرے علاوہ چھ بہنیں اور ایک بھائی ہے تو میں سب کو ملا کر بتاتی ہوں۔"
"اچھا تو یہ بات ہے۔" یہ کہانی سب کی سمجھ میں فوراً آجاتی۔
"مگر تمہارے سگے بہن بھائی تو وہی ہیں جو تمہارے امی ابو کے گھر ہیں۔" کوئی افلاطون لڑکی اسے بتاتی۔
"ہاں ٹھیک ہے، مگر جہاں میں پلی بڑھی ہوں بہن بھائی تو وہی ہیں جو تمہارے ساتھ رہتی ہوں وہ بھی میرے۔ بہن بھائی ہیں۔"

یہ لائن مما یعنی ممانی کی تھی جو انہوں نے سویرا کو ازبر کرائی ہوئی تھی۔ اس سے یہ ہوتا تھا کہ سویرا ان چھوٹے چھوٹے اوپر تلے کے بچوں کو سنبھال بھی لیتی تھی اور ان کے چھوٹے موٹے کاموں میں مما کی مدد بھی کروا دیتی تھی۔
"کیا بہت ساری ہیں جو ابھی تک گنتی پوری نہیں ہوئی۔" اس کے یوں سوچ میں پڑ جانے پر فارینہ نے ہنس کر پوچھا۔
"ہاں نہیں تو بہت ساری۔" سویرا کو اس باتوں پہ اب ہنسی آہی جاتی تھی۔
"چلو تم گنتی کرو، لنچ ٹائم میں بتا دینا۔" فارینہ نے جلدی سے اپنی سیٹ سنبھالی۔
"باس نامی شے آنے ہی والی تھی۔"

☼ ☼ ☼

سرف میں بھگویا ہوا سوٹ اس نے جلدی جلدی دھو کر اچھی طرح نچوڑ کر پھیلایا۔ جارجٹ کا سوٹ تھا، ہوا میں جلدی سوکھ جاتا۔
"ابھی استری بھی کرنی ہے۔" کوفت سے سویرا نے اپنی آنکھیں مسلیں، جو نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔
امی جانے کچن میں کیا کھٹر پٹر کر رہی تھیں وہ ان کے پاس چلی گئی۔
"آپ کیا کر رہی ہیں کچن میں اس وقت؟"
"آٹا گوندھ کے رکھ رہی تھی صبح کے لیے، تمہارے ابو اور بھائی کو تو لازمی پراٹھے چاہئیں، ورنہ ناشتے کے وقت ادھم مچ جائے گا۔"
"تو آپ کسی سے کہہ دیتیں یہ سب کیا کر رہی ہیں۔" سویرا نے ناراضی کا اظہار کیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ محنت مشقت کیا ہوتی ہے۔ وہ سارا دن گھر سے باہر محنت کرتی تھی تو اس کی امی گھر کے اندر مشقت کرتی تھیں۔ صبح سے لے کر شام تک پائیدان کی مشین پر وہ سلائی پر کپڑے سیتی تھیں۔ گھر

کے کام جیسے تیسے لڑکیاں کر لیتیں مگر شوہر نامدار کی عجیب عادت تھی انہیں ناشتہ، کھانا، چائے، روٹی سب کچھ اپنی بیوی کے ہاتھ کا چاہیے تھا اور بیوی کے ہاتھ سے چاہیے تھا۔
صبح ناشتہ کر کے جاتے۔ دوپہر انڈا اور چائے۔ دوپہر میں دکان بند کر کے آتے تو جنتی بیوی کو پھر مشین پر سے اٹھنا پڑتا، ان کی ہنڈیا الگ بنتی تھی بھنا ہوا سالن، برائے نام شوربہ، روٹیاں تازی اور گرم۔ وہ اسی وقت دو، تین روٹیاں پکا کر ان کے آگے دسترخوان لگاتیں، کئی بار کہا کہ بیٹیوں کے ہاتھ کا پکا کھایا کریں یا ان کے ہاتھ سے کھانا لے لیا کریں مگر وہ بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے۔"
"چھوڑو یار! یہ لوگ کہاں تمہاری برابری کر سکتی ہیں۔ کچا پکا سالن، روٹیاں یا تو کچی یا جلی ہوئی میری سمجھ میں نہیں آتا تمہاری لڑکیوں کا کھانا۔"
دو دو منٹ میں ان لوگوں کی ایسی کی تیسی کر دیتے، ورنہ وہ بے چاریاں اتنا برا کھانا بھی نہیں پکاتی تھیں، بس انہیں ہی کچھ شوق ہی تھا بیوی سے اپنی خدمتیں کروانے کا۔
"لائیں میں گوندھ دیتی ہوں۔" سویرا نے آگے بڑھ کر ماں کے ہاتھ سے آٹے کا تسلہ لینا چاہا۔
"نہیں رہنے دو، میں گوندھ لوں گی۔ تم بھی تو سارا دن کی تھکی ہوئی ہو اور پھر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکی تھیں۔
"لڑکیوں سے میں نے خود ہی نہیں کہا تھا، دراصل تمہارے ابو شکایت کر رہے تھے کہ روٹی ٹھیک نہیں بن رہی۔ اس لیے آٹا میں خود گوندھ رہی ہوں۔" انہوں نے وضاحت کی۔
"ایک تو یہ ابو۔" سویرا نے اپنے لب بھینچ لیے۔
"پتا نہیں اتنا تنگ کیوں کرتے ہیں آپ کو۔"
"پرانی عادت ہے کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آٹے میں پانی ڈالنے لگیں۔
"احساس کرنا چاہیے انہیں آپ سارا دن سلائی کرتی ہیں، اس میں کیا کم تھکن ہوتی ہے پورے دن کا برا حال ہو جاتا ہے۔" سویرا جب سے یہاں آئی تھی، اور قریب سے گھر کے حالات دیکھ رہی تھی اسے اپنی ماں پہ ترس آتا تھا اور باپ پر غصہ اور بہنوں پر بھی ترس آتا اور کبھی غصہ۔
"آپی کے لیے پیسوں کا بندوبست ہوا؟"
"سونا کے لیے؟" امی نے چونک کر اسے دیکھا۔
"آپی نے فون کیا تھا مجھے۔" سویرا نے ان کی حیرت دور کی۔ وہ واقعی یہی سوچ رہی تھیں کہ سویرا کو اس بارے میں کیسے پتا چلا۔
"اچھا!" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
"کہاں ہوا بندوبست، اپنے ابو کا تو تمہیں معلوم ہی ہے سب سے زیادہ تو وہ خود ضرورت مند رہتے ہیں۔ میرے پاس تین ہزار تھے وہ دے دیے اسے۔" "تین تھاؤزنڈ میں دے دوں گی آپ کو، آپ دے دیجیے گا انہیں۔"
"سوچ سمجھ کر دینا، ضرورت مند تو ہے وہ مگر واپسی کا کچھ نہیں پتا کب ملیں یا ملیں نہ ملیں۔" امی نے اسے صاف صاف خبردار کیا۔
"میں واپس لینے کی نیت سے نہیں دے رہی۔" سویرا نے آہستہ سے کہا۔
سونا کا چوتھا بچہ تھا، ڈاکٹر نے آپریشن بتایا تھا۔ پرائیویٹ اسپتالوں اور نجی دواخانوں میں تو مریضوں کی کھال کھینچی ہی جاتی ہے پر سرکاری ہسپتالوں یا مختلف نرسوں کے ہسپتالوں میں بھی سب کچھ فری نہیں ہوتا، اچھی خاصی رقم خرچ ہو ہی جاتی ہے۔ سونا کے پاس رقم کم تھی معاملہ سر پر تھا۔ وہ بے حد پریشانی کے عالم میں کئی بار ماں کے پاس آچکی تھی۔ اس کے شوہر نے جیسے تیسے کر کے چند ہزار کا انتظام کیا تھا مگر کیا ہے کہ بنکوں کی طرح صاحب حیثیت لوگوں سے بھی غریبوں کو قرضہ ملنا خاصا دشوار ہوتا ہے، مگر خیر اللہ سب کا ہے، کارساز ہی نہیں مسبب الاسباب بھی ہے، کسی نہ کسی کی مدد کا کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیتا ہے۔
"کل ہو سکتا ہے چکر لگائے دوبارہ۔" امی کا اشارہ

موناکی طرف تھا۔

"میں سونے سے پہلے آپ کو پیسے دے دوں گی۔" سویرا آج آتے ہوئے اے ٹی ایم سے رقم نکال لائی تھی۔

"اپنے ابو کے سامنے ذکر مت کرنا بھولے سے بھی' پیچھے پڑ جائیں گے کہ تم لوگوں کے پاس دولت موجود ہے اور مجھے کاروبار کے لیے نہیں دیتے۔" آنا گوندھتی امی کے لہجے میں معمولی سی تلخی آگئی۔

بیٹی کا معاملہ تھا وہ بھی اہم' مگر باپ کی بے حسی اور لاپروائی قابل دید تھی۔ بیوی سے صاف کہہ دیا کہ داماد صاحب خود ہی انتظام کرلیں کہیں سے' ہمارے پاس کیا ہن برس رہا ہے۔

"تم سو جاؤ جا کر ان لوگوں سے کہہ دوں گی' کوئی بھی لڑکی تمہارا سوٹ استری کردے گی۔"

"میں کرلوں گی' ویسے بھی مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی۔" سویرا نے نرمی سے انکار کیا۔

"حرا پھپھو کا بیٹا اب کیسا ہے؟" سویرا کو معاً یاد آیا۔

"ہاں اب تو ٹھیک ہے پلاسٹر اتر گیا ہے' دوائیاں ہیں کچھ دن کھانے کی۔" امی آٹا باؤل میں نکال کر اب تسلے دھو کر رکھ رہی تھیں۔

سویرا ان کے ساتھ ہی کمرے میں آگئی' انہیں دس ہزار نکال کر دیے۔ انہوں نے بڑی احتیاط کے ساتھ الماری میں رکھ دیے۔

"اللہ کا شکر ہے' کچھ تو انتظام ہو ہی گیا۔"

"ہاں! انتظام تو ہو ہی جاتا ہے۔" چت لیٹی سویرا نے چھت پر گھومتے پنکھے پر نگاہیں جمائیں۔

پچھلے گزرے چند سال کوئی بہت پرانا ماضی نہیں تھے' اکثر یاد آہی جاتے تھے۔ میٹرک کے بعد فرسٹ ایئر اور پھر سیکنڈ ایئر ہر سال بالکل عین وقت پر ہی کئی کئی بار یاد دہانیوں کے بعد ہی سہی پھر بھی فیس کا انتظام ہو ہی جاتا تھا۔ انٹر کے بعد ممانی عرف مما نے صاف صاف اعلان کردیا تھا کہ ہماری اوقات یا سکت اتنی ہی تھی' بارہ جماعتیں پڑھانے کی' اس سے آگے ہم نہیں پڑھا سکتے' ابھی پیچھے پیچھے چار اور ہیں' انہیں بھی دیکھنا ہے اور یوں بھی لڑکیوں کی تعلیم پہ پیسہ خرچ کرنا بالکل فضول ہے۔ شادی ہو کر اگلے گھر چلی جائیں گی' وہاں چکی چولہا ہی سنبھالنا ہے' کیا فائدہ اتنا پڑھا کر' انہوں نے سب کے سامنے تقریر جھاڑی تھی۔

سویرا کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اسّی فیصد نمبروں کے ساتھ ایف ایس سی کلیئر کیا تھا۔ ٹیچرز سمیت اس کی تو مکمل کلاس کا خیال اور مشورہ یہی تھا کہ وہ انٹری ٹیسٹ میں ضرور بیٹھے اور وہ ضرور بیٹھنا چاہتی تھی' ٹیسٹ دینا چاہتی تھی مگر ہزاروں کے خرچے سے تو شروعات تھی لاکھوں کا خرچہ بعد میں تھا' کون کرتا؟ اس نے ماموں سے بات کی' انٹری ٹیسٹ کی امید کی' میڈیکل میں ایڈمیشن کی۔

ماموں یہ سب سن کر ہنس پڑے۔

"ارے بیٹا! یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے' سفارش اور رشوت کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہوتا۔ میرٹ کو یہاں کون دیکھتا ہے' جان بوجھ کر فیل کردیں گے اور بالفرض تم پاس ہو بھی جاؤ تو آگے کے خرچے کون کرے گا۔ میرے پاس تو اتنا سرمایہ نہیں ہے بیٹا' نہ تمہارے سگے باپ کے پاس ہے۔"

"میں اور محنت کرلوں گی' اسکالرشپ مل سکتی ہے مجھے۔" اس نے ماموں کو قائل کرنا چاہا مگر ناکام رہی۔ ممانی اس معاملے میں اپنا ہی نہیں' ماموں کا بھی ذہن بنا چکی تھیں۔

انٹری ٹیسٹ کی تاریخ آئی اور نکل گئی۔ اس کی اگلی چوائس ڈی فارمیسی کا شعبہ تھا۔ مگر ایک خطیر رقم یہاں بھی چاہیے تھی۔ ٹیسٹ کلیئر کرنے کے بعد اس کے پاس فقط ایک ہفتہ تھا ایڈمیشن فیس جمع کرانے کے لیے' دن وہ سب کو قائل کرنے کی کوششوں میں لگی رہی مگر وہ دن اور اس کے سارے الفاظ ضائع ہی گئے۔

"نانی آپ کے پاس کوئی گولڈ وغیرہ نہیں ہے' میرا دو سال کا بھی خرچا نکل آئے نا! تو کافی ہے میرے لیے اور ویسے میں آپ کی پائی پائی لوٹادوں گی۔" سویرا نے بڑی آس لگا کر نانی سے بھی مدد طلب کی تھی۔

"بیٹا! ہمارے پاس جو کچھ تھا سب بیٹیوں اور بہوؤں کو دے دیا شادی کے موقع پر' اب تو بس ناک کی اس کیل اور اس ایک انگوٹھی کے سوا کچھ بھی نہیں میرے پاس۔" انہوں نے اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اچھا! امی کے پاس تو ہوگی کوئی گولڈ کی چیزیں؟" سویرا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اس بے چاری کے پاس جو کچھ تھا نند' مونا اور کائنات کو جہیز میں دے دیا۔ اس بے چاری کے پاس تو ایک چھلا تک نہیں بچا۔"

سب جگہ سے مایوسی ہوئی تھی' جو تھا دن بھی گزر گیا۔ شام میں اس کی کالج کی ٹیچر کا فون آیا تھا اس کے پاس' جو اس کے سارے حالات اور ایڈمیشن کے لیے کی جانے والی تگ و دو سے واقف تھیں' انہوں نے کل کالج بلایا تھا۔

"اپنے سارے ڈاکومنٹس ساتھ لانا' نائنتھ سے لے کر انٹر تک کے رزلٹ اور ساری مارکس شیٹس' ایک خاتون سے رابطہ کیا تھا میں نے جو مستحق طالب علموں کی مدد کرتی ہیں' اسکالرشپ وغیرہ دیتی ہیں' وہ کل اپنے کسی کام کے سلسلے میں ہماری پرنسپل کے پاس آئیں گی۔ میں تمہیں ملوادوں گی ان سے' آگے جو اللہ کو منظور۔"

سویرا کو پوری رات نیند نہیں آئی فکر بھی تھی اور امید بھی۔

اگلے روز وہ کالج گئی' پرنسپل کے آفس میں ہی اس اجنبی خاتون بنام افروز عالم سے ملاقات ہوئی۔

سویرا کی بات سن کر حالات سمجھ کر' ڈاکومنٹس دیکھ کر انہوں نے ہمدردی کا اظہار بھی کیا اور اس کے رزلٹ دیکھ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی پھر آگے انہوں نے تفصیل بتائی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس کے بتائے گئے حالات کی تصدیق کرنے کے بعد مدد کا پروسیس شروع ہوگا' مرحلہ وار اس میں کم از کم ہفتہ دس دن لگیں گے' ورنہ معمول کے مطابق کام کرنے میں مہینہ بھر تو لگ ہی جاتا ہے۔

"پھر تو میرا ایڈمیشن اگلے سال ہی ہو سکے گا۔" سویرا نے ایک گہری سانس لے کر آفس میں موجود جملہ حاضرین کو دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

کاریڈور میں اس کی ٹیچر اس کے پیچھے پیچھے آئیں۔

"تم ہمت نہیں ہارنا۔ دیکھو میں کرتی ہوں کچھ نہ کچھ۔" انہوں نے سویرا کو تسلی دی۔

"جی!" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

گھر کی جانب جاتی ویگن میں بیٹھے بیٹھے اس کے دل و دماغ کالج میں ہونے والی باتوں میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ اسے نوے فیصد امکان یہی نظر آرہا تھا کہ رقم کا انتظام نہیں ہو سکے گا۔

اور پھر میرا ایڈمیشن' ایجوکیشن' کیریئر؟ اسے اپنے سارے خواب بکھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنے خیالات میں اتنی گم تھی کہ اسے احساس بھی نہیں ہوا' ویگن کتنی دیر سے رکی ہوئی تھی۔ لوگوں کی جھنجھناہٹ' تلملاہٹ اور اکساہٹ جب ٹھیک ٹھاک شور میں بدل گئی تو اس نے دھیان دیا۔ ٹریفک سے بھری سڑک پر پولیس اور سیکورٹی اداروں کی وردی میں ملبوس اہلکار مستعد کھڑے ادھر ادھر موجود تھے۔

"اوہ لوی آئی پی موومنٹ' پتہ نہیں کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔" سویرا بے زاری سی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"ویگن کے آگے پیچھے دائیں بائیں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اسی ہجوم میں اس کی نگاہ ایک مرسڈیز پر پڑی' کھلے شیشوں سے جو شکل نظر آئی وہ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ وہ دیکھتی رہی سوچتی رہی۔

گھنے بھرے کھچڑی کے بال جنہیں بڑی نفاست سے سیٹ کیا گیا تھا' صاف رنگت اور دولت کی چمک لیے ایک رعب دار چہرہ۔ عمر پچپن بھی ہو سکتی تھی اور پینسٹھ بھی مگر نظر آنے میں ان دونوں فگر سے کم عمر ہی لگتے تھے' وہ سوچتی رہی پھر اس نے ہونٹ سکیڑ لیے۔

اوہ۔ یہ رضوان یزدانی تھے۔ مشہور کاروباری شخصیت' جو اپنے سماجی کاموں کی وجہ سے بھی مشہور

تھے۔ کبھی کبھار فی وی ٹاک شوز میں بھی نظر آجاتے تھے۔ گاڑی میں ان کے علاوہ ڈرائیور' گن مین اور ایک نوجوان اور تھا۔ انہیں پہچاننے کے بعد سویرا کی دلچسپی یکایک ہی ان میں ختم ہوگئی تھی۔ اس نے وہاں سے نگاہیں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا۔

"ایک خیال برق کی طرح کوندا اور دماغ روشن کرگیا۔ اس نے ایک نظر مرسڈیز میں بیٹھے چاروں نفوس پر ڈالی اور اپنا فولڈر ہاتھوں میں تھام کر ویگن سے اتر گئی۔

چند سیکنڈ بعد وہ مرسڈیز کے قریب پہنچ گئی تھی۔

"سر۔" اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے گن مین بہت تیزی کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

"ہٹو یہاں سے۔" اس کا لہجہ سخت اور کھردرا تھا۔

"مجھے صرف ایک منٹ بات کرنی ہے سر سے۔ پلیز۔ میں کالج اسٹوڈنٹ ہوں۔" سویرا نے گھبرانے کے باوجود اپنے اوسان بحال رکھنے کی کوشش کی۔

"بات کرنی ہے تو آفس آیئے۔ یہاں سے پیچھے ہٹ جایئے۔" گن مین دیکھ رہا تھا کہ وہ کالج یونی فارم میں تھی۔ اس کے لہجے کی سختی کچھ کم ہوئی تھی۔

"مجھے ابھی ہی کام ہے۔ بہت ارجنٹ۔ میرے فیوچر کا سوال ہے۔ پلیز سر!" سویرا نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اتنی بلند آواز میں کہا تھا کہ اس کی آواز گاڑی کے اندر ضرور پہنچ گئی تھی۔

"آنے دو بشیر۔" اندر سے ایک رعب دار آواز نے تحکمانہ لہجے میں کہا تھا۔

"تھینک گاڈ!" سویرا کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ جان میں جان آئی۔ وہ قریب آگئی۔

"ایک منٹ ہے تمہارے پاس' کہو۔" وہ ناک کی سیدھ میں آگے دیکھ رہے تھے۔

"مجھے ڈی فارمیسی میں ایڈمیشن لینا ہے۔ انٹری ٹیسٹ کلیئر ہے۔ پرسوں فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ وسائل بہت محدود ہیں۔ کم سے کم دو چار سمسٹر کی فیس کے لیے قرض چاہیے۔ بعد میں جاب کرکے میں ساری رقم واپس کردوں گی۔"

بولنے کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے اپنے فولڈر میں سے میٹرک اور ایف ایس سی کا رزلٹ اور مارکس شیٹ ان کی طرف بڑھائیں۔

انہوں نے ایک ایک کرکے بغور اس کا رزلٹ دیکھا تھا۔ میٹرک میں اے پلس تراسی فیصد نمبر' ایف ایس سی میں بھی اے پلس بیاسی فیصد نمبرز۔ سویرا کی پرامید نظریں ان پر ٹکی ہوئی تھیں' جو بڑے غور سے اس کی مارکس شیٹ دیکھ رہے تھے۔

"ہوں۔" ایک ہنکارا بھر کر انہوں نے فولڈر واپس سویرا کی طرف بڑھایا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دیا۔

"یہ میرا وزٹنگ کارڈ ہے۔ کل گیارہ بجے اس ایڈریس پر آجانا۔"

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ سر۔" سویرا کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی تھی۔

شاید یہ کرن۔ چمکتا سورج بن جائے۔ پوری رات اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی۔

صبح ماموں کے ساتھ اس ایڈریس پر پہنچی تھی' جو رضوان یزدانی کا آفس تھا۔ پونے گیارہ بجے وہ انتظار گاہ میں بیٹھی تھی۔ پندرہ منٹ بعد انہیں اندر بلایا گیا تھا۔ سامنے بڑی سی ٹیبل کے پیچھے رضوان یزدانی کی رعب دار شخصیت تھی۔

سویرا نروس تھی۔ تھوڑے سے گھبرائے ہوئے تو ماموں بھی تھے۔ زندگی میں پہلی بار اتنی مشہور اور دولت مند ہستی سے ملاقات کررہے تھے۔

انہوں نے مسکرا کر دونوں کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایک دو سوالات پوچھے پھر دراز کھول کر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

"کاؤنٹ کرو۔"

سویرا نے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے وہ نوٹ گنے۔ اس کی مطلوبہ رقم پوری تھی۔

"اب اس پیپر پہ لکھو کہ آپ نے کتنی رقم مجھ سے

لی ہے' کس مقصد کے لیے ہے اور اسے کب واپس کریں گی۔" انہوں نے ایک سادہ کاغذ اور قلم اس کی طرف بڑھایا تھا۔

سویرا نے ان کا مطالبہ مناسب لفظوں میں کاغذ پر تحریر کردیا۔ قرض واپسی کی مدت اس نے تعلیم مکمل ہونے کے ایک سال بعد کی لکھی۔ یعنی کل چھ سال بعد اسے یہ رقم واپس کرنی تھی۔ آخر میں اپنے دستخط کرکے اس نے یہ کاغذ انہیں واپس دے دیا۔ شکریے کے ساتھ۔

سویرا واپسی میں پورے راستے خود کو یقین دلاتی رہی کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہوچکا تھا۔ اسے اپنے خواب پورے کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔ آسمان چھونے کی اجازت مل گئی تھی۔

پھر اگلے پانچ سال اس نے اپنی پڑھائی میں دن رات ایک کردیا تھا۔ دوسرے سمسٹر سے ہی اس کی جی پی تین اعشاریہ نو ہوگئی تھی اور اسے فیس کا بیس فیصد اسکالرشپ ملنے لگا تھا۔

"اب مجھے گیارہ مہینے ہوگئے ہیں جاب کرتے ہوئے اب تک میں نے اتنی سیونگ کرلی ہے کہ یہ قرض باآسانی واپس کرسکتی ہوں۔ نیکسٹ ویک میں وہاں جاؤں گی۔"

سویرا نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر گلاس ونڈو کے باہر' جہاں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔

"امیزنگ اینڈ امپریسو۔" فرحاج نے اس کی اتنی لمبی داستان سن کر بس دو لفظوں میں بھرپور تبصرہ کرڈالا تھا۔

"امیزنگ تو سمجھ میں آتا ہے' مگر امپریسو کیوں؟"

"میں امپریس ہورہا ہوں' ذرا گہرائی میں جاکر سوچو تو کچھ معجزے جیسا معاملہ نہیں لگتا ہے؟ تم بالکل مایوس' بالکل ناامید اور اک دم سے جیسے بجھتے گھٹاٹوپ اندھیرے میں روشنی کی چکاچوند ہوجائے یا جیسے جلتے بھنتے صحرا میں اچانک بادل یوں برس جائیں کہ سب کچھ جل تھل ہوجائے۔" فرحاج شاعرانہ تشبیہات دے رہا تھا۔

"شاعری کرنے لگے آپ تو۔" سویرا نے گلاس میں موجود اسٹرا گھمائی۔

"آج کل شاعری ہی سوجھنے لگی ہے' پتا نہیں کیوں۔" وہ مسکرا کر بولا تھا۔

"پھر تو گئے کام سے۔" سویرا نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اسٹرا منہ میں دبا۔

"ہاں واقعی! پتا نہیں کیا شے ہے' جس نے بالکل نکما کردیا ہے' ورنہ ہم بھی۔"

"کچھ نہ کچھ تو کام کے تھے ہی۔" فرحاج کی معنی خیز باتیں اب اظہار اور اقرار کی حدوں میں داخل ہوچکی تھیں۔ اعتراض تو سویرا کو بھی نہیں تھا۔ اعتراف تھا اسے اپنے آپ میں بہت کچھ بدل جانے کا۔ فرحاج وہ لڑکا تھا جس نے اس کے دل کے تاروں کو چھوا تھا۔ کوئی افلاطونی محبت نہیں تھی نہ ہی دھواں دھار عشق' لیکن اسے فرحاج کے متعلق سوچنا اچھا لگتا تھا۔ آئندہ زندگی اس کے ساتھ گزارنے کا خیال بڑا خوش کن تھا۔ پتا نہیں کیا ہوتا ہے۔ کوئی اچھا لگتا ہے تو اس سے محبت ہوجاتی ہے یا جس سے محبت ہوجائے وہ اچھا لگنے لگتا ہے۔

وہ خوابوں خیالوں میں رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ بہت مشکل وقت اور لوگ دیکھے تھے اس نے۔ مگر اب اس عمل پسند لڑکی کو چاروں طرف سے خوابوں نے گھیر لیا تھا۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی بھی تھی اور خوش سی بھی۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی تھی' پھولوں کی راہ گزر پر' مگر اس کے متوازی ایک اور زندگی بھی تھی جو گزر رہی تھی اپنے پیاروں کے درمیان۔ پیاروں کے درمیان۔ ہاں لوگ اس کے پیارے ہی تو تھے' جنہیں سویرا پیاری تھی اور جو سویرا کو پیارے تھے' مگر اس زندگی میں ان پیاروں کے درمیان الجھنیں تھیں' پریشانیاں تھیں' دباؤ تھا' گھٹن تھی حالات اس کی سمجھ اور قابو سے باہر ہوتے جارہے تھے۔

آج ممانی اس کی کلاس لے رہی تھیں۔ ہاں۔ مگر

اس سے پہلے انہوں نے بہت مزے دار چکن بریانی کھلائی تھی اسے۔ پھر اگلے دن کے لنچ کے لیے بھی پیک کروی تھی۔ اتنی بری نہیں تھیں بے چاری۔ اچھا خاصا خیال کرتی تھیں اس کا۔

کھانے کے بعد ماموں کے لیے چائے بن کر آئی، اسے بھی پیش کش ہوئی۔

"چائے پیو گی؟"

"بریانی کے بعد تو کولڈ ڈرنک اچھی لگتی ہے۔ چائے کون بے وقوف پیتا ہے۔" سویرا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عاطف بے موقع ہو کر تبصرہ کر بیٹھا۔

"جا لے آ ایک لیٹر۔" امی کی سخاوت آج حاتم طائی کو مات کر رہی تھی۔ عاطف نے تیزی سے باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ مبادا والدہ ماجدہ اپنا ارادہ بدل نہ دیں۔

"اب یہ بتاؤ۔ پرورش کرنے والے والدین کے بھی کچھ حق حقوق ہوتے ہیں یا سارے حقوق ان ہی کے ہو جاتے ہیں جو ایک نظر اپنی اولاد پر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتے اور اسے بوجھ سمجھ کر جھٹ سے دوسرے کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔" امی کا طویل سوال اپنے اندر ایک کھلا طنز لیے ہوئے تھا جس کا نشانہ اس کے والد ماجد تھے۔

کولڈ ڈرنک کے سپ لیتی سویرا محض پہلو بدل کر رہ گئی۔

"تمہارا باپ پورے خاندان میں باتیں بناتا پھر رہا ہے کہ ہم تمہاری کمائی کا لالچ کر رہے ہیں۔ کوئی یہ پوچھے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔" ممانی مزید گویا ہوئیں۔

"اگر تم بھی یہ ہی سمجھتی ہو تو مجھے بتا دو صاف صاف... میں سچ کہتی ہوں، آج کے بعد پھر نہ تمہیں کبھی اپنی شکل دکھاؤں گی نہ کبھی تمہاری شکل دیکھوں گی۔"

ممانی آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔ حیرت سی حیرت تھی۔ ماموں تقریباً "غش کھا کر گرنے کو تھے۔ ان کی بیگم ہر حربے سے اپنا کام نکال اور نکلوا سکتی تھیں۔ سختی، رعب، طنز، طعنہ اور حکم، مگر عورتوں کا یہ مخصوص و مرغوب ہتھیار انہوں نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

سویرا کولڈ ڈرنک کا گلاس میز پر رکھ کر ان کے پاس آبیٹھی۔

"آپ کا حق ہے مجھ پر... اور بالکل ہے۔ میں نے پہلے مما کہہ کر آپ کو مخاطب کیا تھا۔ امی ای کو امی کہنا بعد میں سیکھا تھا۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے آپ میرے لیے ماں کا درجہ رکھتی ہیں۔" سویرا نے نرمی اور آہستگی سے اپنی بات مکمل کی اور ان کے ہاتھ کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"تمہاری سگی بیٹی ہوتی تو وہ بھی ہمارے برے وقت میں ہمارے کام آتی یا نہیں؟"

"آپ کس بات سے پریشان ہیں؟"

"ارے کوئی ایک پریشانی ہو تو بتاؤں... دنیا جہاں کے مسئلے، مسائل ایک کے بعد ایک ہمارے اوپر نازل ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے تمہارے ماموں کے چوٹ لگ گئی۔ اتنی رقم اس میں خرچ ہو گئی پھر۔ تمہارا بھائی بیمار ہو گیا۔ ٹیسٹ پہ ٹیسٹ، دوائیوں پہ دوائیاں... شکر ہے کہ لوٹ پیٹ کے ٹھیک ہو گیا۔ میرا کمیٹی... تو بالکل خالی ہو گیا۔ آمدنی گھٹتی جا رہی ہے۔ اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اوپر کا کمرہ اور پوری چھت یوں ہی بے کار پڑی ہے تو وہاں ایک اور کمرہ اور کچن باتھ روم بنا کر کرایہ پر دے دیتے ہیں... کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا آمدنی کا... ہیں... کیا کہتی ہو؟"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" سویرا اب ان کی اگلی بات سمجھ گئی تھی اور اس کی توقع کے عین مطابق ممانی نے وہی کہا جو سویرا سوچ رہی تھی۔

"تمہاری تنخواہ تو اچھی خاصی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو جوڑ لیا ہو گا۔ اگر دل ٹھکے تو اپنے ماموں کی کچھ مدد کر دو۔"

"میں نے اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے لیے قرض لیا تھا۔ آپ کو معلوم ہی ہے۔ پیسے جمع کر کے میں نے وہ قرضہ واپس کیا ہے۔" سویرا نے انہیں بتایا۔

"نہیں..." ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"وہ پیسے واپس کر دیے تم نے؟" انہوں نے بیک وقت بہت حیرت اور بہت صدمے سے اسے دیکھا۔

"واپس تو کرنے ہی تھے، میں نے اسی وعدے پہ لیے تھے۔"

"ارے، تو وہ کون سا پولیس لے کر گھر آرہے تھے۔ سیکڑوں ہزاروں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ انہوں نے کیا یاد رکھا تھا کہ تمہیں پڑھائی کے لیے رقم دی تھی۔" ممانی اس کی بے وقوفی پر تلملا رہی تھیں۔

"انہیں یاد ہو نہ ہو مجھے تو یاد تھا نا۔ ان کی مدد بھی اور اپنا وعدہ بھی۔"

"بتاؤ ذرا۔۔۔ اتنی محنت سے دن رات ایک کر کے پیسہ جوڑا اور جا کر واپس دے آئی جو پہلے ہی پیٹ بھرے ہیں۔ پڑھ لکھ کر بھی عقل نہ آئی اس لڑکی کو، ہے ہے رہی وہی بے وقوف کی بے وقوف۔" ممانی کو اب باقاعدہ غصہ آرہا تھا۔

"سات آٹھ ہزار ہیں میرے پاس، کہیں تو دے دوں۔" سویرا نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

"اس سے کیا ہوگا۔ داڑھ بھی گیلی نہیں ہوگی۔ مجھے تو کم از کم لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی ضرورت ہے۔" وہ مایوس ہوگئیں۔ "سوچا تھا کچھ تم سے لے لوں گی کچھ میں کرلوں گی، تو میرا کام ہو جائے گا، مگر خیر۔" انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ویسے تمہارا باپ کیسے راضی ہوگیا۔ مٹھی بھر رقم ہاتھ سے جانے پر۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے سوال کیا تھا۔

"انہیں بعد میں بتایا تھا۔" سویرا ان کے سوال پہ مسکرا دی۔ وہ کھسیانی سی ہوگئیں۔

"مجھے کیا۔۔۔ تم اپنے باپ کو کچھ بتاؤ یا چھپاؤ، تمہاری مرضی۔۔۔ ویسے بڑا افسوس ہوا ہوگا اس بے چارے کو بھی، وہ تو ویسے ہی ایک ایک پائی پہ جان دیتا ہے۔"

"سب ہی دیتے ہیں ایک ایک پائی، ایک ایک پیسے پہ جان بھی، ایمان بھی۔ دراصل پیسہ ہے ہی ایسی ظالم شے۔ سنگر، نہ خود کسی کا ہوتا ہے اور نہ لوگوں کو ایک دوسرے کا ہونے دیتا ہے۔ کہیں لوگوں نے اسے خدا بنایا ہوا ہے، کہیں اپنا مذہب، عقیدہ اور مقصد حیات اس قاتل شے پر تو لوگ جان دے بھی دیتے ہیں اور لے بھی لیتے ہیں۔"

سویرا نے فلسفہ بیان نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے اہم تجربہ، مشاہدہ اور سچ تھا۔

"بی بی! آج کی دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہے، جس کے پاس نہیں ہے وہ چیونٹی سے بھی کمزور اور حقیر اور جس کے پاس ہے وہ تو بس پوجنے کے لائق ہی سمجھو۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں بھی تو یہ ہی کہہ رہی تھی۔"

"تم دونوں غلط ہو۔ دولت سب کچھ ہو سکتی ہے، مگر دل کی سچی خوشی اور اطمینان کبھی نہیں ہو سکتی۔" ماموں نے درمیان میں مداخلت کی۔

"ہو سکتی ہے۔" سویرا مسکرائی۔ "جائز طریقوں سے کمائی گئی دولت کبھی بھی بے سکونی اور بے برکتی اپنے ساتھ نہیں لاتی۔"

"عجیب لڑکی ہے۔ کبھی کچھ کہتی ہے کبھی کچھ۔۔۔" ممانی نے ٹیڑھی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پھر۔۔۔ میرا کام ہوگا یا نہیں؟" انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔

"اللہ پہ بھروسا رکھ نیک بخت، کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" سویرا کے کچھ کہنے سے قبل ماموں بول پڑے۔

سویرا نے تشکر سے انہیں دیکھا ورنہ اس سوال کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

فرہاج مٹھائی کا ڈبا لایا تھا۔

"ابے اکیلے ہی لے آیا مٹھائی۔ ہم تو سمجھ رہے تھے دونوں ساتھ کھلاؤ گے۔" ارسل نے منہ پھٹ انداز میں با آواز بلند کہا تھا۔ سب نے ایک مشترکہ قہقہہ لگایا۔ سویرا محجوب ہوگئی۔ فرہاج نے ایک

دھپ اس کے کندھے پہ لگائی۔

"میری بہن کا رشتہ طے ہوا ہے۔"

"اپنی کب کھلائے گا؟"

"پیسے جمع کرلے سلامی دینے کے لیے، ڈبل گفٹ لانا ہے تجھے، لڑکی کی طرف سے بھی لڑکے کی طرف سے بھی۔" "انگیج منٹ تو کر پہلے، میں تو تب ہی پیسے جمع کرنا شروع کروں گا۔"

"میں تو تیار بیٹھا ہوں اپنے ہاتھ میں انگوٹھی لیے۔ کوئی اپنا ہاتھ ہی نہیں بڑھا رہا ہے میری طرف جو میں یہ رنگ اس کی انگلی میں ڈال دوں۔"

فرہاج کا لہجہ شریر تھا۔ مگر محبت سے بھرپور۔۔۔ سویرا نے اس کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا۔ ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک گھوری دے کر اس کی زبان بندی کروائے۔ ٹھیک ہے کہ یہ سب آپس میں بڑے پیارے اور مخلص سے دوست بن گئے تھے۔ مگر پھر بھی۔۔۔ ان سب نے ہی مل کر بعد میں اس کا ریکارڈ لگانا تھا۔

"بیٹے! اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ کام اماں، ابا کے کرنے کا ہوتا ہے۔ خود کے کرنے کا نہیں۔ شکر کر تجھے اتنی آزادی اور اجازت مل گئی کہ اپنی پسند کی انگلی میں ان سے انگوٹھی ڈلوا دے، ورنہ پسند اور مرضی بھی اماں، ابا کی ہوتی اور انگوٹھی بھی وہ خود ہی پہنا آتے۔"

"پھر بارات لے کر بھی اکیلے ہی جاتے، بندہ تو جاتا نہیں۔" فرہاج مزے سے پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

سویرا نے دل ہی دل میں پکا ارادہ کرلیا تھا اس کی کلاس لینے کا اور بعد میں فون پر اس نے فرہاج کی خبر لی تھی۔

"تم سب کے سامنے یہ کیا فضول باتیں کرتے رہتے ہو۔" سویرا نے اپنا لہجہ سخت کیا۔

"مثلاً" وہ انجان بنا۔

"بتاؤں ابھی۔۔۔ مثلاً۔۔۔" سویرا نے دانت کچکچائے۔

"ہاں۔۔۔ بتاؤ پلیز۔۔۔! میں ہمہ تن گوش ہوں۔" وہ یقیناً لطف اٹھا رہا تھا۔

"ہمہ تن گوش نہیں۔۔۔ تم ایک خرگوش ہو جو مجھے اپنے پیچھے تھکا رہا ہے۔" سویرا خفا خفا سے لہجے میں بول رہی تھی۔

"کیا واقعی؟ ابھی سے تھک گئیں؟" وہ بھی کچھ سنجیدہ ہوا۔

"پتا نہیں، کبھی کبھی تو یہ ہی لگتا ہے کہ تھک گئی ہوں۔ ہر بات سے، ہر چیز سے، بے زار ہوگئی ہوں بس۔" وہ اتنی سنجیدہ اور رنجیدہ سی لگ رہی تھی کہ فرہاج کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ اسے بہت عزیز، بہت پیاری تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ دنیا بھر کی خوشیاں اور مسکراہٹیں اکٹھی کر کے اس کی جھولی میں ڈال دے کہ یہ لو، یہ سب تمہاری ہیں، تمہارے لیے ہیں۔

"کیا ہوا سویرا؟"

"ایک بات بتاؤ، کیا دنیا میں پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے؟" سویرا کو اس وقت نہ جانے کیا کیا یاد آنے لگا۔

"سب کچھ تو نہیں، مگر بہت کچھ ہوتا ہے۔" فرہاج نے دھیمے سے جواب دیا تھا۔

"پھر اس بہت کچھ کو لوگ سب کچھ کیوں بنا لیتے ہیں۔ یہ رشتہ اور رشتوں کی محبت قدر و قیمت اسی کے حوالے سے کیوں دیکھی جاتی ہے۔ اسی کی کسوٹی پر کیوں پرکھی جاتی ہے۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔

"ہمارے بہت سے المیوں میں سے ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم رشتوں اور انسانوں کو اور اعلا اخلاقی اقدار کو پیچھے کر دیتے ہیں، پس پشت ڈال دیتے ہیں اور پیسے کو آگے لے آتے ہیں۔ سب سے پہلے، سب سے اہم، مگر یہ بھی فیکٹ ہے کہ ایسا ہر جگہ نہیں ہوتا، ہمیشہ نہیں ہوتا، ہر کسی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے لیے، دنیا میں کوئی نہ کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جس کے نزدیک آپ سب سے پہلے ہوتے ہیں، سب سے اہم، باقی سب سیکنڈری ہوتا ہے۔"

فرہاج دھیرے دھیرے سمجھا رہا تھا، مگر وہ بہت جلد سمجھ رہی تھی۔ ایک ایک لفظ جیسے اک دم سے دل کے اندر تک اتر رہا تھا۔ وہ منٹوں میں مطمئن ہوگئی،

پرسکون ہو گئی۔

"نہیں' کبھی کبھی بہت ڈپریسڈ ہو جاتی ہوں۔ بہت الجھ جاتی ہوں۔ پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔" سویرا نے اعتراف کیا۔

"تم بہت زیادہ سوچتی ہو اور وہ بھی بہت فضول۔ ڈپریشن تو ہو گا' اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر دیتی ہو۔" فرہاج نے ڈانٹا تھا۔

"تمہیں برا لگتا ہے' تم پریشان ہو جاتے ہو؟" وہ آہستہ سے پوچھ رہی تھی۔

"مجھے اپنا پریشان ہونا برا نہیں لگتا۔ مجھے دکھ ہوتا ہے تمہارے پریشان ہونے ڈپریسڈ ہونے سے میں تمہیں خوش کرنے کی اور خوش رکھنے کی ترکیبیں سوچتا رہتا ہوں' تمہیں مسکراتا رکھنے اور دیکھنے کے جتن کرتا رہتا ہوں اور تم جانے کیا کیا فضولیات سوچ سوچ کر میری ساری کوششوں پہ پانی پھیر دیتی ہو۔ طبع ڈال دیتی ہو یار۔۔۔ وہ بھی ڈھیروں ڈھیر۔"

"تم جتنا اچھا سمجھاتے ہو' اتنا ہی برا ڈانٹتے بھی ہو۔" وہ ذرا خفا ہوئی۔

"کبھی کبھی تم ناراض ناراض سی بھی اچھی لگتی ہو نا' اس لیے۔"

"ایک ہی بار ناراض ہوں گی اکٹھی' پھر خوش ہوتے رہنا جی بھر کے۔" سویرا نے دھمکی دی' وہ ہنس پڑا۔

"مجھے آتا ہے ناراض لوگوں کو منانا۔" اس نے چھیڑنے کے انداز میں دعویٰ کیا۔

"ہاں۔۔۔ پہلے ناراض کرو' پھر مناؤ۔"

"بالکل۔۔۔ مزا تو اسی میں ہے' ہم پہلے خفا کرتے ہیں پھر مناتے ہیں۔"

"اور ہم ناراض بھی کرتے ہیں اور مناتے بھی نہیں یعنی کہ بالکل ٹھینگا دکھاتے ہیں۔"

"مجھے تو آپ ٹھینگے کے بجائے انگلی دکھا دیں۔"

"کیا؟"

"کب سے رنگ خرید کر رکھی ہوئی ہے۔ موقع ہی نہیں مل رہا پہنانے کا۔"

"موقع ملتا نہیں ہے' نکالنا پڑتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تم مجھے اکسا رہی ہو۔" وہ پھر شریر ہوا۔

"بتا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے! پھر تم دیکھو ذرا' میں کیسے موقع نکالتا ہوں اس سب سے اہم کام کے لیے۔"

"وعدہ کر رہے ہو یا دعوا؟"

"دونوں۔"

"میری بیٹری ختم ہو رہی ہے۔"

"تمہاری؟"

"ارے بھئی! میرے موبائل کی۔"

"تو۔"

"تو پھر خدا حافظ۔"

"اچھا۔" (ایک گہری سانس لے کر) خدا حافظ۔"

گھر میں ایک پروا تھی جسے پڑھائی میں دلچسپی تھی۔ کومل اور سدرہ نے انٹر کر کے چھوڑ دیا تھا۔ ان کا وقت گھر کے کاموں میں اور ٹی وی کے آگے گزرتا تھا۔ سلائی اچھی سیکھ لی تھی۔ کچھ مہینے ماں کا ہاتھ بٹایا تھا۔ سلائی کے کپڑے سی کر' مگر جو تھوڑی بہت رقم جمع ہوئی' وہ ابو نے اپنی دکان میں ضرورت پڑ گئی تھی۔

"جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہو گا' دکان کا مال بڑھے گا تو آمدنی بھی بڑھے گی۔ جو کماتا ہوں' گھر میں ہی لاتا ہوں' کہیں باہر تو اڑا کر نہیں آتا۔" کومل کے اعتراض کرنے پر انہوں نے جواب دیا تھا۔

"ہمیں کیا ضرورت ہے اتنی محنت کریں اور ایک پیسہ بھی نہ ملے۔"

دونوں نے ایکا کر لیا تھا۔ سلائی کے کپڑے سینے سے توبہ کر لی۔ اب امی ہی اکیلی لگی رہتیں۔ دونوں کا موڈ ہوتا تو مدد کر دیتیں۔ پروا کا انٹر کامرس کا رزلٹ آیا تھا۔ بلکہ رزلٹ تو آ چکا تھا۔ اب اس کی مارک شیٹ آئی تھی۔ اسی فیصد نمبر۔ وہ سویرا کے نقش قدم پر چل رہی تھی۔ گھر میں سب نے سوکھے منہ مبارک باد دے دی اور کیا کرتے' خوشی یا بے پناہ خوشی کا اظہار بے معنی تھا۔ سویرا نے مٹھائی منگوا کر اس کامیابی کو سیلیبریٹ کیا اور پروا سے اس کی پسند کے سوٹ کا وعدہ بھی کیا۔

"کیا ہوا' تم خوش کیوں نہیں ہو؟" پروا کے سادہ سنجیدہ چہرے کو اس نے بغور دیکھا۔

"بس جتنا خوش ہونا چاہیے اتنی ہوں۔" وہ جیسے بدقت مسکرائی تھی۔

"خوشی بھی ناپ تول کر ہوتی ہے؟"

"جہاں ہر معاملے میں ہر قدم ناپ تول کر' سوچ سمجھ کر اٹھایا جاتا ہے وہاں کسی کامیابی کو سیلی بریٹ کرنے کی خوشی بھی نپی تلی ہوتی ہے۔ حالات کے حساب سے۔" پروا اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ گھر کے حالات نے وقت سے پہلے اور عمر سے زیادہ شعور اور آگہی بخش دی تھی اسے سنجیدگی اس پر مستزاد تھی۔ اس نے میٹرک ٹیکسٹ ٹیوشن پڑھا کر اپنی فیس بھری تھی پھر انٹر پرائیویٹ بھی اسی طرح کیا تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں بھی پڑھا رہی تھی۔

"تمہارا امتحان بہت اچھا ہے' تم بی اے میں ایڈمیشن لے لو۔"

"میں اتنی فیس افورڈ نہیں کر سکتی بلکہ صرف فیس نہیں' سارے اخراجات۔" پروا نے جیسے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"تمہارے چار سمسٹر کی فیس میں دوں گی اس کے بعد ففٹی پرسنٹ تم دو گی' ففٹی پرسنٹ میں۔" سویرا نے اپنی بہن کی روشن اور ذہین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ جہاں اس کی بات سن کر مسرت آمیز حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔

"تم پہلے ہی اپنی اچھی خاصی سیلری گھر میں خرچ کر رہی ہو' میری پڑھائی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔" پروا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے حقیقت پسندانہ سوال کیا تھا۔

"چراغ سے چراغ جلتا ہے تو روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ کسی نے میرے اندھیرے راستے میں چراغ جلایا تھا اب یہی کام کرنے کی میری باری ہے۔" سویرا گول مول بات کر کے مسکرا رہی تھی۔

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو' سیدھی سیدھی بات کرو۔" پروا نے الجھ کر کہا۔

"میں رضوان سر کے پاس گئی تھی ان کا شکریہ ادا کرنے اور قرضہ واپس کرنے' انہوں نے شکریہ قبول کر لیا اور میری ساری رقم واپس مجھے دے دی یہ کہہ کر کہ اس رقم سے کسی ضرورت مند کی اسی طرح مدد کرنا جیسے میری مدد کی گئی تھی۔" سویرا نے اسے آہستہ سے بتایا۔ "وہ رقم میرے پاس جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔ میں تمہیں اس راز میں اس لیے شریک کر رہی ہوں کہ مجھے تم پر بھروسا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آئندہ زندگی میں جب بھی ممکن ہو تمہیں بہت سارا نوازے تم بھی ایسے چراغ ضرور جلانا۔"

"تو تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں ایڈمیشن لے رہی ہوں؟"

"سمجھ نہیں لیا' فیصلہ کر لیا۔" سویرا مسکرائی تھی اس کے ساتھ پروا بھی اس مسکراہٹ میں شریک تھی۔

☼ ☼ ☼

فرہاج اپنی امی سے خوب متاثر ہو رہا تھا۔

"میری ممی بہت گریٹ ہیں' پرعزم اور محنتی۔ میں میٹرک میں تھا اور میرا بھائی سیونتھ میں' چھوٹی بہن فائیو میں تھی' جب ہمارے پاپا کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ پھپھو ہمارے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ ممی دن بھر جاب کرتیں اور گھر کے اور ہمارے کام۔ اب سوچتا ہوں یار وہ تھک کے چور ہو جاتی تھیں' مگر کبھی بھی ان کے منہ سے ناشکری کا کلمہ نہیں سنا ہم نے' نہ قسمت کی شکایت نہ اللہ سے یا بندوں سے شکوہ' وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ اللہ جب اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے' تو اس سے نمٹنے کی ہمت بھی دیتا ہے وہ کہتی ہیں کہ مشکل حالات میں ہی ہماری طاقت' توانائی اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں جن کا عام حالات میں ہمیں ادراک نہیں ہوتا۔"

فرہاج نے آج پہلی بار اپنی زندگی کا یہ گوشہ اس کے سامنے بے نقاب کیا تھا۔ اس کے لہجے میں اپنی امی کے

لیے محبت ہی نہیں عقیدت بھی تھی۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے سویرا کو اپنی امی کا خیال بارہا آیا۔ کچھ عورتوں کو شوہر کے جیتے جی بھی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"ملوگی میری ممی سے؟"

"ملواؤ گے تو ضرور ملوں گی۔"

"میں نے تمہارے بارے میں بتایا تھا انہیں کہہ رہی تھیں کہ اسے گھر لے کر آؤ۔"

"اگر انہوں نے مجھے ریجیکٹ کر دیا تو؟" سویرا کے دل میں خدشہ جاگا۔

"نہیں کریں گی۔ میرے اور ان کے خیالات پسند ناپسند سب ایک جیسے ہیں۔ جب بیٹے نے تمہیں سلیکٹ کر لیا تو ان کے منہ سے بھی "ہاں" ہی نکلے گا' نہ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' تم اپنی طرف کی بتاؤ' تمہارے ہاں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا؟"

"نہیں۔" سویرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس نے امی کو فرہاج کے بارے میں بتایا وہ خوش ہوئی تھیں سن کر۔

"ابھی کسی اور سے ذکر مت کرنا۔"

"کسی اور؟"

"ہاں اپنی بہنوں سے' باپ سے یا نانی کے گھر ممانی وغیرہ سے' کسی کے آگے بھی زبان مت کھولنا۔" انہوں نے سختی سے تنبیہ کی۔

"کیوں؟" سویرا کو تعجب ہوا' کیا سارے ہی ناقابل اعتبار تھے یا...؟

"جب کوئی بات ہوگی سب کے سامنے آجائے گی' پہلے کے پہلے چرچا نہ ہی ہو تو بہتر ہے۔"

"اچھا!" سویرا کی ذہانت اور محنت تعلیمی میدان تک محدود تھی اور پھر اپنی جاب تک۔ معاشرتی' رواجی معاملات میں وہ اوروں کی نسبت کوری ہی تھی۔

دو ماہ بعد فرہاج کی بہن کی شادی تھی' اس نے سارے دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ سویرا سے فون پر اس کی ممی نے بات کی تھی۔ اسے خاص طور پر سارے فنکشنز اٹینڈ کرنے کا کہا تھا انہوں نے۔ وہ مہندی میں گئی پھر بارات میں۔ فرہاج کی ممی واقعی بہت ڈیسنٹ تھیں' ہنس مکھ اور پھرتیلی سی۔ انہوں نے سویرا کو خصوصی پروٹوکول اور توجہ دی تھی۔ ان کی نظریں اور ایک ایک انداز پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ انہیں اپنے بیٹے کی "پسند" بہت پسند آئی ہے۔ ویسے وہ لگ بھی بہت اچھی رہی تھی۔ بہت عمدہ ڈریسنگ اور پیارا سا میک اپ۔

"اب تمہارے گھر کا چکر لگانا ہے مجھے۔" انہوں نے بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا تھا۔

☼ ☼ ☼

بڑے دنوں بعد نانی کے پاس اس کا چکر لگا تھا' وہ اسے دیکھ کر ہی نہال ہو گئیں۔

"کتنی کمزور ہو رہی ہے میری بچی' اپنے کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتی۔"

"یہ کمزوری نہیں ہے نانو! اسمارٹ نیس ہے۔" سویرا نے ان کا پان دان کھول کر کھوپرا اور چھالیہ ٹٹولنا شروع کر دی۔ کھوپرے کا ٹکڑا بھی مل گیا اور چھالیہ کے دانے بھی' سویرا منہ میں ڈال کر لطف اندوز ہونے لگی۔

"آپ نے نیا سوٹ نہیں پہنا؟" سویرا ان کے لیے لان کا سوٹ لائی تھی' امی سے سلوا کر دیا تھا۔ وہ بہت خوش بھی ہوئیں اور بہت جذباتی بھی۔

"جمعے کے دن پہنا تھا' نہا دھو کر نماز پڑھی پھر اتار کر رکھ دیا۔"

"کیوں؟"

"اب اگلے جمعے کو پہن لیں گے۔"

"پہن کر پرانا کریں اور آجائے گا نیا سوٹ۔" سویرا نے ان کا بوڑھا چہرہ دیکھا۔ بڑھاپا بھی کیا شے ہے عموماً" لوگ ایک گوشے' ایک کونے تک محدود ہو جاتے ہیں۔ وہ بے چاری مرنجان مرنج سی تھیں' اپنی اولادیں یا ان کی اولادیں ہنس کر بول لیتیں تو اسی میں خوش ہو جاتیں' ڈھیروں دعائیں دیتی نہ تھکتیں۔

"بس بیٹا! میرے لیے تو یہ بھی بہت ہے' پہننے اوڑھنے کی عمر تو تمہاری ہے' اللہ تمہیں اور دے' بہت دے' اپنے ماں' باپ کا سب کا دل ٹھنڈا رکھے تم سے۔" نانی آبدیدہ ہو گئیں۔

ایک جوڑا وہ ممانی کے لیے بھی لائی تھی۔ نانی نے سن کر پہلے خاموشی اختیار کی پھر کچھ دیر بعد بولیں۔

"اپنا کنبہ ماشاءاللہ بتیرا ہے' کیا ضرورت ہے ممتاز کو جوڑا دینے کی۔ کوئی غریب' غرباء تھوڑی ہے۔ اپنے لیے' اپنی لڑکیوں کے لیے نئے جوڑے لائی تھی' اسے خیال نہ آیا کہ سویرا بھی میری بیٹی ہے ایک اس کے لیے بھی لے لوں۔"

سویرا کے چہرے پہ ایک سایہ سا گزرا' شاید ملال کا یا دکھ کا۔ پھر وہ نارمل ہو گئی یا شاید نظر آنے کی کوشش کرنے لگی۔

"چھوڑیں ان سب باتوں کو' آپ یہ بتائیں چھوٹی خالہ کیسی ہیں؟ کب آئی تھیں گھر؟" اس نے موضوع بدلا۔

"ہاں پرسوں آئی تھی ذرا دیر کو' پھر چلی گئی۔ روکا تھا مگر رکی نہیں' میاں کے ناشتے کھانے کی فکر تھی' کون دے گا۔" نانی نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"اپنے گھر بسو' خوش رہو۔ دو گھڑی ملنے آجاتی ہے۔ غنیمت ہے' گھر کے دھندوں سے اور بچوں کی جھنجھٹ سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے عورتوں کو' چار بچے پہلے ہی ہیں پھر پانچویں کی تیاری ہے۔ اب تو دو چار بچے بھی بہت ہیں' ہم نے آٹھ بچے پیدا کر کے کون سا کمال کر لیا' ساری عمر ان ہی کے کاموں میں کھپ گئی' اب بڑھاپے میں ایک کونا پکڑ کر بیٹھے ہیں' کبھی کسی کا ضمیر جاگے تو دیکھنے پوچھنے آجاتا ہے ورنہ سب اپنے اپنے دھندوں میں مصروف رہتے ہیں۔"

نانی کو بڑے دنوں بعد کوئی سامع ملا تھا وہ بلا تکان' دل جمعی سے اپنے دل کا غبار نکالتی رہیں' سویرا خندہ پیشانی سے سنتی رہی۔

ماموں کے پورشن میں آئی تو وہاں ادھم مچا ہوا تھا' فراز اسکول والوں کے ساتھ پکنک پر جا رہا تھا۔ Fiasta - ایک ہزار روپے ہر بچے سے لے جا رہے تھے' فراز بضد تھا کہ وہ پکنک پر جائے گا۔

"تمہارا باپ نوٹوں کی گڈیاں لا لا کر نہیں دیتا مجھے' جو ہزار ہزار کے نوٹ لٹاتی رہوں۔" ممانی نے صاف انکار کر دیا تھا' بیٹے کی ضد' منت سماجت اور رونے دھونے کا کوئی اثر لیے بغیر۔

"آپی' آپ بول دیں نا امی بھیج دیں مجھے پکنک پہ' ایک ہزار کی تو بات ہے صرف۔" سویرا کو دیکھ کر اس نے بلبلا کر دہائی دی۔

"تمہاری آپی کماتی ہے اس کے لیے ایک ہزار "صرف" ہوں گے' میں تو دانتوں سے پکڑ پکڑ کر پیسہ خرچ کرتی ہوں تب کہیں جا کر مہینہ پورا پڑتا ہے۔"

"امی...!" وہ چیخا۔

"بس خبردار! اب آگے سے جو ایک لفظ بھی کہا۔" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

"جانے دیں مما' سال میں ایک بار تو پکنک ہوتی ہے۔" سویرا کو اس کی روئی روئی آنکھیں اور بسورتا چہرہ دیکھ کر ترس آنے لگا۔

"تم دے دو پیسے تو بھیج دوں گی' میرے پاس تو نہیں اتنی رقم۔ کل کو دوسرے بچے بھی کھڑے ہو جائیں گے ہزار ڈیڑھ ہزار کے لیے میں کہاں سے سب کو دیتی پھروں گی۔" ممانی نے ٹکا سا جواب دے کر گیند اسی کے کورٹ میں ڈال دی۔ جو بولے سو کنڈی کھولے۔

"ابھی تو میرا ہاتھ کافی تنگ ہے' شاپنگ میں اچھی خاصی رقم اٹھ گئی۔" سویرا نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"کیسی بہن ہو' اپنے بھائی کی چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کر سکتیں' تم تو کماتی ہو پھر یہ کنجوسی؟" ممانی ادھار رکھنے کی قائل بالکل نہیں تھیں' منہ پر ہی بول دیتیں' کسی کو برا لگے یا اچھا۔

"کنجوس تو خیر میں نہیں ہوں' جہاں خرچ کرنا ضروری ہو وہاں کرتی ہی ہوں۔" سویرا نے ماتھے پہ بل ڈالے بغیر رسان سے جواب دیا۔

"ہاں تو اپنے سگے بہن بھائیوں پہ خرچ کرتی ہو نا'

ہم نے بھی تو اتنے سال پالا پوسا' محبت شفقت کے ساتھ رکھا' اب ہمارے بچوں کا اتنا بھی حق نہیں کہ کبھی دو چار پیسے ان پر بھی خرچ کردو۔"

"ممانی...!" سویرا نے بڑے دکھ سے انہیں دیکھا۔ "کیا میں نے کبھی ان لوگوں پر کوئی خرچا نہیں کیا؟"

"کوئی مہینہ تو نہیں باندھا ہوا نا' کبھی کبھار کا کوئی خرچا کس گنتی میں آتا ہے۔ اونٹ کے منہ میں جیسے زیرہ۔" ممانی اس کی فیاضی اور ایثار کو کسی خاطر میں نہ لائیں جو وہ اکثر ان سے روا رکھتی تھی۔

اگلے دن وہ اپنی جاب پر بڑی اداس اداس سی تھی۔ کبھی ممانی کی یا ان کے بچوں کی کسی بات سے' کبھی اپنے گھر والوں کی کسی بات سے وہ دلگرفتہ ہو جاتی تو یونہی اور بھی چپ اور خاموش ہو جاتی تھی۔ سب کے پوچھنے پر سر درد کا بہانا بہت اچھا جواب تھا' مگر فرہاج تو اس بہلاوے میں آنے والا نہیں تھا۔

"آج کا لنچ میری طرف سے ہے۔" اس کی دعوت یقیناً صرف اور صرف سویرا کے لیے تھی۔

"میں لنچ لائی ہوں۔" سویرا نے بتایا۔

"آج واپس لے جانا۔" فرہاج نے حکم دیا۔

"بلکہ ایسا کرو' کسی کو دے آؤ۔" فرہاج نے دوبارہ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا کھلاؤ گے؟" سویرا نے خود پر چھائی یاسیت دور کرنے کی کوشش کی۔

"جو تم کہو۔"

ان کے آفس کی بلڈنگ کے برابر میں ہی ایک ریسٹورنٹ تھا' لنچ ٹائم میں دونوں وہاں بیٹھے تھے۔

"کیا منگاؤں؟"

"چائنیز۔"

"آپ کی خواہش اور پسند قابل احترام ہے خاتون! مگر میں اکثر سوچتا ہوں کہ جو "چائنیز فوڈ" پاکستان میں ملتا ہے ویسا "چائنا" میں بھی نہیں ملتا۔" فرہاج اس کے چہرے پہ مسکراہٹ لانے کے جتن کر رہا تھا۔ خالی خولی مسکراہٹ نہیں' جو بے جان بجھی بجھی سی ہوتی ہے بلکہ زندگی سے بھرپور' روشن چمکدار مسکراہٹ۔

"دیسی چائنیز۔" سویرا تبصرہ کرکے دھیرے سے مسکرا دی۔

فرہاج کے موبائل پہ کال آرہی تھی۔

"ممی کا ہے۔" اس نے نمبر دیکھ کر سویرا کو بتایا اور فون کان سے لگایا۔

"ہیلو! السلام علیکم!"

"جی میں لنچ ہی کر رہا ہوں۔"

"بل کی لاسٹ ڈیٹ کل ہے نا' میں جمع کروا دوں گا۔"

"ڈونٹ وری مام۔ بس کچھ عرصے کی پریشانی ہے' یہ جب تک میری شادی ہوگی پھر۔" وہ کچھ کہہ رہی تھیں فرہاج چپ ہو کر سننے لگا۔

"بالکل وہ تنخواہیں گھر میں آئیں گی' جو تھوڑی بہت پرابلمز ہیں' وہ سولو ہو جائیں گی۔" فرہاج ہنس کر بولا تھا۔

چند منٹ بعد بات کرکے اس نے فون رکھا تو سویرا عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" فرہاج اس کے یوں دیکھنے پر ٹھٹک سا گیا۔

"تم بھی اور سب کی طرح نکلے فرہاج؟" وہ شدید دکھ کی کیفیت میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔

"سویرا!" فرہاج اس کی یکایک بدلتی کیفیت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"تم اس لیے شادی کرنا چاہتے ہو مجھ سے کہ شادی کے بعد تمہارے گھر میں ایک کے بجائے دو تنخواہیں آئیں اور تمہاری فیملی کی پرابلمز سولو ہوں' بہن کی شادی پر قرض ہو گیا ہے نا تم پر' وہ بھی اتارنا ہے۔" وہ نہ جانے کیا کیا بولے چلی جا رہی تھی' فرہاج حیران و ششدر اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرے دو تین جملوں سے تم نے اتنی جلدی اتنے بڑے بڑے نتائج اخذ کرلیے۔" فرہاج ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کچھ دیر بعد گویا ہوا۔

"میں بے وقوف تو نہیں ہوں' ہاں اگر کوئی بنانے کی کوشش کرے تو الگ بات ہے۔" سویرا استہزائیہ

سی ہنسی کے ساتھ بول رہی تھی۔

"میں...! بے وقوف بنا رہا ہوں تمہیں؟"

"یہ تو تم مردوں کی ایک خاص خوبی ہے۔" وہ تلخی سے کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

رات... وہ فرہاج کے فون کا انتظار کرتی رہی' مگر یہ انتظار لاحاصل ہی رہا۔ اسے ہر پل یہ امید رہی کہ فرہاج فون کرکے اپنی بات کی وضاحت کرے گا۔ وہ کہے گا کہ سویرا نے اسے غلط سمجھا ہے' غلط کہا ہے' وہ ایسا نہیں ہے۔ مگر لحہ لحہ یہ امید دم توڑتی رہی ساتھ ساتھ محبت بھی' اسے لگ رہا تھا کہ محبت مر رہی ہے۔ مگر محبت نہ اچانک شروع ہوتی ہے نہ اچانک اتنی جلدی ختم ہوتی ہے۔

ہم لڑکیاں ہی ہوتی ہیں پاگل' بے وقوف۔ محبت کے نام پر آسانی سے دھوکا کھا لیتی ہیں۔ بڑے آرام سے پاگل بن جاتی ہیں۔ وہ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ سوچتی رہی۔ بے خوابی اور رونے کی وجہ سے صبح اس کے سر میں شدید درد تھا' آفس میں وہ انتہائی سنجیدہ تھی اور فرہاج اس سے بھی زیادہ۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں سویرا مایوسی اور بددلی کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔ فرہاج نے کوئی وضاحت دینا تو دور کی بات اسے مخاطب کرنا بھی چھوڑ دیا تھا' سوائے اشد دفتری ضرورت کے۔

کیا واقعی اس شخص نے کبھی مجھ سے محبت کی تھی یا محض وقتی دعوا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ سوچتی۔ بہت قریبی دوستوں نے ان کے درمیان کشیدگی اور پھر بڑھتی ہوئی خلیج کو محسوس کرکے بات کرنی چاہی تو دونوں نے ہی لبوں پر مہر لگالی اور پھر ایک دن اس نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک دوسری کمپنی میں اس نے اپلائی کیا تھا' وہاں سے آفر آئی تھی۔ آخری دن بھی نہ فرہاج نے اس سے کچھ کہا اور نہ ہی سویرا نے اسے مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر' یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ تمہیں اپنی ناک عزیز ہے' تو میری انا کی دیواریں بھی بہت بلند ہیں۔" اس نے خود کو مضبوط کرلیا۔ اور خود کو پتھر کا بنانے کی کوشش کرنے لگی۔

امی مہمانوں کی آمد کے انتظار میں تھیں' اس نے ماں کو سب کچھ بتا کر ان کی امید اور انتظار بھی ختم کردیا۔

"اتنی سی بات پہ ناراض ہو گئیں اس سے۔" امی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یہ اتنی سی بات ہے امی...؟" ماں کی حیرانی پر وہ ان سے زیادہ حیران ہو گئی۔

"کیا مجھے صرف اس لیے پسند کیا گیا' اس لیے محبت کا دعوا کیا کہ میں ان فیوچر فائنینشل سپورٹر ہو سکتی ہوں' محبت تو نہ ہوئی یہ' سیدھا سیدھا بزنس ہو گیا۔"

"کسی اور کی کیا گارنٹی ہے' دنیا لالچی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔" امی نے آہستہ سے کہا۔

"انجانے میں اور انجان لوگوں سے دھوکا کھانے میں اتنی تکلیف نہیں ہوتی۔" سویرا وہاں سے اٹھ گئی۔ اگلی صبح نئی جاب کا پہلا دن تھا' وہ جلدی سونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو کتاب زندگی کا یہ باب ختم ہوا۔" وہ رونا نہیں چاہتی تھی' مگر رونا آرہا تھا اور بے تحاشا آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نئی جگہ پر آہستہ آہستہ وہ ایڈجسٹ ہو ہی گئی۔ یہاں رومیہ تھی اس کی کولیگ' اچھی ملنسار لڑکی تھی۔ سب سے اچھی عادت اس کی یہ تھی کہ وہ کسی کے ساتھ پرسنل نہیں ہوتی تھی۔ جو جتنا بولنا چاہتا اتنا ہی سنتی تھی' پے در پے سوالات کرکے زبردستی کسی کو بولنے پر مجبور نہیں کرتی تھی۔

اس جاب کی سیلری بھی نسبتاً بہتر تھی۔ گھر کے بہت سے اخراجات وہ اٹھا رہی تھی۔ ممانی اکثر ہی یا کسی بچے کو بھیج کر یا اسے بلوا کر گھر کی کوئی ضرورت اس کے سامنے رکھ دیتیں' یہاں ابو بڑبڑاتے' ممانی کو لالچی عورت سمیت کیا کیا القاب دیے جاتے۔ وہ سویرا

کو بھی منع کرتے تھے کہ وہ یوں آئے دن انھیں پیسے نہ دیا کرے' مگر سویرا مسکرا کر ٹال جاتی۔ تیئیس برس کا احسان بڑا بھاری تھا۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ ابو بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ ناشتہ' کھانا بھی برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ پہلے سے کافی کمزور بھی ہو گئے تھے۔ اس نے امی سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"پریشان تو مجھے بھی لگ رہے ہیں۔ میں نے کئی بار پوچھا تو ٹال دیا کچھ بتاتے ہی نہیں کیا بات ہے۔" امی بھی متفکر نظر آرہی تھیں۔ سویرا نے خود ہی ان سے پوچھنے کی ٹھانی' مگر ان کے کچھ بتانے سے پہلے ہی ان کی پریشانی کی وجہ سب کو معلوم ہو گئی۔

رات میں جب وہ گھر آگئے تھے' کوئی آدمی ان سے ملنے آیا۔ وہ اپنی رقم کا مطالبہ کر رہا تھا جو ابو نے ادھار لی تھی۔ دروازے پر کھڑا وہ بہت تند و تیز لب و لہجہ میں اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا' اندر صاف آواز آرہی تھی۔ اس شخص کے جانے کے بعد ابو اندر آئے تو ان کا پورا وجود شدید پریشانی کی جیتی جاگتی تصویر بنا ہوا تھا۔ تھکے تھکے سے وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

دو سال پہلے دکان میں مال ڈالنے کے لیے ایک آدمی سے انہوں نے سود پر ایک لاکھ روپے کا قرض لیا تھا۔ اب تک ڈیڑھ لاکھ روپے ادا کر چکے تھے مگر ستر ہزار پھر بھی باقی تھے۔ دکان بھی تقریباً" خالی ہی ہو چکی تھی۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر تین ماہ سے ایک پائی بھی قرضے کی اور سود کی مد میں ادا نہیں کی تھی۔ دکان پر روزانہ آکر تقاضا کرتے کرتے اب یہ شخص گھر تک آپہنچا تھا۔

"آپ نے گھر میں بتایا کیوں نہیں یہ سب؟" سویرا ہی آگے بڑھی تھی۔

"تمہاری ماں نے پوچھا تھا' میں نے سوچا اب اسے اور کیا پریشان کروں مشکل بتا کر۔" انہوں نے اپنی پیشانی مسلی۔

"ہم میں سے تو کسی کو بتاتے۔" سویرا نے تاسف سے ان کا ستا ہوا کمزور چہرہ دیکھا' دنوں میں وہ اک دم بوڑھے سے لگنے لگے تھے۔

"کسی نے کبھی کچھ پوچھا ہی نہیں۔" انہوں نے آہستہ سے کہا۔

سویرا کا دل دکھ اور تاسف سے بھر گیا۔ اپنی تمام تر بشری کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ وہ بہرحال ان سب کے باپ تھے۔ بہت زیادہ اچھے باپ نہیں تھے' مگر بالکل ہی برے بھی نہیں تھے۔ پروا آگے بڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"ابو آپ پریشان نہ ہوں ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے اور ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو ہی جائے گا۔"

"کیسے ہو گا بچی! جیسے تیسے قرضہ ادا ہو بھی جائے' پھر آگے آمدنی کا کوئی ذریعہ' دکان میں مال ڈالنے کے لیے بھی رقم چاہیے' وہ کہاں سے آئے گی۔ دکان کا کرایہ بھی پانچ مہینے کا چڑھ گیا ہے' میں تو بالکل ہی صفر ہو گیا ہوں۔" وہ مایوس اور دل شکستہ تھے۔

"ہر مشکل کام کی شروعات ہمت اور حوصلے سے ہوتی ہے' ہم بھی اسی سے کام لیں گے تو یہ پہاڑ سر ہو ہی جائے گا۔" سویرا بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"تم بچیاں ہو' کمزور ہو۔ کیا کرو گی بیٹا' کتنی محنت کرو گی۔"

"کمزور کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں لڑکے' لڑکی یا مرد' عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ بات صرف جرأت اور محنت کی ہے' وہ ہم سب مل کر کر لیں گے۔ کشتی طوفان میں پھنس جائے تو کشتی کے سبھی مسافر اپنی اپنی بساط کے مطابق طوفان کا مقابلہ کرتے ہیں تب ہی سیفٹی کی کوئی صورت نکلتی ہے۔" سویرا کوشش کر رہی تھی کہ باپ کو کچھ ہمت و حوصلہ دے اور ان کی ٹینشن اور فکر کو کچھ کم کرے۔

رات نیند بہت دیر سے آئی۔ وہ بہت کچھ سوچتی رہی اور پلان کرتی رہی۔ پروا بھی اس کے ساتھ شریک تھی' ساتھ امی اور دونوں بہنیں بھی تھیں۔

"کیا کرو گی تم لوگ؟" امی نے بڑی امید سے انھیں دیکھا۔

"سب سے پہلے تو قرضہ ادا کرنا ہے۔ سود اور سودی قرضہ تو ایک جال ہے' انسان جتنے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور ہی الجھتا جاتا ہے۔ اس میں نہ برکت ہے نہ اللہ کی رحمت اور اس کے ساتھ ساتھ کرائے کی دکان بھی چھوٹی ہے۔ آدھی سے زیادہ آمدنی تو کرائے میں چلی جاتی ہے۔"

"تمہارے ابو نوکری نہیں کر سکتے' عادت ہی نہیں ہے۔ ساری عمر اپنا ہی کام کیا ہے۔ نوکری تو دوسرے کی غلامی اور وقت کی پابندی ہے۔" امی نے بالکل ٹھیک کہا تھا ابو کے بارے میں۔

"نہ کریں نوکری' اپنا ہی کام کریں' مگر کرائے کی جگہ پر نہیں۔"

"تو پھر کہاں؟" بے ساختہ سوال آیا۔

"اپنے گھر میں' ہمارا گھر کونے سے دوسرا ہے' گلی کی طرف یہ جو کمرہ ہے' اسے ہی دکان بنا لیں گے' تھوڑی بہت تبدیلی کرنی ہوگی۔"

"گلی میں دکان؟ چل جائے گی؟" سویرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"انسان کا کام کوشش اور محنت ہے' روزی اللہ کے ذمے ہے جب وہ پتھر کے اندر کیڑے کو رزق دیتا ہے تو گلی محلے کی دکانداری میں بھی برکت دے گا۔"

"اور تم دونوں امی کی ہیلپ کرو گی سلائی میں' اپنی محنت کے آدھے پیسے تم لوگ اپنے پاس رکھنا اور آدھی آمدنی گھر کے اخراجات میں کام آئے گی۔"

"یہ سب کچھ ہو جائے گا؟" امی بے یقینی کی کیفیت میں تھیں۔ خالی ہاتھ منصوبے بنانا بہت آسان ہوتا ہے مگر ان پر عمل کیسے ہو گا؟

"ہو جائے گا سب کچھ ہو جائے گا' چاہے بہت آہستہ آہستہ ہو' چیونٹی کی رفتار سے ہو۔" سویرا سے پہلے پروا بول پڑی۔ اس کے لہجے میں عزم بھی تھا اور یقین بھی۔

پروا کی ایک سمسٹر کی فیس سویرا نے قرضے کی ادائیگی میں دے دی۔ سودی قرضے سے چھٹکارا ملا' مانو ایک پہاڑ سر سے ہٹ گیا۔ گھر کا وہ کمرہ جو گلی کی جانب تھا اس میں ضروری تبدیلیاں کر کے اسے دکان کی شکل دے دی گئی۔ اب اگلا مرحلہ تھا اس میں مال ڈلوانے کا' ضروری آئٹم کے لیے بھی ٹھیک ٹھاک رقم چاہیے تھی' اس کے لیے بھی اللہ نے غیب سے مدد کر دی۔ محلے کی رضیہ بھابھی کمیٹی ڈال رہی تھیں پانچ ہزار پہ دو لاکھ روپے کی' امی نے بات کی تو وہ دوسری کمیٹی دینے پر راضی ہو گئیں' مگر دو کمیٹیوں پر ایک دوسری ایک آخری ملنی تھی۔

"دس ہزار روپے ماہانہ کیسے بھریں گے؟" امی متفکر سی ہو گئیں۔

"ہم نہیں' ابو بھریں گے یہ کمیٹی۔" سویرا ابو سے مخاطب ہوئی۔

"کمیٹی آپ کو ملے گی' آپ دکان میں مال ڈالیں اور ہر مہینے' دکان کی آمدنی سے کمیٹی بھریں۔ ایک سال تک گھر کے لیے کسی قسم کا کوئی خرچا ہم لوگ آپ سے نہیں لیں گے۔ آپ کو صرف کمیٹی بھرنی ہے اور اس کے علاوہ منافع اگر بچتا ہے تو اس سے دکان کا سامان بڑھاتے رہیں۔"

"اور گھر کا خرچہ؟"

"ہم لوگ مل کر چلا لیں گے' ایک سال کی تو بات ہے' اس کے بعد آپ کمیٹیاں بھرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے خرچے میں تعاون کریں گے۔" سویرا نے ساری پلاننگ کر لی تھی۔

"تم اکیلی کیا کیا کرو گی؟"

"اکیلی کیوں میرے ساتھ امی ہیں' سدرہ' کومل' پروا ہم سب تو ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔"

☼ ☼ ☼

ان ہی گزرتے دنوں میں ایک دن ممانی آئیں۔ گھر کا گھر کے افراد کا' دکان کا سب کا بغور جائزہ لیا۔

"ٹھیک ٹھاک رقم لگی ہو گی اس میں۔" ان کا اشارہ دکان کی طرف تھا۔

"ہاں بھئی! گھٹنا اپنے پیٹ کی طرف ہی مڑتا ہے' ہم نے تو صرف پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ ماں' باپ کی جگہ تو پھر بھی نہیں لے سکے ہم۔ ہماری ضرورت کے وقت تو تم کنگال تھیں' اب ڈھیروں ڈھیر پیسہ کہاں سے آگیا۔" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بے لاگ شروع ہو گئیں۔ ان کا روئے سخن سویرا کی طرف تھا۔

"حسن کے ابو نے کمیٹی ڈالی ہے اس سے کیا ہے سب کچھ۔" سویرا کے کچھ کہنے سے قبل ہی امی نے جلدی سے صفائی پیش کی ممانی ہنس پڑیں طنزیہ ہنسی۔

"باسط میاں کب سے اتنے اچھے اور ذمہ دار ہو گئے؟ ساری عمر تو روتے جھینکتے گزاری اب کیا انقلاب آگیا بڑھاپے میں؟"

"ممانی! شربت۔" سدرہ نے شربت کا گلاس ان کے آگے پیش کیا۔

ٹھنڈا ٹھار' میٹھا خوشبودار شربت۔ روح تک شانت ہو گئی پی کر۔

"تم نے تو آنا ہی چھوڑ دیا بالکل' تمہاری نانی بھی یاد کر رہی تھیں۔" اس بار وہ نسبتاً "خوشگوار موڈ" میں سویرا سے مخاطب ہوئی تھیں۔

"مصروفیت زیادہ تھی اس لیے نہیں آسکی۔ اس ہفتے ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔" سویرا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ممانی کی تیز مزاجی اور صاف گوئی بلکہ اشتعال انگیزی کافی تکلیف دہ ہو جاتی تھی' مگر وہ نظر انداز کر جاتی۔ تحمل سے کام لیتی' برداشت کرلیتی اور گزر کر جاتی۔

"تمہارے ماموں کو ضرورت تھی پانچ ہزار کی' مجھے بھیجا ہے کہ سویرا سے پوچھ لو تھوڑے تھوڑے کرکے واپس کردیں گے ایک دو مہینوں میں۔" خدا جانے وہ ماموں کا نام لے کر جھوٹ بول رہی تھیں یا جھوٹ مگر سویرا ایک لمحے کو ضرور چکرا گئی۔ اس وقت اس کے لیے پانچ ہزار تو کیا پانچ سو روپے نکالنا بھی بے حد دشوار تھا۔

"ممانی!" وہ بدقت کہنے لگی۔ "فی الحال تو بہت مشکل ہے اتنی رقم کا انتظام کرنا' پیپا سے پہلے کہیں کوشش کروں گی جتنے ہو سکیں گے دے دوں گی۔"

"کب تک؟"

"تین چار دن تو لگیں گے۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" وہ امی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ جو کچھ وہ امی سے کہہ رہی تھیں "لڑکیوں کی سمجھ میں سب آرہا تھا۔ وہ کسی رشتے کے بارے میں امی کو بتا رہی تھیں۔

"ہاں ہاں بھابھی! لے آیئے انہیں' دیکھ لیتے ہیں کیسے لوگ ہیں۔ شادی تو کرنی ہی ہے لڑکیوں کی' کوئی گھر بٹھا کر تھوڑی رکھنا ہے۔" امی نے مہمانوں کو بلانے کی ہامی بھرلی تھی۔

رات کو سونے سے قبل اس نے حسب عادت کلینزنگ کی' بالوں کو برش کیا اور اس دوران وہ مستقل فرہاج کو سوچتی رہی تھی۔ اس کے خلاف دل میں غم و غصہ تھا اور بہت تھا۔ اس کے لیے بڑے اچھے جذبات تھے سویرا کے دل میں' اسے اتنا ہلکا' کم تر اور عامیانہ سوچ کا مالک کبھی سمجھا ہی نہیں تھا اور وہ محبت کا دعوا' بس ایک حباب' لمحہ بھر میں ختم' وہ دکھے دل کے ساتھ اس شخص کو سوچتی رہی۔

"کیا میں اس قابل نہیں تھی کہ وہ محبت کے ساتھ مجھے اپنا بنا کر لے جائے فرہاج کے۔" سویرا نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" پروا نے یونہی اسے دیکھا تو اک دم پوچھ بیٹھی۔ اس کی شکل ہی ایسی ہو رہی تھی کہ بس اب روئی کہ تب روئی۔

"کچھ نہیں۔" سویرا نے بے دلی سے بالوں کو ربڑ بینڈ سے جکڑا۔

"ممانی کی باتیں سوچ رہی ہو گی' وہ ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں منہ پھٹ۔ ویسے تمہاری ہمت ہے' تم اتنی کڑوی کسیلی اور طنزیہ باتیں برداشت کرلیتی ہو' میں تو کبھی نہ کروں' ایک کی جگہ چار سناؤں۔" پروا تیز تیز بولتی گئی۔ کومل اور سدرہ بھی اس کی ہم نوا تھیں۔

"ایک سن کر چار سنانا آسان ہوتا ہے۔ ضبط کرنا' تحمل سے کام لینا' صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سولہ سال تعلیم حاصل کرکے اگر اتنا بھی نہ سیکھا تو ہم میں اور اس

گدھے میں کوئی فرق نہیں جس پر کتابیں لاد دی جاتی ہیں' مگر سیکھتا وہ بھی کچھ نہیں۔ ہماری ایک ٹیچر کہتی تھیں کہ ڈگری حاصل کرنا آسان ہوتا ہے' مگر جو کچھ پڑھ کر وہ ڈگری حاصل کی جاتی ہے اس پر عمل کرنا بے حد مشکل۔ ہمیں یہ مشکل کام کرنا ہے ورنہ کوئی فائدہ نہیں ڈھیروں ڈھیر موٹی موٹی کتابیں رٹنے کا۔"

"بہت مشکل ہے بھئی' لوگوں کی تلخ نوائیاں سہنا۔" پروا نے جیسے جھرجھری لی تھی۔

"مشکلات کو آسان کرکے ان سے نبٹا جاتا ہے' اچھا گمان بھی رکھنا چاہیے۔ لوگوں کے متعلق ہمیں ان کی اچھائیاں سوچنی چاہئیں پھر کوئی اتنا برا نہیں لگتا جتنا ہم سوچ لیتے ہیں۔" سویرا بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ کچھ اور اک ہوا تھا ہیں اسی لمحے۔

اس نے خود کیا کیا تھا فرہاج کے معاملے میں؟ یوں بدگمان ہو گئی جیسے کبھی اس کی اچھائیوں سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

"کیا واقعی وہ ایسا ہی تھا لالچی اور خود غرض؟"

اس کے دل نے اس سے سوال کیا تھا' جس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ کبھی کبھی ہم پر اتنی خود ترسی طاری ہو جاتی ہے کہ خود کو مظلوم بنانے کے لیے بلکہ مظلوم ثابت کرنے کے لیے ہم اپنا ہی کوئی بڑا نقصان کرلیتے ہیں۔ اس کا دل ہی تھا جو اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا فرہاج کی حمایت میں' دماغ کی تو بات الگ تھی' دماغ ابھی تک فرہاج کے اسی نظریے میں اٹکا ہوا تھا۔

"میری شادی کے بعد وہ تمہاری گھر میں آسکیں گی' ورنہ اگر آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔"

فرہاج کا یہ جملہ زہر بن کر اس کی محبت کو زندگی کو زہر آلود کر رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نیلاہٹ اپنے اندر پھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ زیادہ دکھ اور بے بسی یہ تھی کہ فرہاج نے نہ وضاحت کی ضرورت محسوس کی نہ معذرت کی' وہ یوں بے نیاز اور لاپروا بن گیا جیسے ان کے دونوں درمیان کوئی کمٹ منٹ تھی ہی نہیں' کوئی دعوا محبت' کوئی وعدہ تھا ہی نہیں۔

سویرا روزانہ خود سے عہد کرتی کہ اسے نہیں سوچے گی' مگر روز ہی دل عہد شکن بن جاتا' بے بسی سی بے بسی تھی' بے اختیاری سی بے اختیاری تھی۔

اگر وہ محض لفظوں کا کھلاڑی تھا تو بہت بڑا کھلاڑی تھا' کھیل کو آخر تک اس کی انتہاؤں تک کھیلنے والا۔ اس کی باتوں سے لے کر اپنی ممی سے ملاقات تک اس نے ایک لمحے کو بھی تو احساس نہیں ہونے دیا کہ سب کچھ محض کھیل ہے۔ وقت گزارنے کا جانا پہچانا کھیل' وہ خیالات کی رو میں بہتی تو بہتی ہی چلی جاتی' واپس پلٹتی تو خود کو ملامت کرتی' ڈانٹتی ڈپٹتی' سمجھاتی مگر اس کے ساتھ کچھ یوں ہو رہا تھا کہ تمام تر بدگمانیوں کے باوجود

تمہارے معاملے میں میرا دل خود
میرے مد مقابل ڈٹ گیا ہے

اپنے اندر کے حریف سے مقابلہ کرنا بہت کٹھن ہوتا ہے' اپنا آپ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اذیت ہی اذیت' تکلیف ہی تکلیف۔ وہ لاکھ خود کو مصروف رکھنے کے جتن کرتی مگر کبھی تو اس محبت کی گرفت اتنی مضبوط محسوس ہوتی کہ اسے بچانے کے سارے جتن' ساری کوشش سب بیکار۔ مچھلی جیسی خود اس کیفیت میں اس کا دل شدت سے خواہش کرتا فرہاج سے بات کرنے کی' اسے دیکھنے کی۔ موبائل پر اس کی انگلیاں فرہاج کا نمبر ملانے کرتیں' وہ نمبر ڈائل کر دیتی' مگر اس نے فون ریسیو نہیں کیا تو؟ مگر اس نے کال نہ کاٹ دی تو؟ یہ سوچتی اور اس کی خود رفتہ بن جانے والی انگلیاں شل ہو جاتیں۔ جبکہ اندر محبت نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے وہیں کہیں انا بھی تھی جو فرہاج طرف جاتے اس کے قدموں کو پیچھے پر مجبور کرتی۔ انا ہمیشہ ظالم نہیں ہوتی ہمیشہ بری اور غلط نہیں ہوتی' مگر محبت کے ساتھ ساتھ انا کا ہم قدم ہونا ناممکن ہے۔ دو کشتیوں میں سوار ہونے والا کبھی کنارے نہیں لگتا ڈوبتا ہے' سویرا کی انا محبت پر حاوی تھی' دل چوٹ کھایا ہوا تھا' انا زخمی' محبت بے چاری بھلا کیا کرتی۔

☼ ☼ ☼

ممانی کے بتائے ہوئے مہمان آئے تھے' سدرہ کو پسند کر گئے۔ ایک ماہ میں اس کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ لڑکے والوں کو شادی کی جلدی تھی' بڑی مشکل سے ایک سال رکنے پر راضی ہوئے تھے۔ اب اس پہاڑ کو بھی سر کرنا تھا۔ شادی اور اس کے اخراجات "امی کے ساتھ ساتھ ابو بھی فکر مند تھے۔ یہ شکر تھا کہ دکان چل نکلی تھی "امی کے پاس سلائی کے کپڑے بہت آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں صفائی بھی تھی اور نفاست بھی یہی ہنر سدرہ اور کومل میں منتقل ہوا تھا' بلکہ کومل تو بہت عمدہ ڈیزائننگ کرتی تھی۔ سڑک پار بلاک میں بڑے بڑے بنگلے تھے "ان میں سے کئی بنگلوں کے مکین اب امی کے مستقل گاہک بن چکے تھے۔

"اچھا معاوضہ مل جاتا وہ بھی وقت پر۔ ہر وقت ٹی وی میں لگے رہنے سے بھی دونوں کی جان چھوٹ گئی تھی۔ ہمت اور محنت کی تو بہت سی آسانیاں زندگی میں اور خوشگوار تبدیلی حالات میں آگئی تھی۔

سویرا حسب معمول نانی سے مل کر کچھ دیر ماموں کے پورشن میں آگئی' وہاں بڑی رونق ہو رہی تھی۔ ممانی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ کچھ دیر پہلے ہی شاپنگ سے واپس لوٹی تھیں۔ اب گھر آکر از سر نو خریداری کا دوبارہ جائزہ لے کر سب کی سب خوش ہو رہی تھیں۔

"آؤ بھئی آؤ۔" اسے دیکھ کر سب الرٹ ہو گئے۔

بڑے پیارے رنگوں اور خوب صورت پرنٹ کے لان کے سوٹ سب کے درمیان بکھرے ہوئے تھے۔

"سمر شاپنگ ہو گئی؟" سویرا نے خوشگوار لہجے میں بولتے ہوئے ایک پیس اٹھایا۔ بے حد نفیس رنگت و ڈیزائن والی نرم لان تھی۔

"یہ بہت خوب صورت لگ رہا ہے' کس کا ہے؟"

"میرا ہے۔" میزاب نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"اب پرائس پوچھیں۔" میزاب نے لطف لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو خود ایک سے ایک اچھا کپڑا پہننے والی ہے' تیری قیمتوں سے کیا مرعوب ہوگی' اپنی کمائی کا یہی تو فائدہ ہے۔ دوسرے کی محتاجی نہیں ہوتی۔" ممانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بہت زیادہ مہنگے کپڑے تو میں نہیں بناتی۔ اپنی جیب دیکھ کر چلتی ہوں۔" سویرا جانے کیوں خفیف سی ہو گئی۔

میزاب نے اس کا کہا' سنا ان سنا کرتے ہوئے اپنے جوڑے کی جو قیمت بتائی' اسے سن کر سویرا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اتنا مہنگا سوٹ؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے باری باری ممانی اور میزاب کو دیکھا۔

"ڈیزائنر لان ہے۔" میزاب نے فخر سے بتایا۔

"پھر بھی! یہ تو بالکل فضول خرچی ہے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ویسے تو یہ لوگ مہنگائی اور پیسوں کی کمی کا رونا روتے رہتے تھے' کتنی بار سویرا اپنی ضرورتوں کو پس پشت ڈال کر ان کی مدد کرتی رہی تھی' اور یہاں للے تللے اپنے عروج پر تھے۔

"او ہو' کوئی آپ سے تو پیسے لے کر نہیں لائی جو ایسے اعتراض کر رہی ہیں' پاپا نے دیے تھے مجھے سوٹ لانے کے لیے۔" میزاب کا منہ بن گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا' میں تو بس۔" سویرا نے رسان سے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ ممانی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بچی۔ تم نے دیے ہوتے تو ایسی باتیں کرتی اچھی بھی لگتیں۔ بچی کی خوشی تو ملیا میٹ نہ کرو۔ بے چاری اتنے شوق سے لائی ہے۔"

سویرا خاموش ہو گئی۔ ہر دفعہ کی طرح اس بار بھی بات گھوم پھر کر اس کی کمائی اور اس کے خرچ پر آگئی تھی۔

"اچھا چلو چھوڑو' یہ دیکھو اور بھی جوڑے ہیں یہ میرا ہے' یہ گوشی کا ہے۔" ممانی نے اور کپڑے اس کے آگے کیے۔

"اچھے ہیں۔" سویرا کچھ دیر بیٹھ کر آگئی۔ وہ کچھ اچھا

وقت گزارنے یہاں آئی تھی مگر۔۔۔ ہر بار وہ مایوس ہی لوٹتی تھی۔ اس نے اپنا بچپن' لڑکپن اور لڑکپن کے بعد کے کچھ سال یہیں گزارے تھے' اس گھر میں' ان ہی لوگوں کے ساتھ۔ اسے اس گھر سے "اس گھر کے لوگوں سے لگاؤ تھا' محبت تھی مگر مادیت پرستی اس محبت کو نگل رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود بھی اس قلبی لگاؤ اور محبت کو بچا نہیں پا رہی تھی۔ روپے پیسے کی بچت آسان ہوتی ہے محبت کو بچانا مشکل ہوتا ہے۔

امی نے دوپٹے میں لگی پائپنگ کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی جھول' کوئی خامی نہیں تھی۔ چاروں کونے بالکل پرفیکٹ تھے۔ انہوں نے دوپٹہ تہہ کر کے ایک طرف رکھا اور انگلیوں کی پوروں سے اپنی آنکھیں ملیں۔ شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ ذرا دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ جائیں مگر ابھی شرٹ میں تھوڑا سا کام باقی تھا۔ اپنی دکھتی ہوئی کمر کی دہائی کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے قمیص اٹھائی اور پھیلا کر اس کا جائزہ لینے لگیں۔ تھوڑا سا کام تھا' ہونے کو تو کل بھی ہو سکتا تھا مگر کل وہ سلائی کا بکھیڑا بالکل بھی پھیلانا نہیں چاہ رہی تھیں۔ کل سویرا کو دیکھنے ایک فیملی آرہی تھی۔ رشتہ کرانے والی نے رشتہ بتایا تھا اور حسب عادت تعریفوں کے پل باندھ دیے تھے۔ لڑکا سوفٹ ویئر انجینئر تھا' والدہ گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ مسٹریس۔ بہن بھائی سب پڑھ رہے تھے۔ انہیں بس شریف فیملی کی پڑھی لکھی لڑکی چاہیے تھی۔

ڈرائنگ روم میں تو لڑکے کی دادی' والدہ اور ایک بہن آئی تھیں۔ یہ لڑکی اپنے بھائی سے چھوٹی تھی۔ میڈیکل میں تیسرے سال کی طالبہ تھی۔ امی نے ہلکے پھلکے ریفریشمنٹ کا انتظام کیا تھا۔ سویرا اندر گئی تو خوش گوار ماحول میں باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ سلام کر کے بیٹھی تو ہلکی پھلکی باتیں اس سے بھی ہونے لگیں۔ ثانیہ (لڑکے کی بہن) بتا رہی تھی کہ وہ اسے جانتی ہے۔

"میں نے بھی آپ کے کالج سے ایف ایس سی کیا ہے۔ ہماری کئی ٹیچرز آپ کی قابلیت اور محنت کی مثالیں دے کر ہمیں سمجھاتی تھیں۔" ثانیہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔ سویرا محجوب سی ہو گئی۔

"سدرہ بھی آپ کی سسٹر ہیں نا' وہ میری کلاس فیلو تھی فرسٹ ایئر کی' پورا سال ہم نے ساتھ پڑھا تھا' پھر اس کے پیپرز رہ گئے تھے۔ اس نے آرٹس لے لیا تھا۔ ویسے وہ آپ کی سسٹر لگتی نہیں ہے' کہیں سے بھی' مائنڈ مت کیجیے گا' کہاں آپ پوزیشن ہولڈر' کہاں وہ ڈفر۔" ثانیہ زور سے ہنسی۔

"بے شک پڑھائی کی طرف اس کا کوئی خاص رجحان نہیں تھا' مگر صرف اس وجہ سے کسی کو ڈفر کہنا تو زیادتی ہے۔" سویرا نے اس سے دھیمے لہجے میں اختلاف کیا۔

"سدرہ جتنے اچھے کپڑے سیتی اور ڈیزائن کرتی ہے' میں مر کر بھی نہیں سی سکتی' اس معاملے میں وہ بہت ٹیلنٹڈ ہے' پھر اس نے مزید کورسز کرنے میں بہت محنت کی ہے اس کے اس ہنر کو ایپری شیٹ کرنا چاہیے۔"

"او' آئی ہوپ کہ بہت اچھی اسٹوڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک بہت اچھی سسٹر بھی ہیں۔" ثانیہ کے تبصرے پہ سب ہی محظوظ ہوئے تھے۔

مہمان کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کر کے چلے گئے۔ امی وہاں سے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔ رشتے والی ایک ہفتے بعد آئی تھی' امی نے فوراً" اسے جالیا۔

"کیا کہا ان لوگوں نے؟ تم نے تو پھر شکل ہی نہیں دکھائی۔" امی نے بے چینی سے سوال کیا۔

"ایک منٹ باجی! بتاتی ہوں ذرا پانی تو پی لوں' سانس تو آئے۔" وہ پنکھے کے نیچے بیٹھتے ہوئے ٹھنڈا یخ پانی گھونٹ گھونٹ گلے سے اتارنے لگی۔

"اللہ تیرا شکر۔" با آواز بلند شکر ادا کر کے وہ "باجی" کی طرف متوجہ ہوئی۔

"انہوں نے کہا کہ سوچ کر جواب دیں گے' پھر کل مجھے بلایا تھا اس لیے آج آئی ہوں آپ کے پاس۔"

"تو کیا کہا انہوں نے؟" امی کو اس کے اطمینان سے غصہ آنے لگا۔ خوامخواہ ان کے تجسس اور بے چینی کو ہوا دے رہی تھی۔

"وہی تو بتا رہی ہوں، آپ سنیں تو۔" وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔
"منع کر دیا انہوں نے۔"
"کیوں؟"
"کیوں کیا؟ بس ان کی مرضی۔ ویسے وہ اماں بیٹی تو راضی تھیں، بڑی بی نے گڑبڑ کر دی۔"
"کون؟ دادی؟"
"ہاں! کہہ رہی تھی لڑکی ابھی سے اپنے گھر والوں کی حمایتی ہے شادی کے بعد کوئی بات ہوئی تو برداشت نہیں کرے گی۔"
"سویرا نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی، وہ تو بس۔"
"ہر کوئی ہماری تمہاری طرح سیدھا سادا نہیں ہوتا باجی، لوگ بال کی کھال نکالتے ہیں۔ لڑکی دیکھنے جاتے ہیں تو ایک ایک بات، ایک ایک جنبش پر نگاہ رکھتے ہیں۔"
"ہاں یہ تو ہے۔" امی ایک آہ بھر کر رہ گئیں۔
رات میں سویرا کے سامنے امی، سدرہ اور کومل اسی معاملے کو ڈسکس کر رہی تھیں۔
سویرا نے سنا تو ایک مسکراہٹ بے اختیار اس کے لبوں پر ٹھہر گئی۔
"منع کرنا ہے تو ویسے ہی منع کر دیں، اتنی معمولی سی بات کو جواز بنایا۔"
سویرا گھونٹ گھونٹ پانی پی رہی تھی۔ اندر تک جیسے اطمینان اتر آیا تھا۔ پتا نہیں پانی سے یا وہاں سے انکار سے۔ عجیب بات تھی، معاملات زندگی کا سامنا کرنا بھی چاہ رہی تھی اور ان سے بچنا بھی، حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی تھی اور اسی خواب میں زندہ بھی رہنا چاہتی تھی جو اس سے روٹھ گیا تھا۔ جسے اس نے خود اپنے دل، اپنی آنکھوں سے نکال باہر کرنے کی کوشش کی تھی، مگر یہ سعی رائیگاں ہی گئی۔

☼ ☼ ☼

سدرہ کی شادی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تاریخ طے ہو جانے کے بعد دھر اُدھر بازاروں کے چکر، خریداری، تیاری، وقت جیسے پر لگا کر اڑ رہا تھا۔
بالآخر مایوں کا دن بھی آن پہنچا۔ گھر میں ہی چھوٹی سی، سادہ سی تقریب کی گئی تھی۔ دولہا کے گھر والے تھے یہاں سے شادی شدہ بہنیں اور قریبی عزیز واقارب۔ اگلے روز سدرہ کی سسرال والوں نے ان سب کو اپنی تقریب میں مدعو کیا تھا۔ ملنے گلے کے شوقین لوگ تھے پھر پہلی شادی تھی، دل کھول کر ارمان نکالے جا رہے تھے۔ انہوں نے مایوں کا پورا پنڈال سجایا ہوا تھا۔ گیندے کے زرد پھولوں کی سجاوٹ ہر طرف نمایاں تھی خوشی، ہنگامہ، مسکراہٹیں، ہر سو بکھرے ہوئے تھے۔
"بات سنو!" کومل نے سویرا کو متوجہ کیا۔
"ہوں۔" سویرا بڑی محویت سے اسٹیج کا منظر دیکھ رہی تھی۔ سدرہ کی نندیں اپنے بھائی کو تنگ کر کر کے مٹھائی کھلا رہی تھیں اور مٹھائی ٹھنسا ٹھنسا کر زچ کر رہی تھیں۔
"یہ جو سدرہ کی خلیا ساس ہیں نا! تمہیں بڑا گھور گھور کے دیکھ رہی ہیں، کئی بار نوٹ کر چکی ہوں میں، کل سے اب تک۔"
"کیوں؟ کیا میں زیادہ "اوور" لگ رہی ہوں۔"
سویرا گھبرا گئی۔ وہ پہلے ہی اپنی تیاری کی طرف سے بہت فکر مند تھی۔
"اوور نہیں بہت پیاری لگ رہی ہو۔"
"تو پھر کیوں گھور رہی ہیں؟" سویرا نے غائب دماغی سے اسے دیکھا۔
"پوچھ کر آؤں؟"
"پوچھو گی؟"
"کس سے؟ ان سے؟"
"نہیں، مجھ سے۔" سویرا نے اس کی اوٹ پٹانگ باتوں پر اسے گھورا، مگر ان اوٹ پٹانگ باتوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی۔
مایوں کے جوڑے میں ملبوس سدرہ سسرال سے آیا ہوا "باربی کیو" مزے سے اڑانے میں مگن تھی۔ امی ابھی ابھی پوری بات بتا کر خاموش ہوئی تھیں۔ کومل اپنے اندازے کی درستی پر فاتحانہ انداز سے سویرا کو دیکھ رہی تھی، کچھ ایسا انداز تھا۔
"دیکھا! میں نے کہا تھا نا۔"
سویرا بے بسی سے امی سمیت سب کو باری باری دیکھ رہی تھی۔ باقی بہنیں تو فوراً "پرجوش ہو گئیں۔
"دیکھ لیں امی، ضروری چھان بین کروا لیں، پھر بات پکی کر دیں۔ ویسے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی لگ رہا ہے، لڑکا بھی اسمارٹ ہے، جاب بھی اچھی ہے، فیملی بھی۔" سب کی سب ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔
"ایک کی شادی سے تو فارغ ہو جائیں پہلے، پھر دیکھ لیجیے گا۔" سویرا کو یہ سب سننا اچھا نہیں لگ رہا تھا، بات ٹالنے کو گویا ہوئی۔
"ہاں ہاں! بعد میں دیکھ لیں گے، میں بھی تو ہوں گی وہاں "ان" کا خالہ زاد ہے نا، اچھی طرح تفتیش کر کے پھر ہاں کروں گی۔" سدرہ بی بی نے آلو بخارے کی چٹنی میں لیگ پیس ڈبویا۔
"اب بس کرو، ویسے ہی اوورویٹ ہو رہی ہو اوپر سے اتنی ہیوی ڈائٹ، بغیر ہضم کیے پڑ کر سو جاؤ گی۔"
سویرا جانے کیوں چڑ گئی اس کی بات سن کر۔
"ایک دو چکن کے ٹکڑوں سے کیا وزن بڑھ جائے گا۔" وہ لاپروائی سے کھانے میں مگن رہی۔
"کبھی کبھی ایک پیس ہی کافی ہوتا ہے وزن بڑھانے کے لیے۔" کومل دانش ور بن گئی۔
"ہاں جیسے کبھی ایک نظر ہی کافی ہو جاتی ہے رشتہ بنانے کے لیے۔" پروا نے دوسرا ٹکڑا لگایا۔
"مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔"
سویرا اٹھ کھڑی ہوئی۔
"نیند؟ آ جائے گی۔" سدرہ نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لے کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"ابھی بول لو جتنا بولنا ہے، دو دن بعد زبان بندی ہو جانی ہے تمہاری۔" سویرا اسے جواب دے کر باہر نکل آئی۔ سب کے قہقہوں کو نظرانداز کر کے۔
رات اپنے شباب پر تھی۔ وہ کرسی اٹھا کر برآمدے سے صحن میں لائی اور بیٹھ گئی۔ اندر سے سب کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔
گہری خاموش، رات اس کے اندر اترنے لگی۔
"تھک گئی ہوں خود سے لڑتے لڑتے۔" اس کے کانوں نے اپنی سرگوشی سنی۔
"کہاں ہے میرا مسیحا، جو اپنی پوروں سے میری تھکن چن لے۔" اس کا دل کرلایا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی گہرائی میں میرے اندر تک اترے ہوئے ہو۔ بہت برے ہو تم، بہت برے، مجھے اپنے قبضے میں کر کے لاپروا ہو گئے، بے نیاز بن بیٹھے۔" سویرا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ بارات والے دن، صبح سے ہی گھر میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کچھ تو تیاری کی روایتی گہما گہمی اور کچھ کومل نے شور مچایا ہوا تھا۔ اسے وہم ہو گیا تھا کہ اس کا نیا ہیئر اسٹائل اس پر سوٹ نہیں کر رہا۔
"دو ہفتے سے اسی ہیئر اسٹائل پر جان دے رہی تھی خود پر قربان ہو رہی تھی، اب آج اچانک کیا ہو گیا؟" کائنات نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔
"دو ہفتے سے اس ہیئر اسٹائل میں، میں "مسحور حیات" لگ رہی تھی۔ آج صبح سے کئی بار آئینہ دیکھ چکی ہوں، پتا نہیں کیا لگ رہی ہوں۔" کومل نے منہ لٹکایا۔
"آج آئینہ اصلیت دکھا رہا ہو گا۔" پروا نے اسے چڑایا۔
"تم لوگ تو کبھی سچ بولو گے ہی نہیں، میں امی سے پوچھتی ہوں۔"
"وہ کون سا سچ بولیں گی، ماں ہیں آخر۔ مس ورلڈ کا تاج دیں گی تمہیں۔"
"اچھا، مس ورلڈ خوب صورت بھی ہوتی ہیں۔"
سویرا نے چٹکی لی۔
"امی!" کومل کی احتجاجی صدا بلند ہوئی۔
"ہیئر اسٹائل کوئی بھی ہو میری بیٹی ہمیشہ ہی اچھی

لگتی ہے۔" امی نے "ماں" ہونے کا حق ادا کیا۔

"اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ۔"

"نہیں ' سب سے بڑا لطیفہ۔"

"جی نہیں ' سب سے بڑی حقیقت۔" کومل نے لاڈ سے ماں کے گلے میں پیچھے سے بانہیں ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

آج کی تقریب کے لیے سویرا نے بنفشی رنگ کا سوٹ پہنا تھا' اپنی بہنوں کے ساتھ تیار ہو کر وہ لوگ جلدی میرج ہال میں آگئی تھیں۔ دھیرے دھیرے ان کے مہمان بھی آنا شروع ہو گئے۔ مما' پاپا (ماموں' ممانی) کی فیملی تو تقریباً" ان کے پیچھے پیچھے ہی آگئی تھی' نانی بھی ان ہی کے ساتھ آئی تھیں۔ اب ایک گھنٹے بعد ہر ایک سے پوچھ رہی تھیں' بارات کب آئے گی؟

سدرہ کے سسر کا فون آیا تھا ابو کے پاس' وہ لوگ نکل گئے تھے۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا' یہاں سب مستعد ہو گئے۔ بارات کے استقبال کے لیے ہار' پھول' سب ہاتھوں میں لیے الرٹ کھڑے تھے۔

بارات آگئی' مہمان اندر آنا شروع ہو گئے تھے۔ پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے ان کا استقبال کیا جا رہا تھا' گھر والوں اور قریبی رشتے داروں کو ہار پہنائے جا رہے تھے۔

"ارے سویرا' تم یہاں! کیسی ہو بیٹا؟" سویرا کسی رشتے دار خاتون کو ہار پہنا رہی تھی جب ایک مانوس اور شناسا آواز پر کرنٹ کھا کر سامنے دیکھا۔

فرہاج کی ممی سامنے کھڑی تھیں۔ آنکھوں میں حیرت اور شناسائی کے رنگ تھے۔ سویرا انہیں دیکھ کر اتنی حیران ہوئی تھی کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا تھا۔

"کیا ہوا بھئی' پہچانا نہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے رخسار کو چھوا۔ سویرا کے پتھر بنے بت میں جان دوڑ گئی۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"دیکھ لو ایسی نظر آ رہی ہوں۔" وہ پھر مسکرائیں۔

"اچھا چلو! تم مہمانوں کو اٹینڈ کرو' تھوڑی دیر میں ملتے ہیں پھر۔" وہ آگے بڑھ گئیں۔

سویرا عجیب غائب دماغی کے عالم میں باقی ماندہ مہمانوں کا استقبال کر رہی تھی۔ ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اندر آئی تو تھوڑی ہی دیر میں وہ نظر آ گئیں۔

سویرا کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی' پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کی طرف بڑھتی چلی آئی۔

"اچھا! تو تم دلہن کی بہن ہو؟" سویرا ان کے مقابل کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"جی' آپ رشتے دار ہیں ان لوگوں کی؟" سویرا نے چند لمحوں کے توقف کے بعد سوال کیا۔

"میرے بیٹے کا دوست ہے خرم' کارڈ دینے آیا تھا تو بہت اصرار کر کے گیا تھا کہ بارات میں ضرور چلنا ہے۔ یہاں تمہیں دیکھ کر میں سرپرائزڈ ہو گئی ہوں۔ تم سناؤ کیسی ہو' نہ کچھ اتا پتا نہ خیر خبر۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ۔ سب لوگ کیسے ہیں؟"

سویرا بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"ہم سب بھی ٹھیک ہیں' تم نے جاب چھوڑ دی؟" وہ جواب دینے کے ساتھ ساتھ سوال بھی کر رہی تھیں۔

"دوسری کمپنی جوائن کر لی تھی۔" سویرا نے دھیمے سے جواب دیا۔

"دیکھو' میں نے تمہیں پہلے دن سے ہی جب میں تم سے ملی تھی' اپنی بیٹی مان لیا تھا۔ تو میری بیٹی' اگر کوئی غلط فہمی ہو جائے تو اس غلط فہمی کو دور کرتے ہیں' معاملے کو وضاحت سے' فرصت سے دیکھتے ہیں' یوں میدان چھوڑ کر نہیں جاتے ایسے میں کبھی ہار بھی مقدر بن جاتی ہے۔"

"آنٹی۔!" ان کے شفقت بھرے رویے اور باتوں سے اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں' اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے کومل کی آواز آئی۔

"آپی! امی بلا رہی ہیں آپ کو۔"

"چلو' تم اپنے مہمانوں کو دیکھو' پھر بات کریں گے۔" انہوں نے سویرا کا کندھا تھپکا۔

پوری تقریب کے دوران پھر سویرا کو موقع نہ ملا کہ وہ ان سے تفصیل سے بات کر سکتی۔ کھانے کے وقت وہ تھوڑی دیر کو ان کے پاس آئی تھی اور "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں" جیسی دو چار رسمی باتیں کر کے وہ دوسرے مہمانوں کو اٹینڈ کرنے لگی۔

شادی کی تقریب خیر و خوبی کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔ رخصتی کے وقت سب کی آنکھیں نم اور دل بوجھل تھے مگر لبوں پر کلمۂ شکر تھا کہ ایک فرض کی ادائیگی ہو گئی۔

ہال سے گھر آنے کے بعد فارغ ہوتے ہوتے صبح کے چار بج گئے' تھکن بہت تھی مگر نیند کا کہیں نام و نشان نہ تھا' پھر بھی کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی۔

آج کتنے عرصے بعد فرہاج اس کے آس پاس تھا۔ وہ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اس سے کچھ کہہ نہ سکی' اسے کچھ بتا نہ سکی۔ نہ اس نے کچھ پوچھا تھا۔ ڈیڑھ سال کے عرصے نے دونوں کے درمیان گریز کی' جھجک کی عجیب سی دیوار بنا دی تھی۔ وہ اب اس دیوار کو گرانا چاہ رہی تھی مگر کیسے؟

☼ ☼ ☼

جب تیرتے تیرتے بازو شل ہو گئے تو اچانک ساحل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ خیرہ کن چمک اس کے ملبوس میں نہیں' آنکھوں اور چہرے پر بھی تھی۔ دل میں اترنے کی حد تک پیارے لگنے والے اپنے آپ کو کرسی پر سمیٹے سویرا ان کے سامنے موجود تھی اور غور سے سن رہی تھی کانوں سے نہیں' دل سے سن رہی تھی ایک ایک لفظ جو وہ کہہ رہی تھیں۔

"اس دن وہ مجھ سے بات کر رہا تھا۔ ہم کچھ فنانشل کرائسز میں گھرے ہوئے تھے۔ وہاج کا ایم۔ بی۔ اے کا آخری سال تھا' ہمارا ارادہ تھا کہ ڈگری کے بعد اسے جاب مل جائے تو تمہاری اور فرہاج کی شادی کر دیں۔ میں اس وقت فون پر فرہاج سے کہہ رہی تھی کہ شادی تھوڑی آگے پلان کر لیں' چھ' آٹھ ماہ بعد تو اس بات پر وہ ہنس کر کہنے لگا کہ شادی کے بعد دو سیلریز گھر میں آئیں گی' یعنی ایک فرہاج کی' ایک وہاج کی تو سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا' تم نے نہ جانے کیا سمجھا اس کے اس جملے سے۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ خاموش ہو گئیں۔ اور بات تو دراصل سویرا نے ادھوری چھوڑی تھی۔ ادھوری بات سن کر اس سے اپنی مرضی کے معنی اخذ کرنا' بدگمانی کی شروعات ہے اور بہت پیارے اور مضبوط رشتوں کا خاتمہ۔

اس وقت ان کی باتیں سن کر سویرا شرمندگی کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ ندامت نے اسے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ کچھ افراد کے رویے تمام افراد پر کیسے چسپاں کیے جا سکتے ہیں۔ اگر اس کے قریبی کچھ رشتوں نے اس کی آمدنی کے حوالے سے خود غرضی کا مظاہرہ کیا تھا تو اس نے کیسے سوچ لیا کہ ہر شخص ایسا ہی ہو گا' ایسے ہی سوچتا ہو گا؟

سویرا آج خود سے سوالات بھی کر رہی تھی اپنا احتساب بھی اور اب سب کچھ روشن اور عیاں تھا' لوگ بھی اور معاملات بھی' اسے آج سے پہلے کوئی دن' کوئی وقت اتنا شادمان اتنا مبارک نہیں لگا' جیسے آج کی رات آج کا وقت' اس کے ڈوبتے دل کو اچانک ہی کسی نے ساحل کا کنارہ دے دیا تھا۔

اس نے حیرت و مسرت سے اپنے ارد گرد دیکھا۔ لوگ خوش تھے' ہنس رہے تھے' مسکرا رہے تھے۔ اسے لگا یہ سب لوگ اس کی خوشی میں خوش ہیں۔ سدرہ کے ولیمہ کا تو بہانہ تھا' دراصل تو یہ اس کی خوشی کی تقریب تھی کہ اس کی محبت پھر سے مجسم اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس نے دور کھڑے فرہاج کو دیکھا اور بے اختیار ہی بے حد خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔

"آنٹی!" اس نے جھجکتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔ "آپ فرہاج کا نیا نمبر دے دیں مجھے ممی۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔

"میں 'ایکسکیوز' کرنا چاہتی ہوں اس سے۔"

سویرا نے سر جھکایا۔

"نمبر میں تمہیں دے دیتی ہوں مگر بیٹا! جو کام اپنے وقت پر نہ ہو' بعد میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" انہوں نے اپنا سیل آن کرتے ہوئے کہا۔

سویرا ان کی بات سن کر ایک لمحے کو ٹھٹکی پھر سر جھٹک کر ان سے نمبر لینے لگی۔

وہ دولہا کا دوست تھا' اسی تقریب میں موجود تھا۔ مگر سویرا نے اس سے ڈائریکٹ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا' پھر شرمندگی نے بھی قدموں کو روک کر اسے مہر بہ لب کر رکھا تھا۔ اس نے فون کا سہارا لیا۔ بس ایک مختصر سا پیغام۔

"جو کچھ میں نے سوچا اور کہا۔ اس سب کے لیے تم سے معذرت چاہتی ہوں۔"

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ فرہاج کو میسج سینڈ کردیا۔ وہ بے تابی سے اس کے جواب کی منتظر تھی' تب ہی دولہا صاحب بنفس نفیس تشریف لے آئے۔

فرہاج کی امی سے سلام دعا کرکے اور مبارکباد وصول کرکے وہ سویرا سے مخاطب ہوا۔

"یہ میری بہت اچھی آنٹی ہیں' بہت پیارے سے دوست کی ممی۔"

"اچھا!" سویرا نے مسکرا کر دیکھا۔ (پیارے سے دوست؟)

"اور یہ سویرا ہیں' سدرہ کی بہن۔" وہ فرہاج کی ممی سے مخاطب ہوا۔

"کون سدرہ؟" سویرا اس بار شرارت سے مسکرادی تھی۔

"ہیں ایک خاتون! کل ہی زندگی میں شامل ہوئی ہیں۔ جان پہچان میں کچھ تو وقت لگے گا۔" دولہا صاحب کی بتیسی پوری باہر تھی۔

"ہماری جان پہچان پہلے سے ہے۔" آنٹی نے موصوف کو اطلاع دی۔

"پہلے ہی بتادیتیں' ناحق تعارف کی زحمت اٹھائی میں نے۔"

"اب زحمت اٹھانے کی عادت ڈال لو' خیر سے شادی ہوگئی ہے تمہاری۔" آنٹی کے ساتھ ساتھ دولہا صاحب نے بھی قہقہہ لگایا تھا۔

"سویرا کے سیل فون پر مسیج آیا تھا' وہ بے تابی سے کھول کر پڑھنے لگی۔

Its Too LateNow

(بہت دیر ہوگئی ہے اب۔")

"ابھی تک ناراض؟"

"آپ نے مجھے ابھی تک مٹھائی نہیں کھلائی' اب میں کلو' دو کلو کا ڈبا لوں گا۔" دولہا میاں آنٹی سے مخاطب تھے۔

"ارے! تمہیں تو میں پورا ٹوکرا بھجوادوں گی' میرے تیسرے بیٹے ہو تم۔"

"جی ضرور' تب ہی اس بیٹے کو ابھی تک آپ کے بیٹے کی منگنی کی صرف خبر پہنچی' مٹھائی نہیں پہنچی۔"

"منگنی کیا۔ بس رشتہ طے ہوا ہے' سادگی کے ساتھ۔ اپنے دوست کو تم جانتے ہو۔ زیادہ چونچلے بازی اسے پسند نہیں اس لیے۔ مگر خیر مٹھائی تو ہم پر ادھار ہے ضرور کھلائیں گے تمہیں۔"

وہ دونوں ہنس بول رہے تھے اور سویرا کو لگ رہا تھا' کوئی ٹرین پوری رفتار سے اس پر سے گزرتی جارہی ہے۔ اس کے وجود کے پرخچے اڑ رہے تھے۔

کس کے رشتے کی بات کررہے ہیں یہ لوگ؟ کس کی منگنی؟" سویرا نے کانپتی انگلیوں سے کرسی کی پشت مضبوطی سے تھامی۔

"دیکھ لو سویرا' یہ کیسی ممی جان ہیں ہماری' اکیلے اکیلے رشتہ طے کرکے آگئیں بیٹے کا' تیسرے بیٹے کو پوچھا تک نہیں۔" وہ سویرا سے مخاطب ہوا۔

"فرہاج کو جلدی ہی اتنی تھی' شکر ہے کہ مجھے ساتھ لے گیا ورنہ مجھے تو لگ رہا تھا کہ خود ہی سب کچھ طے کرلے گا۔" وہ مسکرائیں۔

"مم۔ میں ابھی آتی ہوں۔ پتہ نہیں آنکھ میں کیا۔" وہ اپنی آنکھوں کو تیز تیز جھپکتے ہوئے بولی۔ نہ جانے کہاں چل رہی تھی' کہاں جارہی تھی اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ آنکھ میں کیا پڑ گیا تھا؟ ان میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔

"ارے! سدرہ رخصت تو کل ہوئی ہے' تم آج رو رہی ہو خیریت۔" یہ ممانی تھیں' اس کے پاس رک گئیں۔

"کچھ نہیں مما!" خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے بمشکل آواز کو بھرانے سے روکا۔

"آنکھ میں کچھ چلا گیا شاید' پانی آرہا ہے۔" اس نے ٹشو پیپر سے آنکھ مسلی۔

"ارے رے۔ میک اپ خراب ہوجائے گا۔" انہوں نے ٹوکا۔

"زندگی ہی خراب ہوگئی' میک اپ کا کیا۔" سویرا آگے بڑھ گئی بغیر کچھ کہے۔

ڈریسنگ روم خوش قسمتی سے خالی تھا۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔

کچھ دیر قبل خوشی سے تمتماتا چہرہ اب زرد ہورہا تھا۔

اس کا دل' سہما ہوا تھا' خوف زدہ تھا کسی چڑیا کے ننھے بچے کی طرح' جو اپنے گھونسلے سے نیچے گر گیا ہو۔

"یہ کیا ہوگیا!" اس کے بہتے آنسوؤں نے سوال کیا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس کے دل نے سوال کیا۔

معاً اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے حتی الامکان اپنی آنکھیں اور چہرہ احتیاط سے صاف کیا۔ غم جاناں اپنی جگہ' مگر یہ دنیا بھی تو اپنی جگہ موجود تھی' کوئی بھی کسی بھی وقت یہاں آسکتا تھا۔ ہنسی کا افسانہ اتنی جلدی نہیں بنتا آنسوؤں کا فوراً بن جاتا ہے۔

اس نے اپنے سیل پر ایک مسیج کیا۔

چند منٹوں بعد پروا اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے۔ اور تم یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو' مجھے کیوں بلایا ہے۔"

پروا آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے تابڑ توڑ سوالات کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔ آئینے میں سویرا کا عکس بھی نظر آرہا تھا۔ اس کی خالی آنکھیں' ویران چہرہ جیسے کوئی اپنا سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ رہ گیا ہو۔ جیسے صحرا میں سفر کرتے مسافر کا زاد راہ کب کا ختم ہوگیا ہو اور وہ دم آخر پر ہو۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' سر میں شدید درد ہورہا ہے۔" پروا کے دوبارہ کچھ کہنے سے پہلے ہی سویرا بول پڑی۔

"تھکن ہوگئی ہوگی۔ پورا ہفتہ ہی ہوگیا' نہ نیندیں پوری ہوئیں نہ ڈھنگ سے آرام کرنے کو ملا۔ زیادہ درد ہورہا تو گولی منگوادوں؟" پروا نے ہمدردی سے بہن کو دیکھا۔

"ہاں منگوادو' اور پلیز ایک کام اور کرو' میں کچھ دیر یہیں ریسٹ کررہی ہوں تم وہاں ذرا سنبھال لینا سب کچھ' مووی اور فوٹو کے لیے مجھے مت بلوانا ٹھیک ہے۔ سر درد سے پھٹ رہا ہے۔ بات کرنا' بولنا بھی اچھا نہیں لگ رہا۔"

"اچھا اچھا! تم آرام کرو' میں سنبھال لوں گی سب اور میڈیسن ابھی منگواتی ہوں۔"

"ویسے۔" پروا جاتے جاتے اس کی طرف مڑی۔ "تم آج اتنی پیاری اور خوش لگ رہی تھیں' کسی کی نظر لگ گئی شاید۔"

"مجھے اپنی ہی بدگمانیوں کی اور خوش فہمیوں کی نظر لگ گئی۔" سویرا نے کچھ کہے بغیر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

امی نے پلاؤ دم پر رکھا اور پسینے پسینے ہوتی ہوئی باہر آگئیں۔ کومل باہر تخت پر بیٹھی سلاد کے لیے کھیرے' ٹماٹر وغیرہ کاٹ رہی تھی۔

"آج تو بہت ہی گرمی ہے۔" انہوں نے تخت پر بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا' پیڈسٹل فین کی ہوا ان سے ٹکرائی تو ایک فرحت بھرا احساس رگ و پے میں اتر گیا۔

"پچھلے ہفتے' آج ہی کے دن تو ایسی سخت گرمی نہیں تھی' ہم اس وقت سدرہ کے ولیمہ میں جانے کی تیاریاں کررہے تھے۔"

"ہاں دیکھو تو ذرا! ایک ہفتہ ہو بھی گیا' کتنی جلدی

وقت گزرتا ہے' پتا ہی نہیں چلتا۔"

کمرے سے باہر آتی سویرا کے قدم مدھم سے ہو گئے۔

"کیوں نہیں۔ وقت گزرنے کا پتا تو ان کو چلتا ہے جو کانٹوں پر چل رہے ہوں' ایک ایک لمحہ قیامت ہوتا ہے۔ سزائے موت کے منتظر قیدی کی طرح' جو پھانسی لگنے سے پہلے ہر ہر آن مرتا ہے' ایک ایک سانس زندگی کے بجائے موت کی لیتا ہے۔ انہیں پتا چلتا ہے وقت گزرنے کا۔"

سویرا باہر صحن میں آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں بہت گھٹن محسوس ہو رہی تھی مگر گھٹن تو یہاں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اس گھٹن کو دور کرنے کی کوشش کی مگر بے سود' باہر تو حبس تھا ہی تھا مگر اپنے اندر جو حبس کی گھٹن کی کیفیت تھی وہ مارے ڈال رہی تھی۔ سویرا نے بہت بہادر بن کر خود کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی بہت سمجھا کر اپنے آپ کو جینے پر اور دل کو دھڑکنے پر آمادہ کیا تھا۔ دنیا فقط ایک ہی شخص پر ختم نہیں' حقیقت کا سامنا تو کرنا ہی تھا' جتنی جلدی خود کو کمپوز کر لے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ صبح سے شام تک اسے بہت سے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا' وہ اپنے چہرے کو اپنے آپ کو اپنے غموں کا اشتہار نہیں بنا سکتی تھی۔ جینا ضروری تھا مسکرانا بھی ضروری تھا' جھوٹا ہی سہی' بناوٹی ہی سہی' خود کو مطمئن' پُرسکون اور خوش باش دکھانا ضروری تھا' ان لوگوں کے لیے جو اس کے قریب تھے۔ اس سے محبت کرتے تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ خود کو ایسی ہی کتنی باتیں سمجھا چکی تھی۔

کوئی تسلی دینے والا نہ ہو تو اپنا غم گسار خود ہی بننا پڑتا ہے۔ اس نے کسی کو اپنا رازدار نہیں بنایا تھا' لہٰذا نہ کوئی ناصح تھا نہ چارہ ساز' نہ غم گسار' ہر شخص ہی کوئی کم کوئی زیادہ اپنا محب آپ ہوتا ہے۔ اپنا دوست آپ ہوتا ہے مشکل وقت آن پڑے تو یہ دوستی اور یہ محبت بھی کچھ نہ کچھ سنبھالا دے ہی دیتی ہے۔

"سویرا کی تھکن ابھی تک نہیں اتری' ہیں؟" امی نے چپ چاپ بیٹھی سویرا کو مخاطب کیا۔

"اتر ہی جائے گی' وقت کے ساتھ ساتھ۔" سویرا نے ایک گہری سانس لی۔

آج چھٹی کا دن تھا سدرہ اور اس کا شوہر رات کا کھانا یہیں کھانے والے تھے۔ سدرہ دو دن سے رکی ہوئی تھی' آج دولہا میاں لینے آ رہے تھے۔ آنا تو انہیں شام میں تھا مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے کچھ لیٹ ہو گئے تھے۔

"کھانا تیار ہو گیا؟" سویرا نے امی سے سوال کیا۔ خاموش بیٹھی رہتی تو سوچ کے ناگ ڈستے رہتے۔ اس نے اپنے ذہن کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں سالن تو پہلے ہی تیار ہو گیا تھا' چاول دم پر ہیں۔ کباب کھانے کے وقت تل لیے جائیں گے۔"

"سوئٹ ڈش فریج میں ہے اور سلاد' رائتہ تیار ہے۔" کومل نے لقمہ دیا تھوڑی دیر میں دولہا میاں بھی تشریف لے آئے۔

نئی نئی شادی کا خمار اور خوشی تھی' کچھ وہ تھے بھی بذلہ سنج اور خوش مزاج' وقفے وقفے سے چٹکلے چھوڑتے رہے۔ سب سے زیادہ سدرہ ہی ہنس ہنس کر بے حال ہو رہی تھی۔ باقیوں کو چٹکلوں سے زیادہ ہنسی' سدرہ کے یوں ہنسنے پر آ رہی تھی۔

لبوں پہ زبردستی کی مسکراہٹ سجائے سویرا رشک سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ کاش میں بھی ایسی ہی ہنس سکتی' دل سے۔

کھانے سے انصاف کرتے ہوئے انہوں نے تعریف بھی خوب کی' کھانے کی بھی اور پکانے والی کی بھی۔

وہ لوگ رخصت ہوئے تو گھر میں اک خاموشی سے چھا گئی۔

☼ ☼ ☼

گرمیوں کی ایک گلابی سی شام تھی۔ سدرہ نے فون کیا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ مہمان آ رہے تھے۔ سدرہ کی ساس' خلیا ساس اور سسر آئے تھے' سویرا کا باقاعدہ رشتہ لے کر۔ امی ابو نے سوچنے کے لیے مہلت مانگی تھی مگر یہ تو رسمی بات تھی۔ ابو تو لڑکے کو دیکھ اور مل چکے تھے' وہ راضی تھے۔ مگر سویرا سے تو پھر بھی پوچھنا تھا۔

سویرا نے خود کو خاموشی اور بے حسی کی برف میں دفن کر رکھا تھا۔ رات کو وہ تکیے میں منہ دیے لیٹی تھی جب امی اس کے پاس آئی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ بھی خاموش بیٹھی رہیں شاید الفاظ ڈھونڈ رہی تھیں اس سے بات کرنے کے لیے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے تمہید باندھی۔

"تمہارے رشتے کے بارے میں بات کرنی تھی۔ تم۔"

"جو آپ کی مرضی ہو وہ کریں۔" سویرا نے تیزی سے ان کی بات کاٹی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے قدم بڑھانے کے بجائے ایک ہی جست میں انگاروں بھرے اس راستے کو پار کرنے کی سعی کی۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" امی نے اس کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی' جو وہ چھپائے ہوئے تھی۔

"نہیں۔" اس نے آگ کا دریا بھی پار کر لیا۔

"پھر ہاں کہہ دوں؟" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"جی!" ایک ہی لفظ تھا مگر اس پر قیامت گزر رہی تھی۔

"جیتی رہو' خوش رہو' اللہ خوشیوں سے تمہارا دامن بھر دے۔" امی نے آہستہ سے اس کے سر پر بوسہ دیا۔

وہ تڑپ گئی' آنسو بہہ نکلنے کو بے تاب تھے۔ وہ ضبط کر رہی تھی' قیامت کا ضبط کر رہی تھی' امی گئیں تو اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ بے حسی اور خاموشی کی برف پگھل گئی۔ وہ خود بھی پگھل رہی تھی قطرہ قطرہ' آنسوؤں کے ساتھ ساتھ۔

وہ صبح جاتی اور شام میں آتی' تھکن کا بہانہ کر کے اکیلی پڑ جاتی۔ گھر میں منگنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں' پھر ایک نیا شوشا اٹھا۔

"وہ لوگ نکاح کا کہہ رہے ہیں۔" امی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی' وہ ابو سے باتیں کر رہی تھیں۔

"سویرا سے پوچھ لو' وہ کیا کہتی ہے۔"

"اس نے ہماری مرضی پہ چھوڑا ہوا ہے سب کچھ۔" امی نے انہیں جواب دیا۔

"تو پھر کر دیتے ہیں نکاح ابھی' بعد میں بھی تو ہوگا۔" ابو نے داڑھی سہلاتے ہوئے پُرخیال نظروں سے انہیں دیکھا۔

"چلیں ٹھیک ہے پھر فون آئے گا ان کا' میں کہہ دوں گی۔"

نکاح کا سن کر سویرا کو شاک لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ خود کو بہت مضبوط بنانے کی کوشش میں وہ تھک رہی تھی۔ آنے والے وقت' حالات اور زندگی کا سامنا کرنے کے لیے خود کو لاکھ آمادہ کیا مگر پھر بہت مشکل تھا یہ سب۔ روز بکھرتی تھی روز خود کو سمیٹتی تھی۔

تو اب یہ رنگ ہوگا زندگی کا۔ تم سے ملنے کی' تمہیں دیکھنے کی اجازت چھن گئی تھی اب تمہیں سوچنے سے بھی یہ دل محروم ہونے والا ہے۔" سویرا اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
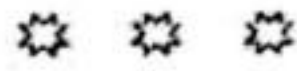
جمعۃ المبارک کا دن اس اہم تقریب کے لیے مقرر ہوا تھا۔ صبح سے گھر میں شور شرابا شروع ہو گیا تھا۔ ساری شادی شدہ بہنیں سرِشام ہی آ گئی تھیں۔ صبح سب جلدی اٹھ گئے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر صفائی ستھرائی کا سلسلہ جاری تھا۔

ظہر کی نماز کے بعد سویرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھوں میں آنسو آنے لگے' عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی اس کی۔

"بس آخری بار" سویرا نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

آج اس نے دعا میں اپنے لیے عافیت مانگی اللہ سے اس کی مرضی اور حکم پہ راضی ہونے کی دعا کی'

خوشیوں کی التجا کی۔ بہت دیر تک اپنے رب سے دعا مانگنے کے بعد وہ فارغ ہوئی تو سچ مچ اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم انسانوں کے خواب لامحدود ہوتے ہیں اور خواہشیں بے لگام۔ ہمیں نہیں معلوم ہمارے حق میں کیا بہتر ہے کیا نہیں۔ خالق جانتا ہے' اس کی مخلوق کے لیے کیا اچھا ہے کیا بُرا۔ اس کے حکم اور فیصلے سے سرتابی ممکن نہیں' پھر بھلائی اس میں ہے کہ اطاعت میں سر تسلیم خم کرلیا جائے۔

سویرا نے شدت سے دعا کی تھی کہ مالک اس کے دل کو رضامند کرلے اپنی مرضی پر' اس کی زندگی کے سب سے اہم معاملے پر اس کا حکم نافذ ہونے جارہا تھا۔ اسے اپنے آپ کو' اپنے دل کو اس حکم کے تابع کرنا تھا اور یہ کام سویرا کے لیے اسی وقت ممکن تھا جب وہ دلوں کو پھیرنے والا' اس کے دل کو پھیر دیتا۔ اسی لیے اس نے آج بہت سچائی' خلوص اور شدت کے ساتھ دعا کی تھی۔ مہمانوں کو عصر کے بعد آنا تھا۔ نکاح عصر مغرب کے درمیان تھا۔ مغرب کے بعد کھانا تھا۔

مہمان وقت کے پابند تھے۔ ٹھیک وقت پر آگئے تھے۔

سویرا تیار ہو کر اندر کمرے میں بیٹھی تھی۔ لباس' جیولری' میک اپ کچھ بھی بیہودہ نہیں تھا۔ ہلکی پھلکی سی تیاری کی تھی۔

مہمان خواتین اندر کمرے میں آئی تھیں۔ سویرا نے سلام کیا۔ تو آدھا سلام منہ میں ہی رہ گیا۔ تین چار انجان چہروں میں ایک چہرہ مانوس تھا۔ محبت اور مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ سویرا کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ماشاءاللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" انہوں نے سویرا کی پیشانی چومی۔

سویرا کے دل میں بہت سے سوالات مچل رہے تھے' مگر یہ موقع محل نہ تھا اس کے کہنے کا' پھر سدرہ اور امی آگئیں۔

"مولوی صاحب آرہے ہیں نکاح کے لیے۔"

سویرا سنبھل کر بیٹھ گئی' اس پر گھونگھٹ ڈال دیا گیا۔ کمرہ آن کی آن میں لوگوں سے بھر گیا۔ مولوی صاحب' وکیل' امی' ابو' بہنیں۔

ایجاب و قبول کے بعد نکاح نامہ اس کے سامنے کردیا گیا۔ جہاں جہاں بتایا گیا وہ دستخط کرتی گئی۔

مبارک سلامت کے شور میں سب نے اسے گلے لگایا۔ پیار کیا ایک ایک کرکے سب کمرے سے نکل گئے۔ اب صرف امی' کائنات آپی اور سویرا کی ساس وہاں موجود تھیں۔

"چلو بیٹا اب ایزی ہو کر بیٹھو ہوا میں' کچھ دیر اور گھونگھٹ میں رہیں تو پسینے میں نہا جاؤ گی۔" انہوں نے سویرا کے اوپر ڈالا ہوا دوپٹا ہٹا دیا۔

"آنٹی! آپ یہیں ہیں؟ میں ذرا آتی ہوں۔" کائنات نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بالکل بالکل' میں یہیں ہوں اپنی بہو کے پاس' تم بے فکر ہو کر جاؤ۔"

سویرا حیرانی کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ اس کی کیفیت سزائے موت کے اس قیدی جیسی تھی جیسے عین وقت پر تختۂ دار سے اتار کر معافی کا پروانہ دے دیا گیا ہو۔ صحرا میں بھٹکتا جاں بلب مسافر اچانک ہی نخلستان کے ٹھنڈے میٹھے سائے میں اور چشمے کے کنارے پہنچ گیا ہو۔

سویرا کی سماعتوں میں ابھی تک مولوی صاحب کا فقرہ گونج رہا تھا۔

"فرہاج احمد جمال بعوض حق مہر پچاس ہزار' قبول ہے؟"

اسے لگا اس کی سماعتیں دھوکا کھا رہی ہیں اسے اب بھی وہی نام' اسی کا نام سنائی دے رہا ہے۔ مگر دوسری بار پھر تیسری بار اسی نام کی تکرار سن کر اس پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ وہ ایجاب و قبول کرکے بیٹھی تھی۔ ایک معجزے کے زیر اثر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اس معجزے کا ظہور کیونکر ممکن ہوا' اس کی ساس' فرہاج کی ممی اس کے پاس بیٹھی تھیں اور

اسے دیکھ دیکھ کر مسلسل مسکرا رہی تھیں۔ وہ خوش لگ رہی تھیں بہت خوش اور سویرا جیسے جیسے اسے ادراک ہو رہا تھا کہ رب کریم نے اس پر کیا مہربانی کی ہے اور اسے کیسے نوازا ہے ویسے ویسے وہ خوشی کے آسمان پر سبک رفتار پرواز کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے انتہائی مسرت کے خوش نما رنگ اسے اپنے گھیرے میں لے رہے تھے۔ ان خوش نما رنگوں میں وہ پور پور بھیگ رہی تھی۔ اتنے زیادہ رنگ، اتنے سارے رنگ کہ سمندر کی حیرت انگیز وسعتیں بھی ان رنگوں کا احاطہ نہ کر سکیں۔

کچھ دیر بعد اسے فرہاج کے پہلو میں بٹھایا گیا۔ تصویریں بنیں۔ ایک دوسرے کو مٹھائیاں کھلائی گئیں۔ بہت دیر بعد کھانے کا غلغلہ اٹھا۔ کھانے کا اہتمام چھت پر کیا گیا تھا۔ سارے مہمان اوپر چلے گئے اور میزبان بھی۔

"چلیں بھائی جان سیٹ خالی کر دیں، ٹائم پورا ہو گیا آپ کا۔" "پروا" نے آکر شوخی سے فرہاج کو مخاطب کیا۔

"معزز خاتون! جہاں اتنی مہربانیاں کی ہیں، تھوڑی سی نوازش اور کر دیں۔" فرہاج مسکرایا تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے پندرہ منٹ ہیں آپ کے پاس۔" وہ حاتم طائی کی سخاوت کو مات کرتی ہوئے پردہ برابر کر کے نکل گئی۔

"ہوں! تو۔ کیسی ہو تم؟"

سویرا نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ مکمل استحقاق اور فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ موتیا رنگ کی شیروانی میں وہ کتنا وجیہہ لگ رہا تھا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہے؟" بمشکل اس کی آواز نکلی تھی۔

"یہ۔!" فرہاج نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ اس کی انتہا ہے۔ جس کی تم نے ابتدا کی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ میری پیاری کہ میری ایک معمولی سی بات پر تم نے جس طرح ری ایکٹ کیا تھا، وہ کم از کم میرے لیے تو ناقابل برداشت تھا۔ لہٰذا میں تمہیں صرف تھوڑا سا سبق سکھانا چاہتا تھا۔ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس طرح بغیر جانے بوجھے اور اگلے سے وضاحت مانگے بغیر، کھٹ پٹ بدگمان ہو کر جھٹ پٹ اپنا فیصلہ سنا دینا، یہ طرز عمل خود اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کچھ دن تک تم سے بات نہیں کروں گا۔ مگر۔"

فرہاج نے ایک گہری سانس لی۔

"تم جاب چھوڑ چھاڑ کر دوسری جگہ چلی گئیں۔ میرا غصہ بھی بڑھ گیا اور محبت بھی۔ تم نظر نہیں آئیں تو مجھے احساس ہوا کہ تم میرے لیے کیا ہو۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔

"کیا تمہیں احساس ہوا کہ میں تمہارے لیے کیا ہوں؟" اس نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

سویرا بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ (تمہیں کیا معلوم۔ اس نے برہمی سے سوچا)

"پروا کو میں نے اپنا راز دار بنا لیا تھا۔ اس کے ذریعے تمہاری خبر گیری کرتا رہتا تھا۔ جب جب تم تکیے میں منہ چھپا کر روئی ہو مجھے پتا چل جاتا تھا۔"

(پروا کی بچی۔ جیمز بونڈ) پے در پے انکشافات نے اسے ہلا دیا تھا۔

"تمہاری بہت بری عادت ہے کہ تم ادھوری باتیں سن کر خود ہی معنی اخذ کر لیتی ہو۔" اس پر پھر فرد جرم عائد کی گئی۔

"سدرہ کے ولیمہ میں تم نے کیا کیا! خرم کی مبارک باد پر تم نے فوراً" فرض کر لیا کہ ممی کے جس بیٹے کا رشتہ طے ہوا ہے، وہ میں ہوں۔"

"آپ نے میری سوری کے جواب میں مجھے کیا کہا تھا کہ Its Too late Now۔ پھر میں اور کیا سوچتی؟" سویرا خاموشی ترک کر کے ذرا برہمی سے گویا ہوئی۔

"تم اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ دل چاہا تمہیں تھوڑا سا تنگ کروں۔ مگر تم تو ٹریجڈی کوئین بن کر

ڈریسنگ روم میں بند ہو گئی تھیں۔ اوپر سے خرم کی خالہ آگئیں ہماری کہانی میں ولن بن کر یار! سیدھی سادی سی کہانی تھی ہماری۔ سب راضی خوشی ہو جاتے۔ تم نے بلاوجہ کا ڈرامہ کری ایٹ کیا۔ تھوڑا سا میں نے بھی کر دیا۔ ممی بات کر کے گئی تھیں۔ تمہارے امی ابو سے۔ میری ریکویسٹ پر تمہیں ہر بات سے لاعلم رکھا گیا۔

"سب کے سب؟" سویرا نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"ہاں سب کے سب چپ رہے، تمہیں سرپرائز جو دینا تھا۔"

"تم۔ تم بہت برے ہو، بہت زیادہ برے۔" سویرا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

"میں جس کرب اور تکلیف سے گزری ہوں میں ہی جانتی ہوں۔"

"جانتا بھی ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔" فرہاج نے اس کے ہاتھ کی پشت کو دھیرے سے چھوا۔ تمہاری ہر تکلیف ہر آنسو کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں ہو سکا کہ میرا طویل دورانیے کا ڈرامہ تمہارے لیے قیامت بن جائے گا۔" فرہاج کے اتنی نرمی اور محبت سے کہنے پر اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"اب کیا ہوا؟"

"اتنے پیار سے بات کر رہے ہو، مجھے رونا آرہا ہے۔"

"یا اللہ!" وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"میں تو ساری زندگی ایسے ہی پیار کا مظاہرہ کروں گا پھر تم کیا یونہی رویا کرو گی ——" وہ بے اختیار مسکرا دی۔

"آنسو بھی ہنسی بھی، تم تو زندگی بن گئی ہو۔" سویرا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر آنکھیں جھکا لیں۔ اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی اسے رونا آرہا تھا اور وہ ہنسنا چاہ رہی تھی۔

"کچھ کہو گی نہیں؟ مجھے برا کہنے کے علاوہ۔" فرہاج اس کی طرف جھک کر بولا تھا۔

"آپ نے بہت تنگ کیا ہے مجھے۔" سویرا کی شکایتیں ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ "اب نہیں کروں گا۔ پرامس کرو۔"

"ہیلو ایوری باڈی! ٹائم از اوور ناؤ۔" پروا اندر آئی تھی۔

"ٹائم تو اب شروع ہوا ہے۔" فرہاج مسکرایا۔

اور واقعی ان کی خوشیوں کا ٹائم تو اب شروع ہوا تھا۔

قرۃ العین خرم ہاشمی

گرما کی بارش

چاول دم پہ لگا کر، ثانیہ سنک میں جمع برتنوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ تیزی سے ہاتھ چلاتی وہ باقی رہ جانے والے کاموں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ساس (فرحت ممانی) کے لیے روٹی بنانی تھی۔ وہ چاول شوق سے نہیں کھاتی تھیں۔ رافعہ (نند) بھی کالج سے واپس آنے والی تھی اس کے لیے مینگو اسکواش بنا کر رکھنا تھا۔ سسر (آفتاب ماموں) اور عامر (شوہر) دوپہر کے کھانے پہ گھر ضرور آتے تھے۔

عامر ایک نجی بینک میں اچھی پوسٹ پہ تھا جبکہ آفتاب ماموں کا اپنا ذاتی کاروبار تھا۔ جسے وہ اپنے بڑے بیٹے ثاقب کے ساتھ مل کر چلاتے تھے۔ ثاقب اپنی نخریلی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ الگ گھر میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی سمیتہ کی اپنی ساس سے کبھی نہیں بنی تھی۔ اس لیے عامر کی شادی سے کچھ عرصہ پہلے وہ الگ ہوگئی تھی۔

ڈیڑھ سالہ وانیہ کو ساس کے پاس بٹھا کر ثانیہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ یونہی اپنی سوچوں میں الجھی، برتن دھوتی ثانیہ کے چہرے پہ یک دم ہی پانی کے چھینٹے پڑے تو وہ بری طرح سے چونک کر کھڑکی کی طرف متوجہ ہوئی۔ جہاں سے تیز ٹھنڈی ہوا کے ساتھ بارش کی پھوار اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ برتن دھوتے ثانیہ کے ہاتھ کچھ لمحوں کے لیے رک گئے۔ کچی مٹی کی سوندھی خوشبو نے ذہن کو نئی تازگی بخشی تھی۔ مسلسل کاموں کے بوجھ سے تھکے اعصاب ایک دم سے ہی پرسکون ہوگئے تھے۔ بارش کی پھوار اور مٹی سے اٹھتی مسحور کردینے والی خوشبو نے موڈ خوش گوار کردیا تھا۔

آج کتنے دنوں کے بعد بارش کی آواز سنی ہے؟ بارش کا بھیگا لمس محسوس کیا ہے؟ آج کتنے دنوں بعد کچی مٹی کی خوشبو نے پھر سے من کا آنگن مہکا دیا ہے!

ثانیہ کے ہونٹوں پہ نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ذہن کے دریچوں میں یاد کی ہوا اٹھکیلیاں کرتی اپنی مستی میں تھی اور ہوا کی شرارت سے ماضی کی کھڑکیاں کھلنے اور بند ہونے لگیں تھیں۔ ثانیہ کا دل شدت سے چاہا کہ سب کام اسی طرح ادھورے چھوڑ چھاڑ کر کسی پرسکون گوشے میں بیٹھ کر ماضی کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں کھول کر اپنے بیتے روز و شب کو دیکھے۔ وہ وقت تھا تو اسے کتنا مشکل اور تکلیف دہ لگتا تھا، مگر آج جب یہ وقت ہے تو اس وقت کو دہرانے اور یاد کرنے کو دل بے قرار ہو رہا تھا۔ سچ ہے کہ انسان کسی حال میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ ثانیہ اپنے دل میں امڈتی خواہش کو دباتی، سر جھٹکتی اپنے کام نمٹانے لگی، مگر اس کی خاموشی اور گم صم انداز عامر کی نظروں سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکے تھے مگر واپس آفس جانے کی جلدی میں اسے پوچھنے کا وقت ہی نہیں ملا۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر جب ثانیہ، وانیہ کو لیے اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے لیٹی تو سب کچھ بھلائے، کچھ سال پہلے کے شب و روز میں جا پہنچی جہاں اس کی یتیمی تھی، اپنوں کے سخت اور غیر منصفانہ رویوں کا دکھ اور چبھن تھی۔ جہاں اس کے خوابوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ جہاں اس کے عزیز

ازجان نانی اماں تھیں اور جہاں اس کی پہلی اور نوخیز محبت کی شروعات ہوئی تھی۔
شاید محبت کے لیے لفظ پہلا یا آخری نہیں بنا ہے۔

محبت اعداد و شمار، جمع تفریق، حساب اور قاعدے سے الگ ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"ثانیہ! دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ جلدی سے کپڑے اتار لو۔ صبح کے دھو کر ڈالے ہوئے ہیں۔"

نانی اماں نے ٹی وی میں گم ثانیہ کے پاس آتے ہوئے کہا تھا۔ آج ثانیہ نے کالج سے چھٹی کی تھی اسی لیے ہفتے بھر کے رکے ہوئے سب کام نمٹا لیے تھے۔ اپنے اور نانی اماں کے کپڑے صبح ناشتے کے بعد ہی دھو کر چھت پہ سوکھنے کے لیے ڈال آئی تھی سب کاموں سے فارغ ہو کر اپنے اور نانی اماں کے مشترکہ کمرے میں موجود چھوٹے اور پرانے ٹی وی پہ ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی' جب نانی اماں نے نیا حکم صادر کر دیا۔ انہیں ویسے بھی ثانیہ کا فارغ بیٹھنا پسند نہیں تھا۔

"اچھا نانی اماں کچھ دیر میں اتار لوں گی۔ ابھی گرمی بہت ہے۔"

ثانیہ نے سستی سے کہا تھا مگر نانی اماں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے بھیج کر ہی دم لیا۔ کچھ دیر بعد ثانیہ سرخ ہوتے چہرے اور پھولی سانسوں کے ساتھ دھپ دھپ قدم مارتی کمرے کے اندر داخل ہوئی اور ہاتھ میں پکڑا کپڑوں کا ڈھیر بیڈ پہ پھینک دیا۔

"لے آئی ہوں آپ کے اعلا اور نفیس کپڑے۔ مجھ سے تو اچھے ہی ہیں' کم از کم ان کی فکر اور خیال تو آپ کو رہتا ہے۔"

ثانیہ نے منہ بناتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔ نانی اماں مسکراتے ہوئے کپڑوں کو ہاتھ لگا کر دیکھنے لگیں۔ سب سوکھ چکے تھے۔

"بے وقوف ہو تم بھلا ان بے جان چیزوں کا مقابلہ میری ہستی بولتی' لڑتی جھگڑتی مینا سے کیسے ہو سکتا ہے۔"

نانی اماں موڈ میں ہوتیں تو اسی طرح اس کو پکارتی تھیں۔ ثانیہ نے اونہہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

"اچھا موڈ ٹھیک کرو اپنا۔ اب شام تک کوئی کام نہیں کہوں گی۔ جو دل چاہے کرو۔"

نانی اماں نے اسے میٹھی گولی دینے کی کوشش کی تھی جیسے وہ بچی ہو جو فوراً" اس کے لالچ میں آجائے گی۔

"سب کام تو ختم کر دیے ہیں۔ شام کی چائے تک ویسے ہی کام نہیں ہوتا ہے۔ آپ آرام سے لیٹ جائیں میں خود سب کپڑے تہہ کر لوں گی۔"

ثانیہ لاکھ منہ بناتی' مگر یہ بھی سچ تھا کہ نانی اماں میں اس کی جان تھی۔ ابھی بھی بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے انہیں کپڑے سنبھالتا دیکھ کر فوراً" آگے بڑھی تھی۔ نانی اماں ظہر کی نماز کے بعد سو جاتی تھیں۔

ثانیہ کو کام میں مگن دیکھ کر وہ اپنی جگہ پہ لیٹ گئیں اور تسبیح پڑھنے لگیں۔ آج بڑے سے گھر میں خاموشی کا راج تھا کیونکہ عفت ممانی' طاہر ماموں اور اپنے تینوں بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے نانی اماں اور ثانیہ کو کافی اچھا وقت گزارنے کا موقع مل گیا تھا۔ دراصل عفت کافی تنگ مزاج تھیں۔ پھر ساس اور اکلوتی نند کی بیٹی کی بھی ذمہ داری ان کے سر آپڑی تھی یہ بات بھی مزاج کو سلگائے رکھتی تھی۔

نانی اماں (رخشندہ بیگم) کی تین اولادیں تھیں۔ طاہر کے بعد آفتاب اور پھر اکلوتی اور لاڈلی بیٹی عروسہ جو کچھ سال پہلے سڑک پہ ہونے والے ایک حادثے میں شوہر سمیت ابدی جدائی کا دکھ دے کر چلی گئی تھیں۔

نانی اماں اپنے بڑے بیٹے طاہر اور بہو عفت کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس لیے ثانیہ کو بھی اپنے پاس لے آئی تھیں۔ ان دنوں ثانیہ چھٹی کلاس میں تھی۔ ماں باپ کی اچانک موت اور جدائی نے اسے وقت سے پہلے بڑا اور سمجھ دار کر دیا تھا۔ اس کے ٹوٹے وجود کو نانی اماں نے اپنی شفیق بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

مگر یہ دنیا ہے' یہاں اپنی اولاد کے لیے محنت مشقت اور جان مارنے والے والدین کسی بھی یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اچھا تو دور' دو وقت کی روٹی دیتے ہوئے' کئی کئی بار سوچتے ہیں۔ آفتاب ماموں کے چار بچے تھے۔ بڑے ثاقب بھائی' پھر عامر اور سب سے

چھوٹی دو بہنیں فرحین جو ثانیہ سے دو سال بڑی تھی اور اس سے چھوٹی رافعہ جو سب کی چہیتی اور لاڈلی تھی۔

طاہر ماموں کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا۔ بڑی بیٹی ماہین' ثانیہ کی ہم عمر ہی تھی جبکہ رانیہ' ثانیہ سے چند سال چھوٹی تھی۔ ایک گھر اور جگہ پلنے بڑھنے کے باوجود ان لوگوں کی تربیت اور مزاج میں وہ ہی فرق تھا جو اپنے والدین اور بن والدین کے ہونے سے پڑتا تھا۔ ماہین اور رانیہ کو جتنی آزادی تھی' ثانیہ کو وہ نہیں ملتی تھی اور یہ بات ہی اسے چڑچڑا کرتی تھی۔ عفت ممانی نے کپڑے دھونے والی بھی لگا رکھی تھی اور صفائی والی بھی' مگر صرف اپنے لیے ثانیہ اپنے اور نانی اماں کے کام خود کرتی تھی۔ ہاں کھانا مشترکہ ہی ہوتا تھا مگر عفت ممانی کی زیر نگرانی!

"جتنی فکر اور توجہ آپ میری تربیت پہ دیتی ہیں کبھی ماہین اور رانیہ پہ بھی دے دیا کریں۔ ماسی صفائی کر کے جاتی ہے۔ کپڑے دھو کر جاتی ہے۔ اتار کر وہی لاتی ہے۔ اگر ماسی دو دن نہ آئے تو کپڑے چھت پہ ہی پڑے رہتے ہیں اور آپ ہیں کہ تھوڑی دیر بھی صبر نہیں کرتی ہیں۔ جیسے کپڑے دھوپ میں موم کی طرح پگھل جائیں گے۔" ثانیہ نے کپڑے تہہ کرتے ہوئے بڑبڑاہٹ جاری رکھی تھی۔

"ان کی اماں موجود ہے سر پہ! دنیا کو اپنی تربیت کے لیے وہ جواب دہ ہو گی میں نہیں' جبکہ تمہارے معاملے میں ذرا بھی کوتاہی یا کمی بیشی ہوئی تو سب مجھ پہ ہی انگلی اٹھائیں گے۔"

نانی اماں نے اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"سچ کہتی ہیں آپ نانی اماں! جن کے والدین سر پہ ہوں' وہ بلند بخت ہوتے ہیں۔"

ثانیہ نے آنکھوں میں پھیلتی نمی کو چھپانے کے لیے ذرا سا رخ موڑ لیا تھا مگر نانی اماں دیکھ چکی تھیں۔

"نہیں بچے! ایسا نہیں کہتے۔ کون بلند بخت ہے اور کون بدنصیب اس کا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کر لیتے اور خاص کر بچیوں کے نصیب کھرے نکلتے ہیں یا کھوٹے یہ کوئی والدین نہ بتا سکتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔

بیٹیاں تو کچھ عرصے' کچھ وقت تک مہمان ہوتی ہیں اپنے ماں باپ کے گھر میں' چاہے خوشیوں' سکون' ناز نخروں کے ہزاروں رنگوں میں پلی بڑھی ہوں مگر ثانیہ بچے! وقت اور حالات کی تیز اور گرم دھوپ سے یہ سارے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔ تم ابھی نا سمجھ ہو اس لیے میری باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی مگر یہ بات یاد رکھو کہ زندگی میں خوابوں' رنگوں کا "ایک وقت" ایک دور سب پہ ضرور آتا ہے مگر عملی زندگی میں خواب سے زیادہ حقیقت کام آتی ہے۔

جیسے تم چڑ رہی تھیں کہ ابھی کپڑے اتار کر لانے کو کیوں کہا؟ اس لیے کہ تیز دھوپ میں رنگ دار کپڑے زیادہ دیر نہیں رکھنے چاہئیں تیز دھوپ میں رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں' سمجھ داری کا تقاضا یہ ہی ہے کہ رنگ خراب ہونے سے پہلے کپڑے سنبھال لو۔ چلو شاباش یہ سمیٹ لو اور ظہر کی نماز پڑھ لو۔ پھر سست پڑ جاؤ گی تم۔"

نانی اماں نے آج کے لیے اتنا لیکچر ہی کافی سمجھتے ہوئے بات سمیٹی اور آنکھیں موند لی تھیں جبکہ ثانیہ سمجھی اور نا سمجھی کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتی' اپنا کام سمیٹنے لگی۔

نانی اماں کی بھی عجیب ہی منطق ہے بھلا کبھی رنگ بھی ایسے پھیکے پڑتے ہیں۔

ثانیہ نے اپنے خوب صورت سبز رنگ کے سوٹ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا تھا اور دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼
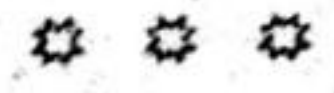
"ثانیہ! بریانی کا مسالہ ذرا دھیان سے بنانا کوئی کمی نہ رہ جائے' چاول ٹھیک سے ابال لینا یہ نہ ہو کہ کنی رہ جائے' کچے چاول کون کھائے گا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ چاول نرم ہی کر دو۔"

فرحت ممانی کی بات دار تواز مسلسل اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"جو بھی فقرے تو خود آ کر رہے ہیں۔ مجھے کب شوق ہے پنی خدمت پیش کرنے کا۔"

صبح سے تھکن چکری ثانیہ نے غصے سے بجگونے میں چمچ ہلاتے ہوئے خود کلامی کی تھی مگر اسی وقت بیکار اس کر تیزی سے پچی تھی۔ عامر فریج سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ وہ یقیناً سب سن چکا تھا ثانیہ خفت زدہ ہو کر رخ موڑ گئی۔

"ویسے کھانا تو امی بھی بنا ہی لیتی ہیں مگر تم سے اچھا نہیں۔ اور یقین کرو ہم سب تہہ دل سے تمہاری خدمات کے قائل ہیں۔ (ویسے دل تو پہلے ہی گھائل ہو چکا ہے)۔"

عامر نے مسکراتے ہوئے آخری فقرہ دل میں کہا تھا اور پانی پی کر باورچی خانے سے باہر نکل گیا۔

"اف! نانی اماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے بھی فضول بولنے کی عادت ہے اب کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔"

ثانیہ کو نئی فکر نے آگھیرا تھا اور ایسی فکریں تب ہی پلتی ہیں جب دل میں کسی کا مقام سب سے الگ اور خاص ہوتا ہے۔ ثانیہ اور عامر بھلے زبان سے کہتے نہیں تھے مگر ایک واضح پسندیدگی اور تعلق دونوں ہی محسوس کرتے تھے۔

غیر محسوس طریقے سے عامر ہمیشہ اس کی حمایت کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اپنے گھر میں یا طاہر تایا کے گھر وہ ہر جگہ سب کے سامنے بھی ثانیہ کے ساتھ غلط روا رکھے جانے والے رویے پہ باقاعدہ احتجاج بھی کرتا تھا اور اکثر ثانیہ کے بہت سے چھوٹے بڑے مسئلے بھی حل کرتا تھا۔ ابھی بھی یہی ہوا ثانیہ کسی کام سے لاؤنج میں گئی تو عامر اپنی ماں کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔

"امی! یہ زیادتی ہے۔ آپ باقی سب لڑکیوں کو بھی کام کہیں۔ اکیلی ثانیہ ہی لگی ہوئی ہے۔"

"تمہیں یہاں کوئی اور نظر آ رہا ہے؟ فرحین تو صبح سے اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی ہے، آج اس کے سسرال والے تاریخ لینے آ رہے ہیں۔ سو طرح کی تیاری کرنی پڑتی ہے ماہین اس کی مدد کروا رہی ہے۔ باقی رانیہ کو کچھ آتا جاتا نہیں ہے اور رافعہ تو ہے ہی بچی! میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں کہ اس دعوت کا انتظام سنبھال سکوں اور تمہاری بھابھی صاحبہ پہلے ہی اپنی خرابیٔ طبیعت کا کہہ کر کمرے سے نکلی ہی نہیں ہیں۔"

فرحت ممانی نے لمبی تقریر جھاڑی تھی۔ عامر جھنجلا کر رہ گیا تھا۔

"عجیب اصول ہیں آپ لوگوں کے! فرحین کے سسرال والے آ رہے ہیں تو کچھ کام وہ بھی کرے یہ کیا کہ دوسرے لوگ فضول میں اپنا خون پسینہ ایک کریں اور صلہ کچھ بھی نہیں۔"

"اے لڑکے! آج کیا ہو گیا ہے تجھے! سب لڑکیاں ہی کام کرتی ہیں میں کون سا روز روز ثانیہ سے کام کرواتی ہوں۔ اب ایسے موقعوں پہ اپنے ہی کام آتے ہیں۔"

فرحت ممانی نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"واہ جی! اپنے کام آتے ہیں بس اپنی بیٹیاں کام نہیں آتی ہیں۔"

عامر طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

"اسے کیا سمجھ ہے ایسے معاملوں کی۔" فرحت نے اس کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سوچا تھا اور باقی کے انتظامات دیکھنے کچن کی طرف چل پڑیں۔

جہاں ثانیہ سب کام مکمل کیے ہوئے تھی کچھ دیر کے لیے ہی سہی عفت بیگم دل سے ثانیہ کے طریقے، سلیقے اور پھرتی کی قائل ہوئی تھیں۔

جبکہ دوسری طرف ثانیہ ساری تھکن اور کوفت کو بھولے، کسی کے اپنی فکر میں جلنے اور تڑپنے پہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ شاید تھکاوٹ، کاموں کا بوجھ اور رویوں کی بے حسی کی گرم ہوا جب پوری شدت سے ہمارے اندر بھرنے لگتی ہے تو کسی مہربان، کسی اپنے

کے چند نرم، اپنائیت بھرے جملوں، میٹھے لفظوں تھوڑی سی ستائش اور فکر سے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پریشر ککر کی بجتی سیٹی ہٹا کر سب غبار، ساری بھاپ کو باہر نکلنے کا راستہ دیا ہے۔

سارے کام خوش اسلوبی سے انجام پا گئے۔ مہمان ہنسی خوشی تاریخ لے کر رخصت ہوئے ایک بہت بڑا مرحلہ سر ہو گیا تھا۔ ثانیہ بری طرح تھک چکی تھی اور گھر جا کر آرام کرنا چاہتی تھی، مگر ابھی ڈرائنگ روم میں سب بڑوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ماہین، رانیہ اور رافعہ، فرحین کے کمرے میں موجود ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ عامر نے پوری دعوت میں اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ثانیہ کے ساتھ باقی لڑکیاں بھی اندر باہر کے چکر لگائیں، مگر وہ چاہنے کے باوجود کسی کو زبردستی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے جو اس سے ممکن ہوا کرتا رہا۔ چائے کھانے کے وقت اسے بھی سب کے ساتھ شامل کیا۔ ثانیہ کے لیے یہی بہت تھا کہ کسی کو اس کا خیال ہے۔ اسی لیے تھکن کے باوجود اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی اور رات کو گھر واپسی کے وقت بھی یہ مسکراہٹ لبوں سے چپکی رہی۔ نانی اماں اس مسکراہٹ میں پوشیدہ خوشی کے راز سے واقف تھیں۔ اور وہ بھی دل سے یہ۔ چاہتی تھیں، مگر ثانیہ کی خوشی اور ان کی چاہت پوری ہونے کے درمیان ابھی بہت کچھ حائل تھا۔

آنگن میں لگے شہتوت کے درخت پہ چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا، مگر تیز بارش نے سب آوازوں کو خود میں چھپا لیا تھا۔ بارش کا شور تھا۔ چھتوں سے ٹپکتا پانی، زمین میں مل رہا تھا۔ ثانیہ بارش کی دیوانی تھی۔ ابھی بھی سب کچھ بھلائے بارش میں بھیگ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک ماہین اور رانیہ بھی بارش کے مزے لے رہی تھیں مگر پھر جلدی ہی اکتا کر اندر چلی گئیں تھیں۔ ثانیہ پتوں میں چھپے، شاخوں سے نیچے بیٹھے شہتوت چننے میں مگن تھی جب نانی اماں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اسے پکارا تھا۔

"ثانیہ! مغرب ہونے والی ہے۔ اب بس بھی کر دو۔ آ کر کپڑے تبدیل کرو۔ بھیگی بلی لگ رہی ہو۔"

نانی اماں نے مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو ثانیہ ہنستے ہوئے ان کی طرف آ گئی۔

"میری اماں! آپ بہت اچھی ہیں۔" ثانیہ نے پاس آ کر شرارت سے ان کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا مگر وہ اس کی شرارت سمجھ گئی تھیں۔ اسی لیے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولی تھیں۔

"پیچھے ہٹ بلی! اپنے ساتھ ساتھ میرے بھی کپڑے خراب کرنا چاہتی ہے۔ سب سمجھتی ہوں تیرے انداز۔ آج ایسے ہی بلی پہ پیار نہیں آ رہا ہے۔"

"جی نانی اماں! آپ کتنی سمجھ دار ہیں۔ پلیز حمزہ سے کہہ کر مجھے جلیبی اور سموسے منگوا دیں میں نے کہا تو عفت ممانی برا مانیں گی۔"

ثانیہ نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔ حمزہ دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ ثانیہ کی اس سے دوستی بہت تھی، مگر عفت ممانی کے مزاج کا پتا نہیں چلتا تھا۔ انہیں ہر بات پر اعتراض ہوتا تھا۔

"عفت کا موڈ آج صبح سے خراب ہے بجلی کا بل دیکھ کر، مگر وہ بھی کیا کرے۔ اتنی مہنگائی اور خرچے، حمزہ کو رہنے دو۔ میں تمہیں سوجی کا حلوہ بنا دیتی ہوں۔"

نانی اماں نے اس کی پسندیدہ چیز کا نام لیا تھا، مگر ثانیہ بددل ہو کر بولی۔

"رہنے دیں نانی اماں! عفت ممانی کا مزاج ایسا ہی رہتا ہے اور ہم کون سا اے سی چلاتے ہیں، کولر ضرور چلتا ہے مگر وہ بھی مخصوص وقت میں۔ اے سی میں تو وہ لوگ مزے کرتے ہیں اور آپ حلوہ بنائیں گی تو اس پہ بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں کپڑے تبدیل کر کے چائے بناتی ہوں۔ بسکٹ کا ایک پیکٹ ہے میرے پاس دونوں اسی پہ عیش کرتے ہیں۔"

ثانیہ نے ماحول کی تلخی کو کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔ کچھ دیر بعد دونوں چائے پیتے ہوئے ماضی کے قصے دہرا رہی تھیں۔

نانی اماں اپنے دور کے قصے مزے لے لے کر سنا رہی تھیں۔ بچپن اور جوانی کی کتنی بارشیں آج

بھی ان کی یادداشت میں مسلسل برستی، دستک دیتی رہتی تھیں۔ اسی وقت دروازے پہ کھٹکا ہوا۔ ثانیہ نے چونک کر دیکھا تو عامر اندر داخل ہو رہا تھا۔ نانی اماں کو سلام کر کے اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپر ثانیہ کی طرف بڑھایا تھا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا موسم اچھا ہے۔ جلیبی اور سموسے کے ساتھ تمہارے ہاتھ کی بنی چائے کا لطف اٹھاتے ہیں، مگر مجھے لگتا ہے کہ میں لیٹ ہو گیا ہوں۔"

عامر نے ٹرے میں رکھے چائے کے خالی کپ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں عامر بیٹا! تم بیٹھو۔ ثانیہ ابھی چائے بنا کر لے آتی ہے۔"

نانی اماں کے چہرے پہ بہت زندہ مسکراہٹ تھی۔ ثانیہ جھینپتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔ شام گہری ہو چکی تھی مگر حیرت کی بات تھی بارش کے بعد قوس قزح اب پھیلی تھی مگر دل کے آسمان پر، آنکھوں کی شفاف سطح پہ محبت کے ہزاروں رنگ قوس و قزح میں ڈھل کر بکھر چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

فرحین کی شادی قریب آئی تو نانی سمیت سب لڑکیوں کا بسیرا آفتاب ماموں کے گھر ہو گیا۔ نانی اماں کی مختلف ہدایتوں اور نصیحتوں کا پنڈورا بکس ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ فرحت ممانی کے مزاج میں عفت ممانی کی طرح تلخی نہیں تھی بلکہ اکثر ثانیہ کا احساس بھی کر جاتی تھیں، مگر ایسا کم کم ہی ہوتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ عفت ممانی حسب معمول اور عادت اپنے مزاج کی تلخی نکال رہی تھیں۔ فرحت ممانی پہلے تو نظر انداز کرتی رہیں پھر وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ گفتگو کا موضوع نانی اماں کی تربیت اور ثانیہ تھی۔ شومئی قسمت عامر بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ پھر کیا تھا، عفت ممانی کی ہر بات کا بہت نرمی اور ذو معنی لہجے میں جواب دینے لگا۔ فرحت ممانی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح یا تو موضوع بدل دیں یا عامر ہی اٹھ کر چلا جائے، مگر دونوں ہی باتیں ممکن نہیں ہوئیں۔ نتیجتاً عفت ممانی غصے سے بھری وہاں سے واک آؤٹ کر گئیں، مگر جاتے جاتے طنز ضرور کر گئیں۔

"فرحت اپنے بیٹے پہ نظر رکھو! مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔"

ان کے جاتے ہی فرحت ممانی عامر پہ برس پڑیں۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے ہر بات میں ٹانگ اڑانے کی، خواتین کی باتوں میں مردوں کا کیا کام۔ اب کیا سوچے گی عفت میں نے کیسی تربیت کی ہے تمہاری۔"

"مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کسی کے کچھ بھی سوچنے، سمجھنے سے مگر غلط بات کوئی بھی کرے، مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" عامر نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"عامر! تم کیوں خود کو اور اس یتیم بچی کو سب کی نظروں میں تماشا بنا رہے ہو۔ تمہیں سمیّہ کے مزاج کا بھی پتا ہے سو سو باتیں کرتی ہے تمہیں اور ثانیہ کو لے کر۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

فرحت بیگم نے تنگ آ کر پوچھا تھا۔

"امی! آپ اب بھی نہیں سمجھ سکیں کہ میں چاہتا کیا ہوں؟"

عامر نے سنجیدگی سے پوچھا تو فرحت بیگم چپ ہو گئیں۔ سمجھ تو وہ کافی پہلے ہی گئی تھیں مگر کبھی اس بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا، اب جب عامر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا تو وہ سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ عامر ماں کو سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر جا چکا تھا۔ رات جب اپنی پریشانی (الجھن) کا ذکر اپنے شریک حیات سے کیا تو وہ بولے۔

"ثانیہ بہت اچھی بچی ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے پلی بڑھی ہے۔ اگر عامر کی پسند ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اچھا ہے میری بہن کی نشانی ہمیشہ کے لیے ہمارے گھر آ جائے گی۔"

آفتاب ماموں نے پرمسرت لہجے میں کہا تھا، مگر فرحت بیگم مسلسل کسی حساب کتاب میں الجھی ہوئی

تھیں۔ آفتاب اپنی شریک حیات کی سوچ کو جان چکے تھے۔

"دیکھو، اگر تم پہلے کی طرح کسی امیر گھرانے سے بہو لانا چاہتی ہو تو اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ پہلی بات تو یہ عامر بہت ضدی ہے، مانے گا نہیں اور اگر مان بھی گیا تو اس کے دل میں ایک گرہ تمہاری طرف سے لگ جائے گی اور اگر دل میں گرہ لگ جائے تو فاصلے بہت جلدی اور آسانی سے بڑھنے لگتے ہیں۔

سمیّہ کی عادتوں اور مزاج کو اچھی طرح دیکھ اور سمجھ چکی ہو۔ بیٹا بھی بیوی کی زبان بولتا ہے۔ بچوں کو ہمارے پاس نہیں آنے دیتی ثاقب اکثر باتوں ہی باتوں میں الگ ہونے کی بات کرنے لگا ہے اور وہ وقت دور بھی نہیں۔

دیکھو! صاف اور سیدھی بات ہے ساس، ساس ہی ہوتی ہے نہ تم نے کبھی اسے اپنی بیٹی کی طرح سمجھا اور نہ سمیّہ تمہیں ماں کی جگہ سمجھتی ہے۔ ثانیہ تمہارے مزاج اور باتوں کی عادی ہے اور کچھ اس کی فطرت میں رشتے نبھانے کا وصف بھی ہے۔ آگے جو تمہاری مرضی، چاہے تو وقتی خوشی حاصل کر لو یا اس گھر کی مستقل خوشیاں اور سکون۔۔۔"

آفتاب نے ایمان داری سے تجزیہ پیش کیا تھا۔ اب فیصلہ فرحت بیگم کے ہاتھ میں تھا اور انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو ان کی اور ان کے گھر کی مستقل خوشیوں کا ضامن تھا۔

فرحین کی مہندی پہ، ثانیہ کی انگلی میں بھی عامر کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی۔ جہاں عامر اور ثانیہ بہت خوش تھے وہاں خاندان کے بہت سے افراد جل بھن کر بھی رہ گئے تھے، خاص کر عفت ممانی اور ماہین جن کی نظریں بھی کب سے عامر پہ لگی ہوئی تھیں۔ مگر قسمت کی مہر کسی اور کے لیے مقرر کی جا چکی تھی۔

منگنی کا یہ عرصہ دو سالوں پہ محیط رہا۔ اس دوران ماہین کی منگنی بھی بہت دھوم دھام سے کر دی گئی تھی اسے شادی کے بعد دیار غیر چلے جانا تھا۔ ان گزرتے دنوں میں نانی اماں شدید بیمار ہو کر بستر سے ہی لگ گئی تھیں۔ ثانیہ کی طرف سے دل مطمئن ہو چکا تھا۔ ثانیہ نے رخصت ہو کر اپنوں میں ہی جانا تھا۔ غیروں کے مزاج اور طریقوں کا کیا پتا چلتا ہے۔ اب کم از کم ثانیہ محفوظ ہاتھوں میں تو تھی۔ فرحت ممانی کے مزاج اور عادتوں سے واقف تھی۔ اسے وہاں نبھانے اور جگہ بنانے میں مشکل نہ ہوتی۔ نانی اماں ثانیہ کو پاس بٹھا کر زندگی سے سیکھے پڑھے سبق رٹانے لگتیں۔ جو ثانیہ اکثر ہنسی میں اڑا دیتی تھی۔

ان دنوں ثانیہ پتنگ بنی محبت کے آسمان پہ توجہ اور وارفتگی کی تیز ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی جب اڑان اتنی اونچی ہو اور پتنگ کی ڈور مضبوط ہاتھوں میں ہو تو پتنگ کو کیا ڈر کٹنے کا بو کاٹا ہونے کا۔۔۔

عامر ہر خاص موقع پہ اسے سرپرائز گفٹ دیتا اور وش کرنا نہیں بھولتا تھا۔ عامر کو پتا تھا کہ ثانیہ کو بارش بہت پسند ہے وہ آفس میں ہوتا تو فوراً فون کر کے کہتا۔

"ثانی! آسمان سے برستا پانی بہت بے رنگ اور اداس لگ رہا ہے اس لیے کہ اس بارش میں تمہاری ہنسی کے، وجود کے رنگ شامل نہیں ہیں۔ باہر جاؤ پلیز بارش کو اداس مت رہنے دو۔"

اور ثانیہ ان لفظوں کے رنگ لیے بارش میں بھیگنے چلی جاتی اور بارش کے ہر قطرے میں ان لفظوں کے رنگ بھرنے لگتی۔

عفت ممانی اور ماہین اکثر سرد آہ بھر کے رہ جاتیں کہ ثانیہ کو اتنا اچھا اور محبت کرنے والا انسان ملا ہے ماہین کا منگیتر بھی اسے تحائف بھیجتا تھا بلکہ بہت مہنگے اور قیمتی، مگر جو مزا سرپرائز گفٹ دینے اور وش کرنے میں تھا وہ ان قیمتی تحائف میں نہیں تھا۔

نانی اماں کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے ثانیہ کی شادی کا شور مچا دیا اور ان کے زور دینے پہ روایتی اور مناسب دھوم دھام سے ثانیہ کو رخصت کر دیا گیا اور اس کے کچھ عرصے کے بعد ماہین کی شادی [illegible] پہ ہوئی۔ ماہین بہت شان سے رخصت ہوئی۔ ثانیہ ان دنوں عامر کی محبت میں اتنی گم اور مگن

تھی کہ اسے دنیا کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ ہوش تب آیا جب ایک دن نانی اماں کے انتقال کی خبر ملی۔

ثانیہ نے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور انمول رشتہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا مگر یہ ہی حکم الٰہی تھا۔

☼ ☼ ☼

وانیہ کے رونے پہ ثانیہ یک دم حال میں پلٹ آئی۔ اپنی آنکھوں میں پھیلی نمی کو اندر ہی اندر چھپاتی وہ وانیہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی شادی کو تین سال ہو چکے تھے۔ ان دنوں رافعہ کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔

ماہین کے بعد رانیہ کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ ثانیہ، نانی اماں کے انتقال کے بعد بہت کم کم، طاہر ماموں کے گھر جاتی تھی مگر حیرت انگیز طور پر عفت ممانی اپنے مخصوص تیکھے لہجے میں اسے گھر بلایا کرتی تھیں۔ ماہین پردیس جا کر بہت بدل گئی تھی یا ثانیہ کو اب محسوس ہوتا تھا۔ تقریباً" روز دونوں کی انٹرنیٹ پہ بات ہوتی تھی ایسے جیسے بہت گہری سہیلیاں ہوں۔ رانیہ کا بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ دراصل وقت اور فاصلے بہت کچھ بدل کر رکھ دیتے ہیں اور عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی بچکانہ پن، لاڈ، ناز نخرے، ماں باپ کی دہلیز پر ہی رہ جاتے ہیں اور جب عملی زندگی کے مسئلے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے تو رشتوں کی قدر خود بخود ہونے لگتی ہے اور یہ ہی ماہین، رانیہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

ایک بار پھر گھر میں، بہت شور شرابا اور افراتفری کا عالم تھا۔ رافعہ کی شادی کی تاریخ رکھی جا چکی تھی۔ فرحین صبح ہی اپنے تینوں نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ آ گئی تھی۔ ثانیہ کا ایک پاؤں کچن میں اور دوسرا کچن سے باہر تھا۔ ساتھ ساتھ وانیہ کو بھی دیکھنا پڑ رہا تھا جو دو روز سے مسلسل بخار رہنے کی وجہ سے چڑچڑی ہو رہی تھی۔ فرحین کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے باتیں زیادہ کر رہی تھی۔ فرحت ممانی حسب معمول گھبرا کر مختلف ہدایتیں جاری کر رہی تھیں۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے عامر اور آفتاب ماموں بھی گھر ہی تھے۔

عامر صبح سے ثانیہ کو بھاگ بھاگ کر کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ فرحت ممانی کی مسلسل آوازوں اور وانیہ کے گلا پھاڑ کر رونے پہ ثانیہ جھنجلا کر رہ گئی۔ اور غصے میں بڑبڑاتی وانیہ کو اٹھا کر عامر کے پاس لے گئی جو اپنے کمرے میں آرام سے لیٹا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

"پلیز عامر! کچھ دیر کے لیے وانیہ کو سنبھال لیں اور تو کسی کو خیال ہی نہیں ہے کہ روتی ہوئی بچی کو چپ ہی کروا دے بس سب اپنی اپنی باتوں میں مگن ہیں۔ امی (فرحت ممانی) بھی مجھے ہی ہدایتیں دیے جا رہی ہیں۔ فرحین آپی کو تو مزے سے پاس بٹھایا ہوا ہے۔"

ثانیہ جس نے کبھی کام کی زیادتی یا کسی کے رویے کا شکوہ نہیں کیا تھا آج بے اختیار پھٹ پڑی تھی مگر دوسرا لمحہ اس سے بھی زیادہ حیران کن تھا۔

"ایک دن تمہیں تھوڑا سا زیادہ کام کیا کرنا پڑ گیا ہے، تم میری ماں اور بہن کو باتیں سنانا شروع ہو گئی ہو۔ ساری دنیا سے الگ اور انوکھا کام کر رہی ہو تم سسرال میں؟ کم از کم اتنا ہی خیال کر لو کہ میری ماں سے اس عمر میں کام نہیں ہوتا ہے اور فرحین کون سا روز روز آتی ہے، اگر تمہیں یہ سب اتنا ہی برا اور ناگوار گزر رہا ہے تو رہنے دو۔ میں سب کچھ بازار سے لے آؤں گا مگر پلیز تم مظلومیت کا رونا مت روؤ۔"

عامر کو نجانے کس بات کا غصہ تھا جو اس طرح ثانیہ پہ نکالا تھا۔ ثانیہ حیرت سے پھٹی، آنکھوں میں آنسو لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں نے تو بس ویسے ہی۔۔۔"

ثانیہ نے کپکپاتے لبوں کے ساتھ کچھ کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے بات پوری نہ ہونے دی اور وہ فوراً" کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عامر کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ ثانیہ نے سب رشتوں کو پوری ایمان داری اور محبت کے ساتھ نبھایا ہے اور کبھی اسے یا گھر کے کسی فرد کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اور آج اگر اس نے کسی وجہ یا اپنی تھکاوٹ سے چڑ کر کچھ کہہ ہی دیا تھا تو

اسے تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اب صرف بیوی پہ ہی تو فرض نہیں ہے کہ شوہر اور اس کے گھر والوں کے ہر طرح کے تلخ و شیریں رویے دیکھے اور برداشت کرے۔ اگر کبھی کبھی شوہر بھی بیوی کی سن کر برداشت کرلے تو اس سے شوہر کے رتبے یا مقام میں کوئی فرق نہیں آجاتا ہے۔ ہاں ذہنی اور جسمانی طور پر تھکی ہاری عورت کو اپنا غبار نکالنے کا موقع ضرور مل جاتا ہے۔ جس کے بعد اندر اور باہر کا موسم خود بخود صاف اور پر سکون ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ثانیہ نے روبوٹ بنے سارا کام سر انجام دیا۔ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو گیا۔ مگر عامر اور ثانیہ کے درمیان سرد مہری کی دیوار سی بن گئی جس کے پیچھے وہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں گم رہنے لگے تھے اسی طرح کچھ دن گزر گئے۔ گرمی کے طویل دن اور لو جھل اور ویران لگنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ثمو! جلدی سے باہر آؤ میرے ساتھ۔"

وانیہ کو رافعہ اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ فراغت ملتے ہی ثانیہ پھر ماضی کے دروازے کھولنے لگی تھی جب تیزی سے عامر کمرے میں داخل ہوا اور ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔

"خیر تو ہے! ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی۔"

ثانیہ پوچھتی رہ گئی، مگر عامر اس کا ہاتھ پکڑ کر چھوٹے سے لان میں لے آیا۔ ثانیہ پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں آخر ہوا کیا ہے؟"

ثانیہ نے یکدم جھنجلا کر پوچھا تھا۔ وہ عامر کے عجیب و غریب رویے کو بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"ہوا تو کچھ بھی نہیں مگر ہونے والی ہے۔" عامر نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہونے والی ہے؟" ثانیہ نے الجھن بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"بارش۔۔۔! صبح مطلع بالکل صاف تھا مگر نجانے کہاں سے یک دم اتنے بادل آگئے اور سارے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ میں آفس سے بھاگا بھاگا گھر آیا ہوں تاکہ تمہارے ساتھ بارش دیکھ سکوں۔"

عامر نے اتنے اطمینان سے کہا کہ ثانیہ کچھ لمحے نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی تو اس نے بھی غور کیا موسم سچ میں بہت خوب صورت ہو رہا تھا۔ کبھی ایسے موسم کی ثانیہ دیوانی تھی مگر شادی کے بعد سب خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ ثانیہ نے گہری سانس لی اور بولی۔

"یہ اس دن کے رویے کی تلافی ہے؟"

"ہاں! ایسا ہی سمجھ لو۔ مجھے احساس ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا مگر تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو تو میری باتیں غلط نہیں تھیں۔"

عامر نے اعتراف کرتے ہوئے بھی اسے ہی سمجھایا تھا۔

"ٹھیک ہے! آپ کی ہر بات کو مان لیتی ہوں مگر صرف ایک بات کا جواب دیں شادی سے پہلے آپ کو ہی ان سب باتوں پہ اعتراض اور مجھ سے ہمدردی ہوتی تھی کام کے دوران چھوٹی چھوٹی باتیں کرکے میرا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ کبھی مجھے کھانے، کبھی چائے پینے کا کہتے تھے، پھر شادی کے بعد ایسا کیوں کہ سب کچھ نارمل لگنے لگا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ یہ سب میری ذمہ داری ہی ہے، مگر کیا میں اپنے شوہر سے ہمدردی، احساس، فکر کی امید بھی نہیں رکھ سکتی؟"

ثانیہ نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا تو عامر چپ کا چپ رہ گیا۔ واقعی پہلے کی طرح وہ اب چھوٹی چھوٹی باتوں میں ثانیہ کا خیال نہیں رکھتا تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو! میری ہی غلطی ہے مگر میں بھی کیا کروں، روز بروز بڑھتے ہوئے مسائل اور کام کا لوڈ مجھے کچھ اور سوچنے ہی نہیں دیتا ہے۔"

عامر نے اعتراف کیا تو ثانیہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ کو پتا ہے نانی اماں اکثر ایک بات کہتی تھیں۔"

ثانیہ کے مزاج پہ بھی ٹھنڈی ہوا نے اچھا اثر ڈالا تھا اور وہ عامر کے ساتھ لان میں چکر لگاتے ہوئے بولی تھی۔

"وہ کہتی تھیں کہ تیز دھوپ، رنگوں کو پھیکا کر دیتی ہے۔ پہلے مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر اب اس بات سے سچی کوئی اور بات نہیں لگتی ہے۔" ثانیہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

"اچھا! وہ کیسے؟" عامر نے جامن کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر پوچھا تھا۔ درخت پہ جامن لگے ہوئے تھے۔ بارش اور تیز ہوا کی وجہ سے بہت سے نیچے بھی گرے ہوئے تھے۔

"نانی اماں کہتی تھیں کہ وقت اور حالات کی تیز اور گرم دھوپ میں جذبے، فکری، ناز نخرے اور محبت کے رنگ پھیکے پڑنے لگتے ہیں۔ عملی زندگی میں خوابوں اور خیالوں کے سب رنگ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ رہ جاتے ہیں تو روز مرہ کے مسئلے، مسائل، ذمہ داریاں اور حقوق و فرائض کی ایک لمبی لسٹ۔

شادی سے پہلے آپ کو جن چھوٹی چھوٹی باتوں پہ میری فکر اور خیال ہوتا تھا اب وہ کہیں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔ پہلے آپ سب کے غلط رویوں پہ، انداز پہ، مجھے پروٹیکٹ کرتے تھے مگر اب نہیں۔"

ثانیہ نے اپنی مٹھی میں جامن بھرے تھے۔ بارش کی پھوار میں وہ دونوں کافی حد تک بھیگ چکے تھے۔ ثانیہ کے چہرے پہ خوشی تھی، اطمینان تھا اور شاید محبت بھی۔ دونوں واپس مڑے تو عامر نے پوچھا۔

"سارا قصور میرا ہی ہے کیا؟"

"نہیں! میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔ یہ سب کچھ تو وقت اور حالات کے تقاضے ہیں ان سے فرار ممکن نہیں۔۔۔ ہاں مگر۔۔۔"

ثانیہ نے مزے سے جامن کھاتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا؟" عامر نے دلچسپی سے اس کا بھیگا ہوا روپ دیکھا تھا۔

"رویوں، وقت اور حالات کی تیز دھوپ جب جسم و جاں کو جلانے لگے، زندگی کے سب رنگ، رشتے اور جذبے پھیکے پڑنے لگیں تو ایک سایہ مہربان، ابر رحمت، محبت اور احساس کا بادل کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر اپنے کرم کی بارش تو کرہی سکتا ہے نا!

اور اس سے زیادہ کی تمنا اور خواہش کسے ہے؟"

ثانیہ نے مسکراتے ہوئے بات مکمل کی تھی۔

"اور تمہارے لیے احساس اور محبت کا بادل میں ہوں نا؟"

عامر نے پورچ میں رک کر دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے ہوئے شرارتاً پوچھا تھا۔ اس سے آگے چلتی ثانیہ لاؤنج کے دروازے کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھ چکی تھی۔ وہ رکی اور کچھ سوچ کر پیچھے پلٹ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے مگر پورے یقین کے ساتھ بولی تھی۔

"آپ نہیں بلکہ آپ کی محبت میرے لیے ابر رحمت ہے۔ تیز دھوپ میں سایہ ہے۔ میرے ہر احساس اور خوابوں کا رنگوں بھرا اور پر سکون سلسلہ ہے یہ۔"

ثانیہ دروازہ کھول کر اندر جا چکی تھی۔ عامر نے سر اٹھا کر آسمان سے برستی بارش کو دیکھا تھا اور اطمینان سے مسکراتا، گنگناتا اندر کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ ایک بات بہت اچھی طرح جان چکا تھا کہ۔۔۔

محبت میں ملنا بڑی بات نہیں ہوتی بلکہ محبت کو باقی رکھنا، کچھ اس طرح کہ محبت روز اول کی طرح تازہ رہے یہ بڑی بات ہوتی ہے۔ محبت کا ملنا خوش نصیبی ضرور ہے مگر محبت کا قائم رہنا اس رب کی رحمت ہے اور ان دونوں کو اسی رحمت کے سائے تلے ہنسی خوشی آباد رہنا تھا کیونکہ محبت کرم کی بارش ہے۔

✿

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔" ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

ناولٹ

عبداللہ پابند صوم وصلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اورید اکے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اورید اکو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے۔ جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کردیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑدی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارحم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارحم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کردے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے۔ جو کسی مرد کی ہے۔

ارحم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

موناعدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کردیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارحم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنادیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

پانچویں قسط

"ارے۔ نہیں نہیں اماں' آپ غلط سمجھ رہی ہیں؟ عدینہ کے چہرے پر پھیلی بدگمانی آپا صالحہ کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کررہی تھی۔

"اس کی تو ہم نے بہت سال پہلے شادی کردی تھی۔" آپا صالحہ نے گھبرا کر اطلاع دی۔ "یہ تو میری بیٹی ہے عدینہ' کیوں بے بے۔؟" انہوں نے فوراً" تصدیق کے لیے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں' صالحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" بے بے کی تصدیق پر آپا صالحہ نے فوراً" مڑ کر عدینہ کے تاثرات جانچنا چاہے' لیکن عدینہ تو کب کی وہاں سے جاچکی تھی۔ آپا صالحہ کو فوراً" ہی کچھ غلط ہو جانے کا احساس ہوا۔

عدینہ کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی میں کبھی اسے یہ الفاظ بھی سننے کو ملیں گے۔ اپنے سوتیلے ہونے کا احساس اسے بارہا ہوا تھا لیکن اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ بعض دفعہ کچھ خیال اس طرح مجسم ہو کر بھی سامنے آجاتے ہیں۔

"میں سوتیلی ہوں' تب ہی آپا میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی تھیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "لیکن مجھے آج تک اس تلخ حقیقت کا ادراک کیوں نہیں ہوسکا۔" وہ بلاارادہ چلتی ہوئی دیوار میں لگے شیشے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"تمہاری آنکھیں اور ہونٹوں کا کٹاؤ بالکل آپا صالحہ جیسا ہے۔" مونا کا بار بار کہا گیا ایک فقرہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ اس نے بغور اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا اسے مونا کی بات میں کہیں جھوٹ کا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔

"اگر آپا صالحہ میری سگی والدہ نہیں' تو میری شکل ان کے ساتھ کیسے مل سکتی ہے ؟" دماغ نے کام کرنا شروع کرہی دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر مزید سوچ وبچار کرتی' مونا مسکراتے ہوئے شربت کا جگ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ مہمانوں کی آمد پر خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔

"عدینہ باجی! آپ نے اپنی نانو کے گال دیکھے' بالکل کشمیری سیب لگ رہے تھے۔" وہ ہاتھ میں پکڑا جگ سائیڈ میز پر رکھ کر شرارت سے بولی۔

"وہ سب کے لیے کشمیری کڑھائی والے اتنے خوب صورت کپڑے لے کر آئی ہیں' میرا تو بس نہیں چل رہا' فوراً" ان سے چھین کر سلائی کرکے پہن لوں۔" مونا اس کی خاموشی سے بے نیاز اپنی ہی ہانک رہی تھی۔

"اور وہ آپ کے نانا' وہ تو اتنے سویٹ ہیں' میں نے انہیں پانی پلایا تو ڈھیروں دعائیں مفت میں دے دیں۔" مونا شربت کا گلاس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی تو ساتھ ہی اس نے عدینہ کا سنجیدہ چہرہ بھی غور سے دیکھنے کی زحمت کرلی۔ وہ چونک سی گئی۔

"آپ کے چہرے پر کیوں بارہ بجے ہوئے ہیں۔؟" مونا کو اس کی خاموشی سے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"ایک بات پوچھوں مونا' اگر تم مجھے سچ سچ بتاؤ تو ؟" اس نے مونا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر التجائیہ انداز میں کہا۔

"لیں' میں نے پہلے کون سا آپ سے جھوٹ بولا ہے۔" مونا فوراً" ہی برا مان گئی۔

"مجھے معلوم ہے تم جھوٹ نہیں بولتیں' لیکن شاید یہ بات ہی ایسی ہے۔" عدینہ کی بات نے مونا کا تجسس بڑھادیا۔

"آپ پوچھیں تو سہی میں بالکل بھی غلط بیانی نہیں کروں گی۔" مونا نے اسے تسلی دی۔

"یہ بتاؤ' میرے ابا کی' آپا صالحہ کے ساتھ دوسری شادی تھی کیا؟" عدینہ کے سوال پر مونا ایک دم چونکی اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"دوسری نہیں' تیسری شادی کہیں۔" وہ دھپ کر کے پلنگ پر بیٹھ گئی اور مزے سے تکیہ گود میں رکھ لیا۔

"کیا ؟" عدینہ کو سچ مچ شاک لگا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟" اسے واقعی اس بات کا علم نہیں تھا' ساری زندگی تو آپا صالحہ نے اسے کتابوں میں مصروف رکھا اور کہیں ادھر ادھر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

"ہاں ناں' رفیق تایا کی پہلی شادی ان کی پھپھوزاد سے ہوئی تھی' جس سے سمیرا باجی پیدا ہوئیں۔" مونا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ "لیکن سمیرا باجی کی پیدائش پر تائی کا انتقال ہوگیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔؟" عدینہ نے تعجب سے مونا کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"اس کے بعد تایا جی نے سمیرا باجی کی وجہ سے دوسری شادی کرلی۔ لیکن ان کی دوسری بیوی' سمیرا باجی کے حق میں بہت بری سوتیلی ماں ثابت ہوئیں' تنگ آکر تایا جی نے انہیں طلاق دے دی' اس طرح وہ قصہ بھی ختم ہوا۔"

"اس کے بعد کیا ہوا؟" عدینہ کو حیرت ہو رہی تھی آج تک اسے پتا ہی نہیں چلا۔

"پھر پانچ سال تک انہوں نے شادی کا نام تک نہیں لیا' بے بے ہی ان کی بیٹی کو سنبھالتی تھیں۔" مونا نے مزید اضافہ کیا۔

"پھر تایا صالحہ سے ان کی شادی کیسے ہوئی۔؟"
عدینہ بے تاب ہوئی۔

"وہ کسی تبلیغی دورے پر کشمیر گئے تھے اور جب واپس آئے تو تایا صالحہ ان کے ساتھ تھیں۔" مونا کی بات پر وہ ہکابکا رہ گئی۔

"اور وہ سمیرا باجی کہاں گئیں۔؟" عدینہ کو خیال آیا کہ اس نے اس نام کی کسی لڑکی کا ذکر کبھی نہیں سنا تھا۔

"ان کا تو تایا صالحہ نے بہت خیال رکھا اور بہت دھوم دھام سے شادی کی، لیکن وہ بھی اپنی والدہ کی طرح پہلے بچے کی پیدائش پر کسی اناڑی دائی کی غفلت کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور بچہ بھی نہ بچ سکا۔" مونا کچھ اداس ہوئی۔

"بہت پیاری تھیں سمیرا باجی، میں آپ کو ان کی بچپن کی تصویریں دکھاؤں گی، یہیں کہیں اسٹور میں پڑی ہوں گی۔" مونا کا لہجہ گواہ تھا وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ یہ کہانی سن کر عدینہ کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

وہ تو دل ہی دل میں کہیں خود کو یقین دلا چکی تھی کہ وہ تایا صالحہ کی سگی اولاد نہیں اور وہ شاید دنیا کی پہلی لڑکی تھی جسے اس وقت اپنے "سگے" ہونے کے احساس سے دکھ ہو رہا تھا۔

"ویسے آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں۔؟" مونا نے عقل کا سوال پوچھ لیا تھا۔

"میں سمجھی میں تایا کی سوتیلی بیٹی ہوں۔" اس کے منہ بنا کر بولنے پر مونا کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

"خدا کا خوف کریں عدینہ باجی! آپ کہاں سے ان کی سوتیلی ہو گئیں، آپ کی پیدائش پر تو پورے پنڈ میں دیسی گھی سے بنے موتی چور کے لڈو بانٹے گئے تھے۔" مونا نے اپنی ہنسی روک کر بتایا۔ "اس بات کی گواہی تو پورے پنڈ کی بوڑھی عورتیں آ کر دے سکتی ہیں اور میری اماں نے آپ کو چاندی کی انگوٹھی پہنائی تھی اپنے خاندانی جیولر سے بنوا کر۔"

"اچھا اچھا، اب رہنے دو۔" عدینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں ذرا نانو سے مل آؤں، کیا سوچتی ہوں گی، کتنی بد مزاج ہے یہ لڑکی۔" اب کنفرم ہو ہی چکا تھا تو نانا، نانو سے اتنی بے رخی بنتی نہیں تھی۔ اگلے ہی آدھے گھنٹے میں وہ صحن میں بیٹھی نانو کی دلچسپ باتیں سن کر مسکرا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
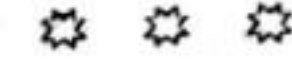
"بی بی جی! اب بس بھی کریں ناں۔" اوریدا اسٹور میں گھسی ایک پرانا سا سوٹ کیس کھولے اس میں سے اپنی ماما کی شادی کی تصویریں ڈھونڈ رہی تھی، پتا نہیں کیوں ارحم والے فنکشن کے بعد اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ماما کی جوانی کی تصاویر دیکھے۔ آنٹی بینش اور ان کی دوست کی گفتگو نے اس کے ذہن میں بہت سے سوال کھڑے کر دیے تھے۔

"کیا مصیبت ہے صغریٰ باجی! آپ سکون سے کھڑی نہیں ہو سکتیں۔" اوریدا نے اسے جھاڑا جو ہاتھ میں ایمرجنسی لائٹ پکڑے بیزار سے انداز سے کھڑی تھی، اس وقت لوڈ شیڈنگ کے کمالات کی وجہ سے لائٹ بند تھی اور اسٹور میں یو پی ایس کا کنکشن نہیں تھا۔

"اوریدا بی بی! ایک گھنٹہ تو ہو گیا ہے۔" صغریٰ نے منہ بنا کر اطلاع دی۔

"صغریٰ باجی! آپ منہ تو ایسے بنا رہی ہیں، جیسے خدانخواستہ ایک سال ہو گیا ہو۔" اوریدا نے برا مانتے ہوئے بریف کیس کی ساری چیزیں زمین پر الٹ دیں۔ اچانک اس کی نظر ایک درمیانے سائز کے پرانے البم پر پڑی۔ اس کا گوہر مقصود ہاتھ آ چکا تھا۔

"تھینکس گاڈ! مل گیا۔" اوریدا نے جلدی سے البم اٹھایا، وہ پچھلے تین دن سے بڑی اماں کی منتیں کر رہی تھی۔ اسے پرانی تصویریں ڈھونڈ کر دیں اور وہ ہر دفعہ اسے ٹال جاتی تھیں، لیکن جب اوریدا کا مطالبہ زیادہ ہی بڑھ گیا تو وہ چڑ سی گئیں۔

"میری جان مت کھاؤ، جا کر اسٹور میں رکھے کسی بریف کیس میں دیکھ لو، طیبہ کی شادی کے بعد میں نے الٹو فالتو سامان وہیں ڈلوا دیا تھا۔"

"بڑی اماں، میری ماما کی تصویریں فالتو تھیں کیا؟" اس کے اعتراض پر بڑی اماں کا منہ حیرت سے کھلا۔

"تو کیا میرے بچوں کی تصویریں فالتو تھیں۔ جو میں نے وہاں رکھوا دیں۔" انہوں نے بیزاری سے سر جھٹکا۔ "جا کر دیکھ لو، سب کی وہیں رکھی ہیں ورنہ تمہاری ماں سے میری کوئی دشمنی تھوڑا تھی۔" بڑی اماں کا مزاج برہم ہوا۔

"آپ کے پاس بس میرے لیے ہی ٹائم نہیں ہوتا، باقی تو ساری دنیا کے لیے ہوتا ہے۔" وہ ان پر الزام لگا کر کمرے سے نکل گئی اور اب بڑی اماں کو اگلے دو گھنٹے بیٹھ کر صرف اس الزام پر کڑھنا تھا۔

"اوریدا بی بی! اب میں جاؤں۔؟" صغریٰ نے شل ہوتے بازو کو دباتے ہوئے اکتاہٹ بھرے انداز سے اوریدا کو دیکھا جو البم گود میں رکھے اب دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے والدین کی بچپن کی تصویروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ زیادہ تر تصویریں تیمور، بینش اور طیبہ کی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک تیسری نو عمر لڑکی کو وہ پہچاننے سے قاصر تھی۔

"صغریٰ باجی! آپ اس گھر میں کب سے ہیں؟" اوریدا کے ذہن میں ابھی ابھی ایک بات آئی تھی۔

"بیس بائیس سال تو ہو گئے جی۔" صغریٰ ہنوز اپنا بازو دبا رہی تھی۔

"یہ کس کی تصویر ہے۔؟" اس نے ایک پیاری سی بچی کی تصویر پر انگلی رکھی جو اسکول یونیفارم میں دو چوٹیاں کیے بہت معصوم لگ رہی تھی۔

"یہ تو ڈیزی باجی ہیں، آپ کی بڑی پھپھو۔" صغریٰ تصویر دیکھ کر کچھ رنجیدہ ہوئی۔

"یہ کہاں ہوتی ہیں۔؟" اوریدا کو احساس ہوا کہ گھر میں ان کا نام بالکل نہیں لیا جاتا۔

"ان کا تو بھری جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔" صغریٰ اپنے بازو کے درد کو بھول کر اس کے پاس آن بیٹھی۔ "سچ کے سوہنی تھیں آپ کی طرح۔" اوریدا نے اس کے تعریفی کلمات کو بے دھیانی سے سنا، اس کی نظریں تو مقناطیس کی طرح ایک تصویر پر چپک گئیں۔ وہ تصویر تھی ہی ایسی۔

"ارے یہ کیا۔" اوریدا کو شاک سا لگا۔ وہ تصویر البم سے نکال کر غور سے دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں کے پاس لے آئی۔

"یہ دولہا، دلہن تو۔؟" اوریدا کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ تصویر خاصی پرانی تھی اور اس کے رنگ بھی مدھم ہو چکے تھے۔

"دکھائیں ذرا۔" صغریٰ بھی تصویر پر جھکی اور اگلے ہی لمحے اسے بھی کرنٹ لگا۔

ایک گھریلو سی تقریب میں گوٹے والا سوٹ پہنے دلہن بنی آنٹی بینش کی عمر کوئی پندرہ سولہ سال اور ان کے ساتھ دولہا کے روپ میں کھڑے تیمور کی عمر کوئی سترہ اٹھارہ سال کے قریب لگ رہی تھی۔ اوریدا اتنی سخت

بے یقینی سے یہ تصویر دیکھ رہی تھی۔

"صغریٰ باجی! یہ تو۔۔۔" اوریدا نے سخت خوف زدہ انداز سے سامنے بیٹھی ملازمہ کا چہرہ دیکھا جس کا اپنا رنگ بھی پھیکا پڑ چکا تھا۔

"یہ بینش باجی اور تیمور بھائی کی منگنی کی تصویر ہے۔" صغریٰ نے دائیں بائیں دیکھ کر رازدرانہ انداز میں کہا۔ "میری مانیں تو ان تصویروں کو بڑی بیگم صاحبہ کے سامنے نے کر مت جایئے گا' ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے گا۔"

"اور جو میرا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے ان کو دیکھ کر۔۔۔" اوریدا کو اس کے مشورے پر غصہ آیا۔

"تو آپ کو کس نے کہا تھا کہ گڑے مردے اکھاڑیں۔۔۔ صغریٰ' بوا رحمت کی بہو تھی اور ان کی خاندانی ملازمہ۔ اس لیے کئی دفعہ بے تکلفی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کر جاتی جو کم از کم اوریدا کو بہت برا لگتا تھا۔

"کیا آنٹی بینش' پاپا کی منگیتر رہی ہیں۔۔۔؟" اوریدا نے خود پر ضبط کرتے ہوئے صغریٰ سے پوچھا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ اس طرح کی باتیں وہ اس گھر میں کسی اور سے نہیں اگلوا سکتی تھی اور صغریٰ سے بڑھ کر باخبر کون ہو سکتا تھا۔

"یہ تو سارے خاندان کو پتا ہے۔" صغریٰ اس کی بے خبری پر لاپروائی سے ہنسی تو اوریدا کو غصہ آگیا۔

"میں بھی تو خاندان کا حصہ ہوں' مجھے تو نہیں پتا۔"

"آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے بی بی جی۔۔۔" صغریٰ کا انداز اسے مزید سلگا گیا۔

"مجھے میری عمر مت بتائیں اور جا کر بوا رحمت کا کچن میں ہاتھ بٹائیں' ورنہ شام کو آپ کی اور ان کی جنگ پلاسی ہو رہی ہوگی۔۔۔"

بوا رحمت اور صغریٰ' ساس بہو تھیں' ان کی آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی۔۔۔ بوا رحمت کو سب ملازمین پر فوقیت حاصل تھی اور پھر ان کا اپنا سارا خاندان ہی اس گھر میں ملازم تھا۔ ایک بیٹا' چوکیدار تو دوسرا ڈرائیور' بہو اور پوتی نے کچن سنبھال رکھا تھا۔ خود وہ کام کم کرتیں اور باقی ملازموں پر نظر رکھتیں اور ان کی وفاداری اور خلوص پر کبھی کسی کو شک کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے ساری زندگی اسی خاندان کی خدمت کی تھی۔

"میں جا رہی ہوں اوریدا بی بی! کوئی کام ہو تو بلا لیجیے گا۔۔۔" صغریٰ شان بے نیازی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر جا چکی تھی' لیکن اوریدا کے دماغ میں مختلف سوچیں اودھم مچا رہی تھیں۔

"پاپا اور آنٹی بینش اگر آپس میں انگیج تھے تو میری ماما بیچ میں کیسے آگئیں۔۔۔؟" یہ ایک ایسا سوال تھا جو وہ کبھی بھی ارحم سے نہیں پوچھ سکتی تھی اور بڑی اماں سے پوچھنے کی صورت میں سوائے جھاڑ کے کچھ بھی نہیں ملنا تھا اور باقی اس گھر میں تھا ہی کون جو یہ معمہ حل کرتا۔

"پھپھو طیبہ سے پوچھوں گی' شاید وہ ہی بتا دیں۔۔۔"

اس نے باقی البم پر سرسری سی نظر ڈالی اور آخری تصویر پر ایک دفعہ پھر اس کی نظریں الجھ گئیں۔ آنٹی بینش کی سالگرہ کا فنکشن تھا اور گھر کے سب ہی افراد وہاں موجود تھے' لیکن اوریدا کے لیے اس تصویر میں سب سے زیادہ اہمیت اس کی ماما کی تھی جو آنٹی بینش کے منہ میں ہنستے ہوئے کیک کا ٹکڑا ڈال رہی تھیں۔ اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کوئی خاص اہمیت کا حامل انسان ہی کر سکتا تھا۔

"ماما اور آنٹی بینش۔۔۔ کا آپس میں کیا تعلق تھا؟"

اس سوال نے اسے خاصا پریشان کیے رکھا' لیکن پھر وہ سر جھٹک کر کتابوں پر جھک گئی' کیونکہ اسے پتا چل گیا تھا کچھ سوالوں کے جواب صرف وقت دے سکتا ہے اور کوئی نہیں اور اسے اس مناسب وقت کا ہی انتظار کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆
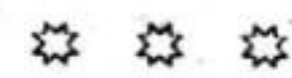
"اوہ مائی گاڈ فلم۔۔۔" شانزے نے تحیر کے عالم میں ہاتھ میں پکڑا برگر پلیٹ میں رکھا اور بے یقینی سے سرمد کو دیکھا۔ آج کافی دن کے بعد ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملنے والی ہے۔

"ہاں تو اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔" سرمد نے فرنچ فرائز اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی معصومیت اسے بہت بھاتی تھی۔

"نہ کمرشل' نہ ڈرامہ' بلکہ ڈائریکٹ فلم۔۔۔" شانزے کا خوشی سے برا حال تھا۔ "مجھے یقین نہیں آرہا۔۔۔"

"ٹرسٹ می شانزے۔۔۔" سرمد نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ "میرا بہت اچھا دوست بنا رہا ہے' میں نے تمہارا شوٹ دکھایا تھا اسے' بہت امپریس ہوا۔" سرمد اسے مزے سے بتا رہا تھا۔

"پھر آپ کب ملوا رہے ہیں مجھے اس سے۔۔۔" شانزے کا بس نہیں چل رہا تھا کہ سارے معاملات ایک منٹ میں طے ہو جائیں۔

"بس کچھ دن اور۔۔۔" سرمد نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے تسلی دی۔

"اب تو زخموں کے نشان بالکل مدھم ہو گئے ہیں۔" شانزے فوراً ہی سمجھی تھی کہ وہ اسے کیوں اتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔

"میں چاہتا ہوں' جب تم اس سے پہلی دفعہ ملو تو بالکل پرفیکٹ انداز سے ملو۔" سرمد نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس لیے ہمیں کچھ دن اور انتظار کر لینا چاہیے۔"

"وہ کوئی اور لڑکی فائنل نہ کر لے۔۔۔" شانزے کے خوف زدہ انداز پر وہ مسکرایا۔

"ڈونٹ ووری' اس چیز کی گارنٹی تمہیں میں دیتا ہوں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔" سرمد اس کے بے شمار اندیشوں سے واقف تھا۔

"ابھی ہم لوگ پیپر ورک مکمل کر رہے ہیں اور کاسٹنگ' شوٹنگ میں بہت ٹائم ہے ابھی۔" سرمد کی بات پر شانزے کو کچھ تسلی ہوئی ورنہ کچھ ہو نہ جائے کا احساس اب اس کے دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ چکا تھا۔

"رباب! دعا کرو یہ فلم بن جائے کسی نہ کسی طرح۔۔۔" ہوسٹل پہنچتے ہی وہ رباب کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھ گئی' رباب جو قرآن پاک کی تلاوت کرنے میں مصروف تھی اس نے مسکراتے ہوئے قرآن بند کیا کیونکہ یہ تو طے تھا کہ شانزے کی موجودگی میں تلاوت ممکن نہیں' اسے وقفے وقفے سے بے تحاشا بولنے کی عادت تھی اور اس کے لیے اسے رباب کو سوتے میں بھی جگانا پڑتا تو وہ بالکل نہیں ہچکچاتی تھی۔

"میں بس یہ دعا کروں گی کہ وہ ہو جائے جو تمہارے حق میں بہتر ہے۔" رباب کی بات پر شانزے بد مزا ہوئی۔

"تم یہ کیوں نہیں دعا کرتی ہو کہ اللہ میرے دل کی خواہش کو میرے حق میں بہتر کر دے۔۔۔" شانزے نے فوراً" اعتراض اٹھایا۔

"میں اللہ کو مشورے نہیں دیتی' جو اس کی رضا ہو' اسی میں راضی رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔" رباب کے اپنے اصول تھے۔

"ویسے ہم لوگ بہت ہی عجیب قسم کے لوگ ہیں' ہمیشہ اللہ سے ڈر اور خوف والا رشتہ ہی قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمارا رب ہے' ہم اس کے بندے ہیں' ہم اس سے نہیں مانگیں گے تو اور کس کے پاس جائیں گے اور بندہ ہمیشہ اپنوں ہی سے مانگتا ہے اور اپنوں سے ڈر کر نہیں بڑے مان سے اور دھڑلے سے مانگا جاتا ہے۔۔۔" شانزے کی باتیں رباب کو حیران کر گئیں۔

"واہ! تمہارے نظریات تو بڑے کلیئر ہیں۔۔۔" رباب نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہمارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے رباب۔۔۔" وہ اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "ہمیں مذہبی معاملات میں اپنے سے زیادہ نیک' پارسا اور متقی کوئی بھی نظر نہیں آتا' ہم کولہو کے بیل کی طرح اپنی ہی ذات کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ ہم دوسروں کو شک اور بدگمانی کی عینک سے دیکھتے ہیں اور اکثر ہمیں دوسروں کا عکس دھندلا ہی نظر آتا ہے۔" شانزے کی

بات پر رباب کو دھچکا سا لگا' وہ سو فیصد درست کہہ رہی تھی۔

"میں غلط کہہ رہی ہوں کیا۔۔۔؟" شانزے نے نرمی سے اس کا شرمندگی سے دھواں دھواں چہرہ دیکھا' رباب نے جلدی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم نے کبھی غور کیا ہے' ہم مسلمانوں کو ہمیشہ اپنا عقیدہ' اپنا نماز پڑھنے کا طریقہ اور اپنے مذہبی معاملات ہی درست نظر آتے ہیں' دوسروں کی مسلمانی تو اکثر مشکوک ہی لگتی ہے۔۔۔" شانزے پر کبھی کبھی فلسفہ جھاڑنے کا دورہ پڑتا تھا اور آج اتفاق سے وہی دن تھا۔

"تم تو آج مجھے حیران کر رہی ہو۔۔۔" رباب نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم حیران ہونا چھوڑو اور بس میرے لیے دعا کرو۔" شانزے نے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"تم خود کرو ناں اپنے لیے' تمہارا اللہ کے ساتھ کوئی جھگڑا ہے کیا؟" رباب نے بھی اسے ہری جھنڈی دکھائی تو وہ مسکرا دی' اسے معلوم تھا ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسے پیارے لوگ ضرور ہوتے ہیں جن کو دعاؤں کے لیے کہنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی' وہ جب ہاتھ اٹھاتے ہیں آپ کا نام بن کہے ہی ان کی دعاؤں میں شامل ہوتا ہے اور رباب کا شمار بھی ایسے ہی مخلص لوگوں میں ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبت انسان کو اس قدر بھی خوار کر سکتی ہے' اس کا اندازہ بختاور کو پچھلے دس دن میں بہت اچھی طرح ہو چکا تھا۔ اس نے کہاں کہاں نہیں ہاشم رضا کو تلاش کیا تھا۔ یونیورسٹی کی کتنی سڑکوں کی خاک چھانی تھی اور کس کس سے نہیں پوچھا تھا۔ اس نے اور نیلم نے بوائز ہوسٹل کے کئی بے معنی سے چکر لگا لیے' وہ شام کو واک کے لیے نکلتیں اور ان کے قدم خود بخود ابوبکر ہال کی طرف اٹھ جاتے۔ اب تو نیلم کو اس طرف جاتے ہوئے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔

"پلیز بختاور! بس کرو اب۔۔۔" نیلم نے جھنجلا کر بختاور کی شکل پر پھیلی بے چارگی دیکھی اور ساتھ ہی وہ ڈھیلی پڑ گئی۔

"تمہیں پتا تو ہے' وہ سینٹرل لائبریری والی کنٹین پر اکثر شام کو چائے پینے آتا ہے۔۔۔" بختاور نے خفت زدہ انداز میں اپنی انگلیاں موڑیں۔

"پھر۔۔۔" نیلم اس کی بات کا پس منظر تو جان چکی تھی' لیکن اتنے خراب موسم میں باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"بس کینٹین سے ہو کر آجائیں گے' دوسری سائیڈ نہیں نکلیں گے۔" بختاور کے انداز میں کچھ تھا جو نیلم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ دونوں کے درمیان میں چپکے سے خاموشی در آئی۔ کوریڈور سے جیسے ہی وہ دونوں باہر نکلیں تو سامنے آسمان کالے بادلوں سے اٹا ہوا تھا۔ دور کہیں بجلی بھی گڑگڑائی۔

"موسم کے تیور دیکھے ہیں تم نے۔۔۔" نیلم نے ہوسٹل کے گیٹ پر رکھے رجسٹر پر اپنا اور اس کا نام لکھتے ہوئے ایک دفعہ پھر اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔۔۔" بختاور نے بھی آج نہ ماننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"میں بھاگ کر اندر سے چھاتا نہ لے آؤں۔" نیلم نے موسم کی شدت کو بھانپتے ہوئے بختاور کا بے چین چہرہ دیکھا جو ایک منٹ بھی وہاں رکنے کی روادار نہیں تھی۔

"تم کوئی مٹی کی بنی ہوئی نہیں ہو' جو دو چار بوندوں سے پگھل جاؤ گی۔۔۔" بختاور کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا' اس نے نیلم کا بازو زبردستی پکڑا اور باہر کی طرف چل پڑی۔ ہوسٹل کے زندہ دل لڑکے اور لڑکیاں موسم انجوائے کرنے کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے۔ موسم غضب کا تھا اور ہوا اپنے دامن میں نم آلود جھونکوں کو لیے ان کے ساتھ ہی محو رقص تھی۔ یخ ٹھنڈی ہوا جب جسم سے ٹکراتی تو ایک کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ ان کے آگے فارمیسی کے کچھ شرارتی لڑکوں کا ٹولہ چل رہا تھا۔ وہ سب آپس میں اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

"آئے موسم رنگیلے سہانے' جیا نہیں مانے۔۔۔" وہ

سب ایک دم ہی بلند آواز میں گنگنانا شروع ہو گئے۔

"نیلم! تھوڑا ٹھہر جاؤ' ان کو آگے جانے دو۔۔۔" بختاور نے خوف زدہ انداز سے نیلم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ دونوں ایک شیڈ کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ موسلا دھار بارش ایک دم ہی شروع ہو گئی تھی۔ لڑکوں کا ٹولہ کافی آگے جا چکا تھا۔

"میں نے کہا تھا ناں' آج ہوسٹل سے مت نکلو۔" بارش کے ساتھ ساتھ نیلم کو بھی برسنے کا موقع مل گیا۔ ٹھنڈی یخ ہوا کا رخ ان کی جانب ہو گیا تھا اور بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے وہ دونوں پریشانی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت یونیورسٹی کی بس اس اسٹاپ پر رکی' اور اس کے اندر سے چند اسٹوڈنٹس اترے۔۔۔

"یہ ہاشم ہے ناں۔۔۔" نیلم کی اطلاع پر بختاور کا دل عجیب انداز سے دھڑکا' اس نے بے چین نگاہوں سے اس طرف دیکھا جہاں چند لڑکے بارش سے بچنے کے لیے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے تھے۔

"کہاں ہے ہاشم۔۔۔؟" بختاور کو مسلسل اور تواتر سے برستی ہوئی بارش میں کچھ فاصلے پر کھڑے لڑکوں کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے' کچھ ایک دم ملنے والی خوشی کی وجہ سے وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"بے وقوف لڑکی' وہ سامنے دیکھو' بلیک کلر کی چھتری اٹھائے' جیمز بانڈ کی طرح چلا آرہا ہے۔" بختاور نے بے ربط ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے سامنے کی طرف دیکھا اور اس دفعہ وہ اسے نظر آہی گیا تھا' پورے بیس دن سولہ گھنٹوں اور تیس منٹ کے بعد جو چہرہ اسے نظر آیا تھا' اسے دیکھتے ہی بختاور کو اپنی زندگی میں ساری رنگینی' خوشی اور دلکشی دکھائی دینے لگی تھی' لیکن اس کے ساتھ ہی اسے پچھلے دنوں کی ساری کوفت' پریشانی اور جھنجلاہٹ یاد آگئی اور عین موقعے پر یہ بھی یاد آگیا کہ وہ اس سے خفا تھی۔ اس لیے قدرے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہائے ینگ گرلز۔۔۔!" وہ اپنی قاتل مسکراہٹ کے ساتھ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ تیز بارش میں اس کے بال بھیگے ہوئے اور شرٹ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ہاتھ میں چھاتا ہونے کے باوجود وہ باقاعدہ بھیگ چکا تھا۔

"آپ کہاں ابن بطوطہ کی طرح جنگلوں کی خاک چھاننے نکل گئے تھے؟" نیلم نے اسے دیکھ کر شوخی سے پوچھا۔

"بس جناب نگری نگری پھرا مسافر' گھر کا رستہ بھول گیا تھا۔۔۔" وہ ہنستے ہوئے بولا اور ہاتھ کے اشارے سے نیلم سے دریافت کیا کہ بختاور کو کیا ہوا۔ نیلم نے غبارے کی طرح منہ پھلا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ اس سے خفا ہے۔

"ہیلو ناراض لوگو۔۔۔" وہ بختاور کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولا۔

"بات مت کریں آپ مجھ سے۔۔۔" وہ ناراض سے انداز سے سامنے خالی سڑک پر چل پڑی۔ بارش اس کی ہم سفر تھی۔

"اس کا مطلب ہے' معاملہ زیادہ خراب ہے۔۔۔" ہاشم کو تشویش لاحق ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں ملبوس وہ ناراض سی لڑکی اس کے دل کا چین تو بہت عرصہ پہلے چرا چکی تھی' لیکن آج اس کی ناراضی تو اس کی جان نکالے جا رہی تھی۔

"آپ یہ چھتری پکڑائیں مجھے اور اس ناراض ہیروئن کو منا کر مغرب سے پہلے ہوسٹل بھجوا دیجیے گا۔" نیلم کی بات پر وہ دوستانہ انداز سے مسکرایا۔ بارش کی شدت میں کمی تو ہو گئی تھی' لیکن ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ نیلم چھتری پکڑ کر ہوسٹل کی جانب دوڑ لگا چکی تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو۔۔۔؟" ہاشم نے شرارت بھرے انداز میں اس کا بازو پکڑا جو نیلم کے پیچھے چل پڑی تھی۔ بختاور کو کرنٹ سا لگا۔ اسی لمحے بارش کی بوندوں میں تیزی آئی' ہاشم نے اس کا چہرہ دیکھا جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو بختاور۔۔۔؟" وہ حقیقتاً پریشان ہوا۔

"میں رو نہیں رہی' یہ بارش کا پانی ہے۔۔۔" بختاور کا

لہجہ بھی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"میں پاگل ہوں کیا جو بارش کے اور آنسوؤں کے پانی میں تمیز نہیں کر سکتا۔" وہ پریشان سے انداز سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا' وہ مکمل بھیگ چکی تھی اور اس خالی سڑک پر ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"میرے ساتھ ڈپارٹمنٹ چلو۔۔۔" وہ دوستانہ انداز میں اس کا بازو پکڑ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے اسے کچھ خیال آیا' اس نے اپنی لیدر کی جیکٹ اتار کر بختاور کے کندھوں پر پھیلادی۔ بختاور کو اس کے پرفیوم کی جانی پہچانی سی خوشبو نے بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ دونوں ڈیپارٹمنٹ کے آگے بنے شیڈ کے نیچے آن کر کھڑے ہوئے۔ ہاشم اب غور سے اس کی آنکھوں میں پھیلی آنسوؤں کی لالی کو دیکھ رہا تھا۔ اسے وہ دنیا کی سب سے معصوم لڑکی لگی' جو خفا ہو کر ساری دنیا سے لاتعلق ہو گئی ہو۔

"مجھ سے ناراض ہو ناں۔۔۔" اس کی گہری نظریں بختاور کی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا کر رہی تھیں۔

"جب پتا ہے' تو کیوں بار بار پوچھ رہے ہیں۔۔۔" اس کے لہجے سے چھلکتی ناراضی کو محسوس کر کے وہ مسکرایا۔

"ٹرسٹ می' ایک عجیب و غریب مسئلے میں پھنس گیا تھا۔۔۔" اس نے صفائی دینے کی کوشش کی۔

"انسان ایک کال کر کے تو بتا سکتا ہے ناں۔۔۔" بختاور آج اسے کسی طور پر بھی بخشنے کو تیار نہیں تھی۔

"اتنے اچھے موسم میں روٹھنا نہیں اچھا۔۔۔" وہ ہلکا سا اس کے کانوں کے پاس آکر گنگنایا۔ بختاور ایک لمحے کو سرخ ہوئی۔

"مجھ سے شادی کرو گی۔۔۔؟" وہ تسلسل سے برستی بوندوں پر نظریں جمائے بڑے لاپروا انداز سے کہتا ہوا بختاور کے دل کی دنیا میں ہلچل مچا گیا۔

"کیا۔۔۔؟" بختاور کو اپنی سماعتوں پر شک ہوا۔

"اے دنیا کی معصوم ترین لڑکی! ایک لاپروا' سست' کاہل' بے روزگار اور نکمے انسان سے شادی کرو گی۔۔۔" وہ تھوڑا سا شوخ ہوا۔

"یہ پرپوز کر رہے ہیں یا ڈرا رہے ہیں مجھے۔۔۔" بختاور بے ساختہ انداز میں ہنسی۔

"بتاؤ ناں۔۔۔؟" وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔" بختاور بوکھلا کر اپنے ہوسٹل کی جانب چل پڑی' یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح اچانک آکر اسے پرپوز کر دے گا۔ بارش بھی اس کا اقرار سننے کو تھوڑا مدھم ہوئی۔ وہ مریم ہال کی جانب جانے والی سڑک کی طرف گامزن تھی۔ وہ ایک دم ہی پیچھے سے آکر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"بختاور۔۔۔" بوندوں کی جلترنگ میں اس کا لہجہ بختاور کو اپنے کانوں میں رس گھولتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔

اس سے پہلے کہ یہ ساون کی جھڑی تھم جائے
جتنے اقرار کے لفظ ہیں' کہہ دو مجھ سے۔۔۔
بھیگتے پیڑ ہیں' میں ہوں' تم ہو۔۔۔
اس برستے ہوئے بادل کی طرح۔۔۔
لفظ اگر مڑ کر بھی نہ آئے تو کیا ہوا۔۔۔؟
بھیگتے پیڑ کے جا کر گواہی دیں گے۔۔۔؟

وہ امجد اسلام امجد کی نظم اپنے خوب صورت لب و لہجے میں سنا کر اس کے اختیار کے سارے موسم اپنی دسترس میں کر چکا تھا۔ ساون کی جھڑی رک چکی تھی' آکاش دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو گیا تھا بالکل اسی طرح بختاور کے دل کی وادی میں ایک دلکش سا موسم آکر ٹھہر گیا تھا۔

"میں نے پچھلے دنوں ایک بات بہت سنجیدگی سے سوچی بختاور۔۔۔" وہ دونوں مریم ہال کے گیٹ کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ بختاور نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جس کے بالوں میں بارش کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"میں نے سوچا' بیس دنوں میں جو لڑکی بیس ہزار دفعہ یاد آئے تو اسے اگلے بیس دنوں میں اپنی دلہن بنا کر گھر لے آنا چاہیے۔" ہاشم کے سنجیدہ انداز پر بختاور کا دل دھڑکا اور پلکوں پر ستاروں کی دھنک مسکانے لگی۔

"ٹھیک سوچا ناں۔۔۔" وہ اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر شرارت بھرے انداز سے گویا ہوا۔

"مجھے نہیں پتا۔۔۔" وہ انجان بن گئی۔

"لیکن مجھے پتا ہے' جب کوئی لڑکی آپ کی آنکھوں میں دیکھے بغیر آہستگی سے کہے' مجھے نہیں پتا' تو یقین مانو' اسے سب پتا ہوتا ہے۔"

"اور جب کوئی لڑکا' بارش کے پانی اور آنسوؤں کے پانی کا فرق جان لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ یہ لڑکی اسی کے لیے رو رہی ہے تو میرے خیال میں اس کا پرپوزل مان لینا چاہیے۔۔۔"

بختاور کا اعتماد بحال ہو چکا تھا اور وہ اب ہاشم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے حیران کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
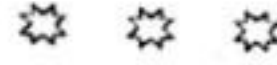
"تم نے بہت اچھا کیا جو قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔" اس دن نانو سرسوں کے تیل کا پیالہ اٹھائے عدینہ کے کمرے میں چلی آئیں اور اسے زمین پر بیٹھا کر خود پلنگ پر بیٹھ کر اس کے سر کا مساج کرنے لگیں۔

"نانو! آپ پہلی خاتون ہیں جو ایسا کہہ رہی ہیں۔" عدینہ کی ان کے ساتھ خوب بے تکلفی ہو چکی تھی۔

"وہ کیوں بھلا۔۔۔؟" اس کے سر کا مساج کرتے نانو کے چلتے ہاتھ حیرت سے رکے۔

"سب کو لگتا تھا' میں نے میڈیکل چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔" عدینہ نے منہ بناتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"خیر' ایسی بڑی غلطی بھی نہیں اور ویسے بھی اللہ کا کلام سینے میں محفوظ کرنا بھی تو آسان کام نہیں۔ اللہ ہر کسی کو تھوڑی یہ سعادت دیتا ہے۔" نانو نے محبت بھرے انداز سے دوبارہ اس کے سر پر مساج شروع کر دیا۔ عدینہ کو طمانیت کا احساس ہوا۔ ذہن پر ہلکا ہلکا سا سرور طاری ہونے لگا۔

"یہ صالحہ تم سے خفا ہے کیا۔۔۔؟" نانو کی بات پر عدینہ کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ ساری نیند اور نشہ ہرن ہو گیا۔

"آپ سے کس نے کہا۔۔۔؟" عدینہ حیران کم اور پریشان زیادہ ہوئی' کیونکہ اپنی طرف سے وہ اور صالحہ مہمانوں کے سامنے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی تھیں' لیکن کہیں نہ کہیں بھول چوک پھر بھی ہو ہی گئی تھی۔

"مجھے کس نے کہنا تھا۔" نانو نے سادگی سے کہا۔ "مجھے خود ایسا لگا کہ تم دونوں میں ماں بیٹی والی روایتی بات ہی نہیں۔۔۔"

"کیا مطلب نانو۔۔۔؟" عدینہ الجھ سی گئی۔

"بھئی' نہ تم اس سے بیٹیوں کی طرح ناز نخرے اٹھواتی ہو' نہ وہ تمہارے ساتھ کوئی ایسا لاڈ کرتی ہے' اب تو یہ بھی شک نہیں رہا کہ تم اس کی سگی بیٹی نہیں ہو۔" نانو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی صاف گو تھیں۔

"اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں' انہوں نے خود ہی مجھے ہمیشہ سے ایک فاصلے پر رکھا ہے۔" عدینہ نے اپنی صفائی دی۔

"میں پوچھوں گی اس سے بھی۔۔۔" نانو نے اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اپنے ارادے سے باخبر کیا' عدینہ پریشان ہو گئی۔

"نانو پلیز' ایسا مت کیجیے گا' وہ سمجھیں گی' شاید میں نے شکایت کی ہے۔"

"لو میں کوئی بچی ہوں یا میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے' جو مجھے چیزیں ڈھنگ سے نظر نہیں آتیں۔" نانو برا مان گئیں۔

"میں نے ایسے تو نہیں کہا' لیکن پلیز' آپ میرا نام لے کر بات مت کیجیے گا۔" عدینہ نے التجائیہ لہجے میں ان سے درخواست کی۔

"ہاں ہاں۔ پتا ہے مجھے' میں کوئی بے وقوف تھوڑی ہوں' اچھی طرح پتا ہے' کون سی بات کیسے کرنی ہے۔" نانو نے لاپروا انداز سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی' یہ الگ بات کہ عدینہ کو یقین نہیں آیا' کیونکہ اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ نانو کو بھی آپا صالحہ کی طرح بغیر کسی لگی لپٹی کے بات کرنے کی عادت ہے اور وہ بھی ان ہی کی طرح خطرناک حد تک صاف گو واقع ہوئی ہیں۔

"اپنی نانو کے سامنے عبداللہ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس دن وہ کچن میں مونا کے ساتھ بیٹھی سلاد بنا رہی تھی' جب آپا صالحہ کسی کام سے اندر داخل ہوئیں' فریج کا دروازہ کھول کر پانی کی بوتل نکالتے ہوئے انتہائی عام لہجے میں کہا کہ اگر اس میں عبداللہ کا نام نہ ہوتا تو شاید مونا اور عدینہ دونوں کو ہی پتا نہ چلتا کہ انہوں نے کسے مخاطب کر کے بات کی ہے۔

"بھلا یہ کوئی بات ہے' کہنے والی۔" آپا صالحہ کے کچن سے نکلتے ہی عدینہ نے شکایتی نگاہوں سے مونا کو دیکھا جو خود بھی آپا کی اس بات پر گڑبڑا سی گئی تھی' کیونکہ اسے بھی آپا سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"پتا نہیں ان کے ذہن میں کیا بات ہو' اس لیے آپ اپنا دل خراب مت کریں۔" مونا کے پاس اس کے لیے دلاسوں کی کبھی کمی نہیں تھی۔

"میرے لیے ہمیشہ وہ غلط ہی سوچتی ہیں۔" عدینہ ہاتھ میں پکڑا کھیرا غصے سے پلیٹ میں رکھ کر کچن سے باہر نکل گئی۔ عدینہ نے تاسف بھرے انداز سے اس کی طرف دیکھا' دل ہی دل میں اسے بھی آپا صالحہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی' لیکن عدینہ کے سامنے ایسا کہنا اس کی ناراضی کو مزید بھڑکانے کے مترادف تھا۔ اس لیے خاموش ہی رہی۔

عدینہ جیسے ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھی' آپا صالحہ کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹک گئی' دروازے کے آگے پردہ تھا اور آپا صالحہ کمرے میں موجود اپنی ساس سے مخاطب تھیں۔

"اماں نے عدینہ کے لیے بہت اچھا رشتہ بتایا ہے...."

آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کو باہر کھڑے شاک لگا' اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے کیوں نانو کے سامنے عبداللہ کا ذکر کرنے سے منع کیا ہے۔

"لیکن ابھی تو وہ قرآن پاک حفظ کر رہی ہے۔" بے بے نے فوراً" ہی انہیں یاد دلایا۔

"ہاں سوچ رہی ہوں جیسے ہی اس کی ختم قرآن کی تقریب ہو' اگلے ہی ہفتے اسے رخصت کر دوں۔" آپا صالحہ اس کے لیے دل میں کئی پلان بنائے بیٹھی تھیں۔

عدینہ کا باہر کھڑے دل خراب ہوا' وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپا اتنی جلدی اس کی شادی کے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیں گی۔

"میں نے عدینہ کو بھی منع کیا ہے اور آپ بھی ان کے سامنے عبداللہ کا ذکر مت کریں۔" آپا صالحہ سنجیدہ انداز سے اپنی ساس کو سمجھا رہی تھیں۔

"بتا دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" بے بے نے ہلکا سا اعتراض کیا۔

"کیا ضرورت ہے بے بے! منگنی کی کون سا کوئی شرعی حیثیت ہوتی ہے اور میں تو راضی ہی نہیں تھی' اللہ بخشے عدینہ کے ابا کا فیصلہ تھا یہ۔" آپا صالحہ منہ بناتے ہوئے بول رہی تھیں۔ "ویسے بھی وہ کون سا زندہ ہے جو ہم خوامخواہ میں اس بات کی وضاحتیں دیتے پھریں۔" آپا صالحہ کی اپنی منطقیں تھیں۔

"لیکن عدینہ ابھی اسے بھولی نہیں ہے۔" بے بے نے محتاط انداز سے انہیں خبردار کیا۔

"ایسی محبتیں ریت پر بنائے ہوئے نقش کی طرح زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں۔" آپا صالحہ خاصی خوش گمان تھیں۔ "عدینہ بھی دو چار مہینوں میں بھول بھال جائے گی' آپ نے دیکھا نہیں اس کا دھیان خاصا بٹ گیا ہے۔"

عدینہ کا دل ایک دم ہی خراب ہوا' وہ زبردستی پاؤں گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی' کچھ سوچ کر اس نے اپنی ڈائری نکالی' اس کے کور میں عبداللہ کی ایک پاسپورٹ سائز تصویر تھی جو اس کے کمرے کی صفائی کے دوران مونا کے ہاتھ لگی تھی۔ وہ بوجھل دل اور نم آنکھوں کے ساتھ اس کی تصویر کو دیکھنے لگی اور پھر نہ جانے اس کے ذہن میں کیا آیا' اس نے قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔

"پہلی محبت' پہلی چاہت اور پہلی پسندیدگی کے رنگ کبھی مدھم نہیں پڑتے۔ خاص طور پر عورت' اس مرد کو کبھی نہیں بھولتی جس نے پہلی دفعہ اس کے دل کی دنیا کو فتح کر کے اپنے نام کا جھنڈا لگایا ہو۔ اگر وہ محبت تقدیر کی ستم ظریفی سے کہیں ہاتھ چھڑا کر دنیا کے

میلے میں گم ہو جائے تو اس چاہت کے نام کا دیا' ہمیشہ دل کے کسی کونے میں جلتا ہی رہتا ہے۔ وہاں منعقد ہونے والی شام غریباں کے چراغوں کو جلانے کے لیے کسی خاص تیل کی ضرورت نہیں ہوتی' کوئی شناسا لہجہ' مانوس سی خوشبو' دل چراتا لمحہ ذہن کے دریچوں پر روشن ہو جائے تو سارے ہی ان کے دکھ جاگ اٹھتے ہیں۔"

اس نے لکھتے لکھتے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں' بہت سے رکے ہوئے آنسو' اس کے گالوں سے پھسلتے ہوئے ہونٹوں پر آ کر ٹھہر گئے۔ اسے آج رات پھر عبداللہ کا سوگ منانا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! میں سخت خفا ہوں ماہیر سے۔" آج کافی دن کے بعد اوریدا کی اپنے باپ سے بات ہوئی تھی اور جب سے تیمور کو اس کے ایف ایس سی میں ایڈمیشن کا پتا چلا تھا وہ آج کل اوریدا کو خاصی رعایت دے دیتے تھے۔

"بیٹا! آپ کو پتا تو ہے اس نے جگہ جگہ پاؤں پھنسا رکھے ہیں۔" تیمور نے ماہیر کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔ ماہیر' اوریدا سے چار پانچ سال بڑا تھا لیکن اوریدا ہمیشہ اس کا نام لے کر ہی بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔

"جب سے میں پاکستان آئی ہوں' وہ بھول کر ایک مہینے میں مشکل سے دو دفعہ کال کرتا ہے۔" اوریدا نے آج ماہیر کے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول رکھا تھا۔

"میں کان کھینچوں گا اس کے' آپ پریشان مت ہوں۔" تیمور نے محبت بھرے انداز سے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں نے سنا ہے بڑے ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" تیمور تھوڑا سا جھجک کر بولے۔

"اچھا.....؟" اوریدا حیران ہوئی۔ "آپ کو کس نے بتایا.....؟"

"تمہاری طیبہ پھپھو سے بات ہوئی تھی کل' وہ ذکر کر رہی تھیں۔" تیمور کی بات پر اوریدا خوشگوار حیرت کا شکار ہوئی۔

"پاپا! آپ کی طیبہ آنٹی سے بات ہوتی ہے کیا....؟" وہ بڑے ابا کی بیماری کو اہمیت دیے بغیر حیرانی سے ان سے پوچھ رہی تھی۔

"میری بہن ہیں وہ۔" تیمور لاپروائی سے گویا ہوئے۔ "اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے' میں کبھی بھی اس سے بات کر سکتا ہوں' مجھ پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔"

"اچھا بڑے ابا سے بات کرنے پر تو پابندی ہے نا۔" اوریدا اپنے مخصوص لاابالی انداز میں ایک دفعہ پھر تیمور کو ستا گئی۔

"ہرگز نہیں اور اس قسم کی فضول باتیں آپ کے ذہن میں آتی کہاں سے ہیں؟" تیمور کے لہجے سے چھلکتی ناراضگی کو محسوس کر کے اوریدا گھبرا سی گئی۔

"ویسے ہی پاپا' آپ ان سے بات جو نہیں کرتے۔" اس نے بوکھلا کر وضاحت دی جو اس کے ہی گلے پڑ گئی۔

"بہت ہی افسوس کی بات ہے اوریدا' میں تو ان سے سات سمندر پار دور ہوں اور وہ آپ کے سگے دادا ہیں' آپ کو ایک گھر میں رہ کر نہیں پتا کہ وہ بیمار ہیں۔" تیمور کی بات پر وہ ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہوئی۔

"ایکچوئلی پاپا' وہ زیادہ تر اپنی اسٹڈی یا اپنے بیڈ روم میں ہوتے ہیں' اس لیے مجھے پتا نہیں چلا۔"

"ان کی اسٹڈی اور ان کا بیڈ روم کوئی امریکہ میں تو نہیں ہیں' جہاں جانے کے لیے ویزا لینا پڑے۔" تیمور کی بات پر اوریدا کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"آئی ایم سوری پاپا۔" اوریدا نے عافیت اسی میں سمجھی کہ فوراً" معذرت کر لے' ورنہ دوسری صورت میں ایک لمبا لیکچر تو ضرور سننا پڑتا۔ جو ابھی بھی اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔

"میں نے آپ کو اس لیے یہاں بھیجا تھا کہ آپ بڑے ابا کا دل جیتیں' شاید اسی طرح وہ اپنا ظرف بڑا کر

کے میری بہت سی کوتاہیوں کو در گزر کرلیں۔"

تیمور کی بات پر وہ حیران ہوئی کیونکہ وہ تو آج تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ باہر کے کھلے ماحول کی وجہ سے اسے پاکستان بھجوایا گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی کال کٹ چکی تھی۔ اورید اکا دل خفا سا ہوا۔ وہ کچھ سوچ کر کچن میں چلی آئی اور فریج سے چکن نکال کر بڑے ابا کے لیے سوپ بنانے لگی۔ اسی دوران بڑی اماں جو کسی کام سے کچن میں داخل ہوئی تھیں اسے دیکھ کر چونکیں۔

"آج سورج کہاں سے نکل آیا جو تم برتنوں اور چولہے میں سر دیے کھڑی ہو۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔

"بڑے ابا کو کیا ہوا ہے ...؟" وہ ان کے طنز کو بمشکل پیتے ہوئے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے میں کامیاب ہو گئی۔

"بازوؤں میں مسلز پین ہوا ہے' آج کل مکمل بیڈ ریسٹ کر رہے ہیں ..." بڑی اماں اب دیگچیوں کے ڈھکن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ "یہ تم کیا بنا رہی ہو ؟"

"بڑے ابا کے لیے چکن سوپ ..." وہ ہلکا سا جھجک کر بولی تو بڑی اماں کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

"یقیناً" تیمور نے ہی کہا ہو گا تمہیں کہ جا کر بڑے ابا کی خدمت کرو ..."

"آپ کو کیسے پتا چلا ..." اورید ا ان کے بالکل درست اندازے پر ہکا بکا سی رہ گئی۔

"اس لیے کہ ایسی عقل والی باتیں تمہارے اپنے ذہن میں خود سے نہیں آتیں۔" بڑی اماں کا لہجہ سادہ تھا لیکن اورید اسلگ کر رہ گئی۔

"اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں ..." اس نے غصے سے چولہے کی آنچ تیز کی۔

"اچھا اچھا زیادہ منہ بنانے کی ضرورت نہیں' چولہا تھوڑا ہلکا رکھو ..." بڑی اماں نے تنقیدی نگاہوں سے سوپ کا جائزہ لیا۔

"بوا رحمت یا صغریٰ کو چیک کروا لینا سوپ' ایسا نہ ہو کہ ایک دفعہ پھر جھاڑ پڑ جائے تمہیں۔" بڑی اماں جاتے جاتے بھی اس کا دل جلا گئی تھیں۔ وہ تو خیریت رہی کہ ان کے کچن سے نکلتے ہی بوا رحمت آ گئیں' باقی سارا کام انہوں نے سنبھال لیا۔

"یہ لو بیٹا' جا کر دے آؤ اپنے بڑے ابا کو ..." بوا رحمت کی بات پر وہ بوکھلا سی گئی۔

"میں ...؟" اس نے انگلی سے اپنی جانب اشارہ کیا۔

"ظاہر ہے بیٹا' اس کچن میں آپ کے علاوہ یہ دیواریں ہی ہیں جو اب میں انہیں تو کہنے سے رہی۔"

بوا رحمت بڑی اماں کے ساتھ رہتے ہوئے انہی کا لہجہ اور انداز اپنا چکی تھیں۔ اورید اکی مجبوری تھی کہ وہ کسی کے ساتھ بھی بد تمیزی نہیں کر سکتی تھی' خصوصاً" بوا رحمت کے بارے میں بڑی اماں کے بڑے سخت احکام تھے۔ وہ بادل نخواستہ ٹرے اٹھا کر باہر نکل آئی۔ اس کا ذرا بھی دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ بڑے ابا کا سامنا کرے' کیونکہ ان کے مزاج کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور اورید ا سے تو وہ ویسے ہی خار کھاتے تھے۔ بڑے محتاط سے انداز سے اس نے دروازہ ہلکا سا ناک کیا۔

"یس کم ان ..." بڑے ابا کی بڑی بارعب سی آواز اورید اکی سماعتوں سے ٹکرائی اور اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ پاؤں زمین پر جم گئے اور ایک قدم اٹھانا بھی دشوار ہو گیا۔

"کون ہے دروازے پر ..." اس دفعہ ان کی آواز میں ہلکی سی برہمی شامل ہوئی۔ اورید اکو کرنٹ سا لگا اس نے ہلکا سا دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہوئی۔

"یہ کیا ہے ...؟" انہوں نے کڑے تیوروں سے اورید ا کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے دیکھی' جو لگتا تھا کسی بھی لمحے چھوٹ کر زمین پر آن گرے گی۔ کمرے کے کونے میں نماز پڑھتی بڑی اماں نے جلدی سے جائے نماز کو لپیٹا اور اس کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔

"بابا کے لیے سوپ ہے ..." اس کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"بابا ..." ڈاکٹر جلال کے دماغ میں آندھی سی چلی اور بہت سال پہلے کا ایک منظر ان کے دماغ میں روشن ہوا۔ وہ بھی تو اس رات اسی طرح ڈرتے ہوئے ان کے کمرے میں آئی تھی اور واپسی پر جاتے ہوئے خاندان کی ساری عزت بھی اپنے دامن میں لپیٹ کر لے گئی تھی۔ ان کا چہرہ دھواں دھواں ہوا' انہیں پہلی دفعہ اورید ا کے چہرے میں ایک اور چہرہ نظر آیا' وہ مضطرب سے ہو گئے۔

"اورید ا! تم جاؤ' میں خود انہیں ڈال کر دے دوں گی۔" بڑی اماں نے اس کی مشکل آسان کی۔ اورید ا فوراً" پلٹی۔

"اپنی پوتی سے کہو' مجھے دوبارہ بابا مت کہے ..." بڑے ابا کا لہجہ دھیما لیکن اس میں کرب کا ایک جہان آباد تھا۔ بڑی اماں نے چونک کر ان کا زرد ہوتا چہرہ دیکھا۔ اورید ا گھبرا کر فوراً" کمرے سے نکل گئی۔

وہ رات ڈاکٹر جلال صاحب پر خاصی بھاری تھی۔ ماضی کی ایسی کون سی تلخ یاد نہیں تھی جس نے ان کا دامن نہیں پکڑا تھا' دل وحشی کو کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک ایک رگ میں حشر برپا ہو۔

کیا ہوا جلال صاحب آدھی رات کو ایسے ٹہل کیوں رہے ہیں ؟" بڑی اماں کی ابھی ابھی آنکھ کھلی تو انہیں کمرے میں ٹہلتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"نیند نہیں آ رہی مجھے ..." انہوں نے بیزاری سے کہہ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ کمرے میں ایک دم ہی حبس کا احساس بڑھ گیا تھا۔

"مجھے لگتا ہے پھر کسی چیز کی ٹینشن لے رکھی ہے آپ نے ..." بڑی اماں بھی ان کے مزاج کے سبھی موسموں کی ساتھی تھیں۔

"کبھی کبھی مجھے لگتا ہے اللہ ہر انسان کو زندگی میں کسی نہ کسی چیز سے آزماتا ضرور ہے اور میرے لیے اس نے میری اولاد کو چنا ہے۔" ڈاکٹر جلال کی بات پر ان کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"یہ تو اوپر والے کے کام ہیں' اسی کی مصلحتیں ہیں' وہ ہی جانتا ہے۔" بڑی اماں کی آنکھوں سے بھی نیند اڑ گئی۔

"مجھے تو لگتا ہے میرا ہی کسی لمحے کا بولا ہوا بڑا بول میرے سامنے آیا ہے۔" وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائے۔

"کون سا بول ...؟" بڑی اماں نے تحیر کے عالم میں پوری آنکھیں کھول لیں۔

"جب حماد کی مسز کی ایک بیٹی کے بعد ڈیتھ ہو گئی تو میں نے پریشانی میں اپنے بھائی کے لیے یہ سوچا تھا کہ اس کی تو صرف ایک ہی بیٹی ہے' بڑھاپے میں کیا کرے گا یہ ؟ کون ہو گا اس کے پاس ؟" وہ افسردہ سے انداز سے اپنے دل کی بات بتا رہے تھے۔ "اس لمحے میں بار بار اللہ کا شکر ادا کرتا تھا کہ چلو میرے تو تین بچے ہیں نا' میرا بیٹا' میرے بڑھاپے کا سہارا ہو گا مگر ..." ان کا دل بھر آیا اور وہ چپ کر گئے۔

"کیوں ایسی باتیں سوچ رہے ہیں آپ ؟" بڑی اماں نے انہیں نرمی سے ٹوکا۔

"اب دیکھ لو' حماد کی ایک ہی بیٹی تھی' لیکن اس کے ساتھ ہے اور میں آج بالکل تنہا اور خالی ہاتھ ہوں۔" پتا نہیں کیوں وہ حد درجہ دل گرفتہ تھے۔

"تیمور تو کب سے آنا چاہتا ہے مگر ..." وہ ہلکا سا جھجک کر بولیں' لیکن اس سے پہلے ہی انہوں نے بات کاٹ کر سختی سے کہا۔

"اسے کہو' وہ جہاں ہے' وہیں رہے' مجھے اس کی ضرورت نہیں ..."

"کب تک منع کریں گے اسے' کبھی نہ کبھی تو وہ آئے گا ہی ناں ..." بڑی اماں برا منا گئیں۔

"جس دن میرا جنازہ اس گھر سے اٹھ جائے' اس دن بے شک آ جائے۔"

ان کے سرد لہجے پر بڑی اماں دہل کر رہ گئیں۔ انہوں نے ناراض نگاہوں سے اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا جو اس وقت بالکل ایک ضدی' ہٹ دھرم اور انا پرست شخص کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا' انا پرست لوگ ٹوٹ تو سکتے ہیں' لیکن کسی کے سامنے جھک نہیں سکتے اور جلال صاحب تو مر

کر بھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ماما! پلیز اب بس کریں ناں۔۔۔" ارصم میڈیسن ہاتھ میں پکڑے بینش کے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلے تین دن سے ان کی طبیعت سخت خراب تھی' وہ ارصم کے ساتھ ساتھ آغاجی سے بھی خفا ہو چکی تھیں' جو اس وقت ان کے کمرے کے کونے میں رکھی کرسی پر بیٹھے بڑی گہری نظروں سے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والے مذاکرات دیکھ رہے تھے۔ بینش ایک دفعہ مان کر پھر مکر چکی تھیں۔

"تم لاہور کیوں نہیں جانا چاہتے آخر" بینش کی سوئی ایک ہی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔ اب تو ارصم کا نام میرٹ کے لحاظ سے بہترین کالجز میں آ چکا تھا۔

"میں آپ کے اور آغاجی کے بغیر نہیں رہ سکتا ماما۔" اس نے نظریں چُرا کر دھیمے انداز میں انہیں دوبارہ یاد دلایا۔

"سچ سچ کہو یہی بات ہے یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ ہے؟" بینش نڈھال سے انداز سے اٹھ بیٹھیں۔

"ٹرسٹ می ماما' آپ کو پتا ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔" ارصم جھنجلا سا اٹھا۔

"بینش! تم اس کی بات پر یقین کیوں نہیں کر رہی ہو بیٹا۔ وہ کیوں تم سے غلط بیانی کرے گا۔" آغاجی نے بھی ارصم کی حمایت میں بیان جاری کیا۔ بینش ان کی بات پر تھوڑا سا بے چین ہوئیں۔

"اچھا خاصا تم پہلے مان گئی تھیں' اب بیٹھے بیٹھائے تمہیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔" آغاجی نے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیٹی کا پژمردہ چہرہ دیکھا۔ جو تین دن میں مرجھا سا گیا تھا' وہ صدیوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھیں' وہ ان کو کیا بتاتیں کہ انہیں تین دن پہلے ہی تو پتا چلا تھا کہ اوریدا نے پری میڈیکل میں ایڈمیشن لے لیا ہے' اس دن اسپتال میں بڑے ابا نے یونہی لاپروائی سے انہیں بتایا تھا۔

"بڑے ابا! وہ میڈیکل کا میرٹ بنا سکے گی بھلا۔۔۔؟"

بینش نے استہزائیہ انداز میں اپنے تایا کا چہرہ دیکھا۔

"بھئی امیر باپ کی بیٹی ہے' ایسے نالائقوں کے لیے جگہ جگہ پرائیوٹ میڈیکل کالج کھل تو گئے ہیں۔" بڑے ابا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اس کا کیا ہے' اس کا باپ کسی بھی اچھے ادارے میں سیلف فنانس پر ایک سیٹ خرید دے گا اسے' آخر کو دن رات انگلینڈ میں پاؤنڈز کما رہا ہے۔" وہ کسی مریض کی فائل پر جھکے ہوئے ان کا سارا سکون برباد کر گئے تھے۔

اس دن سے بینش نے اس بات کو ذہن پر سوار کر رکھا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کا بی پی ہائی اور کولیسٹرول بھی خاصا بڑھا ہوا تھا۔ وہ دو دن سے اسپتال بھی نہیں جا رہی تھیں۔ آغاجی کے ساتھ ساتھ ارصم بھی حیران تھا کہ وہ تین چار دن پہلے تو آرام سے مان گئی تھیں' لیکن اب بیٹھے بیٹھائے انہیں کیا ہو گیا۔

"ماما! آپ میری ایک بات مان لیں' بلیو می' میں آپ کی ہر بات مانوں گا۔۔۔" ارصم نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر التجائیہ انداز اپنایا۔ وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئیں۔ ارصم کی بات پر ان کے چہرے پر ایک پُراسرار سی مبہم مسکراہٹ ابھری۔

"سوچ لو ہم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔" انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا' ذہن کی بساط پر بہت سے مہرے تیزی سے اوپر نیچے کر کے انہوں نے ایک شاطر سا میدان سجا ہی لیا تھا۔

"آپ کہتی ہیں تو میں لکھ کر دے دیتا ہوں۔۔۔" ارصم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ انہیں اپنی زندگی کی ساری خوشیوں کا اختیار دے رہا ہے۔

"دیکھ لیں آغاجی۔ آپ گواہ رہیے گا۔۔۔" انہوں نے کمرے کے کونے میں بیٹھے آغاجی کو بھی اس کھیل میں شامل کیا۔ انہوں نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بیٹی کے ذہن کو پڑھا۔ وہ سوچ سکتے تھے کہ بینش اپنے مقصد کو پانے کے لیے کسی بھی آخری حد تک جا سکتی ہے۔

"ماما' آئی پرامس۔۔۔" ارصم نے اپنے پیروں پر خود کلہاڑی ماری۔

"ٹھیک ہے پھر تم فوجی فاؤنڈیشن میں نہیں بلکہ آرمی میڈیکل میں جاؤ گے۔۔۔" انہوں نے ایک پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے اعلان کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ آرمی میڈیکل کا ایڈمیشن پھر بھی کافی مشکل ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن میں تو وہ کم نمبروں کے ساتھ بھی سیلف فنانس پر بڑے آرام سے جا سکتی ہے۔

"اِٹس اوکے ماما۔۔۔" ارصم کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ مان گئی تھیں۔

"اور تم ہوسٹل میں رہو گے صرف ویک اینڈ پر چکر لگاؤ گے۔۔۔" انہوں نے دوبارہ اپنی شرط دہرائی۔

"ڈن۔۔۔" ارصم کھل کر مسکرایا۔

"اب پلیز بیٹا! اچھی سی کافی اپنے ہاتھ کی بنوا کر پلاؤ' یقین مانو میرا تو دماغ پلپلا ہو گیا ہے' تم ماں بیٹے کے چکروں میں۔" آغاجی نے منہ بناتے ہوئے بینش سے فرمائش کی۔ جو ایک دم ہی ہشاش بشاش سی نظر آ رہی تھیں۔

"اور ماما میرے لیے چکن سینڈوچ۔۔۔" ارصم نے بھی کمرے سے نکلتے ہوئے اپنی فرمائش نوٹ کروائی۔

چائے پی کر اور سینڈوچ کھا کر وہ یونہی اوریدا کے پورشن کی طرف چلا آیا۔ سامنے لان میں اوریدا اور سرمد کھڑے تھے۔ سرمد اللہ جانے اسے کیا سنا رہا تھا اوریدا کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی اوریدا کی ہنسی سن سکتا تھا۔

سرمد بڑی نرم نگاہوں سے اوریدا کی طرف دیکھ رہا تھا جو لاپروائی سے اس کے سامنے کھڑی کچی کیری کھا رہی تھی۔ ارصم نے اس منظر کو خاصی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سرمد کی روز روز یہاں آمد بے سبب نہیں تھی۔

"ارے ارصم! وہاں کیوں رک گئے۔۔۔؟" اوریدا کی اس پر نظر پڑ ہی گئی۔ "ادھر آؤ' سرمد بھائی اپنی یونیورسٹی کے بہت مزے مزے کے قصے سنا رہے ہیں۔"

"ہاؤ آر یو ارصم۔۔۔" سرمد بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"فائن' آپ کیسے ہیں۔۔۔" ارصم نے ہلکا سا سنبھل کر ان سے ہاتھ ملایا' جن کی نظریں ابھی بھی بھٹک بھٹک کر اوریدا کی طرف جا رہی تھیں۔

"آپ سنائیں' کیا چل رہا ہے آج کل۔۔۔" ارصم نے رسمی سے انداز میں پوچھا۔

"بس یار' آج کل جاب اور روزگار کے چکروں نے الجھا دیا ہے۔" سرمد دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔

"اچھا مجھے تو لگتا ہے ان سب کے ساتھ کسی "اور" چکر میں بھی الجھے ہوئے ہیں آپ۔۔۔" ارصم نے اپنی طرف سے اس پر طنز کیا تھا جسے سنتے ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔ وہ اوریدا سے پانچ سال اور ارصم سے تین چار سال بڑا تھا' لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان کافی بے تکلفی تھی۔

"بس یار دعا کرو' جو بھی چکر ہے کہیں گھن چکر نہ بن جائے۔" سرمد نے غیر سنجیدگی سے جواب دیا جسے سنتے ہی ارصم کے ذہن نے خطرے کا الارم بجایا۔ اوریدا لان میں لگے آم کے درخت سے کچی کیریاں توڑنے کے چکر میں دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔

رات کو سرمد کے جاتے ہی وہ اوریدا کی طرف آ گیا جو ٹیرس میں رکھی کرسی پر بیٹھی تھی اور گود میں بیالوجی کی کتاب کھلی ہوئی تھی۔

"یہ سرمد بھائی آج کل زیادہ ہی نہیں آنے لگے یہاں۔۔۔" پتا نہیں کیوں اسے غصہ آ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔؟" وہ چونکی۔ "میں نے تو نوٹ نہیں کیا۔" اوریدا کے لہجے کی لاپروائی سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ "ویسے آج تو بڑے ابا کی طبیعت پوچھنے آئے تھے وہ۔۔۔" اوریدا کو اچانک ہی یاد آیا۔

"بہر حال تم ادھر ادھر ٹائم ویسٹ کرنے کے بجائے اپنی اسٹڈیز پر دھیان دو' تو زیادہ بہتر ہے۔" ارصم کے لہجے کی سنجیدگی پر وہ ٹھٹکی۔

"کیا بات ہے ارصم! تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے

ہو۔۔۔؟"

"مجھے اچھا نہیں لگتا جب تم اپنا ٹائم ادھر ادھر ضائع کرتی ہو۔" وہ ہنوز سابقہ انداز سے گویا ہوا۔

"ارصم! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے کیا۔۔۔" اوریدا پریشان ہوئی تو اس نے الجھ کر اوریدا کا بے داغ معصوم سا چہرہ دیکھا۔ پہلی دفعہ اس نے اس کے چہرے سے شعوری طور پر نظریں ہٹائی تھیں۔

"کیوں کیا ہوا۔۔۔؟" وہ رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا اور ٹیرس کی ریلنگ سے جھک کر نیچے لان میں دیکھنے لگا۔

"تم اس طرح کی باتیں تو کبھی بھی نہیں کرتے۔۔۔" اوریدا کو اس کا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگا تو فوراً ہی اظہار بھی کر دیا۔ ارصم نے بہت سرعت سے خود کو سنبھالا اور مڑ کر اوریدا کی پریشان شکل دیکھی۔

"بیوقوف لڑکی! میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم شروع سے اچھی طرح تیاری کرو، تاکہ تمہارا آرام سے کسی بھی اچھے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو جائے۔"

"کسی" سے تمہاری کیا مراد ہے۔۔۔" اوریدا نے فوراً ہی اس کا جملہ پکڑا۔ "میں نے اگر ایڈمیشن لینا ہے تو صرف تمہارے کالج میں، ورنہ کہیں نہیں۔" وہ ابھی سے اپنا ذہن بنا چکی تھی۔ اس کی بات پر ارصم کا ذہن بھی کچھ ہلکا پھلکا ہوا۔ تھوڑی دیر پہلے کی ساری کثافت ایک دم ہی دھل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے بابا مان جائیں گے ہاشم کے پروپوزل کے لیے۔۔۔" اس رات بختاور بہت خوش تھی اور نیلم حیرانگی سے سارا قصہ سن رہی تھی۔ اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہاشم اس طرح اچانک سے بختاور کو پروپوز کر دے گا۔

"بابا۔۔۔" بختاور ہلکا سا اٹکی۔۔۔ "کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے، وہ صاف صاف کہہ چکے ہیں کہ تمہاری شادی کسی ڈاکٹر سے کریں گے، کیونکہ تم نے ان کی خواہش کے مطابق اس فیلڈ کا انتخاب نہیں کیا۔" نیلم کو اچانک یاد آیا کہ بختاور نے بہت شروع میں اسے یہ بات کہی تھی۔

"بابا کو تو عادت ہے ڈکٹیٹر بن کر اپنے فیصلے مسلط کرنے کی۔۔۔" بختاور کا حلق تک کڑوا ہوا۔ کچھ آج تازہ تازہ ہونے والی ملاقات کا خمار ذہن میں سوار تھا۔ اس لیے اسی فیصد لڑکیوں کی طرح بختاور کو بھی والدین کے پڑھائے گئے سارے سبق فضول اور بے معنی دکھائی دے رہے تھے۔

"اگر وہ نہ مانے تو۔۔۔؟" نیلم۔۔۔ دماغ سے سوچ رہی تھی۔

"انہیں ماننا ہو گا۔۔۔" بختاور نے ہٹ دھرم انداز اپنایا۔

"اور فرض کرو وہ واقعی ہی نہیں مانے تو تم کیا کرو گی۔۔۔؟" نیلم جاننا چاہتی تھی کہ وہ محبت کے اس سفر میں کس حد تک آگے جا چکی ہے۔

"میں ہاشم کو کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتی، چاہے مجھے اس کے لیے آخری حد تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔۔۔" پہلی محبت کے خمار نے اس سے سوچنے اور سمجھنے کی ساری صلاحیتیں چھین لی تھیں۔ نیلم نے خوفزدہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا، جس کے چہرے پر آج عجب قوس قزح پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ان رنگوں میں سے ایک رنگ بغاوت اور ہٹ دھرمی کا تھا جو نیلم کے لیے پریشان کن تھا۔

"مجھے لگتا ہے تم دونوں کے اسٹیٹس میں کافی فرق ہے بختاور۔" نیلم نے ہلکا سا جھجک کر اسے سمجھانا چاہا۔

"سو واٹ۔۔۔؟" بختاور کسی بھی چیز کو اہمیت دینے کو تیار نہیں تھی۔ "مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔"

"بظاہر چھوٹی چھوٹی اور بے ضرر لگنے والی چیزیں، زندگی میں آگے جا کر بہت بڑے بڑے مسائل کا موجب بن جاتی ہیں۔ پانی کے ٹینک میں بننے والا چھوٹا سا سوراخ، کسی کے دل میں لگنے والی ہلکی سی گرہ اور شک کا ایک لمحہ، پوری زندگی کو برباد کر سکتا ہے۔" نیلم نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔ بختاور اس کی بات پر طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"محبت ان سب چیزوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔۔۔" بختاور نے مسکرا کر اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"آئی ایم سوری! میں ایسی وقتی محبتوں کو نہیں مانتی، جو پانی کے بلبلے کی طرح بنتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔" نیلم نے بھی صاف گوئی کہا۔

"یہ وقتی چاہت نہیں ہے نیلم۔۔۔" بختاور کو ایک دم غصہ آیا۔

"نادان لڑکیاں کیوں نہیں سمجھتیں، والدین کی عزتوں کے آنچل لیے جب وہ گھروں سے نکلتی ہیں تو محبتوں کے بے شمار رنگ برنگے کاغذی پھول جگہ جگہ ان کے منتظر ہوتے ہیں۔ جو دیکھنے میں بہت خوشنما لیکن خوشبو سے عاری ہوتے ہیں۔" نیلم کو بھی ایک دم ہی غصہ آیا۔

"تم ہاشم کو غلط سمجھ رہی ہو۔۔۔" بختاور نے احتجاجی نظروں سے اپنی دوست کو دیکھا جو اس وقت ناصح بنی ہوئی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر تم اس ویک اینڈ پر جا کر اپنے والدین سے بات کر کے دیکھ لو۔" نیلم نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور اپنی کورس کی ایک کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ بختاور نے کچھ لمحے جانچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم ہاشم کے بارے میں ایسا سوچتی ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔۔۔" بختاور کے لہجے سے رنجیدگی چھلکی۔

"میں ہاشم کو نہیں بلکہ تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔" نیلم کتاب بند کر کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کلاک پر رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟" بختاور الجھ سی گئی۔

"آئی ایم سوری بختاور! مجھے اندازہ نہیں تھا ہاشم کی محبت تمہارے حواسوں پر اس قدر سوار ہو جائے گی کہ تم اس کے لیے ہر صحیح اور غلط قدم کے لیے بھی خود کو حق بجانب سمجھنے لگو گی۔۔۔" نیلم نے صاف گوئی سے کہا۔

"وہ بہت اچھا ہے نیلم۔۔۔" بختاور نے ضد بھرے انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اس کی اچھائی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ تم اسے پانے کے لیے غلط حربے بھی استعمال کرنے لگو۔" نیلم نے برہم انداز میں اپنی بے وقوف دوست کو دیکھا جو اس کا پوائنٹ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔

"میں ایسا کچھ نہیں کر رہی۔۔۔" بختاور نے نظریں چرا کر آہستگی سے صفائی دی۔

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم سب کچھ ہی کر گزرو گی۔" نیلم ہنوز اس سے خفا خفا سی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔۔۔؟" بختاور نے آخر کار ہتھیار ڈال ہی دیے۔

"میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم جو بھی قدم اٹھاؤ اس میں تمہارے والدین اور گھر والوں کی بھرپور رضامندی شامل ہو، کیونکہ جس فیصلے میں آپ کے والدین کی خوشی بھی شامل ہو، اللہ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔" نیلم نے ذرا نرم انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اس ویک اینڈ پر گھر میں ضرور بات کروں گی۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس بات پر گھر میں اتنا بڑا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ اس کی والدہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، کیا کچھ نہیں تھا ان کی آنکھوں میں غم، غصہ، ناراضی اور شکوہ، وہ ابھی زبان سے کچھ نہیں بولی تھیں، لیکن ان کی آنکھیں چیخ چیخ کر برہمی کا اظہار کر رہی تھیں۔

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔۔۔" انہوں نے اپنی سب سے بڑی اور لاڈلی اولاد کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں سے جھلکتی بغاوت انہیں مشتعل کر رہی تھی۔

"اس میں خرابیٔ دماغ کی کیا بات ہے۔۔۔" بختاور کو بھی غصہ آ گیا۔

"تمہارے والد نے شروع دن سے کہہ رکھا ہے تمہاری شادی کسی ڈاکٹر سے کریں گے۔" بختاور کی

والدہ نے اسے یاد دلایا۔
"سخت نفرت ہے مجھے اس پروفیشن سے۔" وہ تنفر انداز سے گویا ہوئی۔ "اسی لیے تو میں اس فیلڈ میں نہیں گئی۔"
"وہ تو تم بہن بھائیوں کی ملی بھگت تھی' ورنہ سب کو پتا ہے تم آسانی سے اپنا میرٹ بنا سکتی تھیں۔" "نہیں بھی ہر چیز کی خبر تھی۔"
"پلیز ماما' آپ بابا سے بات کر کے تو دیکھیں۔" بختاور نے تھوڑا دھیما انداز اپنایا۔
"انہیں بھنک بھی پڑ گئی تو تمہیں یونیورسٹی بھی نہیں جانے دیں گے۔" انہوں نے اپنی لاڈلی کو ڈرایا۔
"لیں' یہ کوئی زبردستی ہے بھلا۔" بختاور ٹھیک ٹھاک برا مان گئی۔ "بابا کو تو ویسے ہی ڈکٹیٹر کی طرح حکومت کرنے کی عادت ہے' اب یہ کہاں لکھا ہے کہ ایک ڈاکٹر ہی اچھا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔" وہ حد درجہ بدگمان ہوئی۔
"دیکھو بختاور! مجھے اس لڑکے میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی جو تمہارے باپ کے فیصلے کو بدل سکے۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔
"تو ٹھیک ہے' پھر میرے دل کو کوئی ایسی دلیل یا منطق دیں' جسے سن کر میں بھی اپنا فیصلہ تبدیل کر سکوں۔" اس نے بھی دوٹوک انداز اپنایا۔
"بختاور۔" وہ صدمہ بھرے انداز سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
"آپ ایک دفعہ ہاشم رضا سے مل کر تو دیکھیں' مجھے یقین ہے آپ کو میری پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" بختاور کے لب و لہجے کو دیکھ کر انہیں پہلی دفعہ زندگی میں افسوس ہوا کہ انہوں نے اپنی اولاد کو ضرورت سے زیادہ آزادی رائے کا حق دے رکھا ہے۔
"مجھے کسی سے نہیں ملنا۔" انہوں نے ناراض لہجے میں صاف انکار کیا۔
"تو ٹھیک ہے آپ بابا سے کہیں' وہ اس سے ایک دفعہ مل لیں۔" بختاور اب باقاعدہ منتوں پر اتر آئی تھی۔ انہوں نے پریشان انداز سے اپنی بیٹی کے طور طریقے دیکھے' وہ دل ہی دل میں ٹھیک ٹھاک خوفزدہ ہو چکی تھیں۔
"آپ بابا سے تو بات کریں گی ناں۔" بختاور کو ان کی خاموشی دہلا رہی تھی' وہ اپنی جگہ پر متفکر تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماں بیٹی دونوں ہی ایک دوسرے سے خائف ہو رہی ہوں۔
"میں تمہارے باپ سے بات کر کے دیکھ لیتی ہوں' پھر وہ جانیں اور تم جانو۔" ان کی رضامندی پر بختاور کے چہرے پر پھیلنے والے مسرت کے رنگ بڑے فطری تھے' جبکہ اس کی والدہ کے چہرے پر ناپسندیدگی بکھر گئی۔ اگلے ہی دن اس کی بابا جان کے کمرے میں پیشی تھی' بختاور کو یقین تھا کہ وہ اپنا مقدمہ کامیابی سے جیت لے گی' لیکن آگے بھی بابا جان تھے جنہوں نے پہلی بال پر اسے کلین بولڈ کر دیا تھا۔
"کس خاندان سے تعلق ہے اس کا؟ اور باپ کا پروفیشن کیا ہے؟" بابا کے لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔
"آئی ڈونٹ نو بابا۔" اس کے خفت زدہ انداز پر بابا کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔
"ماشاء اللہ' بہت ہی سمجھ دار واقع ہوئی ہیں میری دختر نیک اختر۔" وہ طنزیہ انداز سے گویا ہوئے۔ "نام حسب نسب کا علم نہیں اور چلی ہیں رشتے داریاں جوڑنے' تم سے مجھے اس قدر بے وقوفی کی توقع نہیں تھی بختاور۔" ان کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ ابھری۔
"بابا آپ ایک دفعہ اس سے مل تو لیں۔" وہ نظریں جھکائے آہستگی سے گویا ہوئی۔
"تمہیں شاید علم نہیں' خاندانی لوگ' رشتے ناتے' بڑے بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر طے کرتے ہیں' بچوں کے ساتھ نہیں۔" انہوں نے بیزار انداز سے اپنی بیٹی کی معلومات میں اضافہ کیا جو اضطراری انداز سے اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی' کچھ بھی تھا بابا جان سے ان سب بہن بھائیوں کی جان جاتی تھی۔
"کوالیفکیشن کیا ہے اس کی۔؟" انہوں نے ہلکے سے توقف کے بعد سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
"کمپیوٹر سائنسز میں ماسٹرز کر رکھا ہے' فائنل ایر

کا اسٹوڈنٹ ہے۔" بختاور بمشکل اپنا حلق تر کرتے ہوئے بولی۔
"ہونہہ۔ اسٹوڈنٹ۔" انہوں نے حقارت بھرے انداز میں ہنکارا بھرا۔ بختاور کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے' اسے پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ ہاشم رضا کی جن خوبیوں کو اس نے سنہرے حروف سے اپنی ڈائری میں تحریر کر رکھا تھا' انہیں یہاں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں' کیونکہ اس کے والدین کے پرکھنے کے معیار بالکل مختلف تھے۔ پچیس منٹ کے بعد جب وہ بابا کے کمرے سے نکلی' احساس توہین سے اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔
"کیا وہ واقعی اتنا اچھا ہے' جس کی خاطر آپ بابا کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔" اس کی چھوٹی بہن اسے لان میں اکیلے بیٹھ کر روتے۔ دیکھ کر وہاں پہنچ گئی اور اب عجیب سی نگاہوں سے اپنی بڑی بہن کو دیکھ رہی تھی۔
"پتا نہیں' لیکن میں جب اس کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے دنیا بہت اچھی لگتی ہے۔" بختاور اپنے دل کے معاملے میں بے بس تھی۔
"لیکن بابا بھی نہیں مانیں گے۔" اس کی چھوٹی بہن زیادہ حقیقت پسند تھی۔
"وہ جب ہاشم رضا سے ملیں گے تو مان جائیں گے۔" بختاور کو پتا نہیں کیوں یہ خوش فہمی لاحق تھی کہ ہاشم جیسے شخص کو کوئی ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔ ایک ایسا شخص' جو انسانیت سے پیار کرتا ہو' اسے بھلا لوگ کیسے مسترد کر سکتے تھے۔
"وہ جو غریب' بیمار اور دکھی لوگوں کی مسیحائی کے لیے اپنی زندگی وقف کر چکا تھا' ایسے لوگ بھلا زندگی میں کہاں ملتے ہیں۔" وہ دل ہی دل میں ہاشم رضا کی شخصیت کے ان سارے نمایاں پہلوؤں کو دہرا رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوئی تھی اب وہ ساری خوبیاں کسی اور کو تو بے تکلفی سے نہیں بتا سکتی تھی' لیکن اپنے سے پانچ سال چھوٹی گڑیا سے اس کی کافی دوستی تھی' جو اس وقت کالج کی اسٹوڈنٹ تھی۔
"یہ تو کوئی بہت ہی خوابوں اور خیالوں میں رہنے والا لڑکا لگ رہا ہے۔" گڑیا نے اپنے جملے سے "بے وقوف" کا لفظ حذف کر دیا تھا کیونکہ اس سے بختاور کی دل آزاری ہو سکتی تھی۔
"پورا کیمپس اس کی اچھائی کی تعریف کرتا ہے۔" بختاور نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے عوام الناس کی رائے کو بھی اس میں شامل کیا۔
"وہ تو ٹھیک ہے باجی' لیکن زندگی ان چیزوں کے سہارے تو نہیں گزرتی۔" گڑیا اس سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور پریکٹیکل تھی۔
"کیا مطلب ہے تمہارا۔" اسے اپنی چھوٹی بہن کا تبصرہ پسند نہیں آیا تھا۔
"میرا مطلب یہ ہے کہ زمینی حقائق ان سے بہت مختلف ہوتے ہیں' وہ بحیثیت انسان تو بہت عمدہ ہو گا لیکن پریکٹیکل لائف میں ساری زندگی سوشل ورک تو نہیں کر سکتا' اس کے لیے بہت سارا پیسہ اور ویل سیٹلڈ گھر' جاب یا بزنس ہونا چاہیے۔" گڑیا نے صاف گوئی سے کہا۔
"ہاں تو وہ کہیں نہ کہیں جاب تو کرے گا ہی' اب اتنا بھی بے وقوف نہیں۔" بختاور نے فوراً ہی اس کی طرف داری کی۔
"آپ کچھ بھی کہیں' انہیں سیٹ ہونے کے لیے پانچ چھ سال کا عرصہ تو درکار ہے اور بابا آپ کو کبھی بھی اتنے عرصے کے لیے گھر نہیں بٹھائیں گے۔" گڑیا کی بات پر اسے دھچکا سا لگا' کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی۔

☆ ☆ ☆

شانزے کی فلم کا پورا یونٹ کئی دن سے ناردرن ایریاز میں شوٹنگ کر رہا تھا اور شانزے اس فلم کے ایک ایک سین کے لیے گھنٹوں پریکٹس کرتی اور بار بار آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ریہرسل کرتی۔ اس فلم کا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر دونوں ہی اس کی کارکردگی سے

مطمئن تھے۔

ناران کاغان سے ہو کر وہ لوگ مانسہرہ سے چند کلو میٹر آگے شنکیاری پہنچے۔ وہاں وادی سرن میں بنی ایک چھوٹی سی خوب صورت جھیل میں فلم کے چند سین کی شوٹنگ ہوئی تھی اور اسی دن سرمد نے بھی انہیں جوائن کرلیا۔

"ہاں بھئی چھوٹی! کیا سین چل رہا ہے۔۔۔؟" سرمد کو اچانک وہاں دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت کا شکار ہوئی۔

"ارے سرمد بھائی آپ۔۔۔" شانزے کو حقیقتاً خوشی ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ لوگ سورج کے غروب ہونے کا انتظار کر رہے تھے جس میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ اس لیے سبھی لوگ اپنے اپنے طریقے سے تفریح کرنے میں مصروف تھے۔ شانزے اور سرمد دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اس طرف نکل آئے جہاں پانی کا بہاؤ خاصا تیز تھا۔

"کیسی جاب چل رہی ہے آپ کی۔۔۔" شانزے کو علم تھا کہ وہ جرنلسٹ تھا۔ ابھی بھی وہ اپنے کسی کام سے ہی یہاں آیا ہوگا۔

"بس سو سو۔۔۔" سرمد نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ "پانی میں چلیں۔۔۔؟" وہ دونوں بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے پانی میں آگئے تھے۔ ٹھنڈا یخ پانی گرمیوں کے موسم میں خاصی طمانیت کا باعث بن رہا تھا۔ انہی کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی وہاں آگئے تھے۔

"میں نے تمہارے چند شارٹس دیکھے ہیں، بہت عمدہ کام کیا ہے تم نے۔۔۔" سرمد کی تعریف پر اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

"کیا واقعی۔۔۔؟" اسے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں احمد بھی بہت تعریف کر رہا تھا تمہاری۔۔۔" سرمد نے فلم کے ڈائریکٹر کا نام لے کر اسے بتایا۔

"ہاں، وہ بہت کو آپریٹ کرتے ہیں مجھ سے۔" شانزے بھی اپنی ساری ٹیم سے خوش تھی۔

"لیکن شہریار سے ذرا محتاط ہی رہنا۔۔۔" سرمد نے اس کی فلم کے ہیرو کا نام لے کر وہ بات کہہ ہی دی جس کے لیے وہ اتنا لمبا سفر کر کے ایبٹ آباد سے یہاں پہنچا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" شانزے نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کچھ نہیں، وہ خاصا آؤٹ اسپوکن اور فلرٹ ٹائپ لڑکا ہے۔ آج کل ٹوئیٹر پر بڑے عجیب و غریب قسم کے اسٹیٹس دے رہا ہے۔" سرمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کس طرح سے کھل کر بتائے کہ وہ کیمرہ کے پیچھے اپنی ٹیم کے جو فوٹو شیئر کر رہا تھا اس میں سب سے زیادہ تصویریں شانزے کی تھیں۔ جس میں دونوں کی بے تکلفی نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

"آپ کو کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔؟" شانزے پریشان ہوئی۔

"تمہاری جب تک مووی ریلیز نہیں ہوتی، تم تھوڑا کیئر فل رہو، کیونکہ تمہارے کیریئر کا یہ آغاز ہے جبکہ وہ پھر بھی اپنا کچھ نہ کچھ نام بنا چکا ہے۔" سرمد نے کھل کر اس سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا سرمد بھائی۔۔۔" شانزے نے کھل کر اپنی کم عقلی کا اعتراف کیا تو سرمد نے فوراً ہی اپنے سیل فون پر اس کی فلم کے ہیرو شہریار کا ٹوئیٹر کا اکاؤنٹ کھول کر دکھا دیا۔ شانزے ہکا بکا رہ گئی۔

"یہ تو بون فائر پارٹی کی تصویریں ہیں، جو شوگراں میں احمد صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔" شانزے نے گھبرا کر وضاحت دی۔ اس رات خوب موج مستی کے دوران سب نے ڈھیروں تصاویر بنائی تھیں، لیکن شانزے کو اندازہ نہیں تھا کہ شہریار اپنی اور شانزے کی تصویریں اٹھا کر اس طرح سے اپنے ٹوئیٹر پر شیئر کر دے گا۔

"یہ سب پکچرز، مختلف شوبز کے پیجز اور نیوز پیپرز میں دھڑا دھڑ پبلش ہو رہی ہیں۔" سرمد نے اسے معاملے کی سنگینی سے آگاہ کیا۔

"میں ابھی احمد صاحب سے بات کرتی ہوں۔۔۔" شانزے کو غصہ آگیا۔

"میں ان سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔۔۔" سرمد کی بات پر وہ حیران ہوئی۔

"میری بات غور سے سنو شانزے! تمہاری جب تک کوئی چیز آن ایئر نہیں آجاتی، اپنا امیج میڈیا میں خراب مت کرو، ایسا نہ ہو تمہارا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے۔"

"لیکن سرمد بھائی! سب لوگ انجوائے کر رہے تھے تو۔۔۔" اس نے جھجک کر اپنا فقرہ ادھورا چھوڑا۔

"تم خود کو سب لوگوں کے ساتھ شامل کیوں کرتی ہو شانزے۔۔۔؟" وہ ہلکا سا جھنجلایا۔

"بے وقوف لڑکی! یہ شوبز ہے اور یہاں رائی سے پہاڑ بننے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے، میری خواہش ہے کہ تم سب کو ایک فاصلے پر رکھو، ورنہ شوبز میں روزانہ کتنی لڑکیاں آتی ہیں اور گمنامی کی موت مر جاتی ہیں۔"

سرمد کی بات پر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا لاپروائی سے اٹھایا گیا ایک قدم اسے پہلی سیڑھی پر ہی خوار کر دے گا۔ وہ دل ہی دل میں شہریار کو ہزاروں گالیاں دے چکی تھی۔

☼ ☼ ☼
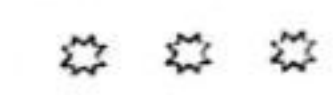
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو مونا۔۔۔؟" عدینہ کو ایک دم ہی دھچکا سا لگا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کے زاویے بری طرح بگڑ گئے۔

"تمہاری اس فضول بات کا مطلب کیا ہے۔۔۔؟" وہ اپنا غصہ کسی طور نہیں چھپا سکتی تھی۔

"لیں میں نے خود سے تھوڑی کہا ہے۔" عدینہ کو غصے میں دیکھ کر اس نے نرم انداز اپنایا۔ "میں نے تو آپا صالحہ اور بے بے کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔"

"میں جا کر پوچھتی ہوں ان سے۔۔۔" وہ مشتعل انداز سے کھڑی ہوئی۔

"پلیز عدینہ باجی۔۔۔" مونا نے گھبرا کر اس کا بازو پکڑا۔ "آپا صالحہ میری جان نکال دیں گی کہ میں نے کیوں بتایا۔" اس کے لہجے میں اس قدر بے بسی تھی، کہ وہ چپ چاپ چپ کر کے بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں وہ۔۔۔؟" عدینہ نے سپاٹ انداز میں مونا کا فکر مند چہرہ دیکھا۔ جو دل ہی دل میں سخت پچھتا رہی تھی کہ اس نے آخر یہ بات عدینہ سے شیئر ہی کیوں کی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح بھڑک اٹھے گی۔

"کچھ نہیں، بس اتنا ہی سنا تھا کہ آپ کی نانو کی جاننے والی ایک فیملی ہے جو آپ کے پرپوزل کے سلسلے میں اگلے ہفتے لاہور آ رہی ہے۔" مونا نے اس دفعہ محتاط انداز اپنایا، اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عدینہ کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہوا۔

"ان کا بیٹا الیکٹریکل انجینئر ہے اور سعودیہ کی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔" مونا نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا، وہ خاموش رہی۔

"پلیز آپ ان سے کچھ مت کہیے گا، وہ ایک دو دن میں خود آپ سے بات کریں گی، میں نے تو اس لیے بتا دیا تاکہ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔" مونا نے اصل بات بتاتے ہوئے لگے ہاتھوں اپنی صفائی بھی دے دی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے آپا کا۔۔۔" عدینہ زہر خند لہجے میں بولی تو مونا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس وقت آپا کے حق میں بولنا گویا جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف تھا۔ اسی لیے وہ کان لپیٹ کر بیٹھی رہی۔

"پھر مجھے کہا جاتا ہے کہ یہ بدتمیزی کرتی ہے، بتا دینا اپنی آپا کو، اگر میری شادی کا کسی نے نام بھی لیا تو میں چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لوں گی۔" عدینہ کے لہجے میں اعلانیہ بغاوت تھی۔

"کیا ہو گیا ہے عدینہ باجی! ابھی نہ کبھی تو شادی کرنی ہی ہے ناں۔۔۔" مونا نے منہ بنایا۔

"میں اپنی زندگی کی کتاب سے اس نام کی ساری چیزیں نکال چکی ہوں۔" اس نے ناراض لہجے میں اطلاع دی۔

"آپ کے ایسا کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں

جائے گی۔" مونا الجھی ہوئی نگاہوں سے عدینہ کو دیکھ رہی تھی۔

"لیکن میں اپنا ذہن بنا چکی ہوں، عبداللہ کے علاوہ میری زندگی میں کسی اور مرد کی گنجائش نہیں نکلتی۔"

عدینہ کا یہ جملہ آپا صالحہ نے اپنے ہوش و حواس میں سنا تھا اور ان کا پارہ ایک دم ہی ہائی ہوا۔ وہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے تمہارا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا، تمہیں شرم نہیں آتی کسی نامحرم کے بارے میں ایسی بات کرتے ہوئے۔" آپا ایک دم ہی کمرے میں آئی تھیں۔ مونا سٹپٹا سی گئی جبکہ عدینہ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

"جن کے ساتھ دل کا تعلق ہو، وہ ہمارے لیے نامحرم نہیں ہوتے۔" عدینہ نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں آپا صالحہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو عدینہ! اللہ جہنم میں ڈال دے گا تمہیں۔" آپا صالحہ نے سخت لہجے میں اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"ابھی بھی تو دنیا کے دوزخ میں ہی جل رہی ہوں۔" عدینہ نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے کہا۔ آپا کے تن بدن میں تو گویا آگ ہی لگ گئی۔

"تم جتنی بھی بکواس کرو، میں سوچ چکی ہوں، جلد ہی تمہاری شادی کردوں گی۔" آپا صالحہ نے اسے اپنے ارادوں سے باخبر کیا۔

"تو ٹھیک ہے پھر، میری ڈیڈ باڈی سے ہی نکاح پڑھوایئے گا کسی کا۔" عدینہ انتہائی بدتمیزی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ آپا صالحہ کا چہرہ اشتعال سے سرخ ہوا۔ عدینہ اب انہیں دوبدو جواب دینے لگی تھی۔

"تم اس بے وقوف کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو مونا۔" انہوں نے اپنا باقی غصہ سامنے خاموش کھڑی مونا پر اتارا۔ مونا انہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ بے وقوف بہت عرصے سے سمجھنے اور سمجھانے کے مرحلوں سے نکل چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

آپا صالحہ اور عدینہ کے تعلقات ایک دفعہ پھر خراب ہو چکے تھے۔ رات تک آپا صالحہ کا بی پی ہائی ہو چکا تھا۔ اور رات کا وہ نہ جانے کون سا پہر تھا جب مونا نے اسے جھنجوڑ کر آپا صالحہ کی خرابی طبیعت کا بتایا، ایک دفعہ تو عدینہ کے پیروں کے نیچے سے بھی زمین نکل گئی تھی۔

"عدینہ پتر، اپنے چاچے بخشا کو فون کر، اپنی سوزوکی لے کر آجائے، صالحہ کو بڑے ہسپتال لے چلتے ہیں۔" بے بے نے ان کی بگڑتی حالت کے پیش نظر فوراً" ہی فیصلہ کیا۔ ٹھیک اگلے گھنٹے میں وہ لوگ بخش الدین کی سوزوکی میں آپا صالحہ کو لے کر پنڈی جارہے تھے۔ آپا صالحہ کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ باقی ساری رات انہوں نے سی ایم ایچ میں گزاری تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپا کی۔۔۔؟" مونا اس کے پاس آن کھڑی ہوئی، جو افسردہ سے انداز سے کوریڈور میں کھڑی تھی۔

"بی پی ابھی تک کنٹرول میں نہیں آرہا۔۔۔" عدینہ بہت پریشان تھی۔

"اب کیا ہوگا عدینہ باجی۔۔۔" مونا کے لہجے میں کوئی ان کہا سا خوف چھپا ہوا تھا۔

"دعا کرو، ان کی طبیعت سنبھل جائے۔۔۔" عدینہ نے ہلکا سا جھجک کر کہا تو مونا سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"آپا بھی تو ہر بات کو اپنے ذہن پر سوار کرلیتی ہیں۔" دونوں چلتے چلتے کوریڈور کے اینڈ پر بنی کھڑکی کے پاس آن کھڑی ہوئیں۔ اس وقت دونوں اسپتال کے فرسٹ فلور پر تھیں۔ عدینہ نے جھانک کر نیچے دیکھا، سامنے پارکنگ میں بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے اور ہاسپٹل میں اچھی خاصی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔

"کتنی دیر اور رہنا پڑے گا یہاں۔۔۔" مونا کو اسپتال میں بہت گھبراہٹ ہوتی تھی۔

"جب تک آپا کی طبیعت نہیں سنبھل جاتی۔۔۔"

عدینہ نے افسردگی سے جواب دیا اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ان کے گاؤں میں کوئی اچھا ڈاکٹر موجود نہیں تھا اور اگر ان کی طبیعت دوبارہ خراب ہوتی تو پھر ایک نیا مسئلہ بن جاتا۔ اس لیے عدینہ اور بے بے، ان کی ناسازیٔ طبیعت تک یہیں رہنا چاہتی تھیں اور مونا کی مجبوری تھی کہ اسے بھی ان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

☼ ☼ ☼

بختاور جب سے گھر سے ہوسٹل واپس آئی تھی کافی الجھی الجھی سی تھی۔ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتی اور مطالعے کا شوق بھی تقریباً" ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو اس نے لائبریری سے کتابیں ایشو کروانا بھی ختم کردی تھیں۔ دو تین کتابیں وہ اپنے گھر سے لائی تھی اور انہیں بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا، وہ جوں کی توں اس کی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ دو دن سے تو وہ کیمپس بھی نہیں گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ہاشم سے خوف زدہ تھی کہ اسے کیا جواب دے گی۔ اس دن نیلم ڈیپارٹمنٹ سے آئی تو اس کا موڈ خاصا برہم تھا۔

"دیکھو بختاور! اس طرح چھپ کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔" نیلم نے اپنا سفید لیب کوٹ الماری میں ٹانگتے ہوئے سنجیدگی سے اس کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اداس بلبل بنی بیٹھی تھی۔

"کیوں کیا ہوا۔۔۔؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"کیوں تمہیں نہیں پتا کیا ہوا ہوگا۔۔۔" نیلم نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے طنزیہ انداز میں اسی سے پوچھا۔

"ہاشم نے کچھ کہا ہے کیا۔۔۔؟" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"اس نے تو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگا لگا کر سارا فرش ہی گھس دیا ہے، اب تو آدھی فیکلٹی کے لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا اس کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے۔" نیلم نے منہ بنا کر اپنی پریشانی بتائی۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ۔۔۔؟" بختاور نے ہلکا سا سنبھل کر پوچھا۔

"یہی کہ تم کب واپس آؤ گی اپنے گھر سے، اور تمہارے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر بھی مانگ رہا تھا۔"

"تم نے دے تو نہیں دیا۔۔۔" بختاور گھبرا سی گئی۔

"اتنا پاگل سمجھ رکھا ہے کیا۔۔۔؟" نیلم برا مان گئی تھی۔ "ویسے تم ایک دفعہ اس سے مل کیوں نہیں لیتی ہو؟"

"ہاں صبح جاؤں گی کیمپس۔۔۔" بختاور اٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگی۔ نیلم نے غور سے اس کا افسردہ اور ڈھیلا ڈھالا سا انداز دیکھا۔

"بختاور! تم نے کیوں اس بات کو اپنے ذہن پر سوار کر رکھا ہے۔" نیلم سارے معاملے سے باخبر تھی، لیکن اس سے بختاور کی پریشانی بھی نہیں دیکھی جارہی تھی۔ اسے رہ رہ کر بختاور کے والد پر غصہ آرہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں، مجھے لگتا ہے ہاشم سونے کا بھی بن کر آجائے تب بھی بابا اس سے میری شادی نہیں کریں گے۔" بختاور الماری سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"اتنی بھی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔ ان کو وقتی غصہ ہے اتر جائے گا۔" نیلم نے اسے دلاسا دیا۔

"وہ اپنی ضد کے بہت پکے ہیں، تم نہیں جانتی ہو انہیں۔۔۔" بختاور کے لہجے میں ہزاروں اندیشے اور خوف پنہاں تھے۔

"تم ہاشم سے کہو ناں اپنے والدین کو بھیجے۔۔۔" نیلم نے اسے مفت مشورہ دیا۔

"ظاہر ہے اس کے علاوہ تو مسئلہ حل بھی نہیں ہوگا۔" بختاور نے استری کا بٹن آن کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ویسے کیسی فیملی ہے اس کی۔۔۔" نیلم کے تجسس بھرے انداز پر وہ زبردستی مسکرائی۔ "تم شاید یقین نہ کرو نیلم! لیکن بائے گاڈ میں نے کبھی اس سے اس کی فیملی، ان کا معاشی اسٹیٹس اور بہن بھائیوں کی تعداد یا جاب وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔"

"لیکن یار تمہیں کچھ تو پوچھنا چاہیے تھا۔" نیلم کو اس کی بےوقوفی پر غصہ آیا۔

"سچ پوچھو تو جب وہ سامنے آتا ہے، مجھے باقی ساری دنیا بے معنی سی لگنے لگتی ہے، اس لیے میں نے کبھی دلچسپی ہی نہیں لی۔ ویسے بھی میں نے زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے، اس کے خاندان کے ساتھ تو نہیں۔" بختاور نے اپنے دل کی بات بتائی۔

"معاف کرنا بختاور! تم کسی یورپین کنٹری میں نہیں رہ رہی ہو۔" نیلم نے فوراً" ہی اسے ٹوکا۔ "جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں یہاں مشرقی عورت کا اپنے میاں سے واسطہ کم اور اس کے خاندان والوں سے زیادہ پڑتا ہے، ساری زندگی وہ ساس، نندوں کے چکر سے ہی نہیں نکلتی۔"

"ہاشم اپنی پرائیویسی سے معاملے میں بہت کانشس ہے۔" بختاور نے اس کی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"سارے مرد شادی سے پہلے تک ہی ان معاملات میں کانشس ہوتے ہیں، بعد میں تو انہیں اپنی ماں بہنوں کو خوش کرنے کی پڑ جاتی ہے۔" نیلم کی صاف گوئی بہت دل دکھانے والی تھی۔

"تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو، کھل کر کہو۔" بختاور نے ناراض نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہرحال تم کل اس سے بے تکلفی سے بات کرنا، وہ کب اپنے پیرنٹس کو بھیجے گا اور تمہیں کہاں رکھے گا۔" نیلم نے اسے سمجھایا۔ "کیونکہ ایسے معاملات میں شرم و حیا بعض دفعہ بہت سے معاملات کو بگاڑ دیتی ہے۔"

نیلم کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور تیزی سے اپنے کپڑے استری کرنے لگی۔ جب کہ ذہن میں نیلم کی باتوں نے ایک اودھم سا مچا رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼
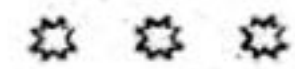
"تم واقعی کل جا رہے ہو۔۔۔؟" اوریدا آج کافی دن کے بعد ارصم کے پورشن کی طرف آئی تھی۔ آنٹی بینش کسی میڈیکل کانفرنس کے سلسلے میں لاہور گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے رلوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔" ارصم سنجیدہ سے انداز میں اپنی پیکنگ کرنے میں مصروف تھا اور چہرے پر ہنوز سنجیدگی طاری تھی۔ وہ ابھی ابھی اوریدا کے پورشن سے واپس آیا تھا۔ آج پھر سرمد بچ پر موجود تھا۔ جسے دیکھتے ہی ارصم کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"اب کیا ویک اینڈ پر واپس آؤ گے؟" اوریدا نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ تناؤ کا شکار لگ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

"تم کل سے اتنے سنجیدہ کیوں ہو ارصم۔۔۔؟" اوریدا کو پریشانی لاحق ہوئی۔

"نہیں تو۔۔۔" وہ صاف مکر گیا۔

"پھر اتنے چپ چپ سے کیوں ہو؟" اوریدا کو اب باقاعدہ ٹینشن شروع ہو گئی تھی۔

"بھئی۔۔۔ وہم ہے تمہارا۔۔۔" ارصم نے اپنی شرٹ کو تہہ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا اور جلدی جلدی اپنی پیکنگ مکمل کرنے لگا۔ اوریدا جانچتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اس کی چھٹی حس اسے کچھ ہو جانے کا اشارہ دے رہی تھی۔

"یہ سرمد بھائی کے ساتھ پرابلم کیا ہے؟" ارصم کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" اوریدا الجھ گئی۔

"انہوں نے اچانک ہی زیادہ آنا جانا نہیں شروع کر دیا تمہاری طرف۔۔۔" ارصم نے اس سے کھل کر بات کرنے ٹھان لی۔

"ان کے نانا، نانی کا گھر ہے اور آپ کو ان کے آنے سے کیا پرابلم ہے۔" اوریدا نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"خوامخواہ آکر تمہارے سر پر سوار ہو جاتے ہیں اور تمہارا ٹائم ضائع کرتے ہیں۔" ارصم نے اپنی بکس بڑے ناراض سے انداز سے اپنے بیگ میں پھینکی تھیں۔ اس دفعہ اوریدا نے کچھ زیادہ ہی اسے غور سے دیکھا۔

"تمہیں ان کا آنا برا لگتا ہے کیا؟" اوریدا تھوڑا سا محتاط ہوئی۔

"ان کا آنا برا نہیں لگتا، لیکن تمہارے سر پر سوار ہونا اچھا نہیں لگتا۔" ارصم اس دفعہ ہلکا سا چڑ کر بولا۔ اوریدا کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔" اس کا مذاق اڑانا ارصم کو اچھا نہیں لگا تھا۔ "تمہیں زرش کا مجھ سے بے تکلف ہونا کیوں برا لگتا ہے؟" وہ ایک دم چپ کر گئی۔

"اس لیے کہ تم میرے بیسٹ فرینڈ ہو اور جب مجھے اگنور کر کے اس کو توجہ دیتے ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اس نے کھل کر بتایا۔

"تو سمجھ لو مجھے بھی سرمد بھائی اسی لیے اچھے نہیں لگتے۔" اس کی ناراضگی پہلی دفعہ اوریدا کو لطف دے رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ارصم بھی اس کے حوالے سے عدم تحفظ کا شکار ہو سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس کے اس رویے سے محظوظ ہو رہی تھی۔

"وہ بےچارے تو بہت اچھے ہیں، اتنا تو خیال رکھتے ہیں میرا۔" اوریدا نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"تو زرش بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ اکثر میری اسائنمنٹس بنا دیتی ہے۔" ارصم نے غصے سے اپنے بیگ کی زپ بند کر کے متحمل انداز سے جوابی کارروائی کی، لیکن آج تو اوریدا کو اس کی کوئی بھی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔

"یہ تو اور اچھی بات ہے، چلو تمہاری ہیلپ ہو جاتی ہے۔" وہ اب بڑے مزے سے ارصم کے کمرے کی گلاس وال کے پاس آن کھڑی ہوئی، باہر موسم کافی زبردست تھا۔ وہ درختوں کی شاخوں کے جھومنے سے اندازہ لگا چکی تھی کہ باہر ہوا چل رہی ہے۔

"میں اس سے کہتا ہوں وہ بھی اپنا مائیگریشن میرے کالج میں کروا لے۔" ارصم کی اس بات پر اوریدا کی جان اٹکی۔

"خبردار۔۔۔ تم نے ایسی کوئی بدتمیزی کی۔" اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو ارصم کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب سرمد بھائی تمہارے دائیں بائیں نظر آئے تو اچھا نہیں ہو گا۔" وہ وارڈروب کھولتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں بولا تھا۔ اوریدا کو اس کی جیلسی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اگلے کئی گھنٹے بس ایسی ہی گفتگو کرتا چلا جائے۔

"اب میں ان کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی نا۔" اوریدا نے اس دفعہ سنجیدگی سے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی، کیونکہ اسے خود بھی سرمد بھائی کی بولتی آنکھوں سے کافی الجھن ہوتی تھی اور کئی دفعہ تو وہ ان کے سامنے بھی بےزاری کا اظہار کر چکی تھی، لیکن اس معاملے میں سرمد نے بھی ڈھٹائی کے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

"تم وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں تو جا سکتی ہو نا؟ یا یہ بھی نہیں کر سکتیں؟" وہ اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ کر اس کے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔ اوریدا کو پہلی دفعہ اس کے لہجے میں موجود سنجیدگی اور آنکھوں سے صاف پڑھی جانے والی برہمی کا احساس ہوا۔

"ہاں یہ میں کر سکتی ہوں۔" اوریدا نے ہار مان لی۔

"چلو پھر اس خوشی میں اچھی سی کافی بنا کر پیتے ہیں۔" وہ اب مطمئن ہو چکا تھا۔ اوریدا اس کے ساتھ کچن میں چلی آئی جہاں پہلے سے آغاجی موجود تھے۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائے۔

"ارے اوریدا آئی ہوئی ہے؟ آج سورج کہاں سے نکلا ہے بھئی۔" آغاجی نے اسے چھیڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ کافی عرصے سے اوریدا نے ادھر کا رخ کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اوریدا مسکراتے ہوئے کچن کے شیلف پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ ارصم کافی کے لیے پانی گرم کرنے لگا۔

"ماما جو یہاں نہیں ہیں۔" ارصم نے کھل کر اس کا مذاق اڑایا۔ وہ آغاجی کے سامنے خفت کا شکار ہوئی۔ جو بڑے غور سے اوریدا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا آغاجی۔۔۔ اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہیں اوریدا کو؟ یہ اصلی والی ہے، نقلی نہیں۔" ارصم

نے آغا جی پر چوٹ کی جو فریج کا دروازہ کھول کر بند کرنا بھول کر اوریدا کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے سنبھل کر فریج کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اوریدا کو شیلف پر بیٹھے دیکھ کر ماضی کی ایک بات یاد آگئی تھی۔"

اوریدا اچھل کر نیچے اتری اور تجسس بھرے انداز سے آغا جی کے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی' وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائے۔

"تمہاری ماں بھی ایسے ہی شیلف پر بیٹھا کرتی تھی اور اکثر اس بات پر ڈانٹ بھی کھاتی تھی۔" انہوں نے بوتل سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ اوریدا کی سانس اٹک گئی۔

"میری ماما' کیا آپ کے گھر میں بھی آیا کرتی تھیں۔" اوریدا کے لہجے میں چھپی حیرانی سے آغا جی کو اندازہ ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ماضی سے بالکل بے خبر ہے۔ انہوں نے اطمینان سے پانی پی کر گلاس میز پر رکھا۔

"آیا کرتی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئے۔ "وہ اسی گھر میں تو رہا کرتی تھی۔" آغا جی کی بات پر اوریدا کو شاک سا لگا وہ ہکا بکا انداز سے آغا جی کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ وہ کچن سے جا چکے تھے۔ جب کہ ارصم کافی بنا کر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جو بے یقینی کے عالم میں کھڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سانس لینا بھول گئی ہو۔

"گھر والی کافی کو چھوڑو' کسی اور اچھی سی جگہ سے پی کر آتے ہیں۔" ارصم نے اچانک ہی پروگرام بنالیا۔ اوریدا نے بھی کوئی بحث نہیں کی اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ ویسے بھی وہ اس وقت اپنے حواسوں میں کہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

"بے انتہا حسین لگ رہی ہو تم۔" رباب نے شانزے کی تصویروں کو غور سے دیکھتے ہوئے کھلے دل سے سراہا' وہ رات ہی شوٹ سے واپس آئی تھی اور اب کافی تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

"یہ سب ناردرن ایریاز کی تصویریں ہیں۔" شانزے نے سستی سے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا اور شہریار کا کپل بہت زبردست لگ رہا ہے۔" رباب کے منہ سے خلاف توقع یہ بات سن کر وہ مسکرائی۔

"دعا کرو' یہ مووی ہٹ ہو جائے' مجھے اس سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔" شانزے نے انگڑائی لے کر اپنے بالوں کو سمیٹا اور کیچر لگایا۔

"کتنا کام رہ گیا ہے اس کا۔" رباب نے اس کی شوٹنگ کی تصویروں سے نظریں ہٹا کر شانزے کی طرف دیکھا جو آج کل خاصی مطمئن لگ رہی تھی' جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی تازگی اور دلکشی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"بس تھرٹی پرسنٹ کام رہ گیا ہے اور سیونٹی پرسنٹ کے قریب مکمل ہو چکا ہے۔" شانزے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم عنقریب سیلیبرٹی بننے جا رہی ہو۔" رباب نے اسے چھیڑا۔

"ان شاء اللہ۔" شانزے بے وجہ ہنسی' اندر کی خوشی کا عکس اس کے چہرے سے بے ساختہ چھلک رہا تھا۔ رباب نے دل ہی دل میں اس کے لیے نظر بد سے بچنے کی دعا کی۔

شانزے نے اگلے کئی دن خاصے مصروف گزارے تھے۔ سرمد نے اسے ڈی ایچ اے میں فلیٹ لینے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ سرمد اس کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ فلیٹ کا ایک سال کا کرایہ دیا جا چکا تھا اور وہ اب اس کی سیٹنگ کے لیے شاپنگ کرنے میں مصروف تھی' اسی سلسلے میں دونوں صفا گولڈ مال آئے ہوئے تھے۔

"ارے اوریدا تم۔" کافی شاپ سے اوریدا اور ارصم کو اکٹھے نکلتا دیکھ کر سرمد سٹپٹا سا گیا۔

"کیسے ہیں سرمد بھائی آپ۔" ارصم نے اس کے ساتھ کھڑی لڑکی کو پہچاننے کی کوشش کی' جبکہ اس لڑکی

کی حیران نگاہیں اوریدا پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں' ان سے ملو' یہ شانزے ہیں۔" سرمد نے بوکھلا کر اس کا تعارف کروایا۔

"ہیلو۔ نائس ٹو میٹ یو۔" شانزے نے اپنا دودھیا سپید ہاتھ اوریدا کی طرف بڑھایا' جو اس کی طرف شرارتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"شانزے! یہ اوریدا ہے میرے ماموں کی بیٹی اور یہ ارصم ہے میرا سیکنڈ کزن۔" سرمد پتا نہیں کیوں بوکھلاہٹ کا شکار ہوا۔

"یہ آپ کی کولیگ ہیں کیا؟" ارصم کو اپنے اندر اطمینان کی لہریں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"ارے نہیں۔ یہ تو میری بہت اچھی اور کیوٹ سی سسٹر ہیں شانزے۔" سرمد کے صاف گو انداز پر ارصم ہلکا سا بے چین ہوا۔

"سرمد بھائی مجھے شوبز میں انٹروڈیوس کروا رہے ہیں۔" شانزے کی نگاہیں اوریدا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ہلکا سا جھجک کر اپنا تعارف مزید کروایا۔

"ویری نائس۔" ارصم اب کے زبردستی مسکرایا۔

"بیسٹ وشز فار یو۔" اوریدا نے خلوص دل سے اس نازک سی لڑکی کو کہا۔ جو پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ لوگ رسمی سی ہیلو ہائے کے بعد آگے بڑھ گئے تھے۔ شانزے اور سرمد بھی۔ "سیکنڈ کپ" شاپ میں داخل ہوئے۔

"آپ کی کزن کی شکل جانے کیوں مجھے بہت جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔" شانزے نے کافی کا آرڈر دے کر سرمد سے کہا۔

"جانی پہچانی؟" سرمد چونکا۔ "لیکن یہ تو برٹش نیشنلٹی ہولڈر ہے اور شروع سے انگلینڈ رہی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی پاکستان آئی ہے۔" سرمد کی بات پر شانزے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے اور خاموش رہی۔

"ویسے تمہیں کیسی لگی میری کزن؟" سرمد نے اس دفعہ شرارتی انداز سے پوچھا۔

"لڑکی تو اچھی ہے۔" شانزے کو بہت کم لوگ پسند آتے تھے' لیکن اوریدا کے چہرے پر پھیلی معصومیت اسے بہت بھلی لگی تھی۔

"تمہارا بھائی اسے پٹانے کے چکروں میں ہے۔ دعا کرو بات بن جائے۔" سرمد نے غیر سنجیدہ انداز سے اسے اپنے دل کی بات بتائی۔ شانزے ایک لمحے کو حیرت کا شکار ہوئی۔

"لیکن سرمد بھائی۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا۔" سرمد پریشان ہوا۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ کھڑے کزن میں انٹرسٹڈ ہو۔" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔ اس کی بات پر سرمد بے ساختہ ہنسا۔

"ارے نہیں' دونوں کے درمیان بس اچھی دوستی ہے اور پھر ارصم کی مدر تو کبھی بھی اوریدا کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھ سکتیں۔" سرمد اندر کی بہت سی باتوں سے باخبر تھا۔

"وہ کیوں؟ اتنی اچھی اور اسٹائلش سی تو لڑکی ہے۔" شانزے کو حقیقی معنوں میں حیرانی ہوئی۔

"بس کچھ خاندانی معاملات ہیں' جس کی وجہ سے ارصم کی ماما' اوریدا کی فیملی کو پسند نہیں کرتیں۔" سرمد نے تھوڑا گھما پھرا کر بتایا۔

"پھر بہت حوصلہ ہے آپ کے کزن کا' جو اپنی مدر کی ناپسندیدگی کے باوجود اپنی کزن کو لے کر گھوم رہا ہے۔" شانزے نے صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اسے اوریدا اور ارصم کا کپل پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا' لیکن سرمد کی پسندیدگی کی وجہ سے اس نے اس بات کو اپنے دل میں ہی رکھ لیا تھا۔ وہ ایسی کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتی تھی جو سرمد کی دل آزاری کا باعث بنے۔ وہ اطمینان سے کافی پیتے ہوئے سرمد کو دیکھنے لگی جو اپنے سیل فون پر آنے والی کال پر مصروف ہو چکا تھا۔ دوسری جانب لگتا تھا کہ کوئی خاص بات کہی جا رہی تھی جسے سنتے ہی سرمد کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"ایسا کیسے ممکن ہے یار۔ انہیں سمجھاؤ۔" سرمد صدمے بھرے انداز سے کسی بندے سے مخاطب تھا۔ شانزے کو بھی کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے کیا اس پروڈیوسر کا۔" سعد ایک دم بوکھلا کر کھڑا ہوا۔ وہ اب خوف زدہ انداز سے شانزے کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"تم فون بند کرو میں تمہاری طرف آرہا ہوں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" سعد کی کافی کا کپ جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اب سیل فون پر آنے والی کسی بری خبر کے بعد وہ اسے ہاتھ لگا بھی نہیں سکتا تھا۔
"سعد بھائی کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا۔" شانزے کا دل بے ہنگم انداز سے دھڑکا۔
"تمہارے لیے ایک بری خبر ہے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیسے سناؤں۔"
سعد کی بات پر شانزے کا چلتا ہوا دل ایک لمحے کو رک سا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ خبر کیا ہو سکتی ہے لیکن اس کی سماعتیں یہ خبر سننا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے اس نے فوراً" خوف زدہ انداز سے سعد کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ سعد کو اپنے سامنے بیٹھی لڑکی پر ایک دفعہ پھر ترس آیا۔

☼ ☼ ☼
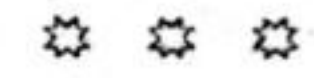
آج صبح سے بڑی اماں پورے گھر کے ملازموں پر گرج برس رہی تھیں۔ پہلے انہوں نے پورے گھر کی ایک دفعہ تفصیلی صفائی کروائی اور اب وہ لان کی جھاڑ جھنکار صاف کروا رہی تھیں۔ مالی کے ساتھ ساتھ اس کے دو ہیلپر بھی پورے لان میں بھاگے پھر رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر بڑے ابا سنجیدگی سے بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔
"غضب خدا کا پورے گھر میں مفت خوروں کی فوج اکٹھی ہوئی ہے۔" بڑی اماں اب غصے سے لان میں ٹہل رہی تھیں۔
"یہ مارشل لاء کیوں نافذ کر رکھا ہے گھر میں۔" بڑے ابا نے گود میں رکھے اخبار پر نظریں جمائے لاپروائی سے پوچھا۔ ان کی طبیعت آج بہتر تھی اور کافی دن کے بعد وہ لان کی طرف آئے تھے۔
"ان سب کو کھینچ کر نہ رکھوں تو پورے گھر میں چوہے ناچتے پھریں۔" بڑی اماں نے منہ بنا کر جواب دیا۔
"کیا کوئی خاص مہمان آرہا ہے گھر میں۔" بڑے ابا نے حیرانی سے اپنی زوجہ محترمہ کو دیکھا جنہیں اچانک ہی تفصیلی صفائی کرنے کا دورہ پڑا تھا۔
"تو یہ کہاں لکھا ہے کہ کسی کی آمد پر ہی گھر کے کونوں کھدروں میں چھپا کوڑا کرکٹ باہر نکالا جائے۔" بڑی اماں کو ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔ وہ ایک دفعہ پھر مالی پر برسنا شروع ہو گئیں۔
اسی وقت گھر کا مین گیٹ کھلا اور اوریدا کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ اب کافی اچھی گاڑی چلانا سیکھ چکی تھی۔ بڑے ابا اور بڑی اماں دونوں کی توجہ اس گاڑی کی طرف مبذول ہوئی۔ اوریدا کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر ارصم بیٹھا ہوا تھا جس نے کل ہوسٹل شفٹ ہو جانا تھا۔
"ارے بڑے ابا آپ۔" ارصم نے دور ہی سے ان کی طرف دیکھ کر خوش گوار حیرت سے ہاتھ ہلایا۔ بڑے ابا بے ساختہ انداز سے مسکرائے۔ اوریدا کے قدم تھوڑے ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہی لان میں ان کے پاس پہنچ گئے۔
"میں نے صبح تمہیں کہا تھا صغریٰ سے اپنے کمرے کے جالے اتروانا۔" بڑی اماں کو اوریدا کی شکل دیکھتے ہی یاد آگیا۔
"اوہ سوری۔ بڑی اماں ذہن سے نکل گیا تھا۔" اوریدا نے ماتھے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر خود کو کوسا۔
"کبھی خود سے بھی دائیں بائیں اور اوپر نیچے دیکھ لیا کرو۔ انتہا درجے کی پھوہڑ لڑکی ہو تم بالکل اپنی ماں پر گئی ہو اس معاملے میں۔" بڑی اماں کا مزاج خاصا برہم تھا ورنہ عام روٹین میں وہ اوریدا کو اس کی والدہ کے طعنے نہیں دیا کرتی تھیں۔ اوریدا کا چہرہ سرخ ہوا۔ بڑے ابا کے ساتھ ساتھ ارصم نے بھی حیرانی سے بڑی اماں کا ناراض چہرہ دیکھا۔
"میں صرف اپنی والدہ کی نہیں آپ کے بیٹے کی

بھی بیٹی ہوں پتا نہیں کیوں ہمیشہ آپ لوگوں کو یاد کروانا پڑتا ہے۔" اوریدا غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی لان سے گئی تھی۔
"بڑی اماں! یہ بری بات ہے۔" ارصم کے منہ سے ایک دم پھسلا۔
"تم اس کا نخرہ بھی تو دیکھو ہر وقت ہری مرچیں چبائے پھرتی ہے۔" بڑی اماں کو اس کے پلٹ کر جواب دینے کا غصہ تھا۔
"غصے میں تو وہ بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔" بڑے ابا نے بھی درمیان میں لقمہ دیا۔ ارصم اور بڑی اماں دونوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بلیو جینز پر ریڈ چیک والی شرٹ پہنے ہاتھ میں ہینڈ کیری اور ساتھ میں دو بڑے بریف کیس کے ساتھ داخل ہوتا نوجوان بڑے ابا کے ساتھ بڑی اماں کا بھی سکون برباد کر گیا۔
"تیمور۔" بڑی اماں کے منہ سے پُراسرار سی سرگوشی بلند ہوئی۔ بڑے ابا کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔ جب کہ ارصم تعجب بھرے انداز سے چوبیس پچیس سالہ ینگ فریش اور ہینڈسم سے لڑکے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ انکل تیمور کا بیٹا اور اوریدا کا بڑا بھائی ماہیر ہے جو کسی کو بھی بتائے بغیر سرپرائز وزٹ پر پاکستان آچکا تھا۔ بڑے ابا کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے بابا آخر چاہتے کیا ہیں۔" بختاور اس دن ہاشم کے ساتھ کیمپس کے لان میں بیٹھی تھی۔ بختاور اسے اپنے بابا اور گھر والوں کے رسپانس کے بارے میں تفصیلی بتا چکی تھی۔ جسے ہاشم نے بڑے سکون اور تحمل مزاجی کے ساتھ سنا تھا۔ بختاور کے بولنے کے دوران وہ ایک دفعہ بھی بیچ میں نہیں بولا تھا اور نہ ہی اس نے اس بے تحاشا بولتی لڑکی کو درمیان میں ٹوکا تھا۔ اس ساری گفتگو میں بختاور کا چہرہ کبھی غصے کی زیادتی سے سرخ کبھی صدمے کی کیفیت میں آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر جاتیں اور کبھی وہ غصے میں ناک چڑھا کر بات کرنے لگتی۔ ہاشم دلچسپی سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیات کو نوٹ کر رہا تھا۔
"مجھے خود نہیں پتا آخر وہ چاہتے کیا ہیں؟" بختاور نے جھنجلا کر لان کی گھاس اکھیڑنا شروع کر دی۔
"میرا خیال ہے انہیں ایک داماد کے طور پر میری شخصیت کچھ پسند نہیں آئی ہے۔ ہے نا؟" ہاشم نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔
"انہوں نے ڈائریکٹ تو ایسا کچھ نہیں کہا لیکن وہ فائنل فیصلہ آپ کے پیرنٹس سے ملنے کے بعد کریں گے۔" بختاور کی بات پر اس کے چہرے پر الجھن بھرے تاثرات نمودار ہوئے۔
"میرے والدین۔؟" اس نے تصدیق کے لیے دوبارہ بختاور سے پوچھا جس نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔
"لیکن انہیں میرے والدین کے بجائے مجھ سے ملنا چاہیے کیونکہ شادی تو تمہاری میرے ساتھ ہوگی۔" ہاشم نے ہلکا سا اعتراض کیا۔
"وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں معاملات بچوں کے ساتھ نہیں بڑوں میں طے کیے جاتے ہیں۔" بختاور نے سر جھکا کر خفت زدہ انداز میں کہا۔ جیسے بابا نے کوئی

بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو۔

"اور اگر کسی کے بڑے نہ ہوں یا پھر اس سے خفا ہوں تو۔۔۔؟" ہاشم کی بات پر بختاور الجھ گئی۔

"مطلب۔۔۔" اس نے جانچتی نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے کو دیکھا جس میں اسے ڈھونڈے سے ایک خامی نہیں ملی تھی 'جس کی بنا پر اسے مسترد کردیا جائے۔

"دیکھو بختاور۔۔۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا' میرے گزشتہ دو تین سالوں سے اپنے والدین سے تعلقات منقطع ہیں۔" ہاشم نے آج پہلی دفعہ ایک عجیب بات بتائی تھی۔

"تو آپ پھر چھٹیوں میں اپنے شہر کیوں جاتے ہیں۔" بختاور تعجب انگیز انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہاں پر میرا ذاتی فلیٹ ہے جس میں' میں رہتا ہوں۔" ہاشم نے اسے مزید حیران کیا۔

"ذاتی فلیٹ؟" بختاور تحیر آمیز انداز میں بولی۔

"ہاں میرے والد نے مجھے اپنی زندگی میں ہی الگ حصہ دے کر علیحدہ کردیا تھا۔ اب ان کا میرے ساتھ کوئی رابطہ نہیں۔"

"لیکن کیوں۔۔۔" بختاور کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

"بس ہمارے درمیان کچھ اختلافات ہوگئے تھے۔ جس میں میرے دونوں بھائیوں اور دونوں بہنوں نے ان کا ساتھ دیا' جس پر میں احتجاجاً "گھر چھوڑ کر آگیا۔" ہاشم اتنے سکون سے اسے ایسے بتا رہا تھا جیسے کسی اور کی کہانی سنا رہا ہو۔

"تو آپ کی اسٹڈی کا خرچ کیسے چلتا ہے؟" بختاور پریشان ہوئی۔

"میرے نام پر لاہور میں لبرٹی میں دو دو کانیں بھی ہیں' جن کا ہر مہینے کرایہ آجاتا ہے اور میں اپنے خرچ کے کچھ پیسے رکھ کر باقی رفاہی کاموں میں خرچ کردیتا ہوں۔ ویسے بھی میری ضروریات زندگی محدود ہیں۔" اس کی بات پر بختاور کو تسلی ہوئی کہ وہ معاشی لحاظ سے اتنا بھی کنگال نہیں تھا' جتنا نیلم سمجھ رہی تھی۔

"تو پھر آپ کے گھر سے ہمارے ہاں رشتہ مانگنے کون آئے گا۔" بختاور کو ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔

"کوئی بھی نہیں۔" ہاشم نے صاف گوئی سے کہا۔ "تم کہو تو میں تمہارے فادر سے مل سکتا ہوں۔" ہاشم کی بات پر وہ اچھی خاصی پریشان ہوئی' کیونکہ یہ صورت حال اسے خوش آئند نہیں لگ رہی تھی اور بابا تو ویسے ہی ہاشم کو پسند نہیں کرتے تھے اور ایسی صورت حال میں تو ان کے پاس انکار کرنے کا ایک اچھا خاصا جواز تھا۔

"بابا نہیں مانیں گے ہاشم۔۔۔" بختاور نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اضطراری انداز میں مسلتے ہوئے اسے کسی اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم اپنے بابا کو چھوڑو' یہ بتاؤ' میرے بغیر رہ لوگی۔"

وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے آزمائش میں مبتلا کر گیا۔

"نہیں۔۔۔" بختاور کی اس سوال پر قوت گویائی سلب ہوگئی اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر۔۔۔؟" اس سوال کا بختاور کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔

"تم اس سے کہو کہ اپنے والدین کو منالے۔" رات کو نیلم نے اس کی ساری بات سن کر بڑے آرام سے مشورہ دیا۔ وہ دونوں ہوسٹل میں اپنے کمرے میں موجود تھیں اور اس وقت دونوں کے ہاتھ میں چائے کے بڑے کپ تھے۔

"وہ ہاشم کو اس کا حصہ دے کر اس سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کرچکے ہیں۔" بختاور نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"لیکن کس بات پر۔۔۔" نیلم جھنجلا اٹھی۔

"میں نے پوچھا تھا' لیکن وہ ٹال گیا۔" بختاور نے شرمندگی سے سر جھکالیا تھا۔

"تمہیں اس بات کی کھوج لگانی چاہیے۔ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو ہاشم کے والدین آخری حد تک پہنچ گئے۔" نیلم اس کی طرف سے بدگمانی کا شکار ہوئی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں یار۔۔۔" بختاور حد درجہ فکرمند تھی' اسے آگے کے حالات کچھ بہتر نظر نہیں آرہے تھے۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے بختاور' کل کو یہ بات تمہارے فیوچر پر بھی اثر انداز ہوسکتی ہے۔" نیلم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر میرا مستقبل ہاشم کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔" اسے ہاشم پر اندھا اعتبار تھا۔

"بے وقوفوں جیسی باتیں مت کرو بختاور' زندگی کے معاملات میں ایسا رویہ انسان کے لیے نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔" نیلم کو اس پر غصہ آیا۔

"جو لوگ پچھلے دو سال سے خفا ہیں' وہ دو دن میں تو نہیں مان سکتے نا۔" بختاور بھی اکتاہٹ کا شکار ہوئی۔

"تو کیا تم اس کے والدین کی رضامندی کے بغیر اس سے شادی کرلوگی۔" نیلم ہلکا سا چڑ کر بولی۔

"میرے لیے ہاشم کے نہیں اپنے والدین زیادہ اہم ہیں۔" بختاور نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"روم نمبر ون سیون کی بختاور کی کال ہے۔" کوریڈور سے کسی لڑکی نے تان لگائی۔ بختاور اچھل کر کھڑی ہوئی اور ریسپشن کی طرف بھاگی۔ اسے یقین تھا کہ پی سی ایل فون کے دوسری جانب ہاشم ہوگا' کیونکہ اس کے گھر والے اس وقت اسے کال نہیں کرتے تھے۔ رات کے دس بجنے میں پورے دس منٹ باقی تھے اور اس کے بعد وارڈن نے فون کی تار نکال کر اسے بند کردینا تھا۔ ریسپشن پر اس وقت بہت کم لڑکیاں تھیں۔ پولیٹیکل سائنس کی ناجیہ اس وقت لکڑی کی میز پر بیٹھی بلند آواز میں نازیہ حسن کا کوئی گانا گنگنا رہی تھی۔

"پلیز ناجیہ مجھے آواز نہیں آرہی۔" بختاور نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر ناجیہ سے درخواست کی تو وہ چھلانگ مار کر میز سے نیچے اتر آئی۔ اس نے بختاور کی بات مان لی تھی' دوسری جانب واقعی ہاشم تھا۔

"جی ہاشم! اب کہیے۔" بختاور نے سنجیدگی سے کہا۔

"بختاور! میں نے بہت سوچا ہے اس معاملے کے بارے میں۔" وہ بولتے بولتے رکا۔ بختاور کی نگاہیں دیوار پر لگے وال کلاک کی جانب تھیں۔ پانچ منٹ کے بعد وارڈن نے اندر سے فون کی پن نکال دینی تھی۔

"پھر۔؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم دونوں کو کسی کو بھی بتائے بغیر کورٹ میرج کر لینی چاہیے۔" ہاشم نے گویا اس کے کانوں میں صور پھونکا تھا۔ بختاور کے ہاتھوں سے ریسیور چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔ وہ خوف زدہ انداز سے ریسیور کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس میں سے ہاشم نکل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہو۔

اسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس نے گھبرا کر ریسیور کو اٹھایا وہ اسے فوراً" انکار کرنا چاہتی تھی لیکن دوسری طرف دس بج چکے تھے اور فون خاموش ہو چکا تھا۔ بختاور' مریم ہال میں گزری اس رات کے بارے میں جب بھی سوچتی تھی تو بے شمار پچھتاوے اس کا دامن پکڑ لیتے۔ وہ ہمیشہ یہ ہی سوچتی کہ کاش اس رات فون بند نہ ہوا ہوتا' جس نے اس کی قسمت کے دروازے اس پر بند کرتے ہوئے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی مفلوج کر دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آپا صالحہ کی بیماری لمبی ہو گئی تھی۔ انہیں اسپتال آئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے۔ آپا کا بی پی کسی طور بھی کنٹرول میں نہیں آ رہا تھا اوپر سے عدینہ کی شکل دیکھتے ہی انہیں غصہ آنے لگتا۔ تنگ آ کر عدینہ باہر کوریڈور میں نکل آئی اور اب اسے اس وقت تک یہیں کھڑے رہنا تھا جب تک آپا دواؤں کے زیر اثر نیند میں نہیں چلی جاتی تھیں۔

"آپا کی طبیعت تو سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔" مونا بھی اس کے پیچھے کوریڈور میں نکل آئی' اب آپا کے پاس بے بے تھیں۔

"لیکن آج چھٹی مل جائے گی' میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے۔" عدینہ نے اسے دلاسا دیا۔

"کاش آپ ڈاکٹر ہوتیں تو گھر میں ہی آپا کا علاج ہو جاتا۔" مونا کے حسرت آمیز انداز پر عدینہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی اور اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ لیڈی ڈاکٹرز کو دیکھتے ہی آپا کیوں بے چین ہو جاتی ہیں۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ آپا اگر اسپتال میں رہیں تو ساری زندگی ٹھیک نہیں ہوں گی۔ اس نے دل ہی دل میں گاؤں واپس جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

"کیا آج ہم واپس چلے جائیں گے۔" مونا کی سوالیہ نگاہوں پر وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"بس آپا کی ڈرپ ختم ہو جائے اور تھوڑا بی پی نارمل ہو جائے تو نکلتے ہیں۔" عدینہ نے سامنے سڑک پر موجود ٹریفک کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ عام سے انداز سے لوگوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم ہی اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی اور اسے شاک سا لگا۔

"مونا۔۔۔" عدینہ نے وحشت زدہ انداز سے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا' اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔

"کیا ہوا عدینہ باجی۔۔۔" مونا بھی گھبرا گئی۔

"عبداللہ۔۔۔" عدینہ کے ہونٹوں سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے۔

"کہاں۔۔۔" مونا کا بھی دماغ بھک کر کے اُڑا۔

"نیچے۔۔۔" عدینہ شاکڈ نگاہوں سے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جس کا سائیڈ پوز نظر آ رہا تھا۔ مونا بوکھلا کر کھڑکی سے باقاعدہ نیچے جھک گئی۔ سامنے فٹ پاتھ پر نیلے رنگ کے کاٹن سوٹ میں مہران گاڑی کا دروازہ کھولتا وہ شخص عبداللہ ہی تھا۔ وہ بھی کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی اور بدحواس انداز سے عدینہ کو دیکھنے لگی' جو بجلی کی سی تیزی سے بھاگتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔ عدینہ کو سمجھ آ گئی تھی وہ عبداللہ کے پاس جا رہی تھی۔ مونا بھی گھبرا کر اس کے پیچھے لپکی۔ دونوں کو ہی ایک خوف لاحق تھا کہ وہ کہیں ان سے پہلے گاڑی اسٹارٹ کر کے نکل نہ جائے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

یہ اکثر سوچتا ہوں بھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیلِ گریہ ہوگا
اگر بادیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظ ان سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

حفیظ ہوشیارپوری

نہ جانتے ہوئے بھی گزاری ہے زندگی
ہم زندگی کے ہیں نہ ہماری ہے زندگی

دریافت ہو رہے ہیں ستارے نئے نئے
شاید یہی ستارہ شماری ہے زندگی

ہم کوئی زندگی کے لیے ناگزیر ہیں؟
یہ بات بھی بہت ہے کہ جاری ہے زندگی

رُکتی نہیں بڑے سے بڑے انقلاب پر
وقتی تاثرات سے عاری ہے زندگی

بہتی ہوئی ندی پہ کسے اختیار ہے
میری ہے زندگی نہ تمہاری ہے زندگی

علم و ہنر کی قدر بھی ہوتی تو ہے شعور
پیسہ نہ ہو تو ذلت و خواری ہے زندگی

انور شعور

خرابی

رمضان نے نئی نئی گاڑی خریدی اور ابھی ڈرائیونگ سیکھ ہی رہے تھے کہ ایک روز شاہ جی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد رمضان نے گویا کان لگا کر سننے کے بعد شاہ جی کو مخاطب کیا۔

"آپ یہ ٹھک ٹھک کی آوازیں سن رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس گاڑی کے رنگ پسٹن خراب ہیں۔"

"یہ رنگ پسٹن کی نہیں' بار بار ڈیش بورڈ سے میرے گھٹنے ٹکرانے کی آواز ہے۔" شاہ جی نے ذرا ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

نمو خان۔ کراچی

تصدیق

پولیس نے ڈاکوؤں سے مقابلے کے بعد جنگل کا محاصرہ ختم کیا تو ڈی ایس پی صاحب نے انسپکٹر سے پوچھا۔

"تمہاری نفری تو پوری ہے نا؟" انسپکٹر نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈی ایس پی صاحب پھر ذرا تشویش سے بولے۔

"تم نے اچھی طرح گنتی کرلی ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں نے خوب اچھی طرح گنتی کرلی ہے۔" انسپکٹر نے پورے وثوق سے کہا۔

"شکر ہے۔" ایس پی صاحب نے اطمینان کی سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے میں نے جس بھاگتے ہوئے سائے کو گولیاں ماری تھیں وہ ڈاکو ہی تھا۔"

اقرا طیب۔ لاہور

خصوصیت

ایک انتہائی بد مزاج اور خشک آدمی کا انتقال ہوگیا۔ پورے محلے میں انہوں نے کبھی کسی سے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی' نہ کوئی اچھا کام کیا تھا۔ انتقال کے موقع پر لوگ مرنے والے کی اچھائیوں اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں' مگر تمام لوگ خاموش بیٹھے رہے کہ مرحوم نے کسی سے اچھا سلوک کیا ہو تو کوئی خوبی بیان کرتا۔ جب سب چپ رہے تو محلے کا حجام ہمت کرکے بولا۔ "مرحوم میں ایک خوبی تھی کہ ان کی داڑھی کے بال سخت نہیں تھے۔ حجامت آسانی سے بن جاتی تھی۔"

اقصیٰ شفیع۔ خانیوال

گدھا

دو صاحبان ایک ہی لڑکی سے شادی کے خواہش مند تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان تھا' جبکہ دوسرے صاحب خاصی بڑی عمر کے تھے۔ ایک روز اتفاق سے دونوں ہی آگے پیچھے لڑکی کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت چائے کا دور چل رہا تھا' جب نوجوان نے اپنی دانست میں بڑی عمر کے صاحب کو خجل اور شرمندہ کرنے کے لیے پوچھا۔

"بائی داوے آپ کی عمر کیا ہوگی؟"

"مجھے صحیح طور پر تو یاد نہیں۔" وہ صاحب ذرا بھی پریشان ہوئے بغیر بولے۔ "لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ گدھا بیس سال کی عمر میں ساٹھ سال سے زیادہ بوڑھا شمار ہوتا ہے۔"

جواب

میڈم اسٹیل فرانس کی ذہین ترین مصنفہ تھی' لیکن نسائی کشش سے محروم تھی۔ ایک تقریب میں سوائے موسیو ٹیلی اینڈ کے جو بالکل اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ تمام مرد مہمان اسے چھوڑ کر ایک مشہور حسینہ کے استقبال کے لیے چلے گئے۔ اس پر میڈم اسٹیل نے موسیو ٹیلی اینڈ سے پوچھا۔

موسیو ٹیلی اینڈ! مجھے اس کا جواب دیانت داری سے دینا۔ اگر آپ' یہ حسینہ اور میں ایک کشتی پر سوار ہوں اور طوفان میں کشتی الٹ جائے تو آپ اس حسینہ کو بچائیں گے یا مجھے؟"

موسیو ٹیلی اینڈ نے ایک لمحہ سوچا اور جھک کر جواب دیا۔

"آہ میڈم! آپ تو بہت اچھا تیر لیتی ہیں۔"

حکمت عملی

کیمپ کا کمانڈنگ افسر نہایت غیض و غضب کے عالم میں اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ اسپتال کے کمانڈر کو فون کیا اور للکارا۔

"کرنل ابھی میں تمہارے اسپتال کے ایک نوجوان میڈیکل افسر کے پاس سے گزرا تھا جس نے مجھے سلیوٹ نہیں کیا اور جب میں نے اسے روکا کہ اسے فوجی آداب یاد دلاؤں تو اس کا ڈریس اور اس کی حرکات اور انداز دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا' اس کے بوٹ بغیر پالش کے تھے۔ اس کی وردی میں سلوٹیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس نے کئی دن سے شیو بھی نہیں کی۔ سر کے بالوں کو حجامت کی ضرورت تھی۔ میں اپنی کمانڈ میں ایسے افسر کا وجود بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ اسے فوراً" کیمپ کے ماہر نفسیات کے پاس بھیجا جائے۔"

اسپتال کے کمانڈر نے جواب دیا "جناب یہی کیمپ کا ماہر نفسیات ہے۔"

بے قصور

نھو کی شادی ایک خوب صورت لڑکی سے ہوئی تھی' جو شادی کے بعد بارہ برسوں میں بارہ بچوں کی ماں بن گئی اور نھو کی مالی حالت روز بروز خراب تر ہوتی گئی۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو دو وقت کی روٹی بھی فراہم نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی بیوی دن بھر لوگوں کے گھروں میں کام کاج کرکے بڑی مشکل سے بچے پالتی تھی۔

ایک روز نھو کو اپنی زندگی پر بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ اس نے چھت کے کنڈے میں پھندا لٹکایا اور رات کے پچھلے پہر جب بیوی' بچے سوئے ہوئے تھے خودکشی کرنے لگا۔ پھندا ڈالنے سے پہلے وہ بڑبڑایا۔

"میں کسی کام کا انسان نہیں ہوں۔ مجھے مرہی جانا چاہیے میں نے اپنی بیوی کو کیا دیا ہے۔ سوائے بارہ بچوں کے۔"

اس کی بیوی کی عین اس وقت آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے چلائی۔

"نھو! خودکشی نہ کرنا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

ہمت کی ضرورت

کچھ کام بظاہر تو معمولی ہوتے ہیں مگر انہیں پورا کرنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک پارٹی میں کھانے اور چائے کا دور چل چکا تو سب نے تقریریں کیں' مگر سب سے زیادہ تالیاں ساجد صاحب کی تقریر پر بجیں۔ لوگوں نے انہیں اتنی داد دی کہ انہیں خود اٹھ کر لوگوں کو خاموش کروانا پڑا۔ دراصل ان کی تقریر جتنی مختصر تھی اتنی ہی زیادہ پسند کی گئی۔

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ وہ تقریر بتاؤں تاکہ وہ بھی ایسی اچھی تقریر کرنا سیکھ لیں۔ لیکن ایسی تقریر کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی تقریر صرف ایک جملے پر مشتمل تھی۔

"آج کی پارٹی کا بل میں ادا کروں گا۔"

باتوں سے خوشبو آئے

شگفتہ شاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اپنا عذاب اتارتا ہے تو اس قوم کے سب لوگ عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں (اچھے ہوں یا برے) پھر قیامت کے دن ہر ایک کا حشر اس کے اعمال کے مطابق ہوگا۔"

(بخاری)

صدقہ کی برکت،

حضرت سالم ابن ابی المعبد سے روایت ہے کہ حضرت صالح کی قوم میں ایک شخص تھا، جو لوگوں کو تکلیف دیتا تھا۔ لوگوں نے کہا۔

"اے اللہ کے نبی! اس پر بددعا کر دیجیے۔"

انہوں نے جواب دیا۔ "جاؤ تم لوگ اس کے شر سے بچالیے جاؤ گے۔"

یہ ہر دن لکڑیاں چننے نکلتا تھا۔ ایک دن لکڑیاں چننے نکلا۔ اس کے پاس دو روٹیاں تھیں۔ ایک خود کھائی دوسری صدقہ کر دی۔ اور لکڑیاں چننے لگ گیا اور شام کو صحیح سالم واپس آگیا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ قوم حضرت صالح کے پاس آئی اور کہا۔

"وہ تو روز صحیح سالم واپس آجاتا ہے۔ اس کو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

حضرت صالح نے اس کو بلایا اور پوچھا۔

"تم روز کیا کرتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "میں لکڑیاں چننے جنگل جاتا ہوں۔ دو روٹیاں میرے پاس ہوتی ہیں۔ ایک خود کھا لیتا ہوں دوسری صدقہ کر دیتا ہوں۔"

حضرت صالح نے فرمایا۔ "لکڑی کا گٹھڑ کھولو۔"

گٹھڑ کھولا تو اچانک ایک بڑا اژدہا نکلا۔ جو لکڑی کے گٹھڑ سے چپکا ہوا تھا۔ حضرت صالح نے فرمایا۔

"اسی صدقے کی وجہ سے یہ بلا ٹلی ہے۔"

توحید کی طاقت،

ایران پر چڑھائی کے لیے جب مسلمانوں کا لشکر گیا تو راستے میں دریا آگیا۔ حضرت سعدؓ نے لشکر سے فرمایا۔

"تم جس خدا کے بندے ہو، اسی کے قبضہ قدرت میں یہ دریا ہے۔ اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دو۔"

چنانچہ سب صحابہ کرام نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور تیرتے ہوئے دریا عبور کر گئے۔

ایک صحابی کا پیالہ دریا میں گر پڑا۔ دوسروں نے کہا کہ اس کو پکڑ لو۔ انہوں نے فرمایا۔

"اگر پیالہ میرا ہوا تو یہ نہیں ڈوبے گا۔" (اللہ اس کی حفاظت فرمائے گا۔) چنانچہ دریا کی موجوں نے پیالے کو دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔ جب وہ صحابی وہاں پہنچے تو پیالہ وہاں پڑا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں قلب کی قوت سے ہوتی ہیں اور قلب کی قوت توحید سے ہوتی ہے۔ شرک سے دل میں تذبذب آجاتا ہے۔

بہترین اعمال،

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔

"بہترین اعمال تین ہیں۔ ذکر الٰہی، بھائیوں سے ہمدردی اور آدمی کا اپنے نفس سے انصاف۔"

فرمایا۔ "ریا کو صرف مخلص ہی پہچان سکتا ہے۔"

اصل بات،

حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں۔

"اللہ کو ماننا اصل بات نہیں کیونکہ اللہ پاک اپنی قدرت اور شان سے خود کو منوا لیتا ہے۔ اصل بات تو اللہ کی مان لینے میں ہے جس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔"

طیبہ سعدیہ عطاریہ۔ کھٹیالہ

خلیل جبران کی ایک نظم،

میرے دوستو! قابل رحم ہے وہ قوم جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں لیکن دل یقین سے خالی ہے۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو ایسے کپڑے پہنتی ہے جن کو اس نے خود نہیں بنا۔ جو ایسی روٹی کھاتی ہے جس کے لیے گندم اس نے خود نہیں اگائی۔ (ایسی شراب پیتی ہے جو اس کے اپنے مے خانوں میں نہیں ملتی۔)

قابل رحم ہے وہ قوم جو بڑھکیں لگانے والوں کو اپنا ہیرو بنا لیتی ہے اور جھکی تلوار لے کر آنے والوں کو اپنا داتا سمجھتی ہے۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو بظاہر حالت خواب میں بھی ہوس اور لالچ سے نفرت کرتی ہے لیکن حالت بیداری میں مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو جنازوں کے جلوس کے علاوہ کہیں اپنی آواز بلند نہیں کرتی۔ اور اپنے ماضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی اور سامان نہیں۔ اور اس وقت تک آواز احتجاج بلند نہیں کرتی تا آنکہ اس کی گردن تلوار تلے نہ آجائے۔

قابل رحم ہے وہ قوم جس کے نام نہاد سیاست دان لومڑیوں کی طرح مکار اور دھوکے باز کے سوا کچھ نہیں ہوتے

اور جس کے دانش ور محض شعبدہ باز اور مداری، جن کے فنون کا عالم یہ ہے جیسے مسخروں کی جگت بازیاں اور بھانڈوں کی نقلیں۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو اپنے نئے حکمرانوں کے راستے میں ہار لیے کھڑی ہوتی ہے۔ جب وہ اقتدار سے محروم ہوں تو ان پر آوازے کستی اور ان کا تمسخر اڑاتی ہے اور عین اس وقت بھی پاس بات کے لیے آمادہ رہتی ہے کہ یا اقتدار سے جائیں تو ڈھول پیٹے بینڈ باجے بجا کر انہیں رخصت کریں۔

قابل رحم ہے وہ قوم جو ٹکڑوں اور قومیتوں میں بٹ چکی ہے اور جس کا ہر طبقہ اپنے آپ کو پوری قوم سمجھتا ہے۔

(ترجمہ: ۔ فیض احمد فیض)

اقوال حکیم بقراط،

- جس چیز کے نہ جاننے سے شرمندگی ہو، اسے ضرور جاننا چاہیے۔
- جس دروازے سے شک اندر آتا ہے، محبت و اعتماد اسی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔
- بہت بڑا اور خطرناک مرض وہ ہے جسے معمولی سمجھا جائے اور اس کے علاج پر توجہ نہ دی جائے۔

واپسی کا راستہ کھلا رکھو،

ایک جھیل کے خشک ہونے پر دو مینڈک نئی جگہ کی تلاش میں نکلے جہاں پانی موجود ہو۔ تلاش پر انہیں ایک کنواں نظر آیا۔ ایک مینڈک نے دوسرے سے کہا۔

"چلو اس میں چھلانگ لگائیں۔"

دوسرے نے کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن اگر یہاں بھی پانی خشک ہو گیا تو پھر باہر کیسے نکلیں گے؟"

کوئی کام شروع کرنے سے پہلے یہ ایک عمدہ نصیحت ہے۔

کتابیں،

- اچھی کتابیں بہترین دوست ہیں۔
(علامہ اقبال)

- بری کتابیں روح کو مار ڈالتی ہیں۔
- کتابیں ہمیں نہ صرف زندگی کی سیر کرا سکتی ہیں بلکہ گزری ہوئی باتیں بھی بتاتی ہیں۔
(حکیم محمد سعید)

ثمرہ، اقرأ۔ کراچی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

سونیا شاہ ______ جڑانوالہ

باتوں میں پہلی سی کوئی بات نہیں ہے
ملتے ہیں مگر لطفِ ملاقات نہیں ہے

زہرا شاہد ______ لودھراں

محبت ایک خوشبو ہے ہمیشہ ساتھ چلتی ہے
کوئی انسان تنہائی میں کبھی تنہا نہیں رہتا

نوشابہ منظور ______ بھریا روڈ

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا

آمنہ اسحاق ______ ملتان

تجھ کو سوچوں تو ایسا لگتا ہے
جیسے خوشبو سے رنگ ملتے ہیں
جیسے صحرا میں آگ جلتی ہے
جیسے بارش میں پھول کِھلتے ہیں

کوثر خالد ______ رحمن گڑھ

یوں بھی کرتا ہے بھلا کوئی چاہنے والوں پہ ستم
نہ اشارہ، نہ کنایہ، نہ عنایت نہ سلام

انجل بخشی ______ ڈہرکی

خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی

ملیحہ خان ______ کراچی

نہ ختم ہو جو کبھی، وہ داستان ہوئی ختم!
جھپک رہی ہیں ستاروں کی آنکھیں اب کے جاگتی

انعم ملک ______ چک بھریاں

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کرکے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

کشمالہ داؤد ______ لاڑکانہ

بے سہاروں کی محبت بے نواؤں کا خلوص
آہ یہ دولت کہ انسانوں نے ٹھکرائی بہت

مہ ناز ______ میر پور خاص

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا
ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مسرت شہزاد ______ ٹنڈو الہ یار

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے
ہم اسی آگ میں گمنام سے جل جاتے ہیں
جب بھی آتا ہے تیرا نام میرے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ میرے نام سے جل جاتے ہیں

عمرانہ جمیل ______ برنالی

عداوتیں تھیں، تغافل تھا، رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا بے وفائی نہ تھی

ایرج حسین ______ گجرات

تیرے بنا جو عمر بتائی، بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

اُفق احمد ______ منڈی بہاؤالدین

آج کی بارش بھی تیرے درد کی طرح ہے
ہلکی ہلکی ہے پر ہوتی جا رہی ہے

ناہید جمیل ______ سانگلہ ہل

بند مٹھی سے گرتی ریت کی مانند
وہ نکل گیا زندگی سے ذرا ذرا کر کے

آسیہ جمیل خان ______ ڈہرکی

چاند جب دُور اُفق میں ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

یاسمین زہرا ______ میانوالی

آج بھی میری عادتوں میں شامل ہے
تیرے کوچے سے ہو کر گھر جانا

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی سلامتی' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

14 اگست 1947 برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے' جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔ قدرت کی عطا کردہ سب سے بڑی نعمت ہماری شناخت ہمارا پیارا وطن جو دنیا بھر میں ہماری واحد جائے پناہ ہے۔
اللہ تعالیٰ پاکستان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اور پاکستان کے خلاف سازشیں کرنے والوں کو ان کے ارادوں میں ناکام اور دنیا میں بدترین انجام سے دوچار کرے۔ آمین۔

پہلا خط حافظ آباد سے صائمہ مشتاق کا ہے' لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے شعاع کے تیس سال پورے ہونے پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ شعاع آج جس مقام پر ہے' اس کے لیے آپ کا پورا ادارہ خراج تحسین کا حق دار ہے۔ گھر بھرے دن ہوں یا جھلساتی گرمی' سردیوں کی چھاتی ہوئی ٹھنڈ ہو یا گرمیوں کی لو۔ شعاع کبھی دیر سے ہم تک نہیں پہنچا۔ اس کو خوب سجا سنوار کر اور پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت بنانے کے لیے جس قدر محنت کرتے ہیں آپ لوگ' اس کے لیے سلام ہے آپ کی جدوجہد کو' یقیناً" آپ لوگوں کے ساتھ بھی خوشی اور غمی کے معاملات ہوتے ہیں۔ اس سب کے باوجود بہترین کہانیوں کا چناؤ' ان کی تصحیح و اصلاح اور پھر سینکڑوں خطوط اور ہر خط کو ایک جیسی توجہ اور محبت سے پڑھنا' ہمارے دل میں آپ لوگوں کی محبت کو اور بڑھاتا ہے۔ کراچی جیسے شہر میں رہ کر ہر ماہ کسی بھی چیز کی پروا نہ کرتے ہوئے سوائے لاکھوں منتظر قارئین کی' شعاع کی روشنی کو ہر طرف پھیلانا بہترین کار خیر ہے' جس کے اجر عظیم کے لیے دل سے دعاگو ہوں۔
اس ماہ سرورق کے رنگ بہت دیدہ زیب تھے۔ "تعویذ حب" میں شہرام کی تکلیف کو ایمل رضا نے بہت خوب صورت انداز میں قلم بند کیا۔ بیانکا کو اچانک اپنی خوب صورتی کا احساس ہو گیا ہے۔ کیا کرنے جا رہی ہیں محترمہ؟
شفق افتخار کا ناول بھی اچھا تھا۔ برا مت مانیے گا۔ اصل میں اس سچویشن اور موضوع پر اتنے ناول پڑھ چکے ہیں کہ لفافہ دیکھ کر مضمون بھانپنے والی بات ہو گئی ہے' لیکن آپ کا طرز اسلوب اچھا ہے۔ یقیناً" آئندہ بھی آپ کی کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہیں گی۔

جی زرنین آرزو! ناول تو جو تھا سو تھا۔ مجھے یہ بتائیں اتنے اچھے مکالمے کہاں سے آئے ذہن میں؟ ہانیہ کی سسرال میں چلتی زبان اور اس زبان سے نکلتے گولے' مزہ آگیا۔ اتنے برجستہ مکالمے... کمال ہی کر دیا۔ "سیاہ حاشیہ" میں مزید کردار متعارف کروا کر ہمارے تجسس اور کہانی میں دلچسپی کو بڑھا دیا گیا ہے۔ شانزے کا بس ایک ہی سین؟ مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔ مصباح نوشین کافی عرصے بعد آئی ہیں۔ "محبت جاوداں ہے"۔ ہلکی پھلکی کہانی پڑھ کر مزہ آیا۔ قانتہ رابعہ جب بھی آتی ہیں دل چھو لیتی ہیں۔ رمضان کی فضیلت پر اتنی عمدہ کہانی تھی۔ جزاک اللہ۔ "وسیع دستر خوان" کی اصطلاح بہت اچھے طریقے سے سمجھا دی آپ نے قانتہ۔ آخری پیراگراف تو بہت متاثر کن تھے جن سے بہت کچھ سیکھا۔ اللہ آپ کو بہترین اجر دے۔ آمین۔
سحر ساجد نے اس بار بھی "زم زم" کے ذریعے خوب بہترین پیغام دیا۔ نادیہ جہانگیر! عجیب اتفاق ہے ناکہ پچھلے پندرہ دنوں سے میں آپ کو یاد کر رہی تھی کہ ایک نادیہ جہانگیر ہوتی تھی۔ جانے کہاں گم ہو گئی اور جب شعاع کھولا تو افسانوں میں آپ کا نام دیکھ کر بے ساختہ مسکراہٹ نے لبوں کو چھو لیا۔ شاباش نادیہ۔ اب آئی ہو تو پھر سے غائب مت ہو جانا۔
"عید سبق" میں ذخیرہ الفاظ اور طرز اسلوب منفرد اور بہت عمدہ تھے۔ لڑکی کا نام بھی منفرد تھا۔ پہلی بار پڑھا ایسا نام۔ "تشنہ جبیں" "اس تشنہ کو سیرابی کا مزہ چکھانے کا سارا سہرا تو سربزی انجم کے سر جاتا ہے۔ اگر باقیوں کی طرح وہ بھی کھسک جاتے تو؟ فریدہ آپ نے بہت اچھا پیغام دیا کہ خوشیاں بانٹنے سے اور بڑھتی ہیں اور جناب پورے شمارے میں بس یہی ایک افسانہ تھا جو عید سے متعلق تھا۔ نیا سلسلہ جو آپ نے شروع کیا ہے وہ بہت اچھا ہے' مگر میرے کسی کام کا نہیں فی الحال۔ "بندھن" میں نازیہ کنول نازی سے ملاقات اچھی رہی۔ ج۔ صائمہ! آپ کی حوصلہ افزائی اور دعاؤں کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

نازیہ کنول نازی کی تصاویر کے لیے ایک وضاحت کر دیں۔ نازیہ نے تصاویر اشاعت کے لیے شاہین رشید کو نہیں دی تھیں' غلط فہمی کی بنا پر شائع کر دی گئیں۔

ستارہ امین کومل پیر محل سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

آپ سب قارئین' لکھاری بہنوں' ادارے کو شعاع اور پاکستان کی سالگرہ بے حد مبارک ہو۔ میں سالگرہ کے موقع پر اپنی بہت پیاری ساجدہ حبیب کو یاد کروں گی' خدارا واپس آجائیں۔ اس خوشی کے لمحات میں' میں اپنی تمام لکھاری بہنوں کو شکریہ بولوں گی جن کی تحریریں ہماری راہ نمائی کرتی ہیں۔ امثل آپی سے کہیں سائرہ رضا کی کوئی تحریر مت روکا کریں وہ بہت اعلا پائے کا لکھتی ہیں' آپ سب کے لیے اک خوش خبری میری پیاری دوست ادی سحرش خان بھٹو اگلے ناول پر کام کر رہی ہیں۔ ان شاء اللہ پھر جلد پڑھیں گے۔ نازیہ کنول نازی کو زندگی کے اس حسین سفر کی بے حد مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ شاد و آباد رکھیں۔
ج۔ پیاری ستارہ! آپ کو بھی شعاع کی سالگرہ مبارک ہو۔ شعاع کی کامیابی آپ لوگوں کی کامیابی ہے' آپ کی محبتوں نے ہمیں شعاع کو خوب سے خوب تر بنانے کا حوصلہ دیا۔ سحرش خان بھٹو آپ کی دوست ہیں تو انہیں کہیں کہ وہ ہمیں اپنا ایڈریس بھجوا دیں۔ ہمارے پاس ان کا ایڈریس نہیں ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

مسز الیس کے حسین نے مارگلہ ٹاؤن اسلام آباد سے لکھا ہے۔

مجھے آپ کے ادارہ سے شائع ہونے والے خواتین اور شعاع بے حد پسند ہیں اور میں یہ رسالے ان کے اجراء سے لے کر آج تک بہت پابندی سے پڑھ رہی ہوں۔ شعاع بہت کار آمد رسالہ ہے۔ اور قیمت بہت کم یعنی کہ 60 روپے' اتنے حجم کا رسالہ انڈیا میں ڈیڑھ دو سو میں ملے گا۔ انڈیا میں لکھاریوں کو بہت کم اجرت ملتی ہے' لیکن وہ اس پر راضی برضا ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ ملک و قوم کی بھلائی میں صحافیوں کا ہاتھ ہوتا ہے اس لیے بغیر معاوضہ کے لکھنا ثواب ہے۔ ان کی یہ صفت مجھے پسند ہے کہ وہ اپنے ملک کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ 91 میں میں انڈیا گئی تھی ان دنوں وہاں پر بجلی کا خطرناک بحران تھا۔ اس بحران کو شکست دینے کے لیے مرد عورتیں' بچے بوڑھے کمر کس کر میدان میں اتر پڑے۔ انہوں نے الیکٹرک مشینری لاک اپ کر دی' ہاتھ سے چلنے والی واشنگ مشینیں بنالیں اور استریاں کوئلوں سے چلنے لگیں۔ مٹی کے دیوں میں ڈیزل ڈال کر جلاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ انڈیا میں بجلی ابھی آئی ہی نہیں۔ عبارت مختصر' ان کی کوششیں کام کر گئیں پھر نئی صدی کے آغاز میں دوبارہ انڈیا گئی تو انڈیا جگ مگ کر رہا تھا اور غریبوں کے ہاں بھی الیکٹرک کینڈل کا استعمال ہو رہا تھا۔ ہمارے ہاں انڈیا کے برے کاموں کی نقل فوراً" اتاری جاتی ہے' وہاں پر عریانی بہت بڑھ رہی ہے۔ ان کی نقل میں ادھر بھی لڑکیاں بے لباس ہو رہی ہیں۔ دراصل ہمسایہ ملک میں حب الوطنی کا جذبہ ہے۔ جو مسلمانوں کا شیوہ ہے۔ اور خدا تعالیٰ کا حکم بھی۔

مگر ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ عوام بہت شوق سے اپنے ووٹ کا استعمال کر کے اپنے لیے سربراہ مملکت چنتے ہیں اور پھر چند روز بعد

اس کے خلاف ہو جاتے ہیں جیسے کہ آنے والا اپنے ساتھ الہ دین کے چراغ والا جن لے کر آیا تھا جو راتوں رات بڑے بڑے ڈیم تعمیر کرا دیتا' ملک سنبھالنا گڈے گڑی کا کھیل نہیں۔ کچھ وقت تو لگے گا۔ پاکستان بہت خوب صورت اور زرخیز ملک ہے۔ ہمارے ملک کا کیلا اور آم دنیا بھر میں نمبر 1 ہیں' میں آپ کے رسالہ کے بارے میں لوگوں سے بات کرتی ہوں۔ اکثر نے یہ بات بتائی ہے کہ انہیں باقی آئندہ سخت ناپسند ہے۔ سات سے زیادہ قسطیں نہیں ہونی چاہئیں۔ زیادہ تر قارئین کو آسیہ رزاقی بے حد پسند ہیں' مجھے بھی ان کی تحریر حد سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ مجھے فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد بھی بہت پسند ہیں۔

ج۔ مسز حسین! آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ بلاشبہ پاکستان کو قدرت نے ہر نعمت سے نوازا ہے' لیکن ہم لوگ ناشکری سے باز نہیں آتے اور پاکستان کی برائی تو لگتا ہے جیسے فیشن بن گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ وہ لوگ شکایت کرتے نظر آتے ہیں جنہیں ہر نعمت' ہر سہولت میسر ہے۔ جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔

طاہرہ ملک جلال پور پیروالہ سے شرکت کر رہی ہیں' لکھا ہے۔

شعاع میں تو اس بار دو دو سرپرائز تھے ایک سمیرا حمید کا "روبرو" میں تب سوال شامل کرنا جب ہم امید ہی چھوڑ چکے تھے اور دوسرا مائی سوئٹ اینڈ کیوٹ نازیہ کنول نازی کا بندھن میں آنا۔ نازیہ کنول نازی جی اس خوب صورت بندھن میں بندھنے پر بہت بہت مبارک ہو' میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ اسی طرح خوش اور مطمئن رہیں۔

شعاع کا ٹائٹل ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ پیاری پیاری باتوں سے دل کو خوش کرتے ہوئے اپنے فیورٹ ناول تک پہنچے۔ رخسانہ نگار جی! پلیز کچھ تو زیادہ لکھا کریں' بہت چھوٹی قسط ہوتی ہے۔ "قدر دان" فائنہ رابعہ بہت ہی لاجواب افسانہ تھا آپ کا۔ "ہیرا اور پتھر" بہت ہی اچھا ناول تھا۔ "زم زم" اچھی کاوش تھی' تعویذ حب "ایمل رضا" لاجواب ناول لکھ رہی ہیں۔

"عید سبق" بڑی انجم کو دادو دینی پڑے گی جس نے تشنہ جیسی لڑکی کو سدھار دیا "سیاہ حاشیہ" میں شانزے میرا خیال ہے بے عدینہ ہی ہے جو ہرٹ ہو کے ڈاکٹری اور گھر والوں کو چھوڑ آئی ہے۔ ارحم اور ید افنا سنک کپل' ضد میں آکے اور ید امیڈیکل کور کرے گی۔ ڈاکٹر بینش پتا نہیں کیوں چڑتی ہیں اتنا۔ "رقص بسمل" نبیلہ عزیز کا ٹاپ کلاس ناول ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" زبردست سلسلہ شروع کر رہی ہیں۔ لیکن ہم تو شرکت نہیں کر سکتے۔ سمجھا کریں نا کیوں کہ ابھی منگنی' شادی سے کوسوں دور ہیں۔

ج۔ پیاری طاہرہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔ نئے سلسلے میں ابھی آپ شرکت نہیں کر سکتیں' لیکن بہت جلد وہ وقت آئے گا جب آپ بھی اس سلسلے میں شرکت کریں گی۔ (ان شاء اللہ)

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماریہ کرن' رکن ضلع منڈی بہاؤالدین سے لکھتی ہیں۔

شعاع سارے کا سارا ہی پسند ہے۔ نمرہ آپی موسٹ فیورٹ ہیں' مگر ان سے ایک شکایت ہے (چھوٹی سی) وہ اپنے ہر ناول میں چچا' تایا زاد کو کیوں بدنام کرتی ہیں۔

ج۔ پیاری ماریہ! خوش آمدید اور دعائیں۔ ناول لکھا ہے تو اور بھجوائیں' لیکن مکمل بھجوائیں۔ قسطوں میں نہیں۔ نمرہ نے ہمیشہ متنوع موضوعات پر لکھا ہے اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں۔

ارم کمال۔ فیصل آباد سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے۔

شعاع کا ٹائٹل عید کی مناسبت سے بہت زبردست تھا۔ نازیہ کنول نازی کو ان کی شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ ماشاء اللہ وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں' میں تو سو جان سے ان پر عاشق ہو گئی۔ سلسلے وار ناول "ایک تھی مثال" نے سانسیں روک رکھی ہیں جبکہ "رقص بسمل" کچھ خاص رنگ نہیں جما رہا۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم چوہدری کا اے ون جا رہا ہے' دیگر تحریروں میں "تھمن چکر" "قدر دان" بہت ہی پُراثر تحریریں تھیں' سائرہ رضا کی اس دفعہ کوئی تحریر نہیں تھی' میں تو ابھی تک "خالی آسمان" کی گرفت میں ہوں' سائرہ رضا کا قلم بہت ہی لازوال شاہکار تحریر کرتا ہے۔

ج۔ ارم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ڈاکٹر عمارہ مریم نے نشتر اسپتال ملتان سے لکھا ہے۔

یہ خط میں اس وقت لکھ رہی ہوں جب میں نے جولائی کے شعاع کی ایک جھلک تک نہیں دیکھی۔ وجہ تسمیہ بھی یہی ہے اس خط کے لکھنے کی۔ 28 تاریخ کو چلچلاتی دھوپ میں جب سورج سوا نیزے پر (بلکہ تین نیزے پر) تھا' شدید دھوپ میں پسینہ سے شرابور ڈیوٹی سے واپس آتے ہوئے میں اسپتال کے بک اسٹال کی طرف گئی' مگر شعاع نہ ملا۔ پھر 30 تاریخ کو پتا کیا۔ یکم جولائی کو روم سرونٹ کو بھیجا تو اس نے بتایا کہ باجی ابھی شعاع نہیں آیا۔ 2 جولائی کو سوچا خود جا کر دیکھ آؤں شاید سرونٹ نے ڈنڈی ماری ہو' مگر یہ کیا شعاع گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب۔ حالت غصہ میں فیصلہ کیا کہ اس بار ایک خط لکھنا چاہیے اور معلوم کیا جائے کہ اس قدر تاخیر آپ کی طرف سے ہے یا گرد اور گرمی کے لیے مشہور اس شہر میں شعاع کا تاخیر سے آنا میرے اسپتال کے بک اسٹال کے مرہون منت ہے۔

ج۔ مریم! ہمیں احساس ہے کہ پرچا لیٹ ہوتا ہے تو ہماری پیاری قارئین کو کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شدید گرمی میں آپ کو بازار کے چکر لگانا پڑے' ہمیں اس کا بے حد افسوس ہے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ پرچا وقت پر آئے' لیکن کبھی کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر تاخیر ہو جاتی ہے۔ لیٹ ہونے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ہم اسی صورت بتا سکتے ہیں جب آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کے بک اسٹال پر پرچا کس تاریخ کو دستیاب ہوتا ہے۔

سدرہ احسان نے اندھیرا گڑیاں سے لکھا ہے۔

شعاع سے وابستگی پچھلے پانچ سال سے ہے اور میں ہر ماہ شرکت اسی لیے نہیں کر سکتی کہ مجھے ڈاک کا مسئلہ ہے۔ آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ پلیز عاطف اسلم اور ایف ایم 100 کے آر جے ذیشان ناصر' محمد یاسر اور آپی نادیہ ڈاے کا تفصیلی انٹرویو بمعہ پکچرز شامل اشاعت کریں۔ پلیز ضرور۔

ج۔ پیاری سدرہ! آپ نے ہمیں خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

عذرا' عظمیٰ' عائشہ۔ فیصل آباد گاؤں خانو آنہ سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے۔

سمجھ نہیں آرہا پہلے تبصرہ کروں یا شکوہ' چلیں پہلے تبصرہ۔ "ایک تھی مثال" "وائق کے دوست کا باپ یقیناً" زبیر ہے۔ پری ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ "رقص بسمل" ٹھیک جا رہا ہے۔ "ہیرا اور پتھر" کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ ایمل رضا کا انداز تحریر سمیرا حمید سے مشابہ ہے اس لیے "تعویذ حب" کا شمار بھی "یارم" کی طرح فیورٹ ناولز میں ہو گا۔ سحر ساجد کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ اب ہو جائے شکوہ۔ وہ دن تو خواب ہوئے جب عید کے دن بازاروں میں جگہ جگہ مختلف چیزوں کے اسٹالز لگا کرتے تھے اور ہم نئے کپڑے' جوتے پہن کر ان بازاروں میں گھوما کرتے' ساتھ ساتھ سموسے' پکوڑے کھاتے اور دس روپے والی گڑیا تو ضرور ہی خریدتے۔ اب تو پچھلے کئی سالوں سے عید گھر پہ مناتے ہیں۔ ہر سال عید کے موقع پر عید کے حوالے سے سروے ہوتا تھا جو کہ عید کا احساس دلاتا تھا' مگر اس بار نہ رمضان کے حوالے سے کوئی سروے اور نہ عید کے حوالے سے۔ کسی اور کا تو پتا نہیں' مگر ہمیں یہ کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ آخر میں ایک درخواست۔ اداکار عمران عباس' اداکارہ مایا علی اور F.M 101 کے آر جے بابر علی کے انٹرویوز بمعہ تصویر شائع کر دیں۔

ج۔ عذرا' عظمیٰ اور عائشہ! یہ شمارہ رمضان کے آغاز میں آیا تھا۔ اس لیے عید نمبر نہیں تھا۔ اکتوبر کا شمارہ جو بقرعید سے پہلے آئے گا۔ عید نمبر ہو گا اس میں قارئین سے سروے بھی شامل ہو گا۔

مبارک باد

مقبول مصنفہ سمیرا شریف طور بابل کا آنگن سونا کر کے پیا دیس کی رونق بن گئیں۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد۔ دعا گو ہیں کہ زندگی کا یہ موڑ ان کے لیے دائمی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین

شعاع کے بارے میں آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

پہلے خط شائع نہ ہونے کا رونا رو رہی تھی پھر تحریریں شائع نہ ہونے کا غم اور اب سروے میں شمولیت کو بھی میری پہنچ سے دور کر دیا گیا۔ہائے اتنی بڑی سازش۔۔۔!بہت سی قارئین کو اس بات کا رنج ہو گا کہ اس محفل میں ان میریڈ قارئین شرکت نہیں کر سکتیں۔ "ایک تھی مثال" ورده پر توجی بھر کر افسوس ہوا' پریشے کی چالاک فطرت سے انجان واثق کو ہی مورد الزام ٹھہرایا۔

ج۔ پیاری مسرت! آپ بالکل افسردہ نہ ہوں' جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے' شعاع کا مستقل سلسلہ ہے ہمیں یقین ہے بہت جلد آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کریں گی۔ (ان شاء اللہ) ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں بلکہ ہماری بہت ساری قارئین جو ابھی سلسلے میں شامل نہیں ہو سکتیں اللہ کرے گا کہ وہ بھی اس سلسلے میں شامل ہوں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ تفصیلی تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت اچھا ہے۔ آپ کے خطوط شامل نہ ہونے کی ایک وجہ تاخیر سے موصول ہونا بھی ہے۔

پیاری مسرت آپ میں صلاحیت ہے' آپ بہت اچھا لکھ سکتی ہیں۔ تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ اس افسانے کے لیے معذرت۔

برج چیمہ ڈسکہ سے شبانہ طارق نے لکھا ہے۔

9th کلاس میں تھی جب شعاع پڑھنا شروع کیا' اب میرا بڑا بیٹا 10th میں ہے 25 سال سے کبھی کوئی رسالہ مس نہیں کیا۔ لوگ ہیروئن کا نشہ کرتے ہیں ہمیں شعاع' خواتین کا نشہ ہے۔

خط لکھنے کی وجہ سائرہ رضا کا ناول ہے۔ میں دو تین بار پڑھ چکی ہوں اور کچھ پڑھا ہی نہیں کیوں کہ پڑھا گیا ہی نہیں' بار بار اسے پڑھتی جاتی ہوں اور روتی جاتی ہوں۔ او میرے خدا یہ کمال ہے' اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے؟ اس سے اچھا کوئی کیسے سوچ سکتا ہے۔ اب مہینوں میں نے تارے کو یاد کر کر کے رونا ہے۔ بہرحال باقی شعاع کے سب سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔ میرا بیٹا خط کا لفافہ اس شرط پر لا کر دینے پر راضی ہوا کہ ماما میرا نام بھی خط میں لکھ دیں کہ فراز نے لفافہ لا کر دیا ہے' پاس چھوٹا بیٹا سعد بیٹھا تھا وہ بھی پکار کر بولا "ماما میرا بھی" تیسرے بیٹے کا نام عمار ہے۔

ج۔ پیاری شبانہ! آپ کے شہزادوں عمار' فراز اور سعد کو ہماری طرف سے پیار اور دعائیں۔

سائرہ رضا تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شعاع اور خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

فاطمہ سکندر گرین ٹاؤن لاہور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

پیپرز کی مصروفیت کی وجہ سے پچھلے چار ماہ سے "شعاع" خرید کر جمع کرتی جا رہی تھی۔ اب تھوڑا تھوڑا تبصرہ پچھلے شماروں پر۔ سب سے پہلے بات کرتے ہیں "یارم" کی تو تعریف کے لیے الفاظ ہی نہیں۔ "غریق رحمت" بہت ہی زیادہ خوب صورت ناول تھا۔ "رقص بسمل" سست روی کا شکار۔ "ایک تھی مثال" کی اس ماہ کی قسط پڑھی' آخر میں وہی ہوا جو اکثر ہو جاتا ہے کہانیوں میں۔ یاد آیا "ایمل رضا" کا افسانہ "مرگ سیاہ" بہت ہی زیادہ زبردست تھا۔ اس ماہ کے افسانوں میں "ممسک" ایک اصلاحی افسانہ تھا۔ "عید سبق" میں الفاظ کا چناؤ بہت کمال کا تھا۔ "تعویذ حب" میں منظر نگاری کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ مکمل ناول میں "ہیرا اور پتھر" پسند آیا۔

ج۔ پیاری فاطمہ! چار ماہ کے رسالے سنبھال کر رکھے اور پھر ایک ساتھ پڑھے' شعاع سے آپ کی محبت قابل قدر ہے۔ اس محبت اور قدر دانی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

کشن گڑھ' ثوبیہ نور لکھتی ہیں۔

جون کی گرمی جب جوبن پر تھی' جسم سے پسینہ اور لہجوں سے بے زاری ٹپک رہی تھی کہ شعاع کی آمد بہار جیسی لگی اور پھر تو جیسے بہار ہی آگئی نیلے' سرمئی بادل جو گھر گھر آئے اور دھاڑ دھاڑ کر جو رونق لگائی کہ ہر شے جل تھل ہی ہو گئی۔ فصلوں کا ہلکا زرد یرقان زدہ ہوتا رنگ نکھر سا گیا اور یہاں کشن گڑھ کی گلیوں میں "گوڈے گوڈے" پانی بھی ٹھہر گیا۔ خیر شعاع ہاتھ میں آیا اور ہم سب بھول گئے۔ عید کے خوب صورت رنگوں سے سجا سرورق دلنشین تھا۔ نازیہ کنول کے بندھن کا احوال پڑھا' دعائیں اور مبارک باد۔

آمنہ مفتی کا ہلکا پھلکا سفرنامہ اچھا لگا۔ "تونبہ وجداری نا" نام پر تو فدا ہی ہو گئے پر سفرنامے اور نام میں کیسا ربط ہے اگر یہ وضاحت فرما دیں تو مہربانی۔ "سیاہ حاشیہ" میں عدینہ خوب ہی ہٹ دھرمی دکھا رہی ہے۔ قرآن پاک حفظ کا فیصلہ البتہ اچھا ہے۔ "رقص بسمل" کے چار صفحوں پر کیا ہی تبصرہ کیا جائے۔ ہاں اللہ تعالیٰ نبیلہ جی کے مسائل حل کرے۔ آمین۔ سمیرا حمید کو روبرو میں دیکھ کر یادم کی کمی دور کر رہے ہیں ہم۔ زرنین آرزو اور شفق افتخار کے مکمل ناول اور مصباح نوشین کا ناولٹ نارمل تھے بس۔ رمضان شریف کا خاص تحفہ قانتہ جی کی طرف سے تھا۔ باقی سب کچھ بہترین تھا۔ اب اجازت دیجیے۔

ج۔ ثوبیہ! کچھ بارشیں کراچی بھی بھجوا دیں۔ اہل کراچی تو اس جل تھل کے لیے ترس ہی گئے ہیں' اگرچہ جل تھل کے بعد شہر کا حال کشن گڑھ کی گلیوں جیسا ہی ہوتا ہے کیوں کہ کراچی میں فلائی اوور اور پل تو بنا دیے گئے' لیکن سیوریج لائنیں سو سال پرانی ہی ہیں اور سڑکیں جو بنائی گئی تھیں' وہ تو سال بھر بھی نہ چل سکیں۔ پہلی بارش میں ہی جواب دے گئیں۔

آمنہ مفتی کے سفرنامے کا عنوان تونبہ وجداری نا اور سفرنامہ میں کیا ربط ہے یہ آپ کو اختتام پر پتا چلے گا۔

ثنا زہرہ ڈھلیال سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے۔

الفاظ کی کم مائیگی کے باوجود خط لکھ رہی ہوں۔ سرورق سے لے کر خوب صورت بنیے تک تمام سلسلے دل کو چھوتے ہوئے گزرتے ہیں۔ دل دماغ روشنیوں سے منور ہو کر جھوم اٹھتا ہے کہ چلو کچھ تو ہٹ کر اور انوکھے طریقے سے ہو رہا ہے' ورنہ ٹی وی تو اب نمائش کی آماجگاہ بن چکی ہے' کہیں تحائف کی بارش ہے تو کہیں نمود و نمائش کی کھلی دکانیں۔ خوب صورت لباس پہن کر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر ہر گز ان کے دکھوں کا مداوا نہیں ہو سکتا جو کراچی میں سورج کی آب و تاب کو برداشت کرنے کی سکت کھو بیٹھے یا جو افراد سفر طے کرتے ہوئے لقمہ اجل بن بیٹھے۔ احادیث مبارکہ سے فیض حاصل کر کے دلوں میں روشنیوں کو مقید کرتے کرتے پہنچے "ایک تھی مثال" تک۔ مثال کے دکھ نے دل درد سے بھر دیا چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھر توڑ ڈالنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ایسی ہزاروں مثال کا کیا بنے گا۔

"تعویذ حب" ایمل رضا نے دلکش الفاظ میں اپنے خیالات کو جامہ پہنایا ہے۔ "سیاہ حاشیہ" پار کر جانے والوں کے لیے منزل صرف پچھتاووں کی پچتی ہے۔

ج۔ پیاری ثنا! آپ کے پاس ذخیرہ الفاظ بھی بہت خوب ہے اور خط بھی بہت اچھا لکھا ہے آپ نے۔ رمضان المبارک پر تمام چینلز نے رمضان کی خصوصی نشریات کے نام پر جو تماشا کیا ہے اور جس طرح رمضان المبارک کے تقدس کو مجروح کیا' وہ تہذیب و شائستگی کے منافی اور قابل مذمت ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

طیبہ سعدیہ نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔

پہلی شعاع' حمد و نعت اور پیارے نبی کی باتیں پڑھیں۔ ایک بات پوچھنا چاہوں گی کہ پیارے نبی کی باتیں کیا کسی خاص فرقہ کی ہوتی ہیں۔ پھر "روبرو" میں سمیرا حمید کے جواب پڑھے اور "بندھن" میں نازیہ کنول نازی جی واہ۔ بہت اچھی جوڑی۔ نازیہ کنول اور ان کے ہزبینڈ زعیم کی۔ !پھر نبیلہ جی کا "رقص بسمل" بھی زبردست۔ اور مکمل ناول میں ایمل رضا کی "تعویذ حب" زبردست' مگر آپ نے آخری قسط سے پھر آئندہ ماہ لکھ دیا اف ف ف۔ اور زرنین آرزو کی "ہیرا اور پتھر" بھی اچھی تحریر تھی' مگر کسی بھی مرد کو زوار کی طرح نہیں ہونا چاہیے۔ جب کہو میرے چاند سے شعاع میں بیسٹ تحریر تھی شفق افتخار کی۔ "سیاہ حاشیہ" میں بہت زبردست ہے۔

ج۔ پیاری طیبہ! آپ کا خط پڑھا' آپ کے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔ خیراتی اداروں کے بارے میں شاید آپ جانتیں نہیں' وہاں کی زندگی بھی آسان نہیں ہوتی۔ بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا مشورہ ہے آپ شادی کر لیں ضروری نہیں کہ جیسے آپ کے گھر کے حالات ہیں شادی کے بعد بھی وہی ماحول ملے۔ دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں اور ہمارا دل کہتا ہے کہ آپ اپنے حصے کے دکھ سہ چکی ہیں۔ اب آپ کو اپنے حصے کی خوشیاں ملیں گی۔ ان شاء اللہ خط سے اندازہ ہوتا ہے آپ ذہین اور سمجھ دار ہیں اور حالات کو بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ شادی کے بعد اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیجیے گا۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" اس سلسلہ کا تعلق کسی بھی فرقہ یا مسلک سے نہیں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے جو فرمایا یا جو عمل کیا۔ وہ حدیث اور سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے' قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں' قرآن مجید دین کا اصل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا یا عملی طور پر پیش کیا وہ قرآن کی تشریح ہے۔

اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

احادیث کی جو کتابیں مستند مانی جاتی ہیں' صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا امام مالک۔ ہم ان ہی کتابوں سے احادیث نقل کرتے ہیں' اور پوری احتیاط کرتے ہیں کہ کوئی غلطی نہ ہو۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں' تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں' نا قابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37-اردو بازار کراچی

کراچی سے شیریں تبسم نے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں۔

میں نے پہلی بار سائرہ رضا کو پڑھا۔ اتنا عمدہ ناول... نہ لفظوں کی ہیر پھیر' نہ مشکل الفاظ' نہ یہ نہ وہ' بس روانی سے لکھتی گئیں اور ہم پڑھتے گئے۔ تارے کا کردار بہت معصوم کردار' خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار آنکھیں نم ہوئیں۔

آئینہ بچہ کا افسانہ "مگر یہ بار جاتی ہے" اچھی کہانی لگی۔ حیا بخاری کا ناول "بہار دستک دے رہی ہے" بھی اچھا لگا۔ سحر محمود کا کردار ممتا سے بھرپور تھا۔ نادیہ احمد کا افسانہ "جھوٹ" پڑھ کر کچھ دیر سوچتی ہی رہی کہ کیا واقعی ایسی ساسیں بھی پائی جاتی ہیں۔

ج۔ پیاری شیریں! ایسی ساسیں بلکہ اس سے اچھی ساسیں بھی پائی جاتی ہیں۔ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ورنہ قیامت آچکی ہوتی۔

سائرہ رضا کا مکمل ناول اس ماہ یعنی اگست کے خواتین ڈائجسٹ میں بھی شامل ہے۔

حمیرا طاہر نے کوٹ رادھا کشن ضلع قصور سے لکھا ہے۔

ڈائجسٹ تو میں بہت دیر سے پڑھتی ہوں۔ پر ایسا ہے تب تو سب کچھ سمجھ سے بالاتر ہوتا تھا۔ اعلانیہ شعاع کو میں نے شادی کے بعد پڑھنا شروع کیا۔ شعاع تو میں جلدی پڑھ لیتی ہوں اور پھر اگلے شمارے کا بے صبری سے انتظار...

ج۔ پیاری حمیرا! بہت خوشی ہوئی کہ ہر ماہ باقاعدگی سے پرچا پڑھتی ہیں۔ آپ قارئین کی یہ محبت ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

تو نبہ و گجلائی نا

آمنہ مفتی

بیاس قوس قزح

وہ سرحد جسے 67 سال پہلے جانے کن جتنوں سے عبور کر کے ہمارے بڑے ادھر آئے تھے' سامنے تھی۔ ایک قدم ادھر اس قدم کے پار ہندوستان تھا' اشوک اور کنشک' پرتھوی راج چوہان اور نریندر مودی کا ہندوستان اور ادھر میرے قدموں کے نیچے' محمد بن قاسم' شہاب الدین غوری۔ محمود غزنوی اور نواز شریف کا پاکستان۔

اور ایک طرف گاندھی جی تھے اور دوسری طرف قائد اعظم۔۔۔ سر جھٹکا کہ ہت تیرے کی۔

"ہم ول زدگاں کا تو خدا ہے نہ صنم ہے۔"

پھر اتنا جذباتی کیا ہونا؟

ہندوستانی سرحد پہ ہماری تلاشی لینے والی خاتون سنیتا اور ایک سفید کتیا تھی' کتیا کا نام معلوم نہیں کیا تھا' لیکن اسے مجھ میں سے آتی بلیوں کی خوشبو نے چوکنا کر دیا۔ لیکن اس کی تربیت نے جبلت کو دبا دیا ورنہ' ہندوستان میں داخلے کے تیس سیکنڈ کے اندر اندر جاں بحق ہو جاتی۔

ہمارے علاوہ اس وقت سرحد عبور کرنے والوں میں دو ایک مریض تھے' جو گردوں کے علاج کی غرض سے جا رہے تھے' ایک میت تھی' جس کے لواحقین' خوب صورت' اداس آنکھوں والے لمبے تڑنگے تین سکھ تھے۔

بارش اور زوروں سے برسنے لگی۔ رخسانہ آپا کو اپنے بڑے سوٹ کیس کے بھیگنے کی فکر اور میں کتابوں کا تھیلا کلیجے سے لگائے دوڑتی ہوئی کسٹم کی چوکی میں داخل ہوئی۔

یہاں تلاشی در تلاشی کے بعد ہم ایک کاؤنٹر پہ پہنچے' جہاں دو ہیلتھ وزیٹرز ہمیں پولیو کے قطرے پلانے پہ مستعد تھیں۔ بہتیرا چیخے چلائے' پاکستان سے لائے ہوئے اپنے سرٹیفکیٹ دکھائے کہ جناب ہم تو پہلے ہی پولیو سے پاک ہیں۔ لیکن میزبانوں کو ہماری کسی بات پہ اعتبار نہ آیا۔

سامنے گولڈن ٹیمپل کی ایک بڑی شاندار تصویر لگی ہوئی تھی اور ایک خوش مزاج آفیسر کہہ رہے تھے۔

"یہ آپ کے کھلاڑی اور اداکار' گلوکار' آٹھ مہینے تو ادھر ہی رہتے ہیں۔ ابھی وہ فصیح نہیں آپ کا' فصیح احمد فصیح' اس کی بیٹی آئی تھیں۔ ادھر جے پور میں اپنی کتاب لانچ کی ہے "کینوس" پانچ ہجار کی' دیکھو جرا' اتنی مہنگی۔"

کسٹم میں پہنچے تو ہم غریبوں کے پاس کیا تھا' لیکن انڈین کسٹم نے اپنی تسلی کی' سوٹ کیس کھلوایا۔ وگنی دیکھ کے چونکے' کھلوایا! اس قدر میک اپ کا سامان دیکھا' پھر میری شکل دیکھی اور کچھ تسلی ہوئی کہ حق بنتا ہے' مطمئن ہو کے پاسپورٹ واپس دیا۔

دوسرے کاؤنٹر پہ ایک خاتون جھگڑ رہی تھیں کہ بھئی اتنا سامان ہے تو ہم کیا کریں؟ جہاں جاتے تھے' لوگ تحفہ دیتے تھے اب کیا وہیں پھینک آئے؟ لایا تو تھا ہی۔"

لیکن لیڈی آفیسر چلا چلا کے اس میں سے دو کمبل اور کچھ واٹر سیٹ وغیرہ نکلوا رہی تھی۔

خدا جانے کیا بنا؟ ہم تو وہاں سے نکلے ہی تھے کہ سامنے دو تین مسکراتے چہرے منتظر تھے۔ کلدیپ چراغ' سورج اور ہماری کار ڈرائیور کرنے والے جگو۔

کلدیپ اور سورج کی جوڑی' سورج کو چراغ دکھاتی ہے۔ لیکن یہ چراغ جادو کا ہے' زگزو تو معلومات

اور دلچسپ گفتگو کا جن حاضر ہو جاتا ہے۔
اٹاری کی چوکی سے نکلے تو یہ کیا؟ یہاں کی رونق، ویسی ہی چھوٹی 'وہی گندم کے کھیت' آلوؤں کی پرال سے ڈھکی دھریاں 'سفیدے کے درخت' یہ نوے باغ اور مسلسل برستی بارش۔ چراغ صاحب ہمارے ساتھ بیٹھے تھے۔ پہلے حسب روایت پاکستانی ناٹکوں کی تعریف ہم نے بھی ہندوستانی فلموں کی جی بھر کے تعریف کی۔ رخسانہ نور کا ظرف کہ وہ اس دوران خاموشی سے ہماری لاف زنی سنتی اور برداشت کرتی رہیں۔

بارش مسلسل برس رہی تھی اور میں اس انتظار میں تھی کہ کب ہائی وے شروع ہو! چراغ سے پوچھا تو وہ مسکرائے اور بولے۔ "میڈم! یہاں موٹر وے نہیں۔ جو دال دلیا ہے حاضر ہے۔"

کچھ سفر کے بعد گاڑیاں "کوروا سپوریاں دے وشنو ڈھابے" کے سامنے جا رکیں۔ سرکی کی ڈھلانی چھت صاف ستھری میز کرسیاں۔

رخسانہ آپا نے موسم اور موقعے کی نزاکت دیکھتے ہوئے پکوڑوں کی فرمائش کی۔ فوراً ہی لذیذ پکوڑے حاضر ہو گئے پنیر کے پکوڑے بھی تھے 'جو ہمارے ہاں عام طور پہ نہیں ہوتے۔

کھانا آیا 'پھلکا پراٹھا' دال مکھنی 'سبزی 'جیرا چاول' اچار 'سب کچھ نہایت مزے دار ۔۔۔ مجھے بس ایک دھن تھی بیاس کی دھن 'بیاس کہاں گیا؟

بچپن سے ایک طویل ریتلا ویرانہ دیکھتی آئی تھی، جس میں ایک میلا سا نالہ لیٹا رہتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ دریائے بیاس کی پرانی گزرگاہ ہے۔ ہماری زبان میں اسے "دیاں" کہتے ہیں وہ "بیاس" یہاں کہیں تھا۔ قریب ہی وشنو ڈھابے سے ذرا آگے اپنی بے چینی دبا کے سورج سے یوں ہی سرسری سا پوچھا۔

"بیاس کہاں ہے؟"

"اودھر ہی ہے ذرا سا آگے۔" سورج بھانپ گیا کہ یہ اجنبی مہمان اس دریا کا بھیدی ہے بولا "میں نے اس کو پہاڑوں میں سے نکلتے دیکھا ہے۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "دیاس کنڈ"

ایک دم خاموشی چھا گئی۔ سورج گھبرا کے میز پہ طبلہ بجانے لگا اور چراغ صاحب نے گھڑی پہ وقت دیکھنا شروع کر دیا۔

"او ہو! دیر ہو جائے گی 'سات بجے ناٹک ہے اور وہ آپ لوگوں کے اعزاز میں ہے۔ آپ کا وقت پہ پہنچنا لازمی ہے چلیں؟"

باہر نکلے ہی تھے کہ ناز مچل گئی "تصویر لینی ہے" اور یہ تو آگے آگے 'معلوم ہوا کہ ناز اس سفر کو کیسے کیسے محفوظ کر رہی تھی۔ تصویر لی گئی اور اب کی بار جگو کی گاڑی میں ہم چاروں خواتین کو بٹھا دیا گیا۔

ناز کو پچھلی نشستوں پہ وحشت ہوتی ہے وہ آگے بیٹھ گئی تھیں اور فرحت آپا پچھلی نشست پہ اور رخسانہ آپا سب سے پیچھے کتابوں کے بنڈل سر کے نیچے رکھ کے فوراً ہی سو گئیں۔

ابھی ہم اپنے اپنے درزیوں کے قصے چھیڑے بیٹھے تھے کہ بیاس آ گیا۔ وہ بیاس جس کا میں نے ہمیشہ ذکر سنا تھا۔ جو کبھی تھا اور اب نہیں ہے۔ میرے سامنے تھا اپنے پورے میدانی حسن اور وقار کے ساتھ 'سرخ مٹیالا پانی 'کناروں پہ جھنڈ اور اپنی جادوئی طاقتوں کے ساتھ بہتا ہوا بیاس کا پاٹ اتنی بارش میں بھی زیادہ چوڑا نہ تھا۔ بیچ بیچ میں ٹاپو اور ان پہ سرکنڈوں کے جھنڈ اور بگلوں کی ڈاریں جو اپنی بے پروا آنکھوں سے پل سے گزرتے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا تو نہ ویزا تھا نہ پاسپورٹ 'جی چاہا تو یہاں بیٹھے 'جی چاہا تو شالیمار باغ پہنچ کر دم لیا۔ ان کو توپوں 'ٹینکوں کی ضرورت نہیں، انہیں اس سے کیا کہ کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔

بیاس کے پل سے اترتے ہی سامنے اتنی بڑی قوس قزح 'اتنی شفاف کہ میں دنگ رہ گئی۔ بگلوں کی ایک ڈار بیاس کے کسی ٹاپوں سے اڑی اور قوس قزح کی طرف روانہ ہو گئی۔ سب خواتین جو اس دوران سو چکی تھیں 'میرے چلانے پہ جاگ گئیں اور قوس قزح کو دیکھ کر حسب مقدور ہائے ہو کرنے لگیں۔

ذرا آگے گئے تو ٹریفک جام تھا۔ جگو نے ہر آتے جاتے سے پوچھا۔

"پاء جی 'کلو دا جام لگا ہے؟" کسی بندۂ خدا نے جواب نہ دیا 'گاڑیاں 'بسیں 'ٹریکٹر ٹرالیاں 'سب اس جام میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ایک جتھا زعفرانی جھنڈوں پہ سکھ پنتھی کے نشان 'کسی درگاہ کی طرف جا رہا تھا۔

جگو کو بار بار ڈاکٹر صاحب کا فون آ رہا تھا کہ بھائی میرے مہمان پہنچاؤ 'میرے مہمان ایک سڑک دائیں مڑ رہی تھی اوپر 'راج کے زمانے کا کالا ریل کا پل جگو نے اسکرین پہ GPS ہولڈر جمایا اور اس ذیلی راستے پہ گاڑی ڈال دی 'ناز نے گھبرا کے پوچھا۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" جگو نے ہمارے پاکستانی ہونے کے احترام میں نہایت شائستہ زبان میں جواب دیا۔

"کہیں نہ کہیں تو نکلیں گے ہی۔"

یہ راستہ بھی گندم اور سرسوں کے کھیتوں کے درمیان بل کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔ نکودر 'جہاں بقول جگو ایک بڑی بھاری درگاہ تھی ہمارے دیپالپور 'یا میلسی جیسا شہر تھا' زرعی آلات کی دکانیں 'اونچی قمیصیں 'گھیردار شلواریں' دوپٹے 'سوئٹر' ڈاڑھیاں 'پگڑیاں 'نکودر کی تاریخ 'انڈو پاک کی تاریخ کی طرح پٹھانوں 'سکھوں اور راجپوتوں کی شجاعت کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ ان سبز کھیتوں میں ان گنت حملہ آور کھیت رہے۔ اب بھی کئی مقام اور آثار موجود ہیں۔ چند مقبروں میں آسودہ لوگوں کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔

"یہ جی گرداس مان جی کا شہر ہے۔" جگو نے بتایا تو یہ ہے انجام جنگوں کا' ان گنت لوگوں نے اس شہر کو جیتنے کے لیے اپنے سر کٹائے 'لیکن اب یہ شہر گرداس مان جی کا ہے اور کرو لڑائیاں گندے بچوں!

سڑک کے دونوں طرف بے تحاشہ بھنگ اگی ہوئی تھی اور ہوا میں بھنگ کی کڑوی خوشبو پھیلی ہوئی تھی ' کھیتوں میں دور دور 'ننھے ننھے گھر یوں لگ رہے تھے کسی نانبائی نے گلابی سفید کھانڈ سے یہ ٹریا گھر بنا کے جہاں تہاں جما دیے ہوں۔ جی چاہا گاڑی رکواؤں اور بے دھڑک کسی بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کے اندر گھس جاؤں۔ بارش مسلسل برس رہی تھی اور ایک میلا سا چوک آیا۔ یہ کپور تھلہ تھا 'ریاست کپور تھلہ 'جو غالباً" ان ہی راجپوتوں کے کسی خانوادے کی ملکیت تھی 'جن سے عباسیوں نے دراوڑ کا قلعہ چھینا تھا۔

بھئی بڑی مارا ماری ہے تاریخ میں ہر طرف تلوار بکف لوگ گتھم گتھا ہیں 'ذرا بھی تمیز نہیں خیر!

یہاں ایک عظیم الشان محل تھا 'جواب سینک اسکول ہے۔ محل تھا 'مہاراجہ جگت جیت سنگھ کا جو "پیلس آف ورسیلز" کے نمونے پہ بنایا گیا ہے 'دروغ برگردن راوی اس کا نقشہ کسی فرانسیسی ایم مارشل نے بنایا تھا اور معمار تھا اللہ دتا۔ آج کے دور میں ہوتا تو مسٹر اے ڈی بٹ ہوتا' بڑے بڑے سرکاری افسروں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور خوب نوازا جاتا 'جانے تب غریب کو کیا پیش آئی؟ امید واثق تو یہ ہی ہے کہ کہیں ہاتھ واتھ کٹوانے پڑا ہو گا۔

یہ مہاراجہ صاحب بے حد سمجھ دار تھے۔ اور رعایا کے لیے مراکش کی عظیم الشان مسجد کی طرز پہ ایک مسجد بھی بنوائی۔

ایک ایم جی این 'اسکول ہے۔ وہ بھی راجہ بکرما سنگھ جی کے محل میں بنا ہوا ہے 'جگ جیت کلب جو کبھی چرچ 'پھر سینما اور اب کلب ہے 'شالیمار باغ اور پانچ مندر 'عمارات تو بہت ہیں۔ تاریخ کا بھی ایک انبار ہے جس میں پٹھانوں 'جاٹوں 'عباسیوں اور جانے کن کن کے نام آتے ہیں 'لیکن مقطع کا بند جہ جگو نے کہا۔

"جی 'تو ونڈرز منو" اودھر ہی شوٹ ہوئی تھی۔" دیکھا نا لڑائی بھڑائی کا انجام؟ کپور تھلہ بھی گیا تنگنا کو اسی لیے منع کرتے ہیں بڑے۔

آسمان پہ بادل تھے اور رخسانہ آپا اپنا کلام ترنم سے گا رہی تھیں۔

شملہ تو پہلے میری رات آگئی
تے فیر میری رات نہ ڈھلی

شام گہری ہو رہی تھی اور جگو نے مسکرا کے اطلاع دی کہ پچھلی گاڑی جس میں ہم سب کے سوٹ کیس موجود تھے ابھی تک بیاس کے پاس کہیں ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا میں اس حلیے میں تقریب میں نہیں جاؤں گی۔" قریب تھا کہ ناز کو فرط غم سے حال آ جاتا، فرحت آپا نے اسے اپنے جوتے پیش کیے اور رخسانہ آپا نے مژدہ سنایا کہ ان کا سوٹ کیس اسی گاڑی میں ہے۔

اور میرا وہ حال کہ "مگر یہ دل ڈوبتا جا رہا ہے جانے کیوں؟"

درویش ہونے کا دعویٰ اسی وقت جچتا ہے جب باریزے کی لان کا سیاہ جوڑا۔ ڈیفنس کے ماسٹر شہزادے سلوا کے باڈی شاپ کا نہ دکھنے والا میک اپ کر کے کھڑے ہوں۔ آٹھ گھنٹے کی طویل مسافت، جس میں تاریخ تلوار بکف دانت نکوسے قدم قدم پہ کھڑی ہو اور بات بے بات گلا رندھ جاتا ہو۔ کسی کی ماں "امرتسر کی تھیں، کسی کی خالہ کپور تھلہ میں ماری گئی تھیں۔ کوئی سیالکوٹی تھا تو کوئی جالندھری تو ایسے سفر کے بعد اپنا سوٹ کیس نہ ملنے کی خبر نہ صرف ہمارے لیے ہولناک تھی بلکہ جملہ حاضرین کے ذوق جمیلہ پہ بھی گراں گزر سکتی تھی۔ اسی لیے ہماری اس دھمکی کہ جواب میں کہ ہم تو سیدھے آڈیٹوریم پہنچ جائیں گے "ڈاکٹر صاحب فرداً" فرداً" ایک ایک کو فون کر رہے تھے کہ خدا کی بندیوں، سیدھی آڈیٹوریم نہ جانا، تمہیں واسطہ ہے رب کا۔

یہاں سے جگو نے گاڑی بھگائی تو، ساڑھے سات ہم لدھیانہ کی سڑکوں سے گزرتے "فرینڈز ریجنسی ہوٹل" کے سامنے کھڑے تھے۔ بارش کا حال مت پوچھیں، مجھے اپنی چھتری یاد آئی اور پھر پورے سفر کے دوران بار بار یاد آئی۔

ہوٹل کے کاؤنٹر پہ ایک لمبا فارم پر کیا، پاسپورٹ اسکین کرائے اور پندرہ منٹ بعد جب کمرہ نمبر ۴۲ میں پہنچے تو خود بخود ناز اور فرحت آپا ایک کمرے میں چلی گئیں دوسرے میں میں اور رخسانہ آپا۔

سامان کی کچھ خبر نہ تھی میں اور رخسانہ آپا جانے کو تیار ہوئے، لیکن ہم سفروں کے بغیر جانا کچھ کمینگی لگا۔ عطاء الحق قاسمی صاحب۔ ان کی بیگم اور عزیز احمد ایک روز پہلے ہی پہنچ گئے تھے اور "مہاراجہ ہوٹل" میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

خدا خدا کر کے آٹھ، ساڑھے آٹھ گاڑی آئی کپڑے استری ہوئے اور جب ج دھج کے ہم "گرو نانک دیو بھون" پہنچے تو "خواجہ صاحب" کا ڈرامہ چل رہا تھا۔ یہ آڈیٹوریم ہمارے "الحمرا" کے ہال نمبر ایک جتنا تو ہو گا ہی۔

ڈاکٹر کیول دھیر ہمارے استقبال کو عمارت سے باہر کھڑے تھے۔ بہت تپاک سے ملے، ہال میں لے گئے، ڈرامہ اپنے اختتام پہ تھا ہم لوگوں کو اگلی نشستوں پہ بٹھایا گیا۔ قاسمی صاحب پہلے ہی فروکش تھے۔

اسٹیج پہ موجود اداکار نے آدھے گھنٹے جاری رہنے والی اپنی سولو پرفارمنس میں ہمیں گویا پتھر کا بنا دیا۔ ہمارے آنے سے پہلے خواجہ صاحب کی زندگی پہ ایک فلم دکھائی جا چکی تھی۔ خواجہ احمد عباس نے 74 ناول اور بے شمار فلمیں ڈرامے لکھے جن میں "میرا نام جوکر" اور "حنا" دو ناقابل فراموش نام ہیں "لاسٹ پیج" کے نام سے ان کا کالم ان کی وفات تک مسلسل چھپتا رہا۔

ہندوستان میں آرٹ فلم کی داغ بیل بھی خواجہ صاحب نے ہی ڈالی۔ "پیدا کہاں ہیں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ۔"

ڈرامہ ختم ہوا اور ہال کی بتیاں روشن ہوئیں۔ قاسمی صاحب کی نظریں ہم پہ پڑیں، لیکن پہلے انہوں نے رخسانہ آپا سے دیر کی وجہ پوچھی، انہوں نے مجھے اور ناز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کڑیاں دے کپڑیاں دا سوٹ کیس جیم وچ پھس گیا سی" (لڑکیوں کے کپڑوں کا سوٹ کیس جام میں پھنس گیا تھا)

کوئی بھی وضاحت نہ سوجھی جملہ حاضرین خوب محظوظ ہوئے۔

قاسمی صاحب نے کہا "اچھا بھئی! فرحت، ناز، آمنہ لگتا ہے کپڑوں والی گاڑی پہنچ گئی۔"

اور میں جو آسٹریلین طوطے کے رنگ کی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ شرمندگی سے وہیں گڑ گئی۔

"گرو نانک دیو بھون" سے ہم لوگوں کو کلب لے جایا گیا یہاں، ہیرو ہنڈا اور بی ایم ڈبلیو والے رائے صاحب ہمارے میزبان تھے۔

ہیرو سائیکلز کی کہانی بھی عجیب ہے۔ کمالیہ کے چار بھائیوں نے امرتسر میں آ کے سائیکل سازی کا کام جمایا بعد ازاں لدھیانہ آ گئے اور 1956ء میں ہیرو بائیسکل شروع کی، 1984ء تک یہ دنیا میں سب سے زیادہ بننے والی سائیکل ہو گئی۔ ہنڈا کے ساتھ اشتراک کیا اور اب شنید ہے کہ بی ایم ڈبلیو سے بھی گٹھ جوڑ ہو گیا ہے۔

بھئی یہ کاروبار کی باتیں ہیں، ہمیں تو اتنا معلوم ہے کہ ہوا بہت سرد تھی، اور رائے صاحب نہایت تپاک سے پوچھ رہے تھے۔

"کیا پیجیے گا؟"

ایک زبردست قسم کی تنبیہی کھنکھار جس میں چودہ سو سال کی پاک بازی اور عظمت رفتہ کا غرور تھا، کے بعد با آواز بلند جواب دیا "کوکا"

ساری میز سے صدا بلند ہوئی "کوکا۔"

رائے صاحب بے چارے کا حوصلہ ہی نہ پڑا کہ کچھ اور کہتے۔ حد یہ کہ مرغی کے تکے اور سیخ کباب لاتا بیرا بھی ایسا بگٹٹ ہوا کہ دوبارہ ہماری میز کی طرف نہ پلٹا۔

مجھے "کھمبوں" کے تکے اور پنیر کے سنکے ہوئے ٹکڑے کھاتے دیکھ کے ناز پہ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ جلدی سے پنیر تکہ کی سیخ کانٹے سے پرے کرتے ہوئے بلند سرگوشی میں بولی "یہ گائے کو بھی ذبح تو نہیں کرتے؟"

میں نے با قرأت جواب دیا "بالکل کو نہیں۔"

تو بولی "پھر یہ پنیر جو تم اس قدر شوق سے کھا رہی ہو، یہ بھی تو گائے کے دودھ سے بنتا ہے" جناب۔

اب جو ہنسی آئی شروع ہوئی تو سارا رعب رخصت ہوا، ناز معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ آخر اس قدر ہنسنے کی کیا بات ہو گئی؟

رائے صاحب کے اصرار پہ سب نے اپنے اشعار سنائے۔

قاسمی صاحب نے اپنی مشہور غزل

گھر کو جانے والے رستے اچھے لگتے ہیں
جیسے دل کو درد پرانے اچھے لگتے ہیں

سنائی

ناز نے "سنو جاناں مجھے کچھ دیر سونا ہے۔"

اور باقی سب نے اپنی اپنی مشہور نظمیں، غزلیں سنائیں، اب سب میری طرف دیکھ رہے ہیں اور میں خاموش بھئی ایک ناول نگار کیا کہے آخر بصد اصرار بلایا گیا تو سب کو جی بھر کے بور کرنے کے بعد کہا۔

"یوں کرو" ڈرامے بنانا بند کر دو یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔"

اپنی کمینگی کا احساس ہوا تو ٹکڑا جوڑا کہ "جیسے ہم نے فلمیں بنانا بند کر دی ہیں اور آپ کی فلموں پہ انحصار کرتے ہیں۔" سب کھسیانی ہنسی ہنس کے چپ ہو گئے۔

یوپی کے ایک صاحب کالی شیروانی پہن کر آئے تھے یوسفی صاحب کے عاشق، لیکن یادداشت سے مار کھا گئے باوجود یہ کہنے کے کہ مجھے یوسفی صاحب کی تینوں کتابیں ازبر ہیں۔ جو بھی اقتباسات سنائے بالکل غلط "ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے۔"

*

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عائشہ عمر

"کیا حال ہے کیا ہو رہا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اور لاہور جانے کی تیاری۔"

"اچھا... کیسا اتفاق ہے کہ جب آپ سے بات ہوتی ہے آپ سفر میں ہی ہوتی ہیں؟"

"بس جی کیا کریں کہ کام ہی ایسا ہے۔"

"کراچی سے لاہور" مکمل ہو گئی۔ کب ریلیز ہو رہی ہے؟"

"بس جی تقریباً" مکمل ہو گئی ہے اور ان شا اللہ 31 جولائی کو امید ہے ریلیز ہو جائے گی۔"

"کردار کیسا ہے آپ کا؟"

"اس فلم میں میرا کردار ایک گھریلو لڑکی کا ہے اور بہت اچھا ہے۔ یقیناً" فلم کے شائقین مجھے پسند کریں گے اور میں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ اس فلم میں ایک گانا مجھ پر ہے جس کو آئٹم سونگ کا نام دیا جارہا ہے، لیکن یہ آئٹم سونگ نہیں ہے اور جو میرا کردار ہے اس کے لیے یہ گانا ضروری ہے۔"

"یہ شاید آپ کی پہلی فلم ہے۔ جس میں آپ بطور ہیروئن آرہی ہیں اس سے قبل...؟"

"جی جی... پہلی فلم ہے جس میں، میں بطور ہیروئن کے کام کر رہی ہوں۔ اس سے قبل میں ریما خان کی "لو میں گم" اور ہمایوں سعید کی "میں شاہد آفریدی" میں کام کر چکی ہوں۔"

"کراچی سے لاہور" میں کون کون اسٹارز آپ کے ساتھ ہیں؟"

"جاوید شیخ، ان کے صاحب زادے شہزاد شیخ اور رشید ناز شامل ہیں جو مین رول میں ہیں۔"

"بلبلے" میں جو امیج آپ نے بنایا، وہ برقرار رہے گا؟"

"کراچی سے لاہور" ایک فلم ہے اور "بلبلے" ایک سٹ کام ہے۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ لوگوں نے تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔"

"یلغار" کا کیا بنا؟"

"بنا کیا؟ بن گئی ہے اور ان شاء اللہ امید ہے کہ یہ بھی جولائی میں ریلیز ہو جائے گی۔ اس میں بھی میرا کردار بہت اچھا ہے اور اس فلم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی عکس بندی پورے پاکستان میں کی گئی ہے اور اس طرح پاکستان دیکھنے کا موقع ملا۔"

"اچھا... گڈ... کیسا لگا پاکستان؟"

"بہت خوب صورت ہے میرا ملک... اگر سیاحت کو فروغ دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ بہت لوگ اس ملک میں آئیں گے اس کی خوب صورتی دیکھنے کے لیے، دوسرے ممالک نے قدرت کے حسین نظاروں کو مزید حسین بنانے کے لیے ان پر کام کیا ہے، جبکہ ہم

نے ان کا خیال نہیں رکھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو اپنے ملک سے بڑھ کر کوئی حسین ملک نہیں ہے۔"

"آپ کی گلوکاری کیسی چل رہی ہے؟"

"الحمد للہ اچھی چل رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے گلوکاری کا شوق ہے اور اپنے کالج بینڈ کا حصہ تھی۔ اب تو خیر پریکٹس جاری ہے اور سیکھ بھی رہی ہوں۔"

"بہت اسمارٹ ہیں۔ ماشاء اللہ... کبھی موٹا نہیں دیکھا آپ کو؟"

"اپنے آپ کو فٹ رکھنے کا بہت آسان طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ اپنی زندگی سے جنک فوڈ کو کولڈ ڈرنک کو یکسر ختم کر دیں۔ برابر کھانا کھائیں، کوشش کریں کہ سبزیاں کھائیں اور گھر کا کھانا کھائیں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، پھر دیکھیں آپ کیسی اسمارٹ اور دلفریب ہو جائیں گی اور ہاں فروٹ کا استعمال ضرور کریں۔ اس سے خون بڑھتا ہے۔"

"تھیٹر میں کبھی کام کیا۔ کیونکہ عموماً" لڑکیوں کا پہلا شوق تھیٹر ہی ہوتا ہے؟"

"واہ کیا بات کی آپ نے... میرا بھی پہلا شوق تھیٹر ہی تھا اور اپنی فنی زندگی کا آغاز تھیٹر سے ہی کیا اور تھیٹر میں میری پرفارمنس دیکھ کر ہی مجھے ماڈلنگ کی آفر آئی اور ماڈلنگ کے بعد اداکاری کی، ٹی ڈراموں کے لیے۔"

"اور اب اداکاری آپ کا اوڑھنا بچھونا ہے؟"

"بالکل... اداکاری اور گلوکاری ہی اب میرا اوڑھنا بچھونا ہے اور جو کام شوق سے کیا جائے، وہ چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو آسان لگتا ہے۔ میں نے اکثر فن کاروں کو کہتے سنا ہے کہ اداکاری تو بہت مشکل کام ہے، جبکہ مجھے یہ کام کرنا آسان لگتا ہے، کیونکہ یہ میرا شوق ہے۔"

"فیشن کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں؟"

"چلنا تو پڑتا ہے، مگر میں زیادہ تر اپنے اسٹائل سے چلتی ہوں اور اپنی پسند کے کپڑے پہنتی ہوں اور ایسے

کپڑے پہنتی ہوں جو مجھ پر اچھے بھی لگیں اور جن میں میں ایزی فیل بھی کروں۔"

"برانڈ کریزی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔ جہاں جو کپڑے اچھے لگتے ہیں، خرید لیتی ہوں۔ مجھے لوگوں کو دکھا کر اور بتا کر پہننے کا کوئی شوق نہیں ہے کہ میں نے فلاں برانڈ کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔"

"کس کو ترجیح دیتی ہیں، ناشتے کو، دوپہر کے کھانے کو یا پھر رات کے کھانے کو؟"

"میں ترجیح دیتی ہوں ناشتے کو۔ میرے دن کی شروعات دو گلاس پانی اور ہیوی ناشتے سے ہوتی ہے اور اچھا ناشتا مجھے سارا دن فریش رکھتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ اپنا ناشتا خود بنا کر کھانے کا مزہ آتا ہے۔ ڈنر اور لنچ بنانے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔"

"کوئی بری عادت؟"

"غصہ جلدی آجاتا ہے اور چاہتی ہوں کہ مجھ میں غصہ کم ہو جائے۔ مگر ہوتا نہیں ہے اور ہاں ایک بری عادت یہ بھی ہے کہ دوسروں پہ جلدی بھروسا کر لیتی ہوں اور پھر نقصان اٹھاتی ہوں۔"

"اور کچھ۔۔۔؟"

"ہاں اس فیلڈ میں آنے والوں سے میری ایک گزارش ہے کہ اپنے سینئرز کی نہ صرف عزت کریں، بلکہ ان سے کچھ سیکھیں بھی۔ جتنا شارٹ کٹ ڈھونڈیں گے اتنا ہی نقصان اٹھائیں گے۔"

نتاشا علی

"نتاشا علی بہت اچھی فنکارہ ہے۔ بہت اچھی پرفارمر ہے، مگر بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہیں اور جب آتی ہیں تو سو بہانے، لیکن بولنے کا انداز ایسا کہ سب بھول جانے کو دل چاہتا ہے۔"

"کیسی ہیں نتاشا علی؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"یقیناً" آپ مصروف ہوں گی؟"

"جی بالکل۔۔۔ مگر سوری کہ آپ کو ٹائم نہیں دے پاتی۔"

"چلو کوئی بات نہیں، پھر کبھی سہی۔۔۔ بس دو چار باتیں کرنی ہیں آپ سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں ضرور۔۔۔؟"

"آج کل آپ کو ڈرامہ سیریل "ماسا" میں دیکھ رہے ہیں۔ کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"بہت اچھا۔۔۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ عاطف حسین کا سیریل ہو اور اچھا رسپانس نہ ملے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ ان کا تو ہر سیریل ہی ماشاء اللہ بہت کامیاب ہوتا ہے۔"

"بالکل۔۔۔ میرے تو پسندیدہ ڈائریکٹر ہیں۔ اب تک کتنے سیریلز کر چکی ہیں۔ بہترین کس کو کہیں گی اور پہلا سیریل کون سا تھا؟"

"جی میرا پہلا سیریل "جاڑے کا چاند" تھا اور میری پرفارمنس اتنی پسند کی گئی کہ پھر ایک کے بعد ایک آفرز آنے لگیں اور اب اللہ کا شکر ہے کہ کافی کام کر چکی ہوں۔ "قرض" میرے خیال سے میرا بہترین سیریل تھا۔ ذاتی طور پر مجھے بھی "قرض" بہت پسند ہے۔"

"کبھی لاہور، کبھی کراچی۔۔۔ مشکل نہیں ہوتی؟"

"نہیں مشکل کیوں؟ مجھے تو خود سفر کرنا اچھا لگتا ہے۔ لاہور میرا گھر ہے، کیونکہ میرا تعلق لاہور سے ہے اور فیملی کے ساتھ رہنا بھلا کسے پسند نہیں ہوگا اور انجم شہزاد کی ڈائریکشن میں ہمایوں سعید کا ایک سیریل بھی لاہور میں ہی کر رہی ہوں اور مجھے لاہور میں رہنا اور کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"ترقی کا راز پوچھو تو جواب آتا ہے، محنت بہت کی، آپ اپنے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"میں تو پہلا کریڈٹ اپنے والدین کو دوں گی، کیونکہ ان ہی کی دعاؤں کی وجہ سے مجھے یہ مقام ملا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں پنکچوئل بہت ہوں۔ وقت کی بھی پابندی کرتی ہوں اور وعدہ بھی پورا کرتی ہوں۔ سب کا خیال رکھتی ہوں اور چھوٹے بڑے سب کا احترام کرتی ہوں۔ ان کو عزت دیتی ہوں۔ تو میری ترقی میں میری اپنی بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔"

"اپنے ڈرامے دیکھ کر بھی اچھا لگتا ہو گا؟"

"سچ بتاؤں، مجھے تو اپنے ڈرامے دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ہاں اگر کوئی کہے کہ تمہارا فلاں ڈرامہ تو بڑا ہٹ جا رہا ہے یا فلاں میں تمہاری پرفارمنس بہت اچھی ہے تو پھر ضرور دیکھتی ہوں کہ دیکھوں تو سہی میں نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔"

"شخصیت کی پرکھ کے لیے کیا پیمانہ ہے آپ کی نظر میں؟"

"آپ کی بول چال، آپ کا اخلاق اور آپ کا لباس، آپ کا لباس آپ کی شخصیت کے مزاج کا پتا دیتا ہے۔"

"آپ فیشن کی دلدادہ ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ ہوں۔۔۔ فیشن کی دلدادہ، مگر فیشن کی اندھی تقلید نہیں کرتی۔ وہی فیشن اپناتی ہوں جو میرے دل کو اچھا لگتا ہے، جو مجھ پر اچھا لگتا ہے۔"

"پہلے کہتے تھے لوگ کہ بچپن سے شوق تھا اس فیلڈ میں آنے کا، اب انداز کچھ بدل گیا ہے۔ نتاشا آپ کیا کہیں گی؟"

"میں تو وہ ہی کہوں گی جو پہلے لوگ کہتے تھے۔ مجھے تو سچ مچ بچپن سے ہی شوق تھا شوبز میں آنے کا۔ مجھے حادثاتی فن کارہ کہلوانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اس فیلڈ میں آئی اور اللہ نے مجھے کامیابی بھی عطا کر دی۔"

"ہر خوب صورت فن کارہ کو فلم میں کام کی آفر ضرور آتی ہے۔ یا وہ خود جانا چاہتی ہے، آپ بھی۔۔۔؟"

"آپ یقین کریں۔۔۔ مجھے فلموں میں کام کرنے کی بہت آفرز آئیں، لیکن میں پاکستانی ڈراموں میں کام کر کے بہت خوش ہوں۔ میرا ایک امیج بن چکا ہے اور فلموں میں کام کر کے میں اپنا امیج خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اگر زندگی میں کبھی کام کیا بھی تو بہت سلجھا ہوا اور اچھا کام کروں گی۔ مطلب اچھا کردار لوں گی۔ محض ڈانس کر کے اپنے آپ کو نہیں منواؤں گی۔ اپنی پرفارمنس سے اپنے آپ کو منواؤں گی۔"

"اپنے ڈراموں سے مطمئن ہیں۔ مطلب اپنے ملک کے؟"

"میں ایک بات اور بھی بتا دوں کہ مجھے پاکستان نے عزت دی ہے، اس لیے کوئی غلط کام کر کے ملک کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی اور ہاں مطمئن ہوں کافی حد تک کہ بہت اچھا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے ڈراموں کا مقابلہ تو پوری دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

اس سے پہلے کہ مزید بات چیت ہوتی، شوٹ کے لیے نتاشا کو بلا لیا گیا اور ہم نے شکریے کے ساتھ بات ختم کر دی۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- ثیزا خان
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ---------- موسیٰ رضا

لکھنؤ کا عروج و زوال

نواب غازی الدین حیدر کے زمانے سے اودھ کے حکمرانوں کو بادشاہ کا درجہ مل گیا' جو وہاں کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ تک برقرار رہا۔ نواب واجد علی شاہ بھی بادشاہ کہلاتے تھے۔ تاہم یہ سب بادشاہ حقیقت میں صرف نام کے ہی بادشاہ تھے۔ انہیں ریاست کے وسائل سے عیش کرنے اور موج مستی میں دولت اڑانے کی آزادی ضرور حاصل تھی' لیکن اصل طاقت اور اختیارات انگریزوں ہی کے پاس تھے۔ وہ جب چاہتے' کسی کو حکمراں بنا سکتے تھے اور جب چاہتے اس منصب سے ہٹا سکتے تھے۔

غازی الدین حیدر کے زمانے میں ان کی بیگم کی کم علمی اور بعض مذہبی معاملات میں حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کی وجہ سے بدعتوں کو بہت فروغ ملا' جو نہ صرف آنے والے زمانوں تک میں رائج ہوتی چلی گئیں بلکہ بعد میں بھی لوگ ان میں حسب توفیق اضافہ کرتے چلے گئے۔

1827ء میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور ان کے صاحبزادے نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے مسلک میں بدعتوں کے سلسلے کو نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھایا اور اس میں نئی نئی اختراعات کیں۔ تاہم ان کے مزاج میں کچھ جدت پسندی بھی تھی یا پھر شاید اپنی توہم پرستی کی وجہ سے وہ علم نجوم میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو' لیکن انہیں بہرحال یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں ہندوستان کی پہلی رصد گاہ تعمیر کرائی جو اپنے وقت اور زمانے کے اعتبار سے جدید ترین آلات اور ساز و سامان سے لیس تھی۔ انہوں نے ایک انگریز ماہر فلکیات کرنل ولکاکس کو اس کا نگراں اور منتظم مقرر کیا۔

1847ء میں کرنل ولکاکس کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ اس رصد گاہ کا کوئی متبادل نگراں اور منتظم مقرر نہیں کیا گیا۔ اس وقت تک واجد علی شاہ کی حکمرانی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس دوران ایک تو ویسے ہی لاوارث ہونے کی وجہ سے رصد گاہ اجڑنے اور برباد ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف واجد علی شاہ کا اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ سنا ہے' انہوں نے اس رصد گاہ کی سب سے بڑی دوربین کو کوئی کھلونا سمجھ کر ایک طوائف کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

یہ رصد گاہ "تاروں والی کوٹھی" کہلاتی تھی۔ کرنل ولکاکس کے انتقال کے بعد سے اس کی بربادی تو شروع ہو ہی گئی تھی' لیکن بعد میں رہی سہی کسر جنگ آزادی' جسے عرف عام میں غدر بھی کہا جاتا ہے کے دوران پوری ہو گئی۔ جذبہ حریت سے سرشار' آزادی کے متوالوں نے اپنے ہی اس ورثے کو ۔ برباد کر ڈالا۔ انگریزوں سے جنگ کرنے والے ایک لشکر کے کمانڈر احمد اللہ شاہ' جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے۔ وہ اسی کوٹھی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں وہ اپنا دربار لگاتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورے کرتے تھے' جو انگریزوں کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔

نصیر الدین کا دور حکمرانی بدنظمی' ابتری اور خرابیوں کا دور تھا۔ بادشاہ کو اپنی عیش و عشرت کی سرگرمیوں اور اپنی مذہبی اختراعات یا بدعتوں سے فرصت نہیں تھی۔ ریاست کا نظام وزیروں پر چھوڑا ہوا تھا۔ جن میں سے ایک بھی دیانت دار یا ڈھنگ کا آدمی نہیں تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ بادشاہ اور ان کی والدہ میں بھی جھگڑے اور اختلافات تھے۔ والدہ کا کہنا تھا کہ منا جان نامی ایک نوجوان جس نے محل میں پرورش پائی تھی۔ نصیر الدین کا حقیقی بیٹا ہے' جبکہ خود نصیر الدین اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے والد غازی الدین حیدر بھی منا جان کو شاہی نسل میں شمار نہیں کرتے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے انگریز سرکار نصیر الدین کے انتقال سے پہلے ہی فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ ان کے بعد نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خان کو

تخت پر بٹھایا جائے گا مگر بیگم صاحب یعنی نصیر الدین کی والدہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ نصیر الدین کے انتقال کے بعد جب تخت نشینی کا مرحلہ آیا تو بیگم صاحب اپنے چہیتے منا جان کو ساتھ لے کر اس بارہ دری میں آگئیں' جہاں باقاعدہ تخت نشینی کی رسم انجام دی جاتی تھی۔

انگریز ریذیڈنٹ نے انہیں احترام کے ساتھ روکا اور سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ منا جان کو بادشاہ بنانا قطعی مناسب نہیں اور انگریز سرکار اس ضمن میں دوسرا فیصلہ کیے بیٹھی ہے' لیکن عمر رسیدہ بیگم صاحب کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا اور انہوں نے رسم کے مطابق امراء اور دربار کے خاص خاص لوگوں سے نذرانے لینے بھی شروع کر دیے۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے مخالفین سے انتقام لینا بھی شروع کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ بہت سے لوگ ان کے حکمران بننے کے حق میں نہیں تھے۔ منا جان نے چن چن کر انہیں گرفتار کرانا اور سزائیں دینا شروع کر دیں۔ ایسے کئی افراد کو انہوں نے قتل کرا دیا۔ کچھ کو زنداں میں ڈلوا دیا اور بعض کے گھر لوٹ لیے گئے۔ یوں پوری ریاست میں ایک افراتفری اور ہلچل مچ گئی۔ خاص طور پر لکھنؤ میں تو گویا بھونچال آگیا۔

انگریز ریذیڈنٹ بہادر ایک بار پھر بڑی بیگم صاحب کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ منا جان کو بادشاہ بنانے کی ضد چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیگم صاحب کو وائسرائے کا حکم نامہ بھی دکھایا' جس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ منا جان کو اودھ کا حکمراں بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ ریذیڈنٹ نے بہت کہا کہ منا جان تخت خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کو تخت پر بٹھایا جائے' مگر دربار چونکہ اب منا جان کے چیلوں' خوشامدیوں اور اس طرح کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے طالع آزماؤں سے بھر چکا تھا' اس لیے کسی نے ریذیڈنٹ کی بات پر کان نہ دھرا۔

الٹا کسی نے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ پر حملہ کر دیا' جس سے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ریذیڈنٹ کو پہلے ہی حالات خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ اس نے انگریز فوج کے دستے بلوائے ہوئے تھے اور بارہ دری کے سامنے توپیں لگوا دی تھیں۔ اس نے ایک طرح سے آخری وارننگ دی کہ اگر دس منٹ کے اندر اندر منا جان تخت سے نہ اترے تو حتمی کارروائی کی جائے گی۔

اس کی اس وارننگ کو بھی کوئی خاطر میں نہ لایا۔ ریذیڈنٹ گھڑی دیکھ کر اعلان کرتا رہا کہ اب اتنے منٹ باقی رہ گئے ہیں' اب اتنی مہلت رہ گئی ہے۔ جب آخری منٹ بھی گزر گیا تو یکایک توپیں گرج اٹھیں۔ بارہ دری کے ستون گر گئے اور اس کے ساتھ ہی تیس چالیس آدمی بھی لاشوں کی صورت میں ادھر ادھر گر گئے۔ دربار میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگنے لگا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ نازک مرحلہ شروع ہونے سے پہلے دربار میں رقص ہو رہا تھا۔ طوائفوں کا ایک طائفہ دربار میں مجرا پیش کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ جب آخری وارننگ دے کر گھڑی دیکھتے ہوئے ایک ایک منٹ گزرنے کا اعلان کر رہا تھا' طائفے کا مجرا اس دوران بھی جاری تھا۔ جب توپوں کی گھن گرج سے در و دیوار لرزے اور لاشیں گریں تو دیگر بدحواس درباریوں اور تماش بینوں کے ساتھ' طوائفیں بھی گرتی پڑتی ادھر ادھر دوڑیں۔ ان کے سازندے اپنے ساز چھوڑ کر بھاگے۔

خوشامدیوں اور موقع پرستوں کی بھیڑ میں منا جان اور ان کی دادی کے تھوڑے بہت جاں نثار بھی موجود تھے۔ انہوں نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی' لیکن انگریز فوج اور ان کی توپوں کے سامنے وہ بھلا کیا کر سکتے تھے؟! ایک ہی حملے میں جب ان کا بھی صفایا ہو گیا تو منا جان نے تخت کو چھوڑ کر جان بچانے کی کوشش کی اور تخت سے اتر کر بھاگے مگر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

انگریزوں نے ان کی دادی کو بھی حراست میں لے لیا اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی اور وہ محمد علی شاہ کے لقب سے اودھ کے بادشاہ قرار پائے۔ منا جان اور ان کی دادی' جو خاص محل (محل سے مراد بادشاہ کی بیگم ہوتی تھیں) کہلاتی تھیں۔ دونوں کو سخت نگرانی میں پہلے لکھنؤ سے کان پور بھیجا گیا' پھر کان پور سے قلعہ چنار گڑھ بھیج دیا گیا' جہاں ان کی حیثیت نظر بند قیدی کی تھی۔ البتہ گزر اوقات کے لیے لکھنؤ کے سرکاری خزانے سے ان کی تنخواہ دو ہزار چار سو روپے ماہوار مقرر کر دی گئی تھی۔

(لکھنؤ عروج و زوال)

آپ سنتے جائیں

واصفہ سہیل

شکر

سائنس دانوں نے دعوا کیا ہے کہ شکر ملے مشروبات ہر سال ایک لاکھ چوراسی ہزار بالغ افراد کو ہلاک کردیتے ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ جھاگ والے سافٹ ڈرنک، فروٹ ڈرنکس، انرجی ڈرنکس اور میٹھی یخ بستہ چائے پینے سے ہزاروں کی تعداد میں اموات ہورہی ہیں۔ اور ان مشروبات سے صحت کو فائدہ بھی نہیں پہنچتا۔ تحقیق کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اگر ہم اپنی غذاؤں میں پھلوں اور سبزیوں کا استعمال بڑھادیں تو ہر سال ہزاروں لوگوں کی جانیں بچائی جاسکتی ہیں۔

گیت گایا

بھارتی فلموں میں پاکستانی فنکاروں کی دھوم تو ہمیشہ سے رہی ہے۔ علی ظفر، عاطف اسلم، راحت فتح علی خان، شفقت امانت علی سمیت کئی نامور موسیقار، گلوکار بولی وڈ میں اپنی موسیقی کا جادو جگا رہے ہیں۔ اب اطلاع یہ ہے کہ نئی ریلیز ہونے والی فلم "دبن روئے" کا ایک گیت معروف بھارتی گلوکارہ ریکھا بھاردواج نے گایا ہے۔ فلم کے موسیقار شانی ارشد کے مطابق ریکھا نے یہ گانا نیٹ پر اسکائپ کے ذریعے ریکارڈ کروایا ہے۔ ریکھا بھاردواج نے بھارتی فلموں میں "سسرال گیندا پھول"، "بیڑی جلائی لے" جیسے گیت گائے ہیں۔ (اب دیکھیں کہ وہاں کی گلوکارہ یہاں کیا تیر مارتی ہیں....؟)

انکار

پتا نہیں ہمارے فنکار ایک جائز کام کو کرنے کے بعد چھپاتے کیوں ہیں جب کہ سچائی چھپ نہیں سکتی۔ اب یہی دیکھ لیں کہ اداکار نور اور ولی حامد کی شادی کی خبریں گردش کررہی ہیں کہ وہ دونوں شادی کے بعد ڈیفنس میں رہ رہے ہیں۔ ولی حامد سے جب اس خبر کے حوالے سے بات کی گئی تو انہوں نے اسے یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ان کی نور سے شادی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ نور ان کی سینئر ساتھی اداکارہ ہیں جو فلم میں ان کے ساتھ اداکاری کررہی ہیں۔

نور اس بارے میں کہتی ہیں کہ جب سے وہ شوبز میں آئی ہیں اس طرح کی خبریں آئے دن سنتی رہتی ہیں، ان کی ایک بیٹی ہے اور وہ اس کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہی ہیں اور اگر وہ شادی کریں گی تو سب کو بتا کر کریں گی چھپ چھپا کے نہیں۔

مواقع

معروف گلوکارہ ٹینا ثانی اب کم کم نظر آتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک تقریب میں بات کرتے ہوئے ٹینا ثانی نے کہا کہ انسان کبھی مکمل نہیں ہوتا کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔ پاکستان میں نئے ٹیلنٹ کو مواقع نہیں مل رہے ہیں جس کی وجہ سے ٹیلنٹ ضائع ہوتا جارہا ہے۔ (اور جن کے پاس ٹیلنٹ نہیں ہے وہ فن کو ضائع کررہے ہیں۔) ہمارے ملک میں گلوکاری کے شعبے میں بے پناہ ٹیلنٹ موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے مواقع نہیں مل رہے ہیں۔ (ٹیناجی! یہ حال تو ہمارے ملک کے ہر شعبے کا ہی ہے تو...؟)

ماضی

بشریٰ انصاری کہتی ہیں کہ "اب نئی پاکستانی فلم انڈسٹری بن رہی ہے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان فلم انڈسٹری بحال ہورہی ہے۔ میں اس کو نہیں مانتی۔ ماضی کی انڈسٹری ختم ہوچکی ہے اور اس بات کو تسلیم کرلینا چاہیے۔ (مان لیں تو پھر...؟) اب نئی انڈسٹری کراچی میں بن رہی ہے۔ اور یہاں پر بہت ساری فلمیں بن رہی ہیں۔ نئی انڈسٹری میں نئے پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ آرہے ہیں۔" (جیسے کہ...؟) اور یہی پاکستان فلم انڈسٹری کا مستقبل ہیں۔" (سچ ہے بھئی)

شوق

ثنا سرفراز کو آپ زندگی گلزار ہے میں دیکھ چکے ہیں۔ بنیادی طور پر ثنا ایک ماڈل ہیں۔ پاکستان میں ہر کام باآسانی ہوسکتا ہے۔ لیکن فیشن ماڈل بننا اب بھی مشکل ترین کام ہے۔ یہ وہ شعبہ ہے جہاں کامیابی کے لیے میرٹ ہی اصل راستہ ہے۔ ثنا ان دنوں کراچی کی ایک نجی یونی ورسٹی سے میڈیا سائنسز میں ماسٹر کررہی ہیں۔ کیونکہ مستقبل میں ان کا ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ ثنا کا شمار صبح دیر سے اٹھنے والوں میں ہوتا ہے۔ تعلیم ان کی پہلی ترجیح ہے۔ خوب سونا انہیں پسند ہے۔ (بھئی نیند والا) تیز ڈرائیونگ اور ہوٹل بازی ان کا شوق ہے۔

اِدھر اُدھر سے

☆ پندرہ سال قبل ترکی کے صدر رجب طیب اردگان کی اہلیہ کی جانب سے پاکستان میں آنے والے سیلاب کے متاثرین کی امداد کے لیے دی جانے والے ہار کی گمشدگی کا معمہ حل ہوگیا ہے کیونکہ اس وقت کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اعتراف کرلیا ہے کہ وہ ہار ان کے پاس ہے۔

لیکن یہ کہانی محض ایک ہار کی نہیں بلکہ ایک وزیراعظم کی ذہنی پستی، حرص، ہوس اور ان کی اخلاقیات کی عبرت ناک داستان ہے۔

(اخبار جہاں)

☆ چین کے انقلابی چیئرمین کامریڈ ماؤزے تنگ نے لکھا تھا۔ بھارت میں صرف دو چیزیں ہیں۔ ایک غربت اور دوسرا تاج محل۔

(اعجاز منگی..... آوازِ حق)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دھواں دار کباب

ضروری اشیاء :

بیف قیمہ	1/2 کلو
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد (باریک چوپ کرلیں)
نمک	حسب ذائقہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	3'4 عدد (باریک کٹی ہوئی)
الائچی پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
پسی سیاہ مرچ	1/2 چائے کا چمچہ
دار چینی پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
کوئلہ	ایک عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چوپر میں قیمہ 'لال مرچ' پیاز' نمک 'ثابت دھنیا' الائچی پاؤڈر' ہری مرچیں 'سیاہ مرچ اور اور دار چینی پاؤڈر ڈال کر باریک پیس لیں۔

اب اس آمیزے کو بڑی پلیٹ میں رکھ کر درمیان میں گول دائرہ بنائیں اور اس میں جلتا ہوا کوئلہ رکھ کر، کوئلے کے اوپر گھی ڈالیں۔ اس کے بعد اس کو کسی برتن سے ڈھک دیں اور اس آمیزے کے کباب بنالیں۔

فرائی پین میں تیل گرم کر کے کباب فرائی کریں اور سرونگ ڈش میں رکھ کر گرم گرم سرو کریں۔

مرغ تکہ مسالا بگھارے چاولوں کے ساتھ

ضروری اشیاء :

مرغ سالم (دھو کر کٹ لگالیں)	ایک عدد
دہی	1/2 کپ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
چاٹ مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
زردرنگ	ایک چٹکی
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
تیل	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

اجزابرائے چاول :-

چاول	ایک پاؤ
آلو	دو عدد (ابال کر کیوبز کاٹ لیں)
تیل	دو کھانے کے چمچے
لونگ	دو عدد
ثابت سیاہ مرچیں	3-4 عدد
بڑی الائچی	ایک عدد
چھوٹی الائچی	2-3 عدد
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی	ایک ٹکڑا
بادیان کے پھول	1-2 عدد
کیوڑہ	ایک چائے کا چمچہ
انڈے (ابال لیں)	گارنشنگ کے لیے
ٹماٹر	گارنشنگ کے لیے

ترکیب :

ایک پیالے میں دہی 'پسی لال مرچ' چاٹ مسالا' پسا گرم مسالا' زردرنگ' سرکہ' تیل اور نمک ڈال کر آمیزہ بنالیں۔ اس کے بعد اس آمیزے کو مرغ پر اچھی طرح اندر باہر لگا کر 2-3 گھنٹے میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں چاروں طرف تیل لگا کر اس میں میرینیٹ مرغ معہ میرینیشن ڈالیں اور ڈھکن ڈھک کر گلنے تک پکائیں۔ ایک علیحدہ دیگچی میں تیل گرم کر کے لونگ' ثابت سیاہ مرچیں' بڑی الائچی' چھوٹی الائچی' سفید زیرہ' دار چینی اور بادیان کا پھول ڈال کر کڑکڑائیں۔ اس میں چاول' نمک اور پانی شامل کر کے پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ جب چاول دم پر آجائیں تو اس میں کیوڑہ چھڑک دیں۔ سرونگ ڈش کے درمیان میں مرغ تکہ مسالا رکھ کر چاروں طرف بگھارے چاول ڈال دیں اور ساتھ ہی آلو' ٹماٹر اور انڈے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

فروٹ جیلی کرسٹل سیلڈ

ضروری اشیاء :

گرین جیلی	ایک پیکٹ
ریڈ جیلی	ایک پیکٹ
آم (کیوبز کاٹ لیں)	ایک عدد
سیب	ایک عدد (کیوب کاٹ لیں)
کیلے	تین عدد (کیوب کاٹ لیں)
پانی	ڈیڑھ کپ

ترکیب :

گرین اور ریڈ جیلی کو پیکٹ پر دی گئی ہدایت کے مطابق تیار کرلیں۔ تھوڑی تھوڑی سیٹ ہوجائے تو اس میں آم' سیب اور کیلے ڈال دیں' باؤل میں جیلی ڈال کر فریزر میں بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ سرونگ پلیٹ میں باؤل کو الٹا رکھ کر تیار شدہ جیلی کرسٹل احتیاط سے نکال لیں۔ ٹھنڈا میٹھا فروٹ جیلی کرسٹل سرو کریں۔

فروٹ کیک

اشیا :

میدہ	آدھا پاؤ
چینی	آدھا پاؤ
انڈے	چھ عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ونیلا ایسنس	حسب ضرورت
کشمش	ایک چھٹانک
مکھن	آدھا پاؤ
بیکنگ پیپر	حسب ضرورت

ترکیب :

چینی کو باریک پیس لیں اور اس میں مکھن کو اچھی طرح سے ملائیں۔ ایک کھلے برتن میں انڈے توڑ کر سفیدی اور زردی کو الگ الگ پھینٹیں۔ سفیدی کو اتنا پھینٹیں کہ جھاگ بن جائیں۔

ایک الگ برتن میں میدے کو چھان لیں پھر اس میں بیکنگ پاؤڈر کو اچھی طرح سے ملالیں۔ پھر مکھن اور چینی کو بھی اس میں ملادیں اور اتنا چمچے سے ملائیں کہ یک جان ہوجائے' پھر اس میں انڈوں کی زردی ملادیں' پھر سفیدی جو جھاگ کی صورت ہوگی وہ ملادیں اور اتنا پھینٹیں کہ سب چیزیں یک جان ہوجائیں پھر اس میں دھلی ہوئی صاف ستھری کشمش ملادیں۔ کیک کا سانچہ لے کر اس کے چاروں طرف اور پیندے پر بٹر پیپر لگا کر اس پر مکھن کی ہلکی سی تہہ لگادیں اور تیار شدہ آمیزے میں ایسنس ملا کر اس میں ڈال دیں۔ تندور یا اوون میں رکھ کر پکائیں۔ تقریباً "45 منٹ بعد سرخ ہونے پر نکال لیں۔

ایلوویرا کے فائدے

گھیکوار ایک ایسا پودا ہے، جو اپنے اندر طبی فوائد کا خزانہ رکھتا ہے۔ پنجاب میں اسے کوار گندل کہتے ہیں۔ یونانی، رومن، اطالوی، روسی اور فرانسیسی زبان میں اسے ایلوویرا کہتے ہیں۔ اس کا استعمال ادویات، شیمپو، کریموں اور کنڈیشنرز میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔

ایلوویرا کو جلد پر لگانے سے بہت سے فوائد سامنے آتے ہیں۔ مثلاً "اگر ہاتھ جل جائے تو فوراً" اس کا گودا لگانے سے جلن ختم ہوجاتی ہے۔

اگر چھری سے خراش آجائے تب بھی اس کا گودا لگانا بہت مفید ثابت ہوگا۔ ایلوویرا کا گودا دن میں دو سے تین مرتبہ لگائیں، خشک ہونے پر منہ دھولیں۔ یہ آپ کی جلد کو جوان اور شگفتہ رکھے گا۔

☆ اگر بال بے رونق، کھردرے، خشک ہوں یا کسی زخم کی شکایت ہو تو اس کا استعمال بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔ بالوں میں ایلوویرا لگائیں اور خشک ہونے پر بال دھولیں۔ نہ صرف خشکی کا خاتمہ ہوگا بلکہ بال بھی نرم ہوجائیں گے۔ اگر خشکی کا مسئلہ زیادہ ہو تو دو چمچے دہی، ایلوویرا کا گودا اور آدھی چمچی سے کم ہلدی ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اب اس آمیزے کو سر پر آدھا گھنٹے کے لیے لگا رہنے دیں اور آدھے گھنٹے بعد سر دھولیں، بال سکری، خشکی سے پاک۔ نرم و ملائم بلکہ مضبوط گھنے اور لمبے بھی ہوں گے۔

☆ ایلوویرا قبض دور کرنے میں بھی بہت مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے جسم میں موجود زہریلے فضلات نکل جاتے ہیں۔ معدے کی گیس اور تیزابیت کو دور کرتا ہے۔ سات گرام گودا کھانے سے قبض دور ہوگا۔ ایک چھوٹا ٹکڑا بھی کافی ہے۔

☆ یہ مسوڑھوں اور دانتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ تھوڑا سا گودا لے کر منہ میں اچھی طرح مل لیں۔ پانچ منٹ لگا رہنے دیں۔ اب نمک لے کر دانتوں پر مل لیں اور منہ صاف کرلیں۔

☆ اگر چہرے پر کیل مہاسے داغ دھبے نکل آئیں تو ان کے لیے ایلوویرا کا گودا بہت مفید ہے۔ دن میں دو سے تین بار اس کا گودا لگائیں۔ تین سے چھ ماہ میں سارے دھبے صاف ہوجائیں گے۔ اگر ایک انچ ٹکڑا نہار منہ صبح کھالیں تو جلد شفا ملے گی۔

☆ اکثر لوگوں کو کمر میں درد کی شکایت رہتی ہے ان کے لیے انمول نسخہ حاضر ہے۔ ایک چمچہ تازہ گودے میں آدھا چمچہ شہد اور دو چٹکی پسی ہوئی سونٹھ ملا کر صبح کے وقت استعمال کریں۔ چند دنوں میں کمر درد ختم ہوجائے گا۔☆☆

میک اپ کے جدید طریقے

میک اپ خوب صورتی بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، مگر بعض اوقات کچھ خواتین فائدہ اٹھانے کے بجائے نقصان اٹھالیتی ہیں، وہ میک اپ کے بعد خوب صورت لگنے کے بجائے اور بری لگنے لگتی ہیں۔ بدلتے زمانے کے ساتھ ساتھ میک اپ کے بھی نئے رجحانات متعارف ہورہے ہیں اور پرانے رجحانات ترک کیے جارہے ہیں۔ یہاں پر کچھ ایسی ہی باتوں کا ذکر کیا جارہا ہے، جن پر دھیان دینے سے آپ اور خوب صورت نظر آسکتی ہیں۔

1) کن سیلر کے بارے میں عموماً" یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ داغ دھبوں کو چھپانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے جبکہ درحقیقت یہ محض آنکھوں کے گرد حلقوں کو چھپانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ داغ دھبوں کو چھپانے کے لیے فاؤنڈیشن اسٹک استعمال کیجئے۔

2) بلش آن کے بغیر چہرے پر رونق نہیں آتی۔ کچھ خواتین کا یہ خیال ہے کہ اگر اسے چہرے کے کھوکھلے حصے میں لگایا جائے تو زیادہ اچھا لگے گا، مگر یہ تاثر غلط ہے۔

بلش آن لگانے سے قبل ذرا سا مسکرایئے اور اب اپنے چہرے کے ابھرے حصے پر بلشر لگایئے اور پھر اچھی طرح سے بلینڈ کرلیں۔ ایسا کرنے کے بعد اپنے جبڑوں کے نیچے بھی ہلکا سا بلش آن لگایئے اور اچھی طرح بلینڈ کرلیں۔ اس طرح آپ کا چہرہ واقعی خوب صورت نظر آئے گا۔

3) آنکھوں پر میک اپ سے پہلے فاؤنڈیشن مت لگائیں بلکہ صرف ہائی لائٹر کا استعمال کریں تاکہ آپ کا میک اپ دیرپا اور تروتازہ رہے۔